BKID -528

تاریخ ادب عربی-I

برائے

ایم۔اے؍عربی

(سمسٹر۔I)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

C مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

سلسلہ مطبوعات نمبر-........

ISBN: ....

Edition: ....

ناشر : رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اشاعت : 2019------

مطبع : ---------------

History of Arabic Literature

Edited by:

Prof. Syed Alim Ashraf

Head, Department of Arabic, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Translation and Publications

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS)

E-mail: directordtp@manuu.edu.in

for

Directorate of Distance Education

E-mail: dir.dde@manuu.edu.in; Website: www.manuu.edu.in

کورس کوارڈی نیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف

شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین :	اکائی نمبر
ڈاکٹر عبید الرحمان (جواہر لال نہرو یونیورسٹی)	1,2
ڈاکٹر ثمامہ فیصل (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)	3,9,10,11
ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)	4(مشترکہ)
ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)	4(مشترکہ)
ڈاکٹر وارث مظہری (جامعہ ہمدرد)	5,6
ڈاکٹر غطریف ندوی	6,8(مشترکہ)
ڈاکٹر محمد مشتاق (جامعہ ملیہ اسلامیہ)	7
ڈاکٹر سعید مخاشن (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)	12
ڈاکٹر جمشید احمد (یونیورسٹی آف ممبئی)	13,14,16
پروفیسر کفیل احمد قاسمی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)	15

مدیران

ڈاکٹر جمشید احمد	(یونیورسٹی آف ممبئی)
ڈاکٹر ثمینہ کوثر	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
ڈاکٹر محمد عبد العلیم	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
ڈاکٹر سید محمد عمر فاروق	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
ڈاکٹر محمد رحمت حسین	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)

ٹائٹل پیج: ڈاکٹر ظفر گلزار

فہرست

پیغام		وائس چانسلر	6
پیش لفظ		ڈائرکٹر، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز	7
ڈائرکٹر کا پیغام		ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم	8
کتاب کا تعارف		کوآرڈینیٹر	9
بلاک	I	عصر جاہلی	10
اکائی	1	جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ: سامی اقوام اور زبانیں	10
اکائی	2	عربی زبان کا ارتقا: دور جاہلی میں عربوں کے سیاسی وسماجی حالات	27
اکائی	3	عہد جاہلی میں عربی ادب: نثر وشعر، اقسام وخصوصیات	52
اکائی	4	اصحاب معلقات، اصحاب مجمہرات اور صعالیک شعرا	80
بلاک	II	عصر اسلامی	117
اکائی	5	عصر اسلامی کا تعارف اور اس کی خصوصیات	117
اکائی	6	قرآن وحدیث کی تدوین اور ان کا ادبی مقام	126
اکائی	7	مخضرمی شعرا اور ان کی شعری خصوصیات	148
اکائی	8	عصر اسلامی میں خطابت	170
بلاک	III	عصر اموی	185
اکائی	9	عصر اموی کے سیاسی ودینی حالات	185
اکائی	10	عصر اموی میں عربی خطابت کا ارتقا، اس کی اہم خصوصیات اور اہم شخصیات	204
اکائی	11	خطوط نویسی اور وصیتیں	225

	اکائی	12۔عصر اموی کی شاعری اور اس عہد کے مشہور شعرا	245
بلاک	IV	عصر عباسی	279
	اکائی	13۔عباسی خلافت وحکومت پر ایک طائرانہ نظر	279
	اکائی	14۔عہد عباسی میں علوم فنون کا ارتقا	319
	اکائی	15۔عصر عباسی میں فنی نثر کا ارتقا	366
	اکائی	16۔عصر عباسی میں شاعری	400

پیغام

وائس چانسلر

وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے جس ایکٹ کے تحت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کی بنیادی سفارش اُردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ایک طرف اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد بناتا ہے تو دوسری طرف ایک امتیازی وصف ہے، ایک شرف ہے جو ملک کے کسی دوسرے اِدارے کو حاصل نہیں ہے۔ اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ بھی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت رسائل و اخبارات کی اکثریت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہماری یہ تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج آج کے دور کے اہم ترین علمی موضوعات چاہے وہ خود اُس کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، وہ جن مشینوں اور آلات کے درمیان زندگی گزار رہا ہے اُن کی بابت ہوں یا اُس کے گرد و پیش اور ماحول کے مسائل ـ ـ ـ ـ ـ وہ ان سے نابلد ہے۔ عوامی سطح پر اِن اصناف کی عدم دستیابی نے علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے جس کا مظہر اُردو طبقے میں علمی لیاقت کی کمی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اسکولی سطح کی اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چونکہ اُردو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہی اُردو ہے اور اس میں علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ اِسی مقصد کے تحت ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا قیام عمل میں آیا ہے اور احقر کو اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اپنے قیام کے محض ایک سال کے اندر ہی یہ برگِ نو، ثمر آور ہو گیا ہے۔ اس کے ذمہ داران کی انتھک محنت اور قلم کاروں کے بھرپور تعاون کے نتیجے میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں نصابی اور ہم نصابی کتب کی اشاعت کے بعد اِس کے ذمہ داران، اُردو عوام کے واسطے بھی علمی مواد، آسان زبان میں تحریر عام فہم کتابوں اور رسائل کی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے تاکہ ہم اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

خادمِ اوّل

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیش لفظ

ہندوستان میں اُردو ذریعہ تعلیم کی خاطر خواہ ترقی نہ ہو پانے کے اسباب میں ایک اہم سبب اُردو میں نصابی کتابوں کی کمی ہے۔اس کے متعدد دیگر عوامل بھی ہیں لیکن اُردو طلبہ کو نصابی اور معاون کتب نہ ملنے کی شکایت ہمیشہ رہی ہے۔ 1998ء میں جب مرکزی حکومت کی طرف سے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اعلیٰ سطح پر کتابوں کی کمی کا احساس شدید ہوگیا۔اعلیٰ تعلیمی سطح پر صرف نصابی کتابوں کی نہیں بلکہ حوالہ جاتی اور مختلف مضامین کی بنیادی نوعیت کی کتابوں کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت چونکہ طلبہ کو نصابی مواد کی فراہمی ضروری ہے لہٰذا اُردو یونیورسٹی نے مختلف طریقوں سے اُردو میں مواد کا نظم کیا۔ کچھ مواد یہاں بھی تیار کیا گیا مگر علمی کتابوں کی منظم اور مستقل اشاعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا جاسکا۔

موجودہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنی آمد کے ساتھ ہی اُردو کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے انقلاب آفریں فیصلہ کرتے ہوئے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا قیام عمل میں لایا۔اس ڈائرکٹوریٹ میں بڑے پیمانے پر نصابی اور دیگر علمی کتب کی تیاری کا کام جاری ہے۔کوشش یہ کی جارہی ہے کہ تمام کورسز کی کتابیں متعلقہ مضامین کے ماہرین سے راست طور پر اُردو میں ہی لکھوائی جائیں۔اہم اور معروف کتابوں کے تراجم کی جانب بھی پیش قدمی کی گئی ہے۔توقع ہے کہ مذکورہ ڈائرکٹوریٹ ملک میں اشاعتی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز ثابت ہوگا۔اب تک یہاں سے تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی یہاں سے کثیر تعداد میں اُردو کتابیں شائع ہوں گی۔

زیرنظر کتاب فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت ایم اے عربی سمسٹر اول کے طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے جس سے روایتی طریقہ تعلیم کے طلبہ بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔کتاب کی تیاری میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ یہاں جن موضوعات کا مطالعہ کریں ان پر انہیں بھرپور اور مکمل مواد دستیاب ہو جائے۔

یہ اعتراف ضروری ہے کہ حالیہ عرصے میں جو بھی کتابیں شائع کی جارہی ہیں ان میں شیخ الجامعہ کی راست سرپرستی اور نگرانی شامل ہے۔اُن کی خصوصی دلچسپی کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اور شعبہ عربی کے اساتذہ اور عہدیداران کا بھی عملی تعاون شاملِ حال رہا ہے جس کے لیے اُن کا شکریہ بھی واجب ہے۔اُمید ہے کہ قارئین اور ماہرین اپنے مشوروں سے نوازیں گے۔

پروفیسر محمد ظفر الدین

ڈائرکٹر، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

ڈائرکٹر کا پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم سارے عالم میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور چہار سو اس طریقے سے بڑی تعداد میں لوگ تعلیم اور اسناد سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طریقے کو اختیار کیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس یونیورسٹی نے روایتی طریقۂ تعلیم سے پہلے فاصلاتی طریقے سے تعلیم کو اُردو عوام تک پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پہل یہاں کے تدریسی پروگراموں کے لیے بعض دوسری یونیورسٹیوں کے نصابی مواد سے من وعن اور بشکلِ ترجمہ استفادہ کیا گیا۔ اِرادہ یہ تھا کہ بہت تیزی سے اپنا نصابی مواد تیار ہوجائے گا اور بتدریج دوسری یونیورسٹیوں پر سے انحصار ختم ہوجائے گا۔ لیکن جب نصابی مواد کی تیاری کا سلسلہ شروع کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ قدم قدم پر مسائل پیش آئے اور مختلف النوع اُلجھنوں نے رفتار کو سست کر دیا۔ مگر کوششیں جاری رہیں اور نتیجے کے طور پر اب بہت تیزی سے یونیورسٹی نے اپنے نصابی مواد کی اشاعت شروع کر دی ہے۔ اور جلد ہی انشاء اللہ ہمارے سبھی کورسز کی کتابیں ہماری خود کی ہوں گی۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم (ڈی ڈی ای)، مانو نے طلبا کی سہولت کے لیے ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے جس میں 9 علاقائی مراکز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور 5 ذیلی علاقائی مراکز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی) شامل ہیں۔ ہر علاقائی/ ذیلی علاقائی مرکز (Regional Centre/Sub Regional Centre) فاصلاتی تعلیم کے طلبا کو "Learner Support Centre" کے ذریعے تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتا ہے۔ سال 18-2017 میں، نظامت فاصلاتی تعلیم میں علاقائی/ ذیلی علاقائی مراکز کے ذریعے 158 ''Study Centres'' چلائے جارہے تھے۔ اب جن کا نام ''Learner Support Centre'' ہوگیا ہے۔ اپنے آپ کو جدید تر بنانے اور فاصلاتی طلبا کی سہولت کے لیے معیار میں اضافہ کرنے کی خاطر ڈی ڈی ای نے یو جی اور نئے ایم اے پروگراموں کے لیے 'انتخاب پر مبنی کریڈٹ سسٹم' (Choice Based Credit System-CBCS) متعارف کیا ہے۔ ڈی ڈی ای نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اب ڈی ڈی ای کے تمام پروگراموں کے لیے داخلے صرف آن لائن طریقے سے ہی دیے جارہے ہیں۔

کسی بھی وقت، کہیں بھی اکتسابی ماحول فراہم کرنے کے لیے یونیورسٹی کا 'انسٹرکشنل میڈیا سنٹر' ویڈیو لکچرز تیار کر رہا ہے جو یوٹیوب چینل http://youtube.com/u/imcmanuu پر دستیاب ہیں۔ مستقبل میں یونیورسٹی کی ویب سائٹ کے ذریعے طلبا کو اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں فراہم کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ ڈی ڈی ای اور طلبا کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے جس کے ذریعے طلبا کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات (Assignments)، کونسلنگ اور امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

فی الحال نظامتِ فاصلاتی تعلیم میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورس پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلائے جارہے ہیں۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز (Skill Based Courses) بھی شروع کیے جائیں گے۔ اپنی کاوشوں کے ذریعے ڈی ڈی ای نارساؤں تک رسائی کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ امید ہے کہ سماج کے تعلیمی، معاشی اور ثقافتی طور پر پچھڑے طبقات کو مرکزی دھارے میں لانے میں ڈی ڈی ای، مانو کا بھی نمایاں کردار رہے گا۔

پروفیسر ابوالکلام

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

کتاب کا تعارف

عربی زبان دنیا کی بڑی اور اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ سامی زبانیں جزیرۂ عرب، عراق، شام اور حبشہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان زبانوں میں سے اب صرف عربی، عبرانی اور امہری زبانیں باقی رہ گئیں ہیں۔ عربی اقوام متحدہ میں دفتری کاموں کے لیے منظور شدہ چھ زبانوں میں سے ایک ہے۔ تمام عرب ملکوں کی سرکاری زبان ہے اور کئی دوسرے ملکوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ عہد وسطی میں عربی زبان علوم وفنون اور فلسفہ اور سائنس کی زبان تھی اور اس نے دنیا کی بہت ساری زبانوں کو متاثر کیا جن میں سرفہرست اردو، فارسی اور ترکی زبانیں شامل ہیں۔ اس روشن تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ زبان آج کے تناظر میں بھی ایک اہم زبان ہے اور اس میں مہارت طلبہ کے لیے امکانات کے نئے دروازے کھولتی ہے۔ زیر نظر کتاب فاصلاتی نظام تعلیم کے ایم اے عربی کے پہلے سمسٹر کے طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے جو نصابی یکسانیت کے سبب روایتی طرز تعلیم کے طلبہ کے لیے بھی مفید ومعاون ہے۔ نصاب کی یکسانیت بیورو برائے فاصلاتی تعلیم (DEB) کی ہدایات مجریہ 18-2017 کے مطابق ہے جس کے بموجب روایتی اور فاصلاتی تعلیم کا نصاب یکساں ہونا چاہیے۔

یہ کتاب عربی ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے جس میں عہد بہ عہد عربی زبان کا تعارف کرایا گیا ہے اور مختلف عہد میں عربی زبان کے احوال ورجال اور امتیازات وخصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب چار بلاک اور سولہ اکائیوں ہر مشتمل ہے۔ پہلے بلاک میں جزیرۂ نما عرب کے جغرافیائی احوال و ظروف کا بیان کیا گیا ہے، عرب اقوام اور ان کی مختلف بولیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اسی بلاک میں اصحاب معلقات ومجمہرات کی شاعری اور اس کی اہمیت وخاصیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ معلقات ومجمہرات کی اہمیت کے پیش نظر ابتداء انہیں دو علاحدہ اکائیوں میں لکھا گیا تھا لیکن بعض تکنیکی ضرورت کے پیش نظر باہم ضم کر دیا گیا ہے۔ دوسرے بلاک کا موضوع عصر اسلامی ہے، اس میں صدر اسلام میں عربی زبان اور اس کے امتیازات کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں سرفہرست قرآن وحدیث کے ادبی مقام اور ان کے فنی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس موضوع کو بھی دو الگ الگ اکائیوں میں تحریر کیا گیا تھا لیکن ضرورتاً انہیں ضم کر دیا گیا ہے۔ تیسرا بلاک عصر اموی میں عربی ادب کے ارتقا اور اس کی خصوصیات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی دو اکائیوں کو باہم ضم کر دیا گیا ہے۔ چوتھا اور آخری بلاک عہد عباسی میں عربی ادب کی تاریخ سے عبارت ہے۔ اس عہد میں نئے نئے شعری ونثری موضوعات واسالیب کا ظہور وارتقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ فن ترجمہ سے متعلق اس بلاک میں ایک مستقل اکائی تھی جسے ضرورتاً حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے ضروری مضامین کو اسی سمسٹر کی کتاب ترجمہ نگاری میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب خود اکتسابی مواد (SLM) کے اصول وضوابط کے مطابق تیار کی گئی ہے، لہذا اس کتاب میں اس بات کی پوری رعایت کی گئی ہے کہ اس میں ان امور کی پوری رعایت کی جائے جن کی روشنی میں خود اکتسابی مواد پر مشتمل درسی کتاب کو تیار کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کو ان اسباق کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

پروفیسر سید علیم اشرف جائسی

کورس کوآرڈینیٹر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

اکائی 1 جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ: سامی اقوام اور سامی زبانیں

اکائی کے اجزا

1.1 مقصد

1.2 تمہید

1.3 جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی احوال

1.3.1 حدود اربعہ

1.3.2 جزیرہ کے مختلف علاقے

1.4 جزیرہ نمائے عرب کے طبعی احوال

1.4.1 پہاڑ اور میدان

1.4.2 صحرا اور نخلستان

1.4.3 نباتات وحیوانات

1.4.4 باشندگان

1.5 سامی اقوام

1.5.1 سامی اقوام کی اصل

1.5.2 سامی اقوام جزیرہ عرب میں

1.6 سامی زبانیں

1.6.1 زبان کی تعریف

1.6.2 زبان کا آغاز

1.6.3 زبانوں کے خاندان

1.6.4 شلیگل کی تقسیم رکا نظریہ

1.6.5 میکس مولر کی تقسیم رکا نظریہ

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 نمونے کے امتحانی سوالات

1.9 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

1.1 مقصد

۱۔ طلبہ اس سبق سے جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیہ سے واقف ہوں گے اور یہ جان سکیں گے کہ اسلام سے قبل اس کے حدود واربعہ کیا تھے اور اس وقت اس کے نواح میں آباد ممالک کون کون تھے۔

۲۔ جزیرہ نمائے عرب کے اندر پائے جانے والے اہم مقامات، پہاڑوں، وادیوں، نخلستانوں اور دیگر قابل ذکر مقامات واحوال کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کریں گے۔

۳۔ جزیرہ نمائے عرب میں پائے جانے والے حیوانات ونباتات سے واقفیت حاصل کریں گے اور اسلام سے قبل عرب دنیا کے ذریعۂ معاش اور انکے کھانے پینے کی چیزوں سے واقف ہوں گے۔

۴۔ طلبہ سامی اقوام کی اصل، ان کے مسکن، جزیرہ عرب میں انکی سکونت اور جزیرہ عرب اور اس کے باہر سامی اقوام کی ہجرت کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔

۵۔ زبان کی تعریف اور زبانوں کے خاندان سے واقف ہونگے۔

۶۔ زبانوں کی گروہ بندی اور اس سلسلے میں مختلف ماہرین لسانیات کی آرا سے واقف ہونگے۔

1.2 تمہید

علم جغرافیہ کسی مقام کے حدود کو متعین طور پر بتاتی ہے کہ کوئی بستی، کوئی شہر، کوئی ملک دنیا کے کس خطہ/ علاقہ میں واقع ہے، اس کے ارد گرد دائیں بائیں، آگے پیچھے یا شمال وجنوب، مغرب ومشرق میں کونسے کونسے ممالک، سمندر، دریا اور پہاڑ واقع ہیں۔ جس سے اس علاقہ میں آباد لوگوں کے حالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ وہ گرم علاقہ ہے یا سرد، سرسبز وشاداب علاقہ ہے یا خشک، صحرا ہے یا ریگستان۔ اس سے ان کے کھانے پینے، رہن سہن، عادات واطوار کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی بولی اور زبان کو جاننے سمجھنے اور اس میں محفوظ انسانی تجربات، علمی ذخائر اور ان کے افکار ونظریات کو جاننے اور ان سے استفادہ کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس لیے کسی بھی ملک یا علاقے کے جغرافیہ اور جغرافیائی حالات کو جاننا انتہائی ضروری ہے، اس کے بغیر ہم وہاں کے رہنے والے باشندوں کی نہ تو زبان سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے احوال وکوائف سے صحیح طور سے واقف ہو سکتے ہیں بلکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہم ان کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں آباد اقوام کا تعلق سامی نسل سے مانا جاتا ہے اس لیے یہ جاننا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ سامی اقوام کا اطلاق کن قوموں پر ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب میں آباد سامی اقوام کا اصل وطن یہی جزیرہ تھا یا پھر کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئیں اور پھر سرزمین عرب سے باہر کب کب ہجرت کی۔ وہ کونسی زبانیں بولتے تھے، سامی زبانوں میں کونسی کونسی زبانیں آتی ہیں۔ زبان کی تعریف کیا ہے اور ماہرین لسانیات نے مختلف زبانوں کے خاندان اور انکی گروہ بندی کیسے کی ہے۔ یہ ساری معلومات ہمیں عربی زبان کی اصل تک پہونچنے، دوسری زبانوں سے اس کے تعلق، ایک دوسرے سے لسانی لین دین کو جاننے میں مدد دیں گی اور عربی کی قدامت، بقا، نشوونما اور پھیلاؤ کو سمجھنے میں انتہائی مدد ومعاون ثابت ہوں گی۔ آنے والے صفحات میں جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیہ، وہاں کے طبعی حالات، سامی اقوام اور سامی

زبانوں سے بحث کی جائے گی۔

1.3 جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی احوال

1.3.1 حدود اربعہ

جزیرۂ نمائے عرب دنیا کے نقشے پر ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں ایشیا اور افریقہ کی سرحدیں ملتی ہیں اور یورپ خشکی اور تری دونوں راستوں سے قریب ہے۔عرب کو جزیرۂ نما اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے تین طرف سے پانی اور ایک طرف خشکی ہے۔مغرب میں بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم ہے،مشرق میں بحر ہند،خلیج فارس اور بحر عمان ،جنوب میں بحر ہند،شمال کے حدود بہت مختلف ہیں بعض جغرافیہ داں شام تک اس کے حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

قدیم زمانے یا دور جاہلی میں جزیرہ نمائے عرب مختلف خطوں رعلاقوں پر مشتمل تھا اور انکے نام کچھ اس طرح تھے: حجاز(مکہ، مدینہ(یثرب)،طائف وغیرہ)، نجد، بحرین، یمن، تہامہ، شحر،ظفار، اور حضرموت۔دور جاہلی سے لیکر دور جدید یعنی ۱۷۹۸ سے پہلے تک جزیرہ عرب کے یہ علاقے انہی ناموں سے جانے جاتے تھے لیکن جب دور جدید میں قومی ریاستوں کا ظہور ہوا تو نئے نئے ممالک وجود میں آئے ۔اس طرح آج جزیرہ عرب کا اطلاق سعودی عرب (حجاز)،یمن،عمان،اردن،متحدہ عرب امارات،کویت،قطر اور بحرین پر ہوتا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب کا رقبہ تقریبا دس لاکھ مربع میل ہے۔جو فرانس کے رقبہ سے دوگنا ہے۔اس کی سب سے طویل سرحد وہ ہے جو بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔اس کا طول چودہ سو میل ہے۔اس کا سب سے زیادہ عریض وہ علاقہ ہے جو یمن سے عمان تک چلا گیا ہے۔جس کی چوڑائی بارہ سو پچاس میل ہے۔

عرب کا لفظ عروبۃ،عَرب اور عُروب سے مشتق ہے اس کے معنی فصیح اللسان ہونا،زبان دان ہونا۔عرب چونکہ اپنے آپ کو اور قوموں کے بالمقابل فصیح اللسان سمجھتے تھے اس لیے غیر عربوں کے لیے عجم کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی کلام میں غیر واضح ہونا،گونگا ہونا۔کچھ لوگوں نے اس کے معنی دشت وصحرا کے بتائے ہیں،شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب دنیا کا بہت بڑا حصہ ریگستان پر مشتمل ہے۔

1.3.2 جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقے

علمائے جغرافیہ نے جزیرہ نمائے عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱)تہامہ (۲) حجاز (۳) نجد (۴)عروض (۵)یمن

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن اپنی کتاب ''تاریخ الاسلام'' کی جلد اول میں اس تقسیم کی تفصیل کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

تہامہ: یہ وہ نشیبی علاقہ ہے جو بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ینبوع سے نجران تک چلا گیا ہے۔اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ "التھم" جو اس کا مادہ اشتقاق ہے اس کے معنی ہیں گرمی کی انتہائی شدت اور ہوا کا رک جانا۔چونکہ اس علاقہ میں گرمی کی شدت نا قابل برداشت حد تک ہوتی ہے اور ہوا رکی رہتی ہے جس سے اس کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔اس لیے اس کو تہامہ کہا جاتا ہے۔اس علاقہ کا دوسرا نام ''الغور'' بھی ہے۔چونکہ نجد کے مقابلہ میں یہ علاقہ نشیب میں واقع ہے اس لیے اسے اس نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

حجاز: یہ علاقہ یمن کے شمال اور تہامہ کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ متعدد وادیوں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان سے جبال السراۃ گزرتا ہے۔ یہ سلسلہ کوہ شام سے شروع ہوتا ہے اور یمن میں نجران تک جاتا ہے۔ اسی میں اسلام کے دو مقدس شہر آباد ہیں ۔مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ۔حجاز کو حجاز اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تہامہ اور نجد کے درمیان حد فاصل ہے۔

نجد: یمن کے جنوب اور صحرا ''سماوہ'' کے شمال میں پھیلا ہوا علاقہ ہے۔عروض اور عراق اس کے ایک جانب واقع ہیں۔اس کو نجد اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی سطح اونچی ہے۔

یمن: یہ نجد کے علاقہ سے بحر ہند کے جنوب اور بحر احمر کے غرب سے گزرتا ہے اور مشرقی سمت سے یہ حضر موت اور الشحر اور عمان سے ملا ہوا ہے۔یمن اور حضر موت کے میدانوں میں کئی داخلی لڑائیاں بھی لڑی گئیں اور بیرونی حملہ آوروں سے بھی معرکہ آرائی ہوئی ہیں۔انہیں جنگوں اور فتنہ وفساد کی وجہ سے خاندان تبع تباہ وبرباد ہوا جس کے بادشاہوں نے مآرب ،حمدان اور ظفار کے محلات تعمیر کئے۔اور اسی زمانہ میں مآرب کے مقام پر ایک ''سد'' ڈیم بنایا۔

عروض: یہ علاقہ یمامہ، عمان اور بحرین پر مشتمل ہے۔اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یمن، نجد اور عراق کے درمیان حد فاصل ہے۔عمان اور بحرین پہلے جزیرہ عرب سے علیحدہ تھے۔اور اس کی دو وجہیں تھیں، ایک فطری اور دوسری سیاسی۔فطری وجہ تو یہ کہ ان کے درمیان اور جزیرہ عرب کے درمیان لق ودق صحرا، جنگل اور خشک ریگستان حائل تھے۔سیاسی وجہ یہ کہ عمان اور بحرین حکومت ایران جو ایک غیر عرب مملکت تھی اس کے زیر نگیں تھے۔

آب وہوا: جزیرہ نمائے عرب کی آب وہوا مجموعی طور پر گرم اور خشک ہے، بارش بہت کم ہوتی ہے۔اور وہ بھی ساحلی علاقوں تک محدود رہتی ہے۔خاص طور پر جنوب اور جنوب مغرب میں زیادہ ہوتی ہے۔اسی وجہ سے وہاں آبادی زیادہ ہے۔مشرقی ساحل کے بعض علاقے خصوصا عمان کا علاقہ زیادہ سرسبز وشاداب ہے۔لیکن بارش کی عام کمی کی وجہ سے علاقے بھر میں کوئی بڑا دریا نہیں ہے البتہ ندی نالے بکثرت پائے جاتے ہیں۔مگر زیادہ تر صرف برسات کے موسم میں بہتے ہیں۔گرمی اور لو چلنے کے باعث دن میں خاصی گرمی ہوتی ہے لیکن رات دن کے مقابلے ٹھنڈی ہوتی ہے۔(تاریخ عالم اسلامی، پروفیسر محمد نعیم صدیق،ص:۵۰)

1.4 جزیرہ نمائے عرب کے طبعی حالات

1.4.1 پہاڑ اور میدان

جبال السراۃ: یہ پہاڑ شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔شمال میں شام وفلسطین کے پہاڑوں سے اس کا سلسلہ ملتا ہے اور جنوب میں یمن سے جا ملتا ہے۔شمالی حصہ کو جبال الحجاز اور جنوبی حصہ کو جبال العسیر اور جبال الیمن بھی کہتے ہیں۔جبال الیمن سے متصل جبال حضر موت ہے جس کے بعد ظفار اور شحر مہرہ کے علاقے واقع ہیں۔اسی کے پاس جنوب مشرقی علاقہ میں جبال عمان بھی پایا جاتا ہے۔ جبال السراۃ کی بلندی اوسطاً پانچ سے سات ہزار فٹ بتائی جاتی ہے اور اس کی چوڑائی بعض مقامات پر کئی سو میل ہے۔

جبال حجاز: خلیج عقبہ سے یمن کے قریب تک سارے پہاڑی علاقہ کو حجاز کہتے ہیں۔ یہ تہامہ ونجد کے درمیان ایک دیوار کا کام کرتا

ہے اس لیے اس کو حجاز کہا جاتا ہے۔حجاز جبال السراۃ کا شمالی جزء ہے جو سات سو میل لمبا اور ۲۷۵ میل چوڑا ہے اور اس کی اوسط اونچائی ۶ ہزار فٹ ہے۔اسی پہاڑی سلسلہ پر مدینہ اور طائف ،خیبر، تیماء وغیرہ مشہور شہر ہیں۔حجاز کے شمالی حصہ کو جو عقبہ سے الوجہ کے درمیان واقع ہے مدین کہتے ہیں۔اس خطہ میں قوم مدین، اصحاب ایکہ اور اس کے جنوب میں قوم ثمود اور اصحاب الحجر آباد تھے جن کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے۔

حرہ: جبال حجاز میں بعض ایسے خطے ہیں جن کے پتھر سیاہ خنجر کی طرح ہیں اس لیے ان کو حرہ کہتے ہیں۔سطح سمندر سے ان کی بلندی بسا اوقات ۵۰۰۰ فٹ تک پہونچ جاتی ہے۔موسم سرما میں کبھی کبھی یہاں برف باری بھی ہوتی ہے۔اپنی ناہمواری کی وجہ سے حرہ آبادی اور جانوروں کے لائق نہیں۔اس کا زیادہ تر علاقہ مکہ وتبوک کے درمیان واقع ہے۔سب سے بڑا حرہ حرۂ عویرض ہے۔مدینہ منورہ بھی دو حرات کے درمیان واقع ہے۔اس کے مغرب میں حرۃ الوبرہ اور مشرق میں حرۂ داقم ہے۔ان حرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل آتش فشانی مادوں سے بنے ہیں۔

عسیر اور یمن: عسیر جبال السراۃ کا حصہ ہے۔اس کی چوٹی اوسطاً دس ہزار فٹ بلند ہے۔یہ جنوب مغرب میں واقع ہے۔عسیر کے جنوب میں واقع جبال السراۃ کے پہاڑی سلسلہ کو یمن کہتے ہیں جس کی اوسطاً بلندی سب سے زیادہ یعنی تیرہ چودہ ہزار فٹ ہے۔یہ دونوں پہاڑ بارش کی وجہ سے سرسبز وشاداب رہتے ہیں۔یہ پہاڑ بادلوں کو جزیرہ نما کے اندر آنے سے روک لیتے ہیں۔عسیر کے شمال مشرق میں نجران ہے جو کسی زمانے میں عیسائیت کا مرکز تھا۔جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ بارش یمن میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ سب سے زیادہ شاداب علاقہ ہے۔حدیدہ، مخا اور عدن اس کے ساحلی شہر ہیں جو بندرگاہ بھی ہیں۔اس کے علاوہ صعدہ، مأرب، زبید، ذمار اور ظفار وغیرہ بھی اس کے قابل ذکر شہر ہیں۔یمن کے جنوب میں حضر موت کی مشہور وادی ہے۔قدیم زمانے سے یہاں تجارت پیشہ لوگ آباد رہے ہیں۔حضر موت سے متصل مشرق میں ایک میدانی علاقہ ہے جس میں شحر، مہرہ اور ظفار نامی خطے پائے جاتے ہیں۔ظفار، شحر اور مہرہ کے بنسبت زیادہ شاداب ہے۔

1.4.2 صحرا اور ریگستان:

الربع الخالی: یہ جزیرۂ عرب کا سب سے بڑا ریگستان ہے جو جنوبی حصے میں ساحل کے قریب قریب تک پھیلا ہوا ہے۔اس کا کل رقبہ چار لاکھ مربع میل ہے۔یہاں پانی تقریباً نایاب ہے اور ریت کے ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔یہاں ریت کا طوفان ایک عام بات ہے۔الربع الخالی کے یمن سے متصل حصہ کو صہیدہ اور حضر موت کے شمال مغربی کنارہ کو احقاف کہتے ہیں اور مہرہ کے شمالی جانب کے ریگستان کو ''وبار'' کہتے ہیں۔الربع الخالی کے شمالی مشرقی گوشہ کو 'یبرین' کا نام دیا گیا ہے۔

النفوذ: یہ صحرائے نجد کے شمال میں واقع ہے۔عربی میں ریت کے سرخ ٹیلوں کو النفوذ کہتے ہیں۔یہ صحراء الربع الخالی سے آٹھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔یہ دراصل چھوٹے چھوٹے ریگستانی قطعوں پر مشتمل ہے۔یہاں کبھی کبھی بارش بھی ہو جاتی ہے جو یہاں کے لوگوں کے لیے کافی سودمند ہے۔دومۃ الجندل کا مشہور نخلستان النفوذ کے شمالی جانب واقع ہے۔

الدھناء: النفوذ کے جنوبی حصہ سے ایک ریگستانی پٹی الربع الخالی تک چلی گئی ہے۔اس کی ریت سرخی مائل ہے اس لیے اس کو الدھناء کہتے ہیں۔اس میں کچھ وادیاں اور نشیبی زمینیں ہیں جن سے احساء ونجد کے راستے گزرتے ہیں۔ان وادیوں میں تھوڑا بہت بارش کا پانی آجاتا ہے جس سے بدو فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بادیۃ الشام: الدھناء سے متصل شمال میں ایک بڑا صحرا ہے جو مثلث کی صورت میں ہے۔اس کے مشرق میں عراق، مغرب میں شام ہے۔ بادیۃ الشام میں پتھریلی مٹی کے میدان ہیں جو سفیدی مائل ہے۔اس صحرا میں چند وادیاں ہیں جیسے سرحان اور حوران جو بہت مشہور ہیں۔ بادیۃ الشام کے مشرقی، مغربی اور شمالی کناروں پر بلند پہاڑوں کے سلسلے ہیں جو ایران اور ترکی کے پہاڑی سلسلوں سے مل جاتے ہیں۔ یہاں کھجور کی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔کسری کی راجدھانی مدائن بھی بادیۃ الشام میں واقع تھی۔عراق کے مشہور دریا دجلہ اور فرات بھی اسی خطے سے گزرتے ہیں۔اور ان دونوں دریاؤں کے سنگم کو شط العرب کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ اپنی زرخیزی کی وجہ سے ہمیشہ تہذیب وتمدن کا مرکز رہا ہے۔ اس میں نینوی، بابل، مدائن اور حیرہ جیسے شہر آباد ہوئے اور آشوری، سومری اور کلدانی تہذیبیں یہاں پھلی پھولیں۔حضرت ابراہیمؑ کا شہر ''اُرُ'' عراق کے جنوبی حصہ میں تھا۔وسطی عراق کے بادیۃ کو بادیۃ الجزیرہ یا خساف بھی کہا جاتا ہے اور شط العرب کے مشرقی حصہ کو بادیۃ العراق یا سماوہ بھی کہتے ہیں۔ بادیۃ الشام کا مغربی حصہ پہاڑی سلسلہ سے گھرا ہوا ہے جو ترکی کے جبال طوروس سے ملتا ہے اور وہ جنوب میں جبال السراۃ سے متصل ہے۔ بادیۃ الشام کا مغربی کنارہ شام اور فلسطین پر مشتمل ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔کنعانی وفینیقی شام میں آباد ہوئے۔

مشرقی ساحلی علاقے:

قطر کا علاقہ الربع الخالی سے متصل ہے اور عمان کے شمال مغرب میں سمندر کے اندر دور تک پھیلا ہوا ہے جو سو میل لمبا اور چالیس میل چوڑا ہے۔ پٹرول کی دریافت نے اس علاقہ کی قسمت تبدیل کردی ورنہ یہاں بہت غربت تھی اور لوگوں کا کام یہاں سمندر سے مچھلی پکڑنا اور موتی نکالنا تھا۔زمانہ قدیم میں قطری کپڑوں کی کافی شہرت تھی۔

قطر کے شمال سرحد سے کویت کے جنوبی سرحد تک پھیلی ہوئی ساحلی پٹی کو احساء کہا جاتا ہے۔ یہ بہت زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں کی کھجوریں بہت مشہور ہیں۔اس علاقہ کے خطی نیزوں کا تذکرہ بھی جاہلی ادب میں خوب ملتا ہے۔

بحرین احساء کے مشرق میں چھ جزیروں پر مشتمل ایک مشہور علاقہ ہے جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔اسی طرح کویت بھی ایک مشہور علاقہ ہے جو احساء کا شمالی سرا ہے۔اس کی زمین صحرائی اور پانی کمیاب ہے۔تاریخ میں یہ علاقہ جہاز رانی اور جہاز سازی میں کافی مشہور تھا۔ پٹرول نے ان تمام علاقوں کو مالا مال کردیا ہے۔

1.4.3 نباتات وحیوانات:

عسیر، یمن اور عمان کے پہاڑوں اور نجد کے بعض خطوں کو چھوڑ کر جزیرۂ عرب عام طور سے خشک اور غیر مرطوب ہے اور پانی کی سخت قلت ہے۔ یہاں سخت سردی وگرمی دونوں پڑتی ہے اور خال خال بارش ہوتی ہے جو یہاں کی آبادی کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں پہاڑی نالے وغیرہ تو ہیں جس سے پہاڑوں کا پانی وادیوں میں پھیل جاتا ہے لیکن یہاں کوئی ندی نہیں ہے۔ اس طرح کی وادیاں سرسبز وشاداب ہوتی ہیں اور صحرائی علاقے میں یہ بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ان وادیوں میں وادی الرمۃ، وادی الدواسر، وادی حضر موت، وادی سرحان، وادی نجران، وادی عقیق اور وادی القری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عرب میں جنگلات نہیں پائے جاتے ہیں البتہ کھجور کے درخت بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ببول، بیری، مہدی، پیلو

اور جھاؤ وغیرہ کے درخت اور خاردار جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ علاقوں میں انار، انگور اور سیب وغیرہ کے بھی درخت ہوتے ہیں۔ چند علاقوں خاص طور پر یمن، عمان، یمامہ وغیرہ میں کاشت کاری بھی ہوتی ہے۔ یمن کے لوگوں نے بند باندھ کر آبپاشی کا نظام بنا لیا تھا اور یہ علاقہ بہت زیادہ شاداب ہو گیا تھا۔

جزیرۂ عرب کے حیوانات میں اونٹ بہت مشہور ہے جو صحرائی زندگی کے لیے انتہائی کارآمد ہے۔ عربی گھوڑا بھی پوری دنیا میں کافی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ، بکری، ہرن، نیل گائے، خچر، گدھا، شیر، چیتا، تیندوا، بجو، لومڑی، بھیڑیا، بندر، گائے، شتر مرغ، خرگوش اور پرندوں میں کبوتر، فاختہ، عقاب، چیل، گدھ، شکرہ اور کوا وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

1.4.4 باشندگان:

جزیرۂ عرب کے باشندوں کو نسلی و تہذیبی ترقی کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی عرب کے لوگ قحطانی نسل سے ہیں اور شمالی عرب کے لوگ عدنانی نسل سے۔ دونوں کے درمیان کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جنوبی عرب کے باشندے عام طور پر متمدن اور مہذب ہوتے ہیں جب کہ شمالی عرب پر بدویانہ زندگی کا غلبہ ہے۔ دونوں کی زبان عربی ہے لیکن ان کے درمیان کافی فرق ہے۔ جنوبی لوگ زراعت و تجارت کرتے اور باہری دنیا سے ان کے گہرے تعلقات تھے جس کے اثرات ان کی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ شمالی عرب عام طور سے باہری دنیا سے علیحدہ رہتے تھے اور ان کا میل جول دوسروں سے کم تھا۔ پھر جزیرۂ عرب کے باشندوں کو طرز رہائش اور معیشت کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بدوی یعنی دیہاتی عرب اور حضری یعنی شہری عرب۔ بدوی عرب کو اہل الوبر اور حضری عرب کو اہل المدر بھی کہا جاتا ہے۔ جزیرۂ عرب کے طبعی حالات کی وجہ سے وہاں شہری زندگی بہت کم پائی جاتی ہے عام طور سے بدویانہ زندگی گزارتے ہیں اور چارہ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ عرب باشندوں کے چند خصوصیات ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

قبائلی زندگی: عرب عام طور سے قبائلی زندگی گزارتے تھے۔ پورا عرب چھوٹے بڑے قبیلوں میں تقسیم تھا جو آپس میں سخت عصبیت رکھتے تھے اور ان کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتوں پر جنگ بھڑک اٹھتی تھی۔ سردار قبیلہ کی اطاعت ہر حال میں واجب تھی اور قبیلہ کا ہر فرد فوجی کی ذمہ داری بھی نبھاتا تھا۔ کسی بھی مصیبت کی صورت میں افراد قبیلہ آپس میں مل کر اس کا مقابلہ کرتے تھے۔ قبائل سیاسی اور جنگی مسائل کی وجہ سے کبھی کبھی ایک دوسرے سے معاہدہ بھی کر لیتے تھے۔

عورت: عورت زندگی کے مختلف میدانوں میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہے اور اس کی ہر طرح مدد کرتی ہے لیکن اس کو سماج میں مرد سے کم درجہ حاصل ہوتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ میدان جنگ میں مرد کی طرح نہیں لڑ سکتی اور اپنا دفاع نہیں کر سکتی جس کی وجہ سے وہ ایک کمزور کڑی ثابت ہوتی ہے۔ بعض عرب لڑکیوں کو باعث ذلت سمجھتے تھے اور ان کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کسی اصول یا مذہب کے پابند نہ تھے بلکہ رسوم و رواج پر عمل تھا۔ جنگ میں مفتوح قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا اور ان کو کسی طرح کے بنیادی انسانی حقوق حاصل نہ ہوتے تھے۔

مذہب: اہل عرب عام طور پر مشرک تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کا مذہب انتہائی سادہ تھا اور وہ غور و فکر نہیں کرتے تھے بلکہ تقالید اور رواجوں پر چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اہل عرب ابتدا میں بت پرست نہ تھے بلکہ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے پیروکار اور توحید پرست تھے اور

خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے لیکن انقلاب زمانہ سے ان کے اندر آہستہ آہستہ بت پرستی پھیل گئی اور رسول ﷺ کا عہد آتے آتے ہم دیکھتے ہیں کہ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک بت تھا جیسے قریش کا مشترکہ بت عزیٰ و ہبل، قبیلہ ثقیف کا بت لات، اوس وخزرج کا بت مناۃ، یمن میں اہل جرش کا یغوث، خیوا میں حمدان کا یعقوق، قبیلۂ ذوالکلاع حمیری کا بت نسر، دومۃ الجندل میں ہذیل کا بت سواع وغیرہ۔ عرب بتوں کو اصل خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ ان کو خدا کا مقرب سمجھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ وہ خدا کے سامنے ان کی سفارش کردیں گے۔ کچھ عرب باشندے سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ باہری دنیا کے اثرات سے ان کے اندر دیگر مذاہب بھی در کر آئے جیسے عیسائیت شمالی نجد کے بعض قبائل میں، حیرہ کے حکمرانوں میں اور یمن کے علاقہ نجران میں۔ یہودیت یمن اور مدینہ منورہ اور خیبر کے علاقوں میں، مجوسیت نجد میں قبیلہ کندہ کے آخری بادشاہ نے اس کو اختیار کرلیا تھا اور صابیئت وغیرہ۔

معاشی زندگی:

عرب عام طور سے زراعت پیشہ نہ تھے البتہ کھجور کی پیداوار بکثرت ہوتی تھی اور وہ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالتے تھے جس کے دودھ، گوشت اور اون وغیرہ پر وہ اپنا گزارہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ ہوتی تھی۔ شہروں کے لوگوں میں جیسے مکہ، مدینہ، طائف اور یمن کے علاقوں میں تجارت کا بھی خوب رواج تھا۔ وہ سمندر کے ذریعہ چین، جاپان اور ہندوستان کا مال درآمد کرتے تھے اور پھر یمن و مکہ کے راستے اس کو شام و مصر کے بازاروں تک پہنچاتے تھے اور وہاں کا مال ہندوستان وغیرہ لے جا کر فروخت کرتے تھے۔ عربوں میں لوٹ مار بھی عام بات تھی اور اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ذریعہ بھی وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

میلے اور بازار: مختلف ضروریات اور خرید وفروخت کے لیے عربوں میں میلہ کا رواج تھا جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے۔ یہ میلے سال میں ایک بار اپنی طے شدہ تاریخوں میں لگتے تھے اور مختلف طرح کے سامان یہاں بکتے تھے۔ اس طرح کے میلوں کی تعداد تقریباً تیرہ ہیں جن کے مقامات اس طرح ہیں، دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبا، شحر، عدن، صنعاء، الرابیہ، عکاظ، ذوالمجاز، منی، نطاۃ اور حجر۔

عکاظ کا میلہ ان میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس میں تجارت و کاروبار کے علاوہ شعر و ادب کی محفلیں بھی سجتی تھیں اور شعرا اپنا اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ فخر و مباہات کرتے تھے اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے پوری تگ ودو کرتے تھے۔ ان قصائد کے حسن و قبح کو بیان کرنے کے لیے حکم ہوتا تھا جیسے نابغہ ذبیانی۔ اس میلہ میں قریش، ہوازن، غطفان، عقیل، مصطلق وغیرہ قبائل خاص طور سے شریک ہوتے تھے۔ یہ سوق عکاظ مکہ سے شمالی رخ جانے والے راستہ پر نصف ذیقعدہ سے آخری ذیقعدہ تک لگتا تھا۔

1.5 سامی اقوام

1.5.1 سامی اقوام کی اصل:

لفظ سامی کا اطلاق مشرق وسطی کی ان قوموں پر ہوتا ہے جو سام بن نوح کی اولاد بتائے جاتے ہیں اور جن کی زبانوں کے درمیان پائی جانے والی قربت ظاہر کرتی ہے کہ یہ لوگ ماضی میں کبھی ایک جگہ رہتے تھے اور ایک زبان بولتے تھے لیکن گردش زمانہ نے جب ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا تو آہستہ آہستہ ان مختلف گروہوں کی زبانوں نے مستقل زبانوں کی شکل اختیار کرلیا لیکن اس کے باوجود بہت ساری

مشترکہ خصوصیات باقی رہیں جن کی بنا پر ان زبانوں کو سامی زبان اور ان کو بولنے والی قوموں کو سامی قوم کہا جاتا ہے۔

1.5.2 سامی اقوام جزیرہ عرب میں:

سامی زبان کا اصل وطن کیا ہے؟ وہ علاقہ کون سا ہے جہاں سامی اقوام علیحدہ ہونے سے پہلے رہتی تھیں؟ محققین اس سلسلے میں بہت ساری آرا رکھتے ہیں۔ شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حامی وسامی دونوں کا وطن ایک ہی تھا، یہ یا تو شمالی افریقہ ہوسکتا ہے یا صومالیہ جہاں سے سامی قومیں باب المندب یا صحرا سینا کے راستے بلاد عرب کی طرف ہجرت کر گئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سامی اقوام کا اصل وطن شمالی شام ہے اور کچھ اس کو دجلہ وفرات کے درمیان کے علاقہ کو قرار دیتے ہیں۔ (شوقی ضیف، تاریخ الادب العربی، ج/۱، ص: ۲)

جواد علی اپنی مشہور کتاب ''تاریخ العرب قبل الاسلام'' میں لکھتے ہیں کہ ایک جماعت مانتی ہے کہ سامی کا مہد اول بابل تھا، لیکن کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ سامیوں کا مہد اول جزیرہ عرب تھا اور ان میں سے ایک گروہ جزیرہ عرب کے ایک خاص علاقہ کی تحدید بھی کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ سامیوں کا اصل وطن افریقہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سامی وحامی زبانوں میں ایک رشتہ پایا جاتا ہے۔ ایک جماعت آموریون کی سرزمین کو ان کا اصل وطن قرار دیتی ہے تو ایک دوسری جماعت آرمینیا کے علاقہ کو ان کا وطن سمجھتی ہے۔ (جواد علی: تاریخ الاسلام قبل العرب، ج/۱، ص: ۲۲۹)

یہ بات تقریبا متفق علیہ ہے کہ تمام سامی اقوام ابتدا میں کسی ایک چھوٹے سے مقام پر رہتی تھیں، پھر آبادی کی کثرت، کھانے پینے کی قلت اور آپسی جھگڑے کی سبب وہ مختلف ادوار میں گروہوں کی صورت میں قرب وجوار کے علاقوں کی طرف ایک بہتر زندگی کی تلاش میں ہجرت کر گئیں۔ جزیرۂ عرب کے طبعی حالات ایسے ہیں جو بڑی آبادی کے بود وباش کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے اس لیے یہاں کی ایک بڑی آبادی قرب وجوار کے زرخیز علاقوں کی طرف (مثلاً عراق، شام، یمن) ہجرت کر گئی۔ مشہور مورخ فلپ حتی لکھتا ہے:

''تاریخ نے ہمارے لیے بابلی، آشوری، کلدانی اور آرامی وغیرہ قوموں کی خبروں کو محفوظ کر لیا۔ ان قوموں کے آبا واجداد کی پرورش وپرداخت جزیرۂ عرب میں ہوئی تھی پھر وہاں سے وہ قرب وجوار کے ملکوں میں ہجرت کر گئے جہاں انہوں نے عظیم سلطنتیں قائم کیں لیکن پھر یہ سلطنتیں روزگار زمانہ کی نذر ہوگئیں"۔ (فلپ حتی :العرب تاریخ موجز، ص ۹، والعلم للملایین، بیروت، ۱۹۹۱ء)۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اکادیوں (بابلی وآشوری) نے چوتھی صدی قبل مسیح کے اُواخر یا تیسری صدی ق م کے اوائل میں جزیرۂ عرب سے ہجرت کی اور عراق کو اپنا مسکن بنایا جہاں سومریوں کا بول بالا تھا۔ ایک زمانہ تک ان کی حکومت میں رہ کر اکادیوں نے ان کی زبان اور علوم سیکھے اور پھر اپنی مملکت قائم کر لی جس کی راجدھانی ''اکد'' تھی اور ان کا قابل ذکر بادشاہ "سرجون اول'' تھا۔ جس کی سلطنت عراق، شام اور جزیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے زوال کے بعد بابل کی سلطنت قائم ہوئی جس کا مشہور بادشاہ ''حمورابی'' اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں بہت مشہور ہوا۔ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے اس کا دور بہت ممتاز ہے۔ پھر اس سلطنت کا کشیون اور حیشیون نے خاتمہ کر دیا۔ اسی دوران دجلہ وفرات کے درمیان اکادیوں سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ آشوریوں نے چودھویں صدی قبل مسیح میں ایک سلطنت قائم کی اور نینوی کو راجدھانی بنایا۔ اس نے آہستہ آہستہ بابل، شام اور ایشائے کوچک پر قبضہ کر لیا اس کے زوال کے بعد کلدانی حکومت (۶۲۶۔ ۵۳۸ ق م) قائم ہوئی جس کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اس کے بعد فرس اور سکندر اعظم کا یہاں

یکے بعد دیگرے قبضہ ہوگیا۔

جزیرۂ عرب سے سامی قوم کی دوسری ہجرت کنعانیوں کی تھی انہوں نے دوسرے ہزار قبل مسیح کے اوائل میں ہجرت کرنا شروع کر دیا تھا اور شام و بحر ابیض کے ساحل پر آباد ہو گئے جہاں انہوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کر لیے مثلاً صیدا، صور، جبیل و بیروت۔ یونانی ان کو فینقی کا نام دیتے ہیں۔ کنعانیوں نے افریقہ، ایشیا کو چک اور اندلس وغیرہ میں بھی اپنی بستیاں بسالیں تھیں۔ اوجریتی شمالی شام میں پھیلے جن کے آثار رأس شمر میں پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک گروہ عبرانی لوگوں کا تھا جو تیرہویں صدی قبل مسیح میں فلسطین میں آباد ہوئے۔ بخت نصر شاہ بابل نے عبرانیوں کی راجدھانی یروشلم کو تباہ کر دیا اور آرامی زبان عبرانی زبان پر غالب آ گئی۔

سامی قوم کی تیسری بڑی ہجرت جزیرۂ عرب سے آرامیوں کی تھی پندرہویں صدی قبل مسیح کے آس پاس ان کی ہجرت شروع ہوگئی تھی اور انہوں نے بابل اور خلیج عربی کے درمیان اپنی حکومت 'کلد' کے نام سے قائم کر لیا تھا گیارہویں صدی اور دسویں صدی قبل مسیح ان کے عروج کا زمانہ ہے وہ شمالی شام پر قابض ہو گئے اور اپنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس قوم کا تجارت میں بہت بڑا کردار تھا یہاں تک کہ آشوریوں نے ان کی حکومتوں کا خاتمہ کر دیا۔ آرامیوں نے فینقیوں کے رسم الخط کو اپنا لیا جس کو بعد میں دوسرے لوگوں نے اپنایا اور یہی رسم الخط کچھ تغیرات کے ساتھ عربی زبان نے اپنا لیا۔ حواریوں نے انجیل کو آرامی رسم الخط میں لکھا تھا۔

سامی قوم کی آخری بڑی ہجرت جنوبی عرب کے بڑے لوگوں کی تھی جنہوں نے پندرہویں صدی قبل مسیح کے بعد ہجرت کرنا شروع کر دیا تھا کچھ تو جنوب اور بحر ہند کے ساحل کی طرف گئے اور کچھ نے حبشہ کا رخ کیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کر لی جو ۵۲۵ عیسوی تک قائم رہی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ غالباً سامی اقوام کا اولین مسکن جزیرہ عرب تھا یہاں سے انہوں نے تاریخ کے مختلف کے ادوار میں آس پاس کے علاقوں شام، عراق اور فلسطین کی طرف ہجرت کیں۔ یہاں بود و باش اختیار کیا، حکومتیں و سلطنتیں قائم کیں، تہذیب و تمدن کو فروغ دیا۔ اور آخر میں عربی زبان ان سامی اقوام کی زبان ہوگئی۔

1.6 سامی زبانیں

1.6.1 زبان کی تعریف:

حضرت انسان کو حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ وہ کرۂ ارض کے دوسرے جانداروں سے اس لیے ممتاز ہے کہ اس کو نطق کی صلاحیت حاصل ہے۔ اس نے مختلف اصوات کو ایک خاص ترتیب میں پرو کر زبان کی تشکیل یا ایجاد کو تاریخ انسانی کا سب سے بڑا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ یہ زبان ہی ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے جذبات، احساسات اور علوم فنون کو دوسروں تک منتقل کرتے ہیں تہذیب و تمدن اور ترقی کی جو معراج آج انسان کو نصیب ہوئی ہے وہ زبان کے بغیر ممکن نہ تھی۔

زبان کیا ہے؟ زبان مافی الضمیر کی ادائیگی کا ایک وسیلہ ہے۔ زبان کی تعریف کے بارے میں علما لسانیات کے درمیان کافی اختلافات پائے جاتے ہیں اور متفق علیہ تعریف ابھی تک سامنے نہیں آئی ہے۔ چند تعریفات کو ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں جو خلیق صدیقی کی کتاب ''زبان کیا ہے؟'' سے ماخوذ ہیں:

''مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اظہار کا وسیلہ ہے جو متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں تقریر

، یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔۔۔‘‘

ڈاکٹر محی الدین قادری کے الفاظ میں زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔

ہادی حسین زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زبان علامتوں کا ایک نظام ہے جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہوتا ہے یا بن سکتا ہے۔

’’ہیگل (Hegel) کے مطابق زبان صحیح معنوں میں فطری ذہانت کا آرٹ ہے کیوں کہ وہ اس کا خارجی اظہار کرتی ہے۔‘‘

’’کینز (Kainz) کا کہنا ہے کہ زبان ان علامتوں کا ایک ڈھانچہ ہے جن کی مدد سے خیالات اور حقائق کو بیان کیا جا سکتا ہے جن اشیا کا وجود نہیں اور حواس جن کا ادراک نہیں کر سکتے ان کا خاکہ کھینچا جاتا ہے۔‘‘

دی ساسور (De Sassure) کے مطابق زبان خیالات اور افکار کا اظہار کرنے والی علامتوں کا نظام ہے‘‘

(صدیقی، خلیل: زبان کیا ہے؟، ص: ۱۰۔ ۱۴، عاکف بک ڈپو دہلی، ۱۹۹۴ء)

1.6.2 زبان کا آغاز:

زبان کب اور کیسے وجود میں آئی ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا صحیح جواب کسی عالم لسانیات کے پاس نہیں ۔ وہ محض قیاس آرائیوں کے ذریعہ اس میدان میں اپنے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ مذاہب زبان کو خدا کا عطیہ سمجھتے ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔ چنانچہ زبان کو ’دیووانی‘ یا ’دیو بھاشا‘ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو نطق کی صلاحیت جنت میں ہی عطا کر دیا تھا لیکن علما لسانیات مذاہب کی آراء کو قبول نہیں کرتے ہیں اور اپنی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

زبان کے آغاز کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے جاتے رہے ہیں میکس مولر نے ان کو جمع و ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اور ان کو چار نظریوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔

۱۔ صوت تقلیدی نظریہ: اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ الفاظ فطری اصوات کی نقلیں ہیں انسان نے کتے کے بھونکنے کی نقل کی جس سے ابتدائی لفظ ’باو واؤ‘ (کتا) ’با آ‘ (بکری) جیسے لفظ بنے۔

۲۔ فجائی نظریہ: اس نظریہ کی بنیاد اس نفسیاتی خصوصیت پر ہے کہ مختلف چیزوں یا مظاہر کا مشاہد دل میں مختلف قسم کے احساسات اور جذبات پیدا کرتا ہے ان جذبات اور احساسات کو انسان مختلف قسم کی موزوں آوازوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے اس کی مثال ’دھت‘ ’اف‘ اور ’ہائے‘ وغیرہ ہیں جو مختلف قسم کے احساسات و جذبات کو ظاہر کرتے ہیں۔

۳۔ ابتلا زائی نظریہ: اس نظریہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ابتدائی زمانہ کا انسان جب خاص خاص چیزوں کا مشاہدہ کرتا تھا تو جوابی ردعمل کے طور پر اس کی زبان سے بے ساختہ کچھ آوازیں نکل جاتی تھیں، یہی آوازیں رفتہ رفتہ اس چیز کے نام کے طور پر مستعمل ہو گئیں، مثال کے لیے اردو کا لفظ ’’جگ مگ‘‘ اور ’’جھلا جھل‘‘ وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ ہائی سو نظریہ: یہ ہمارے روز مرہ مشاہدے کی بات ہے کہ مزدور جب بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں یا کسی کٹھن کام میں ان کو

جسمانی قوت سے کام لینا پڑتا ہے تو سب مل کر کچھ آوازیں بلند کرتے ہیں جس سے ان کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے اسی طرح مغربی ملکوں میں ملاح جب جہازوں کے لنگر کو کھینچتے ہیں تو ''یو ہے ہو'' کی صدا بلند کرتے ہیں لیکن ہمارے یہاں عام طور پر مزدور اور ملاح ''ہائی سو'' کی صدا نکالتے ہیں یعنی الفاظ کے مادے انسانی افعال کو ظاہر کرتے ہیں۔ (سروری، پروفیسر عبدالقادر: زبان اور علم زبان، ص: ۲۰۔ ۲۳، مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء)

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے نظریے انفرادی یا مجموعی طور سے زبان کے آغاز پر پوری طرح روشنی ڈالنے سے عاجز ہیں اور کوئی ایسا تشفی بخش جواب دینے سے قاصر ہیں جس کو ذہن قبول کرے اور تمام زبانوں پر اس کی تطبیق کی جا سکے اور زبان کے آغاز کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ ایک بات جو تمام علمائے لسانیات میں تقریباً متفق ہے وہ یہ ہے کہ یہ مانتے ہیں کہ ابتدا میں زبانیں سادہ روپ میں تھیں لیکن جیسے جیسے انسان کی زندگی نے پیچیدگیاں اختیار کیں اور تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنے لگیں تو یہ زبانیں بھی سادہ حالت سے پیچیدہ حالت میں بدلنے لگیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے اور غیر شعوری طور پر اس میں تغرات نمودار ہوتے ہیں تبدیلی زبان کی فطرت میں داخل ہے یہ تبدیلی زبان کے کسی بھی گوشہ میں پیدا ہو سکتی ہے وہ لفظ ہو یا معنی، ترکیب ہو یا ساخت اور جملے وغیرہ۔ کسی بھی زبان کے سو دو سو سال قدیم لٹریچر کا موازنہ اس کے موجودہ لٹریچر سے کیا جائے تو اس کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ تبدیلی ایسا ارتقائی عمل ہے جس میں چند عوامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً طبعی یا جغرافیائی اثرات، سیاسی و معاشی اسباب کی بنا پر دونوں زبانوں کا اختلاط زبان کے بولنے والوں کے ذہنی رجحانات اور تہذیبی اثرات۔

1.6.3 زبانوں کا خاندان:

زبان اپنے مسکن اول (خواہ جزیرہ عرب مانیں یا جنوبی افریقہ اور ایتھوپیا) میں پیدا ہوئی اور پھر مختلف اسباب و وجوہات سے وہ دوسرے علاقوں میں پھیل گئی۔ ان اسباب میں ہجرت، استعماریت اور تہذیبی ترقی وغیرہ شامل ہیں اپنے مرکز سے دوری کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں اور زبان سے بولی اور پھر بولی سے ایک مستقل زبان کی صورت اختیار کر گئی اور دوسروں کے لیے اس زبان کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ لیکن کثرت اختلاف اور مستقل زبان کی صورت اختیار کرنے کے باوجود ان زبانوں کے اندر کچھ مشترکہ خصوصیات باقی رہیں جن کی بنا پر آج علمائے لسانیات ان کی گروہ بندی کرتے ہیں یوں تو زبانوں کا مختلف علما نے مختلف گروہوں میں اپنے اصول کے مطابق تقسیم کیا ہے لیکن دو تقسیمیں زیادہ مشہور ہیں، ایک شلیگل (Schlegel) اور دوسری میکس مولر کی۔

1.6.4 شلیگل کی تقسیم:

شلیگل نے زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

ا۔ متصرفہ یا تحلیلی زبانیں: ان زبانوں کی خصوصیت مورفولوجی (علم صرف) اور سینٹیکس (علم نحو) ہے اس طور پر کہ مادہ کی صورت میں تبدیلی آنے سے کلمات کے معانی میں تبدیلی آجاتی ہے اور دوسرے یہ کہ جملہ کے اجزاء چند مستقل روابط سے جڑے ہوتے ہیں (مثلاً عربی میں 'محمدٌ'، اس کلمہ کے آخیر میں واو قصیرہ اور نون ساکنہ ہے یعنی یہ 'محمدن' ہے)۔ اور یہ چیز جملہ میں اس کی حیثیت کو متعین کرتی ہے اس میں عربی

زبان کے ساتھ فارسی، ہندی، لاطینی اور یونانی، جرمن اور عبرانی وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔

۲۔ سبقلاحی یا وصلی زبانیں: مورفولوجی اور سینٹیکس ان زبانوں کی بھی خصوصیت ہے اس اعتبار سے کہ اس میں مادہ یا اصل کلمہ کے معنی میں تبدیلی اور جملہ میں اس کی حیثیت سابقہ (Prefixes) اور لاحقہ (Suffixes) حروف کی مدد سے ہوتی ہیں۔ اس میں ترکی منغولی، منشوری، جاپانی اور باسک زبانیں شامل ہیں۔

۳۔ یک رکنی یا غیر متصرفہ زبانیں: مورفولوجی کے اعتبار سے اس زبان کے کلمات غیر اشتقاقی یا یک رکنی ہوتے ہیں ان کے مادوں میں تبدیلی نہیں آتی اور نہ ہی سابقہ ولاحقہ حروف کی مدد سے ان کے معانی میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ ان زبانوں کا ہر کلمہ اپنی ایک مستقل صورت رکھتا ہے اور ایک مستقل معنی جس میں تغیر نہیں ہوسکتا جس اور سینٹیکس کے اعتبار سے ان میں اجزائے جملہ کے درمیان روابط (رابطہ کے حروف) نہیں پائے جاتے جو جملہ میں اس کے معنی اور حیثیت کو متعین کرے بلکہ یہ چیز کلمات کی ترتیب اور سیاق سباق سے سمجھی جاتی ہے اس میں چینی، سامی، برمی، تبتی زبانیں شامل ہیں۔

1.6.5 میکس مولر کی تقسیم:

میکس مولر نے زبانوں کی تقسیم میں قربت کی بنیاد پر اس کو تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔

ا۔ انڈو۔ یوروپین خاندان

۲۔ سامی۔ حامی خاندان

۳۔ طورانی خاندان

ا۔ انڈو۔ یوروپین خاندان:

لسانی خاندانوں میں یہ سب سے زیادہ معروف ومشہور خاندان ہے یہ خاندان آٹھ شاخوں پر مشتمل ہے:

ا: آریائی زبانیں: یہ دو ذیلی شاخوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی ہندوستانی زبانیں جس میں سنسکرت، پراکرت اور جدید ہندوستانی زبانیں شامل ہیں اور دوسری شاخ ایرانی زبانیں جس میں قدیم فارسی، اوستی، زنداوستی، پہلوی، جدید فارسی، کردی اور پشتو زبانیں شامل ہیں۔

ب۔ آرمینی زبان

ج۔ یونانی زبانیں جس میں قدیم یونانی اور جدید یونانی زبانیں شامل ہیں۔

د۔ البانی زبان

ر۔ اطالوی زبانیں جس میں سمنی، لاطینی اور رومانی زبانیں شامل ہیں۔

س۔ سلتی زبانیں (Celtiques Languages)۔ یہ یورپ کی سلت قوم کی زبانیں ہیں جن پر فرانسیسی، انگریزی ہسپانوی زبانوں کا غلبہ ہوگیا ہے لیکن پھر بھی اس کے کچھ آثار باقی ہیں۔

ص۔ جرمن زبانیں: یہ تین ذیلی شاخوں پر مشتمل ہے: مشرقی جرمن زبانیں، شمالی جرمن زبانیں اور مغربی جرمن زبانیں۔

ط۔ بلطیقی سلاوی زبانیں: یہ دو ذیلی شاخوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی شاخ بلطیقی زبانوں میں لیتوانی اور قدیم بروسی زبانیں ہیں اور دوسری شاخ سلاوی زبانیں ہیں جس میں سلاوی، روسی، بولونی، سربی اور جدید بلغاری زبانیں ہیں۔

۳۔ حامی۔سامی زبانیں:

یہ خاندان دوشاخوں میں منقسم ہے سامی زبانیں اور حامی زبانیں۔

أ: سامی زبانیں: یہ دو ذیلی شاخوں میں منقسم ہوجاتی ہیں۔

ا۔ شمالی سامی زبانیں جن میں اکادی یا آشوری بابلی، کنعانی اور آرامی زبانیں شامل ہیں۔

۲۔ سامی جنوبی زبانیں جو عربی، قدیم یمنی اور حبشی شامی زبانوں پر مشتمل ہیں۔

ب۔ حامی زبانیں: جس کی تین ذیلی شاخیں ہیں۔

ا۔ مصری زبانیں جو قدیم مصری اور قبطی زبانوں پر مشتمل ہیں۔

۲۔ لیبی یا بربری زبانیں جو شمالی افریقہ کے اصل باشندوں کی زبانیں ہیں (لیبیا، تونس، جزائر، مراکش، صحراء) اس میں تماشی، سلحی، زناجہ اور جونشی وغیرہ قبائلی زبانیں شامل ہیں۔

۳۔ کوشیتی زبانیں یہ مشرقی افریقہ کے اصل باشندوں کی زبانیں ہیں جس میں صومالیہ اور حبشہ کے علاقے شامل ہیں اس کے تحت صومالی، جالد، بدجا اور دنقلہ وغیرہ زبانیں آتی ہیں۔

۴۔ طورانی زبانوں کا خاندان:

اس زبان میں وہ تمام ایشیائی اور یورپی زبانیں شامل ہیں جو سابقہ دونوں خاندان کے تحت نہیں آتیں مثلاً ترکی، ترکمانی، مغولی، منشوری اور فینیقی وغیرہ۔ اس تقسیم کی کوئی اساس یا وجہ نہیں سوائے یہ کہ یہ سابقہ دونوں خاندانوں میں شامل نہیں ہے۔

1.7 اکتسابی نتائج

عرب کو جزیرۂ نمائے عرب اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں بحر احمر، جنوب میں خلیج عدن، بحیرۂ عرب، شمال مشرق میں خلیج عمان اور خلیج فارس (خلیج عرب) واقع ہے۔ جزیرۂ نمائے عرب کو مختصراً جزیرۂ عرب بھی بولتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جزیرۂ نمائے عرب کا اطلاق حجاز (مکہ، مدینہ، طائف وغیرہ)، نجد، بحرین، یمن، تہامہ، شحر، ظفار اور حضرموت پر ہوتا تھا۔ دور جدید میں جب قومی ریاستوں کا ظہور ہوا تو نئے ممالک وجود میں آئے اب جزیرۂ عرب کا اطلاق سعودی عرب، یمن، عمان، اردن، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین پر ہوتا ہے۔

جزیرۂ عرب میں بہت سے پہاڑ، وادیاں، صحرا و نخلستان ہیں مثلاً جبال السراۃ، جبال الحجاز، حرات۔ پھر صحرا اور ریگستان میں الربع الخالی، النفوذ، الدھناء، بادیۃ الشام وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ عرب دنیا میں ندیاں نہیں ہیں لیکن کچھ وادیاں ہیں جن کی وجہ سے بعض مقامات میں سرسبزی اور ہریالی رہتی ہے۔ مثلاً وادی الرمۃ، وادی الدواسر، وادی حضرموت، وادی سرحان، وادی نجران اور وادی ام القریٰ

وغیرہ ہیں۔عرب میں جنگلات نہیں ہوتے لیکن مختلف قسم کے درخت ضرور پائے جاتے ہیں۔جیسے ببول، بیری اور مہدی وغیرہ۔پھل دار درختوں میں کھجور سب سے اہم ہے۔انار، انگور وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔جانوروں میں سب سے اہم جانور اونٹ پھر گھوڑا ہے۔ان کے علاوہ بھیڑ، بکری، ہرن، نیل گائے، خچر، گدھا، شیر، چیتا، تیندوا، بھیڑیا، لومڑی، بندر، گائے، خرگوش بھی پائے جاتے ہیں۔پرندوں میں عقاب، چیل، گدھ، شکرہ، کبوتر، فاختہ اور کوا وغیرہ اہم ہیں۔

عرب باشندگان سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یہ عام طور سے قبائلی زندگی گزارتے اور محدود علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔آپس میں جنگ و جدال بھی چلتا رہتا تھا۔عورت کو بدوی ماحول میں اہم مقام حاصل تھا۔مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی اور ہر میدان میں موجود نظر آتی۔

عربوں کا اولین مذہب تو دین ابراہیمی تھا لیکن بت پرستی ان میں داخل ہوئی اور سینکڑوں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگے۔اس کے علاوہ عربوں میں یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت بھی پائی جاتی تھی۔عربوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا اور صحرانوردی کرنا تھا۔کچھ لوگ زراعت کرتے اور کچھ تجارت بھی کرتے تھے۔یمنیوں نے زراعت و تجارت میں کافی شہرت حاصل کی۔پھر قریش مکہ اس میں آگے بڑھے۔مکہ کے علاوہ بہت سے تجارتی مراکز یا بازار لگتے تھے۔جیسے سوق عکاظ، دومۃ الجندل، منیٰ، ذوالمجاز وغیرہ۔

سامی اقوام: مشرق وسطی میں رہنے والی اقوام کو سام بن نوح کی اولاد بتایا جاتا ہے اور وہ کسی زمانے میں ایک جگہ رہتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے۔پھر دھیرے دھیرے مختلف گروہوں میں بٹتے گئے اور زبانیں بھی مختلف ہوتی گئیں اور مستقل زبانوں کی حیثیت اختیار کر لیا۔لیکن ان میں آپسی نسلی قربت، جغرافیائی قربت اور زبانوں میں بہت سی مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں سامی اقوام کہا جاتا ہے اور ان کی زبانوں کو سامی زبانیں۔

سامی اقوام کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں کہ ان کا اصل وطن کہاں تھا۔کچھ نے شمالی افریقہ اور ایتھوپیا (حبشہ) کو بتایا ہے تو کچھ نے عراق کے قدیم شہر بابل کو اور کچھ نے آرمینیا کو بتایا ہے، لیکن شوقی ضیف نے جزیرۃ العرب کو بتایا ہے اور فلپ حتی نے مختلف شواہد کی روشنی میں جزیرۃ العرب کو ان کا اولین وطن قرار دیا ہے۔پھر یہ سامی اقوام یہاں سے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہجرت کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں۔

سامی زبانوں کے تعلق سے یہ بات یاد رہے کہ علمائے لسانیات نے جب سامی زبانوں کی گروہ بندی کی تو عربی زبان کو ان میں سب سے اہم مانا جو جزیرۂ عرب میں بولی جاتی تھی۔اور شاید سامی خصوصیات جو قدیم سے عربی زبان میں پائی جاتی ہیں سامی گروپ کے کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں۔

زبان کی تعریف: مختلف ماہرین نے زبان کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ہادی حسن زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''زبان علامتوں کا ایک نظام ہے جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہوتا ہے یا بن سکتا ہے۔'' دی ساسسور کے مطابق'' زبان خیالات اور افکار کے اظہار کرنے والی علامتوں کا نظام ہے۔''

انسان نے کیسے بولنا شروع کیا؟ زبانیں کس طرح وجود میں آئیں۔اس سلسلے میں بہت سارے نظریات پائے جاتے ہیں۔میکس

مولر نے انہیں چار نظریات میں سمویا ہے:

۱۔صوت تقلیدی نظریہ ۲۔فجائی نظریہ ۳۔ابتلازائی نظریہ ۴۔ہائی سونظریہ

علمائے لسانیات نے پھرزبانوں کے خاندان بنائے اور ان کو مختلف انداز میں تقسیم کیا۔شلیگل اور میکس مولر کی تقسیم کو زیادہ مقبولیت اور رواج ملا۔شلیگل نے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔

۱۔متصرفہ یا تحلیلی زبانیں ۲۔سبقلاتی یا وصلی زبانیں ۳۔یک رکنی یا متصرفہ زبانیں

میکس مولر نے زبانوں میں آپسی قربت کی بنیاد پر تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ انڈو۔یوروپین خاندان، ۲۔ سامی-حامی خاندان، ۳۔ طورانی خاندان

پھر ان کو مزید شاخوں میں تقسیم کیا ہے ۔عربی زبان سامی -حامی خاندان کے سامی خاندان کے تحت آتی ہے۔عربی زبان سامی زبانوں میں مہتم بالشان رہی۔سامی خصوصیات کی حامل کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔عربی اپنے وجود سے لے کرآج تک کبھی مردہ نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ایک زندہ زبان کی حیثیت بولی جاتی رہی۔اس نے دنیا کی بیشتر زبانوں پر اپنے اثرات ڈالے،اور خود بھی دوسری زبانوں سے استفادہ کیا اور اپنے آپ کو مالا مال کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آج بھی دنیا کی زندہ اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے اور خالق کائنات کی ضمانت ہے کہ تا قیامت زندہ رہے گی۔

1.8 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی احوال بیان کیجیے۔

۲۔جزیرہ نمائے عرب کے طبعی حالات پر مختصر روشنی ڈالیے۔

۳۔جزیرہ نمائے عرب کے قبائلی اور معاشی زندگی کے حالات تحریر کیجیے۔

۴۔سامی قوم کی اصل کیا ہے؟اور جزیرۂ عرب میں اس کے وجود کے بارے میں بتائیے۔

۵۔زبان کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کا آغاز کب سے ہوا؟۔

۶۔زبان کی تقسیم کو تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

1.9 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔ تاریخ الأدب العربی، احمد حسن الزیات: دار نهضة مصر للطباعه و النشر، القاهرة، سنه طباعت غیر مذکور۔

۲۔ الجامع فی تاریخ الأدب العربیہ(قدیم ادب) حنا الفاخوری:۔دار الجیل۔بیروت۔ ۱۹۸۶ ۔

۳۔تاریخ الأدب العربی، ج ۱، عمر فروخ: دار العلم الملايين، بيروت، الطبعه الرابعه، ۱۹۸۱ م۔

۴۔تاریخ الأدب العربی، ج ۱، الدکتور شوقی ضیف، دار المعارف القاهره، ۱۱/ایڈیشن، سنه طباعت غیر مذکور۔

۵۔ موسوعة علوم اللغة العربية۔ج۷۔یعقوب، امیل بدیع: دار الکتب العلمية۔بیروت۔سنه طباعت ۲۰۰۶ ۔

٦۔ نشأة اللغة الانسان والطفل، د/علی عبدالواحد وافی، الناشر: نهضة مصر للطباعة والنشر والتوزیع، القاهرة، مصر، سنه الطباعة ۲۰۰۳م۔

۷۔ جزیرۃ العرب : مولانا محمد رابع ندوی، ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۔ پانچواں ایڈیشن، سنہ ۲۰۰۴ء۔

۸۔ زبان کیا ہے؟، خلیل صدیقی، عاکف بک ڈپو دہلی، ۱۹۹۴ء۔

۹۔ زبان اور علم زبان، پروفیسر عبدالقادر سروری، مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء۔

اکائی 2 عربی زبان کا ارتقا: دور جاہلی میں عربوں کے سیاسی وسماجی حالات

اکائی کے اجزا

2.1 مقصد

2.2 تمہید

2.3 دور جاہلی میں عربوں کے حالات

2.3.1 سماجی حالات

2.3.2 دینی حالات

2.3.3 اقتصادی حالات

2.3.4 سیاسی حالات

2.3.4.1 جزیرۂ عرب کی ریاستیں

2.3.5 علمی حالات

2.4 عربی زبان کا ارتقا

2.4.1 عربی زبان کا خاندان

2.4.2 قدیم لہجات

2.4.3 شمالی اور جنوبی لہجہ یا عدنانی اور قحطانی لہجہ

2.4.4 قرآن کریم کا نزول

2.4.5 زبان اور لہجہ: تعریف اور فرق

2.5 عربی رسم الخط

2.6 اکتسابی نتائج

2.7 نمونے کے امتحانی سوالات

2.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

2.1 مقصد

ا۔ طلبہ اس سبق میں دور جاہلی میں عربوں کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات سے واقف ہوں گے۔

۲۔ عربی زبان کے نشوونما اور ترقی کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔

۳۔ عربی زبان کے مختلف لہجات اور فصیح عربی کے فرق کو سمجھیں گے۔

۴۔ قرآن کے عربی زبان پر اثرات کو بھی سمجھیں گے۔

۵۔ عربی خط کے نشوونما اور اس کی موجودہ شکل سے واقفیت حاصل کریں گے۔

2.2 تمہید

انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ یہ شرفِ امتیاز شاید دو چیزوں میں مضمر ہے: قوتِ عقل وفہم اور قوتِ گویائی۔ دنیا کے دوسرے جانداروں میں بھی عقل وفہم پائی جاتی ہے لیکن انسان ان سے اس معنی میں منفرد وممتاز ہے کہ وہ کسی چیز کو سمجھ کر اس کا تجزیہ کر سکتا ہے اور پھر اسے کیا کرنا چاہیے اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے دلکی بات اور مافی الضمیر کی ادائیگی اپنی زبان سے کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ انسان کے علاوہ دوسری ساری مخلوقات جو اس کائنات میں پائی جاتی ہیں وہ سب اس صفت سے یا تو مکمل طور سے عاری ہیں یا ان میں یہ ناقص شکل میں پائی جاتی ہے۔

انسان نے اس زمین پر قدم رکھنے کے بعد کس زبان میں بولنا شروع کیا؟ یہ بالکل مجہول اور نامعلوم ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اندازہ، قیاس یا اعتقاد وایمان کی بنیاد پر کہا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت نوحؑ تک کے احوال پردۂ خفا میں ہیں۔ اولادنوح کے دنیا میں پھلنے اور پھولنے اور پھر مختلف زبانوں کے وجود میں آنے کی تاریخ ملتی ہے یا یوں کہیے کہ ماہرین زبان نے ایسا ہی مان لیا ہے۔ بہر حال اولادنوحؑ میں سام بن نوحؑ نے جزیرۂ عرب کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ سامی اقوام کا گہوارہ بنا اور ان کی زبان سامی زبان کہلائی۔ عربی زبان بھی سامی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا وطن جزیرۂ عرب رہا۔ یہیں بچپن سے جوانی کا سفر طے کیا۔ زمانے کے مختلف انقلابات دیکھے جس سے عربی لہجے (بولی) سے فصیح عربی زبان بن گئی۔ یہ تاریخ کے کسی دور میں پژمردہ زبان نہیں رہی۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں ہم پڑھیں گے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ زبان جس خطے میں پیدا ہوئی اور بام عروج پر پہونچی وہاں کا جغرافیہ کیا تھا۔ اس کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات کیا تھے۔ اس کی مدد سے ہم اس زبان کی اصل، اس کی اہمیت اور اس کے مقام کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے کلمات، تعبیرات اور دیگر چیزوں کو بھی اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اس لیے پہلے ہم جزیرۂ عرب کے عمومی احوال جاننے کی کوشش کریں گے پھر عربی زبان کی نشوونما کا مطالعہ کریں گے۔

2.3 جزیرہ نمائے عرب کی سماجی حالات

2.3.1 عرب اقوام:

عرب قوم کا تعلق سامی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ سامی اقوام کا مسکن جزیرۂ عرب تھا۔ اس بات کو شوقی ضیف نے مدلل انداز میں لکھا

ہے۔فلپ حتی نے مختلف دلائل اور شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ سامی اقوام کا اصل وطن جزیرۂ عرب تھا۔قدیم عرب مؤرخین نے جزیرۂ عرب کی اقوام کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ عرب بائدہ، ۲۔ عرب عاربہ، ۳۔ عرب مستعربہ

عرب بائدہ: اس سے مراد وہ عرب اقوام ہیں جن کا وجود مٹ چکا ہے۔یہ سام بن نوح کے دو بیٹوں لوواورارم کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ان اقوام میں طسم، جدیس، عاد اور ثمود وغیرہ ہیں۔جن کا تذکرہ قرآن وحدیث، جاہلی شاعری اور بائبل وغیرہ میں ملتا ہے۔عاد وثمود کے عروج وزوال کا قرآن میں جا بجا تذکرہ پایا جاتا ہے اور ان کے اندر پھیلی سماجی برائیوں اور ان کی تباہی پر خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔ {فاما ثمود فأهلكو بالطاغية وأما عاد فأهلكو بريح صرصر عاتية} (الحاقة: ٦۔٥) یعنی’’جہاں تک قوم ثمود کا تعلق ہے تو وہ ایک عذاب میں ہلاک کردیئے گئے اور جہاں تک قوم عاد کا تعلق ہے تو وہ ایک تیز وتند ہوا سے ہلاک کردیئے گئے‘‘۔

عرب عاربہ: یہ وہ عرب اقوام ہیں جن کی اصل زبان عربی تھی۔اور ان کا مسکن یمن تھا یہ عرب بائدہ کے باقی ماندہ لوگ بتائے جاتے ہیں۔عرب عاربہ کو یعرب بن قحطان کی طرف نسبت کر کے قحطانی بھی کہا جاتا ہے۔اوس وخزرج اور غساسنہ بھی عرب عاربہ میں سے ہیں۔یمن کی مشہور ریاستیں سبا وحمیر کا انتساب بھی انہیں اقوام کی طرف ہے۔حسان بن ثابت کہتے ہیں۔

تعلمتم من منطق الشيخ يعرب أبينا فصرتم معربين ذو نفر

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے ہمارے دادا یعرب سے زبان سیکھی اور پھر عرب قوم ہوگئے۔(حسن الزيات، ص:٧)

عرب مستعربہ: یہ وہ عرب اقوام ہیں جو اصلاً عرب نہ تھیں بلکہ باہر سے آکر جزیرۂ عرب میں آباد ہوگئی تھیں اور عربی زبان سیکھ لیا تھا۔ان کو عدنان کی طرف نسبت کر کے عدنانی بھی کہا جاتا ہے۔ان کو اسماعیل کی اولاد بھی کہا جاتا ہے جو انیسویں صدی قبل مسیح میں حجاز میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ربیعہ، مضر، انمار، قریش، ایاد وغیرہ قبائل عرب مستعربہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

2.3.2 سماجی حالات

عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی اولاد خوب پھلی پھولی اور جزیرۂ عرب کے مختلف حصوں کو آباد کیا۔ یہ قبائلی زندگی گذارتے۔قبیلہ ہی ان کا محور اور مرکز تھا۔وہ کسی بھی نظام حکومت اور بادشاہت سے ناآشنا تھے۔قبیلے کے لیے جینا اور قبیلے کے لیے مرنا ان کا شعار تھا۔’’انصر أخاك ظالما أو مظلوما‘‘ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ان کی طبیعت میں آزادی اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔امانت داری اور وفاشعاری ان کے اندر بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔عہد شکنی اور بزدلی کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ فیاضی اور مہمان نوازی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔

قبیلے کا اپنا نظام ہوتا۔ہر قبیلے کا اپنا ایک سردار ہوتا تھا جو تجربہ کار، بہادری، فیاضی اور دیگر کاموں میں سب سے آگے رہتا۔اس کے ایک اشارہ پر قبیلے کا ہر فرد جان دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔قبیلے کا کوئی فرد اگر کسی کو امان دے دے خواہ وہ دشمن ہی ہو تو قبیلے کا ہر فرد اس امان کی پاسداری کرتا۔اگر قبیلے کے کسی فرد کا کوئی عزیز دشمن کے ہاتھوں مارا جائے اور وہ انتقام کا مطالبہ کرے تو انتقام لینا پورے قبیلے کی ذمے داری ہوتی تھی۔

عربوں کی ایک بہت اچھی خصوصیت سخاوت ومہمان نوازی تھی اور بخل کو انتہائی معیوب سمجھتے تھے۔جو بھی ان کا مہمان بنتا چاہے وہ اجنبی یا دشمن قبیلے کا ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کی مہمان نوازی کرتے۔قحط سالی اور سردی کے موسم میں ان کی فیاضی اور مہمان نوازی میں اور اضافہ ہوجاتا۔وہ ٹیلہ پر آگ جلاتے تا کہ مہمان اس کو دور سے دیکھ کر ان کے پاس آجائے۔وہ شراب پیتے اور جوا کھیلتے اور اس وقت خوب فیاضی کرتے۔

قبائلی عصبیت ان کی رگ رگ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان میں آئے دن آپس میں جنگ ہوا کرتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ حالت جنگ میں رہتے۔ چھوٹی اور معمولی باتوں پر جنگ شروع ہوجاتی تو سالہا سال جاری رہتی۔ خون کے بدلہ خون کا زیادہ رواج تھا۔ اور خون بہا لینے کو معیوب سمجھتے۔ بستر پر مرنے کے بجائے جنگ میں مرنا افضل سمجھتے۔ حرام مہینوں میں جنگ بند کردی جاتی اور ہر قبیلے اس کی سختی سے پابندی کرتا۔ عربوں کی دو جنگیں حرب بسوس اور حرب داحس وغبراء بہت مشہور ہیں۔ یہ قبائل بسا اوقات جنگ سے تنگ آکر آپس میں صلح بھی کر لیتے۔ کچھ قبائل آپس میں معاہدہ کرلیتے کہ وہ ایک دوسرے کا جنگ اور امن میں ساتھ دیں گے۔ ایسے قبائل متخالف قبائل کہلاتے۔ پھر وہ ایک دوسرے کے لیے اپنی جان تو دے سکتے تھے لیکن اپنے عہد و پیمان سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی فرد قبیلہ اگر قبیلے کی پاسداری نہیں کرتا اور دوسروں سے جنگ کر بیٹھتا تو اسے خلیع (نکالا ہوا) قرار دے دیتے پھر نہ تو اس کی حمایت کرتے اور نہ ہی اگر اسے کوئی قتل کر دیتا تو اس کے خون بہا کا دعوی کرتے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آزادی حاصل کرلیتا تو پھر کسی نہ کسی قبیلے سے جڑ جاتا اور زیادہ تر اسی قبیلے سے جڑ جاتا جس نے اسے آزاد کیا۔ اس تعلق کو وِلاء اور اس کو مولی کہا جاتا۔

قبائلی سماج میں عربوں میں شعرا اور خطبا کی بہت اہمیت حاصل تھی۔ شاعر اپنے قبیلے کا ترجمان ہوتا اور اپنے قبیلے کے کارناموں پر فخر کرتا اور اپنے دشمنوں کی ہجو کرتا، اپنے مقتولین کا مرثیہ کہتا اور جنگوں میں جوش دلاتا۔ خطیب بھی مختلف مناسبت سے تقریریں کرتا جس میں فخر ومباہات، جاں فروشی و بہادری اور حکمت وموعظت کی باتیں ہوتیں۔ قبیلے میں ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

بت پرستی عرب سماج میں سرایت کر چکی تھی اس کی وجہ سے بہت سی بداعتقادیاں بھی سماج میں پھیل گئی تھیں۔ اس پر آگے کے صفحات میں تفصیل سے بات کی جائی گی۔

شادی بیاہ میں کوئی قانون و قاعدہ نہ تھا وہ جس قدر عورتوں سے چاہتے شادی کرتے۔ باپ کے مرنے پر اس کی بیویوں سے کبھی اسکے لڑکے بھی شادی کر لیتے۔ جنگ میں جس قدر مرد اور عورتیں پکڑی جاتیں وہ یا تو فدیہ دیکر اپنے آپ کو چھڑا لیتے یا مردوں کو غلام بنا لیا جاتا اور عورتوں کو باندیاں۔ ان سے تمتع اپنا حق سمجھتے۔ البتہ ان سے ہونے والی اولاد کو اپنی طرف منسوب کرنا اپنے لیے عار سمجھتے۔ دو سگی بہنوں سے بھی شادی کا رواج تھا۔ مرد بھی کسی عورت کو شادی کا پیغام دے سکتا تھا اور کوئی عورت بھی کسی مرد کو۔

عورت: جاہلی سماج میں عورت کو مرد کے مساوی حقوق حاصل تھے۔ وہ اپنی پسند سے کسی سے شادی کرسکتی تھی۔ کوئی تجارت کرسکتی تھی۔ وہ مرد کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر میدان میں کام کرتی۔ جنگوں میں ساتھ ہوتی اور بوقت ضرورت تلوار بھی اٹھاتی۔ مرد کی طرح ہی وہ بھی کسی پریشان حال کو پناہ/امان دے سکتی تھی۔ علم وفن کے میدان میں بھی وہ سب کے ساتھ ہوتی۔ خنساء جیسی شاعرہ دور جاہلی ہی کی پیداوار تھیں۔ آزاد بڑے گھرانے کی عورتوں کے خدمت گار بھی ہوتے۔ باندیاں ان کے گھر اور ان کی خدمت کرتیں۔

غلام اور لونڈیاں: عرب معاشرے میں بہت سی لونڈیاں اور باندیاں بھی تھیں یا تو وہ افریقہ وغیرہ سے خرید کر لائی جاتیں اور پھر عرب کے بازاروں میں بیچی جاتیں یا جنگوں میں پکڑ کر لائی جاتیں۔ ان کا سماج میں کوئی مقام نہ تھا۔ اپنے آقا کی خدمت کرنا بس۔ بعض لوگ لونڈیوں اور غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ کچھ لوگ ان سے گانے بجانے کا کام بھی لیتے اور بسا اوقات یہ معاملہ فحاشی تک پہونچ جاتا۔

باندیوں کی طرح غلام بھی عرب معاشرے کا ایک اہم جزء تھے یہ بھی یا تو خرید کر لائے جاتے یا جنگوں میں پکڑے جاتے ان کو غلام

بنا لیا جاتا۔ ان سے ہر طرح کا کام لیا جاتا۔ گھر، تجارت، گلہ بانی اور بسا اوقات جنگوں وغیرہ میں بھی۔ ان میں سے کوئی اگر اپنے مالک کو خوش کر لے یا پیسہ دے دے تو اسے وہ آزاد بھی کر دیتے۔ غلاموں کی بھی تجارت ہوتی تھی۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جاہلی دور میں عرب قبائلی زندگی گذارتے تھے اور عرب کی صحرائی زندگی کی خصوصیات جیسے حریت پسندی، حق گوئی، وفا شعاری، سخاوت اور مہمان نوازی ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ ساتھ ہی قبائلی عصبیت اور جنگ وجدال بھی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ انکا کوئی مذہب نہ تھا بلکہ اس وقت کے سارے ہی مذاہب عربوں میں پائے جاتے تھے۔ البتہ بت پرستی کا ان پر غلبہ تھا۔

2.3.3 دینی حالات

اللہ کے نبی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ میں آباد کیا۔ دونوں نے ملکر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی۔ ایک اللہ کی عبادت کی اور لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ لوگ دین ابراہیمی پر چلتے رہے۔ وقت گزرتا رہا بالآخر لوگ اصل دین کو دھیرے دھیرے بھولتے گئے۔ بت پرستی در آئی۔ اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ خانۂ کعبہ میں ہی سینکڑوں بت رکھ دیئے گئے۔ ان میں سب سے ممتاز بت لات، منات، عزیٰ، یغوث، یعوق، نسر، ود اور سواع تھے، ان میں سب سے پرانا بت منات تھا، یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ نصب کیا ہوا تھا، یہاں آکر سارے عرب کے لوگ اس کی عبادت کرتے اور قربانی کے جانور ذبح کرتے۔ قبیلۂ اوس وخزرج کا یہ محبوب بت تھا۔ اسی طرح سے لات قبیلۂ ثقیف کا محترم بت تھا، جس کا طائف میں انہوں نے مندر بنا رکھا تھا، عربوں میں ان بتوں کے نام پر نام رکھنے کا بھی عام رواج تھا، چنانچہ عبد مناف، زید منات، زید اللات اور تیم اللات کے نام عام طور سے عربوں میں پائے جاتے تھے۔ عزیٰ قریش کا محبوب ترین بت تھا، اس کے علاوہ قریش نے خانۂ کعبہ میں بھی کئی بت رکھ رکھے تھے، ان میں سب سے بڑا ہبل تھا جو انسانی شکل کا عقیق ہیرے کا بنا ہوا تھا۔

عربوں میں کچھ لوگ چاند اور سورج کی بھی پوجا کرتے تھے چنانچہ ان میں سے بعض سورج کی عبادت کرتے تھے اور اس کے نام پر عبد شمس یعنی سورج کا بندہ نام رکھتے تھے۔ اسی طرح سے بعض قبائل چاند کی پرستش کرتے تھے۔ قبیلۂ لخم، خزاعہ اور قریش ''الشعریٰ'' ستارہ کو اپنا معبود مانتے تھے۔ بعض لوگ ستاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے اور ان کی پوجا کرتے۔ بعض قبائل جنوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔

عربوں کی زندگی پر ان بتوں کا اثر اور ان کی کارفرمائی بہت نمایاں تھی۔ یہ لوگ ان سے برکت حاصل کرتے، مدد مانگتے۔ ان پر چڑھاوا چڑھاتے، فال نکالتے، سفر میں جاتے وقت اور واپس آکر ان کو چھوتے اور اپنے جسم پر ملتے، غرض کہ بت پرستی اور اس کے اثرات عربوں کی زندگی اور معاشرت میں بری طرح سرایت کر چکے تھے۔ دین ابراہیمی جس کا وہ اپنے آپ کو پیروکار بتاتے تھے۔ ایک بھولی بسری کہانی بن گیا تھا۔

یہودیت:

بت پرستی کے بعد عرب کا دوسرا اہم ترین مذہب یہودیت تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے حملے کے نتیجہ میں بہت سے یہودی قبائل نے جزیرۂ عرب کا رخ کیا اور مختلف مقامات پر آباد ہوگئے خاص طور سے یثرب (مدینہ)، فدک اور خیبر وغیرہ۔ اس طرح یہودیت بھی جزیرۂ عرب میں پھیل گئی۔ دھیرے دھیرے وہ تجارت وزراعت میں آگے بڑھے اور عربوں میں سے سب سے مالدار ہو گئے۔ یہ سود پر اپنا پیسہ لوگوں کو دیتے چنانچہ عربوں میں سودی کاروبار انہیں کے ذریعہ پھیلا۔ پھر اہل کتاب ہونے کے ناطے وہ لکھنے پڑھنے میں بھی

سب پر سبقت رکھتے تھے۔

عیسائیت:

تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت عرب میں داخل ہوئی۔ اس وقت تک عیسائیت میں خرافات اور بدعات رواج پا چکی تھی۔عیسائی اور رومی سلطنت کے عربوں سے قریب ہونے کی وجہ سے کافی لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ جزیرۂ عرب کے شمال مغرب ومشرق میں روم سے عیسائی مبلغین کے وفود کثرت سے آنے لگے۔عیسائی بادشاہ ان کی خوب مدد اور حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان علاقوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہتے تھے۔حبشیوں کے درمیان اس مذہب کو بڑی مقبولیت ملی۔ ابرہہ کی قیادت میں یہ مذہب خوب پھلا پھولا۔ اس نے جگہ جگہ کنیسہ بنوائے اور یمن میں نجران عیسائیت کا گڑھ بن گیا۔شمالی عرب میں بھی یہ مذہب رواج پایا۔قبیلۂ عاملہ، جذام، کلب اور قضاعہ کے لوگوں نے اس کو اپنایا۔عراق میں قبیلۂ تغلب، ایاد، بکر میں لوگوں نے عیسائیت اختیار کرلی۔ حیرہ میں عرب کے مختلف قبائل جن کو"العباد" کہتے تھے مذہب عیسوی کے پیرو بن گئے۔حجاز خاص طور سے مکہ میں جو غلام تھے وہ زیادہ تر عیسائیت کے ماننے والے تھے۔ مذکورہ بالا گفتگو سے یہ پتہ چلا کہ اسلام سے پہلے جزیرۂ عرب میں عیسائیت کے ماننے والوں کی ایک اچھی تعداد پائی جاتی تھی۔

ایک اہم بات یہاں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کیا نصرانیت، مسیحیت اور عیسائیت میں کوئی فرق ہے؟ کیا یہ تینوں ایک چیز کے تین مختلف نام ہیں یا یہ الگ الگ ہیں؟۔نصرانی وہ فرقہ ہے جو یہود سے نکلا اور حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتا ہے کہ وہ ایک انسان تھے، اللہ کے نبی تھے اور ان کو سولی پر نہیں چڑھایا گیا بلکہ ایک دوسرے شخص کو چڑھایا گیا اور ان کو اللہ نے اپنے پاس بلالیا اور قیامت سے پہلے ان کا ظہور ہوگا۔ ان اعتقادات کے مجموعہ کا نام نصرانیت اور ان کے ماننے والوں کو نصرانی کہتے ہیں۔اس فرقہ کو مسیحی اپنے میں شامل نہیں کرتے۔مسیحیت کا ماننا ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے اور نبی تھے ان کو پھانسی دی گئی پھر قبر سے تین دن بعد اٹھے اور اللہ کے پاس چلے گئے اور قیامت سے پہلے دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے اور دنیا کو امن وسلامتی سے بھر دیں گے۔ جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے تو یہ اردو زبان میں مسیحیت کا مترادف ہے۔موجودہ دور میں عام بول چال میں نصرانیت، مسیحیت اور عیسائیت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا بلکہ ان تینوں سے مراد وہ دین سمجھا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰ لیکر اس دنیا میں تشریف لائے۔اور ان کے پیروکاروں کو نصرانی، مسیحی اور عیسائی کہتے ہیں۔

مجوسیت:

ایران اور عرب کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایرانی ایک عظیم سلطنت کے مالک تھے۔ایرانی تہذیب وتمدن ایک زمانے میں بہت مشہور تھی۔عرب ان کے ہمسایہ تھے۔اس لیے عربوں پر ان کے اثرات پڑنا ایک فطری بات ہے۔ مجوسی عربی لفظ ہے اس کے معنی آتش پرست۔ مجوسیت کا بانی زرتسترہ تھا جو بلخ میں دو ہزار سال قبل مسیحؑ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زندگی وہیں گذاری۔ کہتے ہیں کہ کافی دنوں ریاضت وعبادت میں گذاری پھر خدا کا پیغام لیکر ایران کی بادشاہ کی خدمت میں پہونچا، اس نے اس کے مذہب کو قبول کرلیا۔ایک جنگ میں بلخ میں مارا گیا۔کوروش اعظم اور دارا اعظم نے زرتشتی مذہب کو ایران میں حکما نافذ کیا۔پھر یہ پورے ایران میں پھیل گیا۔کہتے ہیں کہ ابتداء میں یہ مذہب بھی عقیدۂ توحید کا پیغام لیکر اٹھا لیکن پھر اس میں ثنویت یعنی دو خدا کا تصور داخل ہوگیا۔ایک خدا اہورا مزدا (یزداں) خالق اعلی جو حق وصداقت اور نیکی خدا ہے۔ دوسرا اہرمن بدی، جھوٹ اور تباہی کا خدا۔ان دونوں میں ازل سے کشمکش چلی آرہی ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

جب اہورا مزدا کا پلہ بھاری ہوجا تا ہے تو دنیا امن وسکون اور خوشحالی کا گہوارہ بن جاتی ہے اور جب اہرمن غالب آ تا ہے تو دنیا فسق وفجور سے بھر جاتی ہے۔لیکن بالآخر خدائے یزداں کی فتح ہوگی۔اس مذہب میں آگ کو پاک اور ہر شیٔ کو پاک کرنے والی چیز سمجھا جاتا ہے۔اس لیے اس مذہب کے ماننے والے ہروقت اپنی عبادت گاہوں میں آگ روشن رکھتے ہیں بلکہ گھروں میں بھی آگ روشن کرتے ہیں اور پھر شاید یہیں سے اس میں آگ کی پرستش در آئی۔عرب انہیں مجوسی کہتے ہیں اور ان کے مذہب کو مجوسیت کے نام سے پکارتے ہیں۔آج کل اس مذہب کے ماننے والوں کو پارسی کہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ ایران عربوں کا پڑوسی ملک تھا اور اس کے اثرات اہل عرب پر پڑنا ایک فطری بات ہے۔اسی لیے ایران وعراق کی سرحد کے قریب آباد عرب زرتشت کے آتش پرست مذہب سے متاثر ہوئے۔یہ ایرانیوں کی طرح نیکی کا خدا یزدان اور بدی کے خدا اہرمن کے قائل تھے۔یہ لوگ عموما آگ کی پوجا کرتے تھے۔حیرہ کی ریاست مجوسی عربوں کے زیر تسلط تھی۔مکہ میں بھی کچھ لوگ دو خدا مانتے تھے، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت وتاریکی کا۔خدائے ظلمت کو فتنہ وفساد اور برائیوں کی جڑ مانتے تھے۔

دہریت:

عرب میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے مشرکانہ عقائد کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، یہ لوگ نہ تو بت پرست تھے اور نہ ہی کسی آسمانی مذہب کے پابند۔وہ خدا اور حشر ونشر کے منکر تھے۔وہ دنیا کو ہی ازلی اور ابدی خیال کرتے تھے،اس طبقہ کو دہریت کا پیرو کہا جاتا ہے۔

دین ابراہیمی:

مذکورہ مذاہب کے ماننے والوں کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو صرف ایک خدا کی عبادت کرتی تھی اور بت پرستی، یہودیت یا نصرانیت کی قائل نہ تھی، یہ لوگ ''حنفاء'' (حنفی کی جمع یعنی خالصتا ایک خدا کے ماننے والے) کہلاتے تھے۔یہ لوگ قریشیوں کی بت پرستی کو خام خیالی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے تھے، ان کے بتوں پر چڑھاوے کے جانوروں کے گوشت کو یہ لوگ حرام جانتے تھے۔کچھ مشہور نام یہ ہیں: نزار بن معد بن عدنان ،قریش بن کنانہ، عامر بن الظرب، ورقہ بن نوفل،قس بن ساعدہ ایادی، حرب بن امیہ، ادہم الیشکری وغیرہ۔

2.3.4 عربوں کی معاشی حالت

جزیرۂ نمائے عرب کا بیشتر حصہ ریگستانوں اور صحراؤں پر مشتمل ہے۔بارش کم ہوتی ہے۔بڑی ندیاں نہیں پائی جاتی ہیں۔کچھ چھوٹے چھوٹے ندی نالے پائے جاتے ہیں جہاں کبھی کبھار ہونے والی بارش کا پانی آکر گرتا ہے اور کچھ زرخیزی کا سامان مہیا کرتا ہے۔اسی طرح پہاڑوں کا پانی بہہ کر وادیوں اور نخلستانوں میں پہونچتا ہے تو اس سے شادابی و ہریالی پیدا ہوتی ہے۔ایسی جگہیں جہاں بارش ہوتی اور زمین کسی قدر زرخیز ہوتی وہاں کھیتی باڑی کی جاتی تھی بقیہ مقامات بنجر،صحرا اور ریگستان تھے جہاں نہ تو کھیتی ہوتی اور نہ ہی چلنا پھرنا آسان ہوتا۔اس وجہ سے قدیم زمانے میں عربوں کی معیشت تین چیزوں: زراعت،تجارت اور گلہ بانی پر منحصر تھی۔

ا۔زراعت :

یمن کی سرزمین سب سے زیادہ زرخیز تھی یہاں لوگ سینچائی کے لیے بند باندھ کر پانی روک لیتے اور حسب ضرورت سینچائی کرتے۔

اس طرح انہوں نے کھیتی باڑی میں بہت ترقی کی اور پھر ان کی تجارت بھی خوب پھلی پھولی۔ یہاں چاول، گیہوں، روئی اور کافی coffee کی بہت اچھی کاشت ہوتی تھی۔ اسی طرح مکہ، مدینہ، طائف میں گیہوں، جو، کھجور، انگور کی کھیتی ہوتی۔ عرب میں سب سے اہم درخت کھجور ہے۔ کھجور اور دودھ کو مکمل غذا سمجھا جاتا۔ بدوی عرب کا خواب ہوتا Two blacks یعنی Water and dates یعنی پانی اور کھجور ہوتے تھے۔ مدینہ کی کھجور دنیا بھر میں سب سے عمدہ مانی جاتی ہے۔ مورخین نے مدینہ میں کھجور کی ۱۰۰/ سے زائد انواع گنایا ہے۔ خیبر، فدک وغیرہ علاقوں میں بھی چاول، گیہوں، کھجور اور انگور کی اچھی کھیتی ہوتی۔

۲۔ تجارت:

شوقی ضیف نے جاہلی دور کی معاشی حالت پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے: جاہلی زمانے میں عربوں کی معاشی حالت کسی ایک خاص طرز کی نہیں تھی۔ جنوبی و مشرقی عرب اور حجاز کے نخلستانوں جیسے یثرب اور خیبر، طائف اور وادی القری میں زراعت کی جاتی تھی۔ مکہ والوں کی زندگی کا انحصار تجارت پر تھا۔ مکہ والوں کے تجارتی قافلے بحر ہند اور بحر متوسط کے درمیان اپنا تجارتی مال لیکر چلتے۔ اسی طرح خشکی میں شمال اور جنوب میں کچھ معلوم راستوں سے سفر کرتے۔ بحری اور بری دونوں سفروں میں ان کے ساتھ کچھ گائڈ اور محافظ ہوتے جو انھیں راستوں میں بھٹکنے اور بحری اور بری ڈاکوؤں سے بچاتے۔ چنانچہ یہ جنوب یعنی یمن، بحر ہند، مشرقی افریقہ سے لوبان، خوشبو، صندل، چمڑے، عدن کے قیمتی کپڑے، ہندوستانی مسالہ جات، افریقی غلام، گوند، ہاتھی دانت وغیرہ۔ اسی طرح وہ طائف سے کشمش اور بنوسلیم کے کانوں سے سونا لے جاتے، یہ سب سامان وہ بحر متوسط کے علاقوں میں لے جاتے اور وہاں سے اسلحہ، گیہوں، تیل، شراب، مختلف قسم کے سوتی اور ریشم کے کپڑے لاتے۔

دور جاہلی میں مکہ ایک بڑا تجارتی منڈی تھا۔ کعبہ سب سے بڑا صنم خانہ۔ لوگ اس کا طواف کرتے، اپنے بتوں کی عبادت کرتے، قریش مختلف قسم کے بازار اور میلے لگواتے جیسے عکاظ کا بازار۔ یہ ادبی میلہ بھی ہوتا تھا۔ عکاظ سے قریب ہی ایک اور بازار لگتا جسے ذو المجاز کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے بازار لگتے تھے جیسے نجد کے شمال میں دومۃ الجندل، خیبر، حیرہ، حجر یمامہ میں، صحار اور دبا عمان میں، المشقر ہجر میں، شحر، حضر موت، صنعاء، عدن اور نجران کے بازار۔ یہ سب بازاروں کے کچھ متعین دن ہوتے انہیں دنوں میں لگائے جاتے تھے۔ قریش کے لوگ ان میں سے بعض بازاروں میں کمیشن ٹیکس بھی وصول کرتے۔ مذکورہ بالا باتوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اہل مکہ سب کے سب مالدار تھے بلکہ ایک بڑا طبقہ غریبوں، فقیروں اور غلاموں کا بھی وہاں رہتا تھا۔

۳۔ گلہ بانی:

عرب چونکہ قبائلی زندگی گزارتے اور کچھ قبائل چلتے پھرتے رہتے جہاں کہیں چارہ پانی ملتا ٹھہر جاتے اور جب پانی ختم ہوا وہاں سے نکل پڑے اور دوسری جگہ جہاں چارہ پانی ملا ٹھہر گئے۔ سارے ہی عرب مویشی پالتے خاص طور سے اونٹ اور بھیڑ بکری پالنا ان کی ضرورت اور ان کا اثاثہ تھا۔ البتہ چلتے پھرتے قبائل کی زندگی کا تو دارومدار ہی گلہ بانی پر تھا۔ انہیں سے ان کو غذا ملتی اور وہی ان کی مال وجائداد تھے۔

شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ مکہ کے علاوہ دوسری جگہوں جیسے تہامہ، نجد، صحرا نفوذ، وادی شام اور دھناء، اور بحرین میں بدوی زندگی گذارتے تھے ان کی معیشت کا دارومدار اونٹ اور بکریاں پالنا اور ان کو چرانا تھا۔ وہ زراعت اور صناعت کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ حقارت کی

نظر سے دیکھتے۔اور صحرا کی آزاد زندگی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے۔اس چیز نے ان کی زبان ان کے رسوم ورواج سب کو محفوظ رکھا۔ان کا کھانا بہت معمولی اور سادہ ہوتا جیسے تھوڑا سا جو ان کے لیے کافی ہوتا۔کھجور اور دودھ ان کی سب سے عمدہ غذا ہوتی۔اسی طرح ان کا لباس ایک لمبا کرتا (چغہ) جس کو بیچ میں کمر کے پاس ایک عباء سے لپیٹ لیتے اور سر پر عقال باندھ لیتے۔

سارے ہی عرب جانور پالتے اور ان سے مختلف کام لیتے۔البتہ عربوں میں ایک طبقہ ایسا تھا جس کی زندگی صرف اور صرف گلہ بانی پر منحصر تھی۔پالتو جانوروں میں اونٹ، گدھا، کتا، تازی کتا، بلی، بھیڑ، بکری وغیرہ۔گھوڑا، عربی گھوڑا بہت مشہور ہوا۔کہا جاتا ہے عرب بدو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر ایک بچہ پانی مانگ رہا ہے اور دوسری طرف ان کا گھوڑا پیاسا ہے تو بدو گھوڑے کو پہلے پانی دے گا۔

عربوں کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اونٹ کی تھی۔یہ ان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔اونٹ بدوؤں کا صحرا کی کشتی، زمین کا دوست، اونٹ کا پالنے والا، شادی میں دہیز کا سامان، خون کا فدیہ اور جوئے بازی کا سکہ اور بدو کی سب سے قیمتی دولت ہوتا۔ بدو اس کی سواری کرتا، اس کا دودھ پیتا، اس کا گوشت کھاتا اور اس کے کھال سے خیمہ بناتا اور بال سے کمبل۔اس کا پیشاب اس کے لیے ٹانک اور اس کا گوبر اس کے کھاد کا کام کرتا۔عرب اپنے آپ کو اھل البعیر (وہ اونٹ والے) کہنے میں فخر محسوس کرتے۔کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر بدو اونٹ کے پیٹ سے پانی نکال کر پی جاتا۔کہتے ہیں کہ عربی زبان میں ایک ہزار سے زائد الفاظ اونٹ کے لیے پائے جاتے ہیں۔شاید اس کے بعد دوسرا لفظ سیف (تلوار) ہے جس کے لیے عربی میں کثرت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔اونٹ جاڑے میں ۲۵/دنوں تک اور گرمی میں ۵/دنوں تک بغیر پانی کے رہ سکتا ہے۔جزیرۂ عرب ہی دنیا کا واحد خطہ سے جہاں پر سب سے زیادہ اونٹوں کی پرورش وافزائش ہوتی ہے۔نجد کے گھوڑے، اُحساء کے گدھے اور عُمان کی اونٹنی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

سیر وشکار اور لوٹ مار: عرب کی صحرائی زندگی بہت آسان نہ تھی بلکہ بہت سی دشواریوں اور خطرات سے پر تھی۔جنگلی جانوروں اور سانپ سے مدبھیڑ، آپسی قبائلی لڑائیاں، بلکہ کچھ نے تو لڑائی اور ڈاکہ زنی کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنالیا تھا۔اور پھر یہ تجارتی قافلوں پر حملہ کرتے، ان کے سامان چھین لیتے اور مزے لیکر کھاتے اور غریبوں میں بھی بانٹتے پھر اس پر فخر کرتے۔

سیر وشکار بھی ان کے یہاں کافی اہم سمجھا جاتا۔بہت سے لوگ ہرن، گاؤخر، یہاں تک کہ شیر وتیندوئے کا شکار کرتے اور خوب فخر کرتے۔اس کے لیے کچھ لوگ شکاری کتے بھی پالتے۔ان کے کتوں اور جنگلی بیل اور گدھوں کے درمیان آئے دن خونی معرکے ہوتے رہتے۔ جاہلی شعرا کے کلام میں گھوڑے دوڑانے اور شکار کرنے کا خوب ذکر ملتا ہے۔

یہ لوگ جنگلی ہرن، جنگلی بکرے وبکریوں کا بھی شکار کرتے۔اس طرح ان عربوں میں سے کچھ لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ جانوروں کا شکار تھا۔

2.3.5 سیاسی حالات

جزیرۂ عرب کے باشندوں کی زندگی عموماً قبائلی تھی وہ آزاد زندگی گذارتے تھے۔کسی طرح کے نظامِ حکومت اور بادشاہت سے ناآشنا تھے۔مجموعی طور سے جزیرۂ عرب میں کبھی کوئی حکومت نہ قائم ہوئی۔البتہ ایران اور روم کے سرحدی علاقوں پر جیسے غساسنہ اور مناذرہ کی حکومتیں اور پھر یمن میں مختلف بادشاہتیں قائم ہوئیں لیکن حجاز وغیرہ میں کہیں بھی کوئی حکومت نہ بنی۔آئندہ سطور میں انہیں حکومتوں کا ذکر کریں گے تاکہ

اس دور کے سیاسی حالات کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکے۔

2.3.5.1 جزیرۂ عرب کی ریاستیں

جزیرۂ عرب کے طبعی حالات اس کو بنیادی طور پر دو حصوں سے تقسیم کرتے ہیں۔شمال اور جنوب جس کے درمیان میں بہت بڑا صحرا واقع ہے۔جنوبی علاقہ کے لوگوں نے شہری زندگی اختیار کر لیا تھا اور بڑی بڑی عمارتیں اور قلعہ و برج وغیرہ تعمیر کر لیا تھا۔یہاں تک مأرب جیسا بند بھی بنا لیا تھا جس سے وہ سینچائی وغیرہ کا کام لیتے تھے۔ان کے تجارتی قافلے عرب کے صحرا کو عبور کر کے شام وعراق تک ہندوستان اور افریقہ کا سامان پہنچاتے اور وہاں کا سامان ہندوستان اور افریقہ۔جبکہ شمال میں واقع نجد وحجاز میں زیادہ تر لوگ بدویانہ زندگی گزارتے تھے اور چارے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے تھے۔شام وعراق کے سرحدی علاقوں میں روم وفارس کے اثرات کی وجہ سے مدنی زندگی کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں۔لیکن وہ بہت کم ہیں۔وہاں چند نیم مختار عرب ریاستیں بہت مشہور ہوئیں جیسے غسانی، حیرہ، اور کندہ کی ریاستیں۔

جنوبی عرب کے بارے میں بہت کم معلومات مہیا تھیں لیکن جب کھدائی ہوئی اور کنائس وقبور پر پائے گئے کتبات کو علمائے لغت نے پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی تو بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔

ان کتبات سے جنوبی عرب کی تہذیب وثقافت کے بارے میں محققین کو پتہ چلا وہاں کے مختلف مذاہب، حکومتیں، سیاسی نظام اور بادشاہوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔اس بات پر سب متفق ہیں کہ جنوبی عرب میں پانچ ریاستیں وجود میں آئیں۔حکومت معین جس کی راجدھانی جوف یمن کا شہر معین تھی۔اس کے جنوب میں حکومت سبا جس کی راجدھانی مأرب تھی۔سبا کے جنوب مغرب میں حکومت قتبان تھی جس کی راجدھانی تمنع تھی اور قتبان کے جنوب میں اوسانی حکومت تھی حکومت حضرموت وہیں واقع تھی جس کی راجدھانی شبوہ تھی۔'' (ضیف، دکتور شوقی: تاریخ الادب العربی، ج ۱، ص: ۲۷)

2.3.5.2 شمالی ریاستیں:

جزیرہ عرب کی شمالی ریاستوں میں تین بہت مشہور ہیں: غسانی ریاست، ریاست حیرہ (ریاست مناذرہ) اور ریاست کندہ۔

غسانی ریاست: غساسنہ نے اس ریاست کو مشرقی اردن کے علاقہ میں قائم کیا تھا۔اس کا بانی جفنہ بن عمرو بتایا جاتا ہے۔یہ ریاست رومی سلطنت کے زیر اثر اور اس کی باج گزار تھی۔اس میں جبلہ حارث بن جبلہ وغیرہ مشہور بادشاہ ہوئے ہیں۔چوتھی صدی عیسوی میں حارث بن جبلہ کے عہد میں اس ریاست نے مجموعی طور سے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔اس ریاست کے حکمرانوں نے علم وفن اور شعر وادب کی خوب قدردانی کی۔نابغہ ذبیانی، اعشیٰ قیس، علقمہ الفحل اور حسان بن ثابت اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

ریاست حیرہ: (لخمی ریاست/ ریاست مناذرہ): غساسنہ کی طرح قبیلۂ لخم بھی یمن سے ہجرت کر کے شمال میں آباد ہو گیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔یہ ریاست ایرانی سلطنت کے زیر اثر تھی اور اس کی باج گزار تھی۔ریاست حیرہ تہذیب وتمدن سے آراستہ ریاست تھی۔غساسنہ زیادہ متمول، ترقی یافتہ اور شان وشوکت کی حامل تھی۔اس پر ایرانی مذہب اور تہذیب کا غلبہ تھا۔یہ ریاست بھی علم وفن کے بہت قدردان تھی۔حارث بن حلزہ الیشکری، عمرو بن کلثوم تغلبی، لبید بن ربیعہ، نابغہ ذبیانی اس کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔

ریاست کندہ: قبیلہ کندہ نے اس ریاست کو غسانی ولخمی ریاستوں کے درمیان شمالی نجد میں چوتھی صدی عیسوی میں قائم کیا۔یہ قبیلہ

یمن سے ہجرت کر کے شمال میں آباد ہو گیا تھا۔اس کے مشہور حکمراں حجر آکل المرار نے نجد کے قبیلۂ بکر وتغلب پر قبضہ کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔اس کا بیٹا حارث بھی بہت مشہور حکمراں ہوا جس نے حرب بسوس کی جنگ میں بکر وتغلب کے درمیان صلح کروائی۔ یہ ریاست بھی علم وفن کی سرپرستی کرتی اور شاعروں اور خطیبوں کو خوب نوازتی۔

2.3.5.3 جنوبی ریاستیں:

ریاست معین: یہ ایک مضبوط ومستحکم اور عربوں کی قدیم ترین حکومت تھی جس کا وجود ۱۰۰۰ صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا۔اس نے قتبانی اور حضرمی حکومتوں کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا بہت سے معینی کتبات حجاز کے دادان، حجر اور مدائن صالح میں پائے گئے ہیں جن سے شمالی عرب کے ساتھ اس مملکت کے گہرے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ریاست سبا: ساتویں صدی قبل مسیح اس سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے جب اس نے ریاست معین پر غلبہ حاصل کر لیا اور سارے اہم تجارتی مراکز پر قابض ہو گئے۔ بند بنانے اور آبپاشی کے نظام میں اس کو مہارت حاصل تھی جس نے اس علاقہ کو سرسبز وشاداب بنا دیا۔سد مأرب کا نام تاریخ میں بہت ملتا ہے۔اس ریاست اور اس کی شادابی کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے۔تجارت کے تباہ ہونے اور سد مأرب کے ٹوٹنے سے یہ ریاست تباہ ہو گئی۔

ریاست حمیر: ریاست سبأ پر قبضہ کر کے اس ریاست کو عروج ہوا۔اس ریاست کی ابتدا ۱۱۵ ق م میں ہوتی ہے۔حبشہ کی حکومت نے چوتھی صدی عیسوی کے نصف میں حملہ کر کے اس ریاست پر قبضہ کر لیا جو قبضہ بیس سال تک دراز رہا پھر حمیری ریاست دوبارہ قائم ہو گئی لیکن یہ کمزور ریاست ثابت ہوئی اور شمالی بدو قبائل اس پر حملہ آور ہونے لگے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال کی جانب ہجرت کا سلسلہ جو سد مأرب کے ٹوٹنے سے شروع ہوا تھا اب تیز تر ہو گیا۔آہستہ آہستہ یہ ریاست عیسائیت اور یہودیت کی کشمکش، اور رومی وساسانی حکمرانوں کی چپقلش کا میدان بن گئی یہاں تک کہ اس کے حکمراں باذان اور یہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا اور یہاں اسلامی اقتدار قائم ہو گیا۔

2.3.5.4 حجاز اور اہل حجاز:

شمالی عرب میں حجاز بھی داخل ہے لیکن اس کی دینی وسیاسی اہمیت کے پیش نظر یہاں خاص طور سے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ حجاز یعنی مکہ ، یثرب (مدینہ)، اور طائف وغیرہ۔ یہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم علاقہ رہا ہے یہاں عام طور سے قبائلی زندگی تھی۔البتہ قبیلۂ قریش اور اس کے مختلف خاندانوں کو یہاں قیادت وسیادت حاصل تھی۔ایک طرح سے وہ یہاں حکمرانی کر رہے تھے۔کیونکہ وہ کعبہ کے متولی تھے اور عرب قبائل انکا احترام کرتے تھے۔وہ حج کے محترم مہینوں میں قبائلی جھگڑوں کو حل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔سد مآرب کے ٹوٹنے کے بعد عرب تجارت اور دوسرے ملکوں سے تجارت میں یمنیوں کی جگہ حجازیوں اور خاص طور سے قریشیوں نے لے لی۔پھر قریش کے سرداروں نے ایرانی ورومی بادشاہوں اور یمن کے حکمرانوں سے تجارتی معاہدے یا اجازت نامے حاصل کر لیے اس طرح وہ بین العرب اور سرحدی ممالک کی تجارت پر کافی حد تک غالب ہو گئے۔اسی وجہ سے عربوں میں ان کی قیادت وسیادت تسلیم کی جانے لگی اور ان پر ان کی ایک طرح کی حکومت قائم ہو گئی۔

2.3.6 علمی حالات

دور جاہلی میں عربوں میں جو علوم ومعارف پائے جاتے تھے وہ بہت ہی محدود اور ناقص قسم کے تھے۔ یہ ان کے ذاتی تجربات پر مبنی

تھے ،ان کی عقلی اور سائنٹفک کوئی بنیاد نہ تھی ۔ چنانچہ وہ لکھنے پڑھنے کو اپنے لیے عار اور اپنے حافظہ کے لیے داغ تصور کرتے ۔گھوڑ سواری،تلوار زنی اور شعر وشاعری کرنا یہی ان کا سب سرمایہ تھا۔شعر وادب پر گفتگو بعد میں کریں گے البتہ محدود طور پر ہی سہی جو علوم ومعارف ان کے یہاں رائج تھے وہ یہ ہیں۔

علم الانساب :(علم نسب نامہ یا شجرۂ نسب کا علم) عرب قوم کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ اپنا نسب نامہ یاد رکھتی اور اس کو یاد رکھنے کا بڑا اہتمام کرتی ۔جس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی۔عربوں میں کچھ لوگ باقاعدہ اس کی روایت کرتے اور اپنے بچوں کو بھی یاد کراتے تھے ۔ اس میں کچھ لوگوں کو کافی شہرت بھی ملی، انھیں میں سے حضرت ابو بکرؓ بھی تھے۔ وہ علم الانساب کے ماہر مانے جاتے تھے۔ عرب نہ صرف اپنے آباء واجداد کا شجرۂ نسب یاد رکھتے بلکہ اپنے جانوروں جیسے گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب نامہ بھی یاد رکھتے تھے۔

علم النجوم (Astrology) :عربوں کو صحرا نوردی ،تجارتی اسفار اور بارش کے آنے اور رکنے کے اوقات معلوم کرنے وغیرہ ضروریات سے وہ ستاروں کے ڈوبنے، نکلنے اور چلنے اور ثابت رہنے کے اوقات معلوم کرتے ۔ اس میں کچھ لوگوں کو کافی مہارت بھی تھی ۔ ایک بدوی عورت سے پوچھا گیا کہ : أتعرفين النجوم؟ قالت: سبحان اللہ أما أعرف أشباحاً وقوفاعليّ كل ليلة۔ یعنی کیا تم ستاروں کے بارے میں جانتی ہو تو اس نے کہا: سبحان اللہ، کیا میں ان سایوں کو نہیں جانتی جو ہمارے اوپر ہر رات پہریداروں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔

صاعد بن احمد (المتوفی ۴۳۵ھ) نے لکھا ہے کہ ’’عربوں کو ستاروں کا بڑا علم تھا۔ وہ ان کے ڈوبنے اور نکلنے کے اوقات اچھی طرح جانتے تھے۔ سیاروں کا بھی علم تھا۔ انھیں اس سے بارش کا علم ہو جاتا۔ یہ علم انھیں از حد توجہ اور کثرت تجربہ سے حاصل ہوا کیونکہ انھیں اپنی روزی روٹی کے حصول کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ وہ حقائق کے انکشاف یا علوم میں تجربہ کی غرض سے ایسا نہیں کرتے تھے۔‘‘

علم طب :عربوں میں دیگر فنون کی طرح جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کا فن قدیم زمانہ سے پایا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد ان کے تجربات پر تھی۔ جیسے آگ سے سینکائی کرنا۔ اسی طرح مختلف نباتات کے خواص معلوم کرکے ان سے دوا کا کام لینا۔ اسی طرح علم جراحت سے ان کو اچھی واقفیت تھی۔ وہ خراب خون ہڈی کے ذریعہ نکال دیتے۔ اسی کے ساتھ ان میں جھاڑ پھونک اور دیگر خرافات بھی داخل ہوگئی تھیں۔ جیسے وہ کہتے تھے بدروحیں مریض کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ’’بدوی زندگی میں علم طب کی بنیاد زیادہ تر کچھ لوگوں کے محدود تجربات پر منحصر ہوتی ہے۔ اور یہ قبیلہ/ خاندان کے بڑے بزرگوں سے وراثتاً منتقل ہوتی رہتی ہے۔اس میں کچھ صحیح بھی ہوتی ہے البتہ اس کی کوئی ٹھوس بنیادنہیں ہوتی۔اس طرح کا طب عربوں کے یہاں بہت رائج تھا۔ اور اس سلسلے میں بہت لوگ مشہور تھے جیسے حارث بن کلدہ وغیرہ‘‘۔

طب کی ایک شاخ بیطرہ ــــــ یعنی طب حیوانات۔ خاص طور پر گھوڑوں اور اونٹوں سے متعلق بیماریوں اور ان کا علاج۔ جیسے اونٹنی کا خارش زدہ ہونا اور اس کے علاج کا طریقہ،گھوڑوں کے پیروں کی بیماری وغیرہ۔اس میں بھی عربوں کو بڑی مہارت تھی۔

الفراسة و القيافة(Physiognomy / Palmistry) : یعنی ریت اور زمین میں نقوش پا کی پہچان کرکے آنے جانے والوں کا پتہ کرنا۔ جانوروں اور دشمنوں کے نقل وحرکت کا پتہ لگانا۔ اس کی بدوی معاشرہ میں خاص ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے وہ اپنے ان دشمنوں کا پیچھا

کرتے جوان پر حملہ کرتے اوران کے مال اورعورتوں کوان کی غیر موجودگی میں اٹھالے جاتے۔

العیافة: چڑیوں کے حرکات وسکنات سے شگون لینا۔اس کے لیے بنو اسد اور بنولہب بہت مشہور تھے۔اگر چڑیا دائیں سے گزر جائے تو نیک شگون لیتے اور بائیں سے گزرجائے تو بدشگون لیتے ۔ چڑیوں میں خاص طور سے کوے سے زیادہ شگون لیتے ۔

اقوال حکمت اورضرب الأمثال: (کہاوتیں) حکمت سے مراد یہاں فلسفہ نہیں جوکہ اسلامی دور میں رائج ہوا بلکہ وہ مختصر اقوال جو کسی تجربہ کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے جملے کی شکل میں ظاہر ہوتے۔جاحظ کا کہنا ہے کہ قدماء میں جن لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی عظمت، مہارت، فصاحت و بلاغت، حکمت، ذہانت وفطانت کے لیے ان میں لقمان بن عاد، محاشع بن دارم، سلیط بن کعب بن یربوع، لوئی بن غالب، قس بن ساعدہ اورقصی بن کلاب ہیں۔اورزبان آور خطیب اور حکم (فیصلہ کرنے والا) کی حیثیت سے جولوگ مشہور ہوئے ان میں اکثم بن صیفی، ربیعہ بن حذار، ہرم بن قطبہ، عامر بن الظرف اور لبید بن ربیعہ وغیرہ ہیں۔لقمان حکیم کا عربوں میں خاص چرچا تھا اوران کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی حکمت ودانائی کی باتوں کوایک ''مجلۃ'' کی شکل میں کچھ لوگوں نے جمع کیا تھا۔

عربی ادب کی کتابیں ان حکماء کے اقوال سے بھری پڑی ہیں۔ بطور مثال چند اقوال یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔اکثم بن صیفی کا قول ہے ''مقتل الرجل بين فكيه'' (اردو میں کہتے ہیں یہی زبان پان کھلائے اور یہی جوتا)، اسی طرح عامر بن الظرف کا قول ہے ''رب زارع لنفسه حاصد سواه''، اسی طرح طرفہ کا ایک شعر ہے:

أرى العيش كنز أناقصاً كلَّ ليلة	و ماتنقُص الأيام و الدهر ينفذ

(میں دیکھ رہا ہوں کہ زندگی وہ خزانہ ہے جو دن ورات کم ہورہا ہے اورزمانہ بذات خود فنا کی طرف رواں دواں ہے)

اور زہیر بن سلمی کا قول ہے

و مهما تكن عند امرئ من خليقة	و ان خالها تخفى على الناس تعلم

(کسی انسان کے اندر کوئی بھی خو ہو اگر چہ وہ یہی سوچے کہ وہ لوگوں سے پوشیدہ رہے گی لیکن ایک دن ضرور لوگوں کواس کا پتہ چل جائے گا)

اور قس بن ساعدہ

في الذاهبين الأولين	من القرون لنا بصائر
و رأيت قومي نحوها	يسعى الأصاغر و الأكابر
أيقنت أني لا محالة	حيث صار القوم صائر

(پہلے جانے والے لوگوں میں ہمارے لیے عبرت ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری قوم کے سب چھوٹے بڑے دوڑتے ہوئے اس کی طرف (موت) جارہے ہیں۔تو مجھے یقین ہوگیا کہ مجھے بھی لامحالہ وہیں جانا ہے جہاں میری قوم گئی۔)

اُدبی سرمایہ: دور جاہلی میں عربوں کے ادبی سرمایہ کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔اس کے لیے ایک کتاب یا کم ازکم ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔عربوں کے ادبی سرمایہ میں خطبے، وصیتیں، کہاوتیں، نصیحتیں اورسب سے اہم چیز شعروشاعری ہے جس کا لاثانی اور بہت ہے قیمتی سرمایہ ہمیں ملتا ہے۔اس دور کا سب قیمتی سرمایہ المعلقات ہے جو آج تک پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ یہ سات مشہور ترین جاہلی شعرا کے قصائد کا

مجموعہ ہے۔ان کے نام یہ ہیں: امرؤالقیس، زہیر بن ابی سلمی، النابغہ الذبیانی، الأعشی قیس،عنترہ بن شداد،طرفہ بن العبد، اورعمرو بن کلثوم۔

2.4 عربی زبان کا ارتقا

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ ہمیشہ ایک زندہ زبان رہی ہے۔ابتدا میں یہ مختلف لہجات یا بولیوں کی شکل میں رہی۔مختلف علاقوں میں وہاں کی زبانوں کے اثرات بھی اس پر پڑے۔لیکن ان میں سے بیشتر زبانیں وقت گزرنے کے ساتھ ناپید ہوگئیں ۔لیکن عربی زبان ترقی کرتی رہی۔قدیم عربی لہجات / بولیاں جیسے ثمودی ،لحیانی ،صفوی،اورنبطی لہجات / بولیاں دھیرے دھیرے ختم ہوگئیں یا یہ کہیے کہ ان کی جگہ دوسری عربی بولیوں قحطانی یا جنوبی لہجہ اور عدنانی یا شمالی لہجہ نے لے لی۔قحطانی لہجہ یمن میں خوب ترقی کیا یہاں تک کہ وہی مستند زبان سمجھا جانے لگا۔عدنانی لہجہ حجاز میں خوب پھلا پھولا اور پھر سد مآرب کے ٹوٹنے سے یمن میں جو تباہی آئی تو لوگ ادھر ادھر منتشر ہونے پر مجبور ہوئے ۔ بہت سے لوگوں نے حجاز کا رخ کیا اور پھر دونوں لہجات میں کشمکش جاری ہوئی ۔اسی اثناء میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا اور اس طرح حجازی لہجہ دھیرے دھیرے جاری وساری ہوگیا اور یہی فصیح عربی کہلاتا ہے۔

2.4.1 زبانوں کا خاندان:

عام طور سے دنیا کی تمام زبانوں کو دو خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ہند۔آریائی زبان اور حامی ۔سامی زبان پھران دونوں خاندانوں کو ذیلی گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایسا ان زبانوں کے کلمات ،تراکیب اور اسٹرکچر وغیرہ کے درمیان پائی جانے والی قربت اور مشابہت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

ا۔ہند_ آریائی زبان Indo-European Languages: دنیا میں یہ زبانیں سب سے زیادہ رائج ہوئیں۔ یہ زبانیں ہندوستان سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کو آٹھ ذیلی گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس میں سنسکرت ودیگر ہندوستانی زبانیں۔ اطالوی ، یونانی ، اور جرمن وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔اس زبان کا وطن اصلی نامعلوم ہے۔ کچھ ترکستان کو اس کا اصل وطن قرار دیتے ہیں تو کچھ لوگ مشرقی یورپ اور بحر بالٹک کے علاقہ کو۔

حامی ۔سامی زبان:

اس کو افریقی ایشیائی زبان بھی کہتے ہیں۔اس زبان کا دائرہ کار ہند آریائی زبان کی طرح زیادہ وسیع نہیں ہے۔ یہ زبان عرب، شمالی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے بعض علاقوں میں رائج تھی۔اس کا بھی اصل وطن نامعلوم ہے ۔اس زبان کو دو ذیلی گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، حامی زبان اور سامی زبان۔ حامی زبان میں مصری، بربری اور کوشیتی زبانیں شامل ہیں اور سامی زبانوں میں آشوری، کنعانی، آرامی اور عربی شامل ہیں۔

اصل سامی زبان:

سامی زبانوں کی اصل کیا ہے اس میں علمائے لغت میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔اکثر علمائے آرامی، کنعانی اور عربی زبان میں سے کسی ایک کو اصل قرار دیتے ہیں۔لیکن دلائل وقرائن عربی کے سلسلے میں زیادہ قوی ہیں۔ہم چند لوگوں کی آراء کو یہاں پیش کرتے ہیں:

۱۔ احمد حسن زیات: ان العربیة اقرب المصادر الثلاثة الی اللغة الام، لانها بانعزالها عن العالم سلمت مما اصاب غیرها من التطور والتغیر تبعا لاحوال العمران (حسن زیات: ۱۵) یعنی عربی زبان مادری زبان سے تینوں مصادر میں سب سے قریب ہے۔کیونکہ دوسری زبانیں انسانی آبادی میں گردش زمانہ کے ترقی اور تغیر سے جو تبدیلیاں آئیں انکا شکار ہوگئیں لیکن عربی زبان دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ان سے محفوظ رہی۔

۲۔ حنا فاخوری: والثابت ان بین اللغات السامیة قرابة واضحة وانها جمیعا ولیدة لغة سامیة عامة قد بادت وصار من المتعذر علینا ان نعرف شیئا یذکر منها (حنا فاخوری: ص: ۴۸) یعنی یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ سامی زبانوں میں ایک واضح قربت ہے۔ساری زبانیں (عربی کے علاوہ) مٹ گئیں اور ہمارے لیے ان کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات کہنا مشکل ہوگیا ہے۔

۳۔ واذا نحن اعتبرنا اللغة العربیة وجدناها اکثر اخواتها السامیات مفردات واتمها صیغا واکملها صرفا ونحوا وارقاها بیانا وبلاغة واحسنها اسلوبا۔ من اجل ذلک لانستبعد ان تکون اللغة العربیة هی اللغة السامیة الام الفصحی (عمر فروخ، ص: ۳۶) یعنی جب ہم عربی زبان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ اس میں دیگر سامی زبانوں سے زیادہ مفرد الفاظ، اور مکمل صیغے ہیں، اور وہ صرف ونحو کے اعتبار سے زیادہ مکمل اور زیادہ فصیح وبلیغ ہے اور اسکا اسلوب زیادہ خوبصورت ہے۔اس لیے ہمارے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں کہ عربی زبان ہی اصل مادری فصیح سامی زبان ہے۔

اب یہ بات امر مسلم ہے کہ عربی ایک سامی زبان ہے اور پھر قرین قیاس یہ بھی ٹھہرا کہ عربی ہی سامی زبانوں کی اصل اور مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔اب آیئے عربی لہجات/بولیوں سے فصیح عربی کے سفر کی کہانی پڑھتے ہیں۔

2.4.2 قدیم عربی بولیاں

ماہرین زبان کو عربی کے چار قدیم لہجات کے نقوش ملے ہیں۔ان میں سے تین جنوبی خط مسند میں لکھے ہوئے ہیں اور وہ ہیں ثمودی لہجہ، لحیانی لہجہ اور صفوی لہجہ۔اور ایک آرامی خط میں اور یہ نبطی لہجہ ہے۔

ثمودی لہجہ: قوم ثمود کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔وہ مدائن اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔اسی طرح یہ لہجہ طائف، طور سینا، مصر وغیرہ میں پھیلا ہوا تھا۔یہ تجارتی پیشہ لوگ تھے۔ان کے نقوش چھوٹے ہیں۔اور ان کا خط جنوبی مسند خط سے نکلا ہے۔علامات، حرکات، زیر، زبر پیش اور تشدید وغیرہ سے خالی ہیں۔اور تمام نقوش ضمیر غائب میں ہیں۔وہ بہت سے حروف حذف کر دیتے تھے جیسے ابن سے نون گرادیا، لنا کو 'ل' بنادیا۔اس میں آرامی اور عبرانی آثار بھی مل گئے ہیں۔

اگر چہ یہ نقوش جنوبی خط مسند میں ہیں لیکن یہ شمالی عربوں کے نقوش ہیں۔یہ شمالی عربی زبان ہے چنانچہ ضمائر، اسمائے اشارہ، اسمائے موصولہ، ضمائر اور حروف جر وہی ہیں۔البتہ کسی اسم کو معرفہ بنانے کے لیے ال کے بجائے ھا کا استعمال کرتے تھے جیسے الکتاب ھلکتاب۔اسی طرح ثمودیوں اور لحیانیوں فعل ثلاثی سے فعل متعدی بناتے وقت 'ال' استعمال کرنے کا بجائے 'ھا' کا استعمال کرتے تھے مثلاً اکرم اور افلس کو ھکرم اور ھفلس لکھتے تھے۔اس سلسلے میں ان کی مثال عبرانیوں اور سبئیوں جیسی ہے۔

لحیانی لہجہ: اس لہجہ کی نسبت بنولحیان کی طرف ہے جو کثرت سے ان کے نقوش میں ملتا ہے۔سامی زبانوں کے ماہرین کو ان کے

نقوش حجاز کے شمال میں جو اس وقت العلا کے نام سے جانا جاتا ہے، ملے ہیں۔ان کے نقوش میں بھی وہی ساری مشکلات ہیں جو کہ ثمودیوں کے نقوش میں ہیں۔ مثلا حرکات، اعراب، حروف علت، تشدید وغیرہ کی علامتیں نہ ہونا وغیرہ۔ یہ لوگ معرفہ بنانے کے لیے ال اور ھا دونوں کا استعمال کرتے تھے جیسے ثمودیوں کے یہاں رائج تھا۔ اور کبھی کبھی دونوں کو یکجا کر دیتے مثال کے طور پر الحمی کو ھلحمی لکھتے۔ اسی طرح افعال کے صیغوں میں ھفعل اور سفعل لکھتے اور فعل ماضی میں تائے تانیث بڑھا دیتے۔ اسی طرح اسمائے اشارہ ذا، ذہ، اور ذات استعمال کرتے تھے۔ ان کے یہاں اسمائے موصولہ من، ما اور ذو تھے جیسا کہ قبیلہ طیء میں رائج تھا۔ ان کے دیوی دیوتاؤں میں بعل، عزی، مناۃ، ود وغیرہ کے نام کثرت سے ملتے ہیں۔ اور اپنی کنیت اور نسبت کا اظہار اسی طرح کرتے تھے جیسا کہ فصیح عربی میں رائج ہے۔

صفوی لہجہ: اس لہجہ کی نسبت جبل صفاۃ کی طرف ہے جو کہ مشرقی حوران، بادیۃ الشام میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نقوش نہیں پائے گئے ہیں۔ یہ اس حرہ میں پائے گئے ہیں جو کہ اس کے اور حوران، بادیۃ الشام کے درمیان ہے۔ اس کا خط جنوبی خط مسند سے نکلا ہے جیسا کہ پہلے دونوں لہجات کا معاملہ ہے۔ اس میں جو مشکلات ہیں وہ کثرت مشابہت ہے چنانچہ حرف 'ب' مشابہ 'ظ'، اور 'خ' مشابہ 'ت' اور 'ل' مشابہ 'ن' اور 'ھ' مشابہ 'ص' ہے۔ اور لکھنے والا کبھی دائیں سے بائیں سے لکھنا شروع کرتا اور کبھی اس کے برعکس وہ بائیں سے دائیں لکھتا۔

معرفہ بنانے کے لیے وہ 'ھا' کا استعمال کرتے ہیں، ایسے بہت ہی کم اسماء ملے ہیں جو 'ال' سے معرفہ ہوں۔ یہ صفت کی طرف موصوف کو مضاف کرتے تھے جیسے وہ الجبل الاحمر کہنے کے بجائے جبل الاحمر کہتے۔ اسی طرح اسم اشارہ، مشار الیہ کے بعد لاتے، اس سے پہلے نہیں لاتے جیسے ھذا الکتاب کے بجائے الکتاب ھذا، چنانچہ وہ لکھتے "جو، ذا" ای ھذا الوادی جیسے مصری عامیہ (دیہاتی) "النھار دا" بولتے ہیں بجائے ھذا النھار کے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ قبیلۂ طیء کی طرح ذو کا استعمال بطور اسم موصول کرتے، اس کی مشہور مثال ہے "بئری ذو حفرت و ذو طویت" ای الذی حفرت والذی طویت۔

نبطی لہجہ: یہ لہجہ بلاد شام میں رائج تھا۔ یہ دراصل آرامی زبان سے آیا۔ اسی طرح نبطی خط جو بعد میں عربی خط کے لیے بنیاد بنا، آرامی خط سے آیا۔ اس میں اور دیگر قدیم عربی لہجات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس لہجہ میں حرف 'ز' کو 'س' سے بدل دیتے تھے جیسے زورق کو سورق لکھتے۔ اسی طرح عین کو ھمزہ میں اور کسرہ جہاں ہو اس کو فتحہ میں بدل دیتے۔ 'ز، ر، و،' کو الگ الگ لکھتے یعنی بائیں طرف کسی حرف سے ملا کر نہیں لکھتے جیسا کہ آج بھی لکھا جاتا ہے۔ نبطی میں آسان افعال استعمال کرتے جیسے 'ع، ب، د' بمعنی 'عمل' (کام کرنا) یا فعل مضارع ی ک ت ب بمعنی یکتب (وہ لکھتا ہے) وغیرہ۔

2.4.3 قحطانی اور عدنانی عربی:

سامی زبانوں کو مشرقی و مغربی زبان میں تقسیم کیا جاتا ہے مشرقی زبان میں اکادی زبانیں جیسے بابلی، آشوری زبانیں شامل ہیں۔ مغربی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مغربی شمالی اور مغربی جنوبی۔ مغربی شمالی میں کنعانی و آرامی زبانیں ہیں۔ کنعانی زبان کئی زبانوں اور فینیقی لہجات کا مجموعہ ہے جو لبنان کے ساحلی علاقوں میں پائی جاتی تھی۔ کنعانی زبان کو اوجریتی، کنعانی قدیم، مؤابی، عبری قدیم اور فینیقی زبانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مغربی جنوبی زبانوں کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ شمالی عربی زبان جس کو حمیری زبان بھی کہتے ہیں اور جنوبی عربی زبان جو

جزیرۂ عرب کے علاقہ یمن، عمان اور افریقہ کے بعض ساحلی علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ جنوبی عربی کو قحطان کی طرف نسبت کر کے قحطانی زبان بھی کہاجاتا ہے اور شمالی زبان کو عدنان کی طرف نسبت کر کے عدنانی زبان کہاجاتا ہے۔ جنوبی زبان اشتقاق، تصریف، اعراب اور ضمائر وغیرہ میں شمالی زبانوں سے مختلف ہے۔ اسی لیے ابوعمرو بن العلاء کہتا ہے: 'ما لسان حمير بلساننا ولا لغتهم بلغتنا'' یعنی حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور نہ ہی انکا لہجہ ہمارا لہجہ ہے''۔

جنوبی عربی میں معینی، سبئی، حضرمی، قتبانی، اور حبشی زبانیں شامل ہیں جبکہ شمالی عربی میں لحیانی، ثمودی، صفدی اور فصیح عربی زبانیں شامل ہیں۔ جنوبی عربی پر اکادی زبانوں کا اور شمالی عربی پر عبری و نبطی کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔

یمن میں سد اِرم کے ٹوٹنے کے بعد جنوبی عرب کے قبائل نے شمال کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیا اور انہوں نے جلد ہی شمال میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس طرح شمال وجنوب کے درمیان تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ جس سے شمالی عربی اور جنوبی عربی کو قریب آنے کا موقع ملا، الفاظ، جملے، لہجے اور اسالیب میں قربت پیدا ہونے لگی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ان میں سے کوئی زبان بھی دوسری زبان پر غالب نہ آسکی غالبا اس کی وجہ یہ تھی کہ جنوبی زبان کو بولنے والے لوگ سیاسی ومعاشی اعتبار سے بہت طاقتور تھے تو دوسری طرف شمالی زبان بولنے والے لوگ بدویانہ زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جلد ہی گردش ایام نے حالات کو بدل دیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جنوبی عرب کے قبائل سے اقتدار وثروت کی ڈور پھسل گئی اور شمالی قبائل طاقت ور ہو گئے اور سیاسی ولغوی اعتبار سے ان پر غالب آ گئے۔ حسن زیات شمالی عربی کا جنوبی عربی پر غالب آنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اخذت دولة الحميرين تدول وسلطانهم يزول بتغلب الاحباش على اليمن طورا وتسلط الفرس عليه طورا آخر۔ وكان العدنانيون على نقيض هؤلاء تتهيأ لهم أسباب النهضة والألفة والوحدة والاستقلال بفضل الأسواق والحج، ومنافستهم للحميريين والفرس، واختلاطهم بالروم والحبشة من طريق الحرب والتجارة ففرضوا لغتهم وأدبهم على حمير الذليلة المغلوبة۔ ثم جاء الاسلام فساعد العوامل المتقدمة على محو اللهجات الجنوبية وذهاب القومية اليمنية، فاندثرت لغة حمير وآدابهم واخبارهم حتى اليوم''۔ (حسن زیات: ۱۵) یعنی حمیر یوں کی حکومت ڈانواڈول ہو گئی اور ان کی سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ کبھی حبشیوں کے ان پر غلبہ کی وجہ سے اور کبھی فارسیوں (ایرانیوں) کے ۔ ان کے برعکس عدنانیوں کے اٹھان، ان میں یگانگت، اتحاد اور خود اختیاری کے اسباب مہیا ہوتے رہے۔ بازاروں اور حج، اور ان کی ایرانیوں اور حمیر یوں سے مقابلہ آرا، اسی طرح رومیوں اور حبشیوں سے جنگ اور تجارت کی وجہ سے اختلاط بڑھا تو انہوں نے حمیر یوں جو اس وقت مغلوب اور کمزور ہو چکے تھے پر اپنی زبان اور ادب تھوپ دیا رمسلط کر دیا۔ پھر اسلام کی آمد نے مذکورہ عوامل کو اور مہمیز دی جس سے جنوبی لہجات ختم ہونے لگے اور یمنی قومیت بھی مٹنے لگی۔ اس طرح حمیر یوں کی زبان اور ان کا ادب اور ان کے قصے سب فنا ہوتے گئے۔''

جنوبی عربی پر غلبہ کے ساتھ ساتھ قدرت نے شمالی عربی کو کئی سارے عوامل مہیا کیے جس نے اس زبان کو مزید صیقل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ تین اہم عوامل نے شمالی یا عدنانی عربی کے غلبہ کی راہ میں بنیادی کردار ادا کیا۔

عرب کے بازار: پورے عرب میں سال کے مختلف موسم میں کچھ متعین دنوں میں بازار لگتے۔ اس میں مختلف قبائل جمع ہوتے اور خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ لسانی تبادلے بھی کرتے۔ ان میں تین بازاروں کا خاص ذکر ملتا ہے: عکاظ، مجنہ اور ذو المجاز۔ عکاظ میں تو سارے عرب سے لوگ جمع ہوتے اور یہاں سالانہ میلہ لگتا جس میں ایک شعری محفل منعقد ہوتی اور شعرا میں سے ایک معمر، قابل ثقہ اور زبان وشعر میں مہارت رکھنے والے شاعر کو حکم رنج بنایا جاتا۔ وہ سب کے قصائد سننے کے بعد کسی ایک قصیدہ کو سال کا بہترین قصیدہ قرار دیتا پھر اس کی پورے عرب میں شہرت ہوجاتی۔ اس طرح شعروشاعری اور عربی زبان خوب پروان چڑھتی۔

مکہ مکرمہ: یہ سب عربوں کا مشترکہ عبادت خانہ تھا۔ وہ ہر سال حج کے مہینے میں یہاں حج کے لیے آتے۔ عبادت کے ساتھ ساتھ وہ تجارت بھی کرتے اور آپسی جھگڑے اور لڑائیوں کا نپٹارہ بھی کرتے۔ اس میں زبانوں کا تبادلہ وسیع پیمانے پر ہوتا۔

قریش مکہ: مکہ کے قبائل میں سب سے مشہور اور بااثر قبیلہ قریش کا تھا۔ انہوں نے تجارت میں کافی ترقی کی اور عرب کی تجارت پر چھا گئے۔ وہ مشرق میں ایران اور سند کے ساحلوں تک اور مغرب میں شام کی سرحدوں تک تجارت کرتے۔ اس سے ان کے تعلقات عرب کے مختلف علاقوں کے قبائل کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملکوں سے بھی استوار ہوگئے۔

قریش ہی کا قبیلہ خانۂ کعبہ کی دیکھ ریکھ کرتا۔ حاجیوں کو پانی پلانا، ان کے کھانے کا انتظام کرنا اور حج میں ان کی رہنمائی کرنا حتی کہ قبائلی جھگڑوں میں ثالثی اور صلح کراتا۔ اس طرح تجارتی اور دینی سیادت وقیادت نے ان کے زبان وبیان کو قوت اور وسعت بخشی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے لہجے کو قبولیت اور رواج ملا۔

2.4.4 قرآن کریم کا نزول:

جنوبی اور شمالی عربی کے درمیان یہ کشمکش جاری تھی کہ اسی دوران حضرت محمد ﷺ پر قرآن کا نزول شروع ہوا۔ آپ کا تعلق قریش سے تھا۔ قرآن نے قریش کی زبان یا شمالی عربی پر گویا مہر لگا دی پھر اسلام کا اقتدار جس قدر بڑھتا گیا یہ زبان دینِ اسلام اور حکومت وسلطنت کی زبان بنتی گئی اور اختلاف کی صورت میں قرآن کی زبان حکم اور فیصل ہوگئی۔ یہی نہیں بلکہ عربی زبان، مفردات اور مرکبات، عربی صرف ونحو، معانی وبلاغت سب کے لیے سند اور مرجع قرآن کی زبان بن گئی۔ اس طرح سے قرآن نے عربی کے لہجات کو متحد کرنے میں عظیم کردار ادا کیا۔ اور اسے پائیداری، استحکام اور ابدیت عطا کی۔

2.4.5 زبان، لہجہ: تعریف اور فرق

زبان کی تعریف: عربی لفظ لغۃ کے معنی زبان کے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین علمائے لغت نے زبان کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ خلیل بن احمد فراہیدی نے ''کتاب العین'' میں زبان کی تعریف یوں کی ہے ''اختلاف الکلام فی معنی واحد'' یعنی ایک معنی کو مختلف انداز سے ادا کرنا۔ ابن حاجب نے کہا ''حد اللغۃ کل لفظ وضع لمعنی'' یعنی زبان کی تعریف یہ ہے کہ ہر لفظ کو اس معنی میں استعمال کرنا جس کے لیے اس کو وضع کیا گیا ہے''۔ پھر ایک اور ماہر لسانیات ابن جنی نے زبان کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا: '' **حد اللغة أصوات يعبر بها كل قوم عن أغراضهم** '' یعنی زبان کی تعریف یہ ہے کہ یہ ان آوازوں کا نام ہے جن کے ذریعہ ہر قوم اپنے مقاصد بیان کرتی ہے''۔ اس میں ابن جنی نے

تین خاص باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے زبان اصوات یعنی آوازوں کا نام ہے۔ یہ انسانوں کے درمیان اظہار کا وسیلہ وذریعہ ہے، اوراس سے سماجی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اسی چیز کو ابن خلدون نے ذرا اور کھول کر بیان کیا اور زبان کی تعریف یوں کی "اعلم أن اللغة فی المتعارف هی عبارة المتکلم عن مقصوده، وتلک العبارة فعل لسانی ناشئ عن القصد بافادة الکلام، فلابد أن تصیر ملکة متقررة فی العضو الفاعل لها وهو اللسان وهو فی کل أمة بحسب اصطلاحاتهم"۔ زبان نام ہے اس عبارت کا جو متکلم اپنے مقصود کو بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور یہ عبارت عضو زبان سے ارادۃً صادر ہونے والے اس عمل کا نام ہے جس کا مقصد کلام ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عمل کرنے والے عضو میں یہ ملکہ (قوت گویائی) پائی جاتی ہو اوراس کا نام زبان ہے اور یہ ہر قوم میں ان کی اپنی اصطلاح کے مطابق ہوتی ہے"۔

ابن خلدون کی تعریف کے بعد کسی اور نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ مغربی ماہرین زبان میں سے یسبرسن زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے "زبان کو کان اور زبان (عضو) کے ذریعہ دیکھا جاتا ہے نہ کہ آنکھ اور قلم سے"۔

دائرۃ المعارف برطانیہ میں لکھا ہے۔ "زبان صوتی رموز کے نظام کا نام ہے"۔ اسی سے ملتی جلتی تعریف دی ساسور (De Sassure) نے کی ہے "زبان ایک منظم لسانی علامتوں کے مجموعہ کا نام ہے جو ایک خاص ترتیب سے ہوتے ہیں۔ ان کے وضع کرنے کا مقصد باہمی ابلاغ اور افہام وتفہیم ہوتا ہے"۔

اللھجۃ: خلیل بن احمد فراہیدی نے لہجہ کی تعریف یوں کی ہے "اللہجۃ طرف اللسان، ویقال جرس الکلام"۔" لہجہ زبان کے کنارے کو کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لہجہ کلام کی جھنکار کا نام ہے"۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "فصیح اللھجۃ" اس کا لہجہ فصیح ہے۔ اور لہجہ اس زبان کو کہتے ہیں جو انسان کی فطرت میں داخل ہوگئی پھر اس کی عادت بن گئی اور پھر اسی میں وہ نشوونما پایا"۔

عربی لغت میں لہجہ زبان کی ادائیگی کے طریقہ یا بولنے کے طریقہ کا نام ہے یا کلام کی آواز اور اس کی نغمگی کا نام لہجہ ہے۔

جدید ماہرین زبان نے لہجہ کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ دراصل ان صفات یا خصوصیات کا نام ہے جس سے کوئی ماحول (علاقہ) زبان یا بولنے کے طریقے میں دوسرے سے نمایاں وممتاز ہوتا ہے۔ دور جدید کے ایک ماہر لسانیات ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی نے لکھا ہے کہ عربی زبان سارے عرب اقوام کی زبان ہے، لیکن اس زبان کی تطبیق ایک ملک سے دوسرے ملک میں مختلف ہوتی ہے حروف کی آواز، اوران کی صفات مختلف ہوتی ہے تفخیم، ترقیق اور امالہ وغیرہ میں یعنی کسی حرف کو کہیں کھینچ کر بولتے ہیں کہیں ہلکی نرم آواز سے اور کہیں امالہ کرتے ہیں چنانچہ مصریوں کے بولنے کا طریقہ (کیفیت) مغاربہ (عرب افریقی باشندوں)، عراقیوں سے مختلف ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

لہجہ کے یہ معنی قدیم زمانے میں رائج نہیں تھا۔ یہ تو ہر قوم کی زبان کی جھنکار اور اس کی مادری زبان کے طریقۂ استعمال کا نام تھا۔ لیکن عربی کتابوں میں عربی لہجات کے عنوان سے مباحث ضرور ملتے ہیں مثلاً قبیلہ تمیم کا عنعنہ، اور قبیلہ ربیعہ کا کشکشہ وغیرہ۔ انہیں وہ لہجہ کے بجائے زبان کہتے تھے جیسا کہ کتاب العین میں خلیل احمد نے لکھا ہے "الخبع: الخبء فی لغة تمیم یجعلون بدل الھمزة عینا" یعنی خبء کو قبیلہ تمیم کی زبان میں خبع ہمزۃ کے بجائے عین سے بولا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قدیم زمانے میں لغۃ فلان جب بولتے تھے تو اس سے مراد ان کی زبان یا جس کو ہم ان کا لہجہ کہیں مراد ہوتا تھا جیسا کہ ابوعمرو بن العلاء کہتا ہے "ما لسان حمیر بلساننا ولا لغتھم بلغتنا" یعنی حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور نہ ہی انکا لہجہ ہمارا لہجہ ہے"یعنی ہماری زبان اور حمیر کی زبان میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ جبکہ دونوں ہی عربی زبان ہیں بس لہجہ کا فرق

تھا۔بعض حروف کی ادائیگی، بولنے کا طریقہ، کسی حرف کو کسی اور حرف سے بدل کر بولنا۔یہ دراصل مختلف قبائل میں رائج لہجات یعنی بولیاں تھیں۔

دور جدید میں اللھجۃ کے وہی معنی ہیں جو اردو زبان میں لہجہ کے ہیں۔ یہ وہی ہے جس کو انگریزی میں Accent کہتے ہیں جبکہ قدیم زمانے میں یہ بولی کے معنی میں تھا جسے Dialect کہتے ہیں۔ ڈاکٹر مازن مبارک مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق کے بانی ممبر اور ایک ماہر لسانیات نے اپنے ایک خصوصی لیکچر بعنوان الفرق بین اللغة واللهجة میں اللغة، اللهجة والعامية (زبان، لہجہ اور عامیہ) کی بڑی خوبصورت تشریح کی ہے۔ڈاکٹر مازن کہتے ہیں کہ زبان وہ ہے جس سے لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور عامیہ سے بھی لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔تو پھر لہجہ کیا ہے؟ لہجہ صرف اور صرف ایک صوتی صفت ہے۔مثال کے طور پر اگر جاحظ کی کتاب البیان والتبیین کا ایک صفحہ ایک مصری، ایک عراقی، ایک جزائری اور ایک شامی کو دے دیجیے یہ سب فصیح عربی پڑھیں گے۔لیکن ان میں سے ایک الف کو امالہ کے ساتھ، اور دوسرا میم کو مرقق اور تیسرا تفخیم کے ساتھ پڑھے گا۔ایک اور مثال لیجیے ایک المانیا کو بھاری آواز سے، دوسرا المانیا کو باریک آواز سے اور اسی طرح یابان کو، لفظ وہی رہا، معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔صرف اس کو بولنے اور اس کی آواز میں تبدیلی ہوئی۔ چنانچہ لہجات مختلف ہوتے ہیں۔وہ کہتے ہیں "اللھجۃ عبارۃ من مجموع أو مجموعۃ صفات صوتیۃ للغۃ من اللغات فی بیئۃ من البیآت ھذا الذی نسمیہ اللھجۃ" یعنی کسی ماحول میں پائی جانے والی کسی زبان کے کچھ صوتی صفات کے مجموعہ کا نام لہجہ ہے۔ڈاکٹر مازن نے زبان کو ایک زندہ شیء بتایا ہے جس میں وقت اور حالات سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔کل کچھ الفاظ رائج تھے آج ان میں سے کچھ متروک ہو گئے اس کی مثال بالکل انسان کی طرح ہے آج سے کچھ سالوں پہلے ہم ایک الگ طرح کا لباس پہنتے تھے۔وہ کپڑا الگ تھا، اس کا طرز الگ تھا پھر ہم نے ایک دوسرے طرح کے کپڑے پہننے شروع کیے اور آج ہم ایک نئے طرز کا کپڑا پہنتے ہیں لیکن حضرت انسان وہی ہے زبان وہی، کپڑے اس نے بدل لیے۔زبان وہی ہے اس نے کچھ اپنے الفاظ اور کچھ کے معانی میں تبدیلی کر لی لیکن بقیہ سب وہی ہیں مثال کے طور پر امرؤالقیس کے شعر میں استعمال الفاظ

قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل × بسقط اللوی بین الدخول فحومل

اس شعر میں قفا، قف، قفی، قفا، قفوا (ٹھہرو، رکو) آج بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔اسی طرح نبک بکی یبکی بکاء (رونا)، ذکری، ذکر یذکر (یاد کرنا) حبیب حب یحب (پیارا) وغیرہ۔ جہاں تک جگہوں کے نام جیسے سقط اللوی، الدخول اور حومل کا ذکر ہے تو آج ہم اپنے شہر اور ملک کے مختلف جگہوں کے نام نہیں جانتے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے اور یہ بدلتے رہتے ہیں۔

عامیہ: یہ بھی زبان ہے اور اس کا بھی موقع و محل ہے۔ہر جگہ الگ الگ ہے ایک عرب بھی دوسرے جگہ کی عامیہ نہیں بول سکتا ہے، نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ڈاکٹر مازن علم نحو کے ایک بڑے عالم اور ماہر لسانیات ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف ملکوں میں رہا ،مصر، کویت، امارات، سعودی عربیہ وغیرہ وغیرہ لیکن اماراتی جس عامیہ میں بولتا ہے میں نہیں سمجھتا، سوڈانی یا جزائری جس عامیہ میں بولتا ہے میں نہیں سمجھتا۔

عامیہ کو الدارجۃ بھی کہتے ہیں۔یہاں سوال یہ ہے کہ اس کو دیہاتی زبان کہیں یا بولی کہیں۔ یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے یہ روزمرہ کی عوامی زبان ہے اور ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی ہے۔جزائر کی سڑکوں پر بولی جانے والی عامیہ، مصر کی سڑکوں پر نہیں سمجھی جاتی ہے۔ امارات کی گلیوں میں بولی جانے والی عامیہ یمن میں نہیں سمجھی جاتی۔اس کے بالمقابل العربیۃ الفصیحۃ یا الفصحی ہے یعنی فصیح عربی ہے۔ ڈاکٹر

مازن کہتے ہیں فصیح عربی وہی نہیں جو امرؤالقیس، زہیر، اعشی وغیرہ شعرا کے یہاں ہم دیکھتے ہیں۔ فصیح کلام وہ ہے جو عربی حروف سے بنایا گیا ہو، عربی اسلوب پر ہو، اور عربی قواعد کے مطابق ہو، وہ فصیح عربی ہے۔ چنانچہ آج ہم اور آپ جو اخبارات پڑھتے ہیں چاہے مراکش سے شائع ہو رہے ہیں یا سعودی عربیہ سے۔ اسی طرح ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات جو ہم سنتے ہیں وہ سب فصیح عربی ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ زبان ایک منظم کلام کے مجموعہ کا نام ہے جس کا مقصد افہام وتفہیم اور ابلاغ وتبلیغ ہوتا ہے۔ اللھجۃ قدیم زمانے میں زبان کے مترادف کے طور پر بھی بولا جاتا تھا اور بولی dailect کے معنی میں بھی بولا جاتا تھا۔ اس طرح اللھجات العربیۃ القدیمۃ کے معنی قدیم عربی بولیاں ہیں۔ بولی اور زبان کا فرق یہ ہے کہ بولی ایک محدود علاقے میں بولی جاتی ہے، گرامر کی پابندی ضروری نہیں، الفاظ کو بھی کبھی توڑ مروڑ کر بولا جاتا ہے۔ جبکہ زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، گرامر کی پابندی ضروری ہے اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

دور جدید میں لہجہ کا معنی accent کے ہیں۔ یعنی کسی لفظ کے بولنے کا انداز، طریقہ یا اسلوب۔

عامیہ: دیہاتی زبان یا عوامی زبان جس میں کسی قاعدہ وقانون کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ہر علاقے کے لوگ اپنی سہولت کے لحاظ سے اپنی مادری زبان کو جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا لہجہ، اسلوب اور طریقۂ نطق یا ادائیگی بالکل منفرد اور الگ ہوتی ہے۔

2.5 عربی رسم الخط

عربی زبان کی طرح عربی رسم الخط کے آغاز وارتقا کی تاریخ بھی ماضی میں گم ہے۔ حال ہی میں بعض عرب علاقوں کی کھدائی میں کچھ کتبات اور نقوش دستیاب ہوئے ہیں جو تھوڑا بہت نفس مضمون پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کو بنیاد بنا کر محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ موجودہ عربی رسم الخط سے پہلے عربوں میں بنیادی طور پر دو رسم الخط رائج تھے جو امتداد زمانہ کے ساتھ ترقی کر کے موجودہ رسم الخط کی صورت میں نمودار ہوا۔

۱۔ خط مسند معینی، ۲۔ خط آرامی

خط مسند معینی: اس کا تعلق جنوبی عرب سے ہے جو تقریباً ۳۰۰۰ ق م میں جزیرہ پایا جاتا تھا۔ اس کو جزیرہ عرب کا سب سے قدیم رسم الخط مانا جاتا ہے۔ خط مسند معینی سے کچھ ذیلی رسم الخط پیدا ہوئے جیسے خط حمیری (خط سبئی) جو جنوبی عرب میں رائج ہوا اور خط ثمودی، لحیانی اور صفوی خطوط جن کو شمالی عرب کے لوگوں نے اپنایا بیشتر لحیانی کتبات العلا کے مقام پر پائے گئے ہیں جن کا تعلق پہلی صدی عیسوی سے ہے۔ ثمودی کتبات العلا، خیبر، الجوف وغیرہ مقامات پر دریافت ہوئے ہیں اس میں سے ایک کتبہ ۱۰۶ ق م کا ہے۔ صفوی کتبات زیادہ تر جبل صفا کے علاقہ میں پائے گئے ہیں۔ سیاسی اور معاشی اور تہذیبی اعتبار سے جنوبی اقوام شمالی اقوام سے زیادہ طاقتور تھیں۔ اس لیے شمالی عرب کا جنوب سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا چنانچہ ثمودی لحیانی اور صفوی رسم الخط کو شمال میں فروغ حاصل ہوا۔ خط مسند اور اس کے ذیلی خطوط آہستہ آہستہ ختم ہو گئے اور ان کی جگہ آرامی نبطی نے لے لیا۔

خط آرامی۔ نبطی

شمالی عرب میں نبطی قوم جو خالصتاً عرب تھی اور عربی بولتی تھی، آرامیوں کو شکست دے کر ایک عظیم الشان ریاست قائم کر لیا اور الحجر کو

راجدھانی بنایا۔ نبطی قوم سیاسی بالادستی کے باوجود آرامی رسم الخط سے مرعوب ہوکر اس کو اختیار کرلیا اور حسب موقع اس میں حذف واضافہ کرکے اس کو خط آرامی نبطی کی شکل دے دیا۔ اس کو کبھی کبھی خط آرامی اور کبھی خط نبطی بھی کہا جاتا ہے۔ جب رومیوں نے اس سلطنت پر قبضہ کرلیا تو نبطی قوم حجاز و نجد کے علاقہ میں ہجرت کرکے آباد ہوگئی۔ وہ اپنے ساتھ خط نبطی کو بھی لائی تھی جس کو عربوں نے آہستہ آہستہ اختیار کرلیا اور خط مسند معینی اور اس کے ذیلی رسم الخطوط حمیری، ثمودی، لحیانی اور صفوی ماضی کا حصہ بن کر رہ گئے۔ موجودہ عربی رسم الخط اسی خط آرامی نبطی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ چنانچہ شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ جب نبطیوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور وہ نجد وحجاز میں پھیل گئے تو عرب شیوخ اور سرداروں نے نبطیوں کے خط کو اپنالیا اور لحیانی، ثمودی اور صفوی رسم الخط کو ترک کردیا اور جلد ہی یہ آرامی نبطی رسم الخط ترقی کرکے عربی رسم الخط کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں قرآن اور اسلامی مؤلفات لکھے گئے۔ (شوقی ضیف: ۳۴)

سب سے قدیم کتبہ حوران میں نمارہ کے مقام پر امرؤالقیس بن عمرو کی قبر پر پایا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط آرامی نبطی شمالی عربی کے حروف کی شکل میں ڈھلنے لگے تھے اور یہ کتبہ ۳۲۸ عیسوی کا ہے۔ لیکن واضح عربی خط کو سب سے پہلی مرتبہ دو کتبات میں پایا گیا۔ ایک 'زبد' کے کھنڈرات میں اور دوسرا قران اللجا میں۔ پہلا کتبہ میسیحیت سے متعلق سریانی، یونانی اور عربی زبان میں تھا جو ۵۱۳/ ۵۱۲ء کا تھا۔ اس میں آرامی نبطی رسم الخط اور عربی رسم الخط آپس میں مدغم ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرا کتبہ حران اللجا کے کنیسہ کے دروازہ پر پایا گیا تھا جو یونانی اور عربی زبان میں لکھا گیا تھا۔ جو ۵۶۸ء کا تھا۔ یہ دونوں ہی کتبات نقطہ اور اعراب سے خالی تھے۔ (حنا فاخوری: ۳۴)

2.6 اکتسابی نتائج

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے اہم زبان ہے۔ اس کا مسکن جزیرۂ عرب ہے۔ اس زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جب سے وجود میں آئی کبھی مردہ نہیں ہوئی۔ ہمیشہ ایک زندہ زبان رہی۔ آج دنیا کے ۲۲ رملکوں کی سرکاری زبان ہے اور اقوام متحدہ کی چھ دفتری زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے نشوونما کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اس کو جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں جزیرۂ عرب کے قدیم زمانے میں دور جاہلی کے جزیرۂ عرب میں بسنے والی عرب قوم کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔

عرب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عرب کے معنی فصیح اللسان، زبان دان، اور دوسرے معنی صحرا اور ریگستان کے ہیں ہے۔ یہ دونوں ہی درست ہیں کیونکہ عرب اپنے آپ کو دنیا کی ساری قوموں کے بالمقابل زبان داں سمجھتے تھے۔ اور پھر چونکہ عرب کا بیشتر حصہ صحرا اور ریگستان پر مشتمل ہے اس لیے یہ دوسرا معنی بھی صحیح ہے۔

عرب کا جغرافیہ: عرب کو جزیرہ نما عرب کہتے ہیں کیونکہ یہ تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ مغرب میں بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم ہے، مشرق میں بحر ہند، خلیج فارس اور بحر عمان، جنوب میں بحر ہند، شمال کے حدود بہت مختلف ہیں بعض جغرافیہ داں شام تک اس کے حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

قدیم زمانے یا دور جاہلی میں جزیرہ نمائے عرب: حجاز (مکہ، مدینہ (یثرب)، طائف وغیرہ)، نجد، بحرین، یمن، تہامہ، شحر، ظفار، اور حضرموت پر مشتمل تھا۔ لیکن آج کل جزیرۂ عرب کا اطلاق سعودی عرب (حجاز)، یمن، عمان، اردن، متحدہ عرب امارات، کویت،

قطر اور بحرین پر ہوتا ہے۔

عرب دنیا کی آب وہوا گرم وخشک ہے۔ کچھ جگہوں جیسے یمن یا طائف وغیرہ میں قدرے بہتر ہوتی ہے۔

جزیرۂ عرب میں بہت سے پہاڑ اور وادیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں جبال السراۃ، جبال حجاز، حرات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک صحرا اور ریگستان کا تعلق ہے تو ان میں الربع الخالی سب سے بڑا ریگستان ہے۔ پھر النفوذ، الدھناء، بادیۃ الشام وغیرہ آتے ہیں۔

جزیرۂ عرب کی کچھ وادیوں کے نام یہ ہیں: وادی الرمہ، وادی الدواسر، وادی حضرموت، وادی سرحان، وادی نجران، وادی عقیق اور وادی القری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عرب دنیا میں جنگلات تو نہیں پائے جاتے البتہ کھجور کے درخت بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ببول، بیری اور پیلو کے درخت بھی ہوتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں انار، انگور اور سیب وغیرہ کے بھی درخت ہوتے ہیں۔ یہاں کے جانوروں میں اونٹ سب سے عمدہ اور کارآمد جانور ہوتا ہے۔ عربی گھوڑا بھی بہت شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ بکری، ہرن، نیل گائے، خچر، گدھا، شیر، چیتا، لومڑی، بھیڑیا، بندر یا گائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پرندوں میں کبوتر، فاختہ، شکرہ، عقاب، اور کوا وغیرہ جانے جاتے ہیں۔

عرب اقوام کو مورخین نے عرب بائدہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ میں تقسیم کیا ہے۔ یہ اقوام جزیرۂ عرب کے مختلف حصوں میں پھلیں پھولیں۔ کچھ حصوں میں حکومتیں اور بادشاہتیں بھی قائم ہوئیں جیسے یمن میں بہت سی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ اسی طرح سرحدی علاقوں میں مناذرہ اور غساسنہ کی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ عرب کے بیشتر حصوں میں قبائلی زندگی گذارتے تھے۔ حجاز میں بسنے والے زیادہ تر بدویانہ زندگی گذارتے تھے اور یمن میں شہری تھی۔ شمالی عرب میں بسنے والوں کا پیشہ تجارت اور زراعت تھا۔ اسی طرح یمن میں بسنے والوں نے زراعت اور تجارت دونوں میں بہت ترقی کی۔ عربوں میں ایک بڑا طبقہ گلہ بانی پر اپنا گزر بسر کرتا تھا۔ کچھ سیر وشکار بھی کرتے۔ عرب سماج میں عورتوں کو بہت اچھا مقام حاصل تھا۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتیں۔ ان کے یہاں غلاموں اور لونڈیوں کو رکھنے بلکہ تجارت کا بھی رواج تھا۔

عربوں میں تمام ادیان پائے جاتے تھے۔ بت پرستی عام تھی۔ یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے ماننے والے بھی پائے جاتے تھے۔ ایک چھوٹی سی جماعت دین ابراہیمی پر بھی قائم تھی۔

جہاں تک عربوں کے علوم وفنون کا تعلق ہے تو طب، جراحت، بیطری، علم الانساب، عیافہ، قیافہ وغیرہ علوم ومعارف ان کے یہاں پائے جاتے تھے۔ اسی طرح ادب کی دنیا میں شعر وشاعری، خطابت وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خاص طور سے شعر گوئی میں انہوں بڑا کمال حاصل کیا۔ المعلقات السبعۃ دور جاہلی کا شاہ کار مانا جاتا ہے۔

عربی زبان پہلے مختلف لہجات یا بولیوں کی شکل میں پائی جاتی تھی قدیم بولیاں / لہجات یہ تھے ثمودی، لحیانی، صفوی اور نبطی لہجہ۔ یہ بولیاں دھیرے دھیرے ختم ہوتی گئیں آخر میں دو بڑے لہجے / بولیوں نے کافی ترقی کی۔ قحطانی یا جنوبی یا یمنی لہجہ اور دوسرا شمالی یا حجازی یا عدنانی لہجہ۔ سد مآرب کے ٹوٹنے پر یمنیوں کی زندگی میں بڑا انتشار آیا۔ بہت سے لوگ ادھر ادھر نقل مکانی پر مجبور ہوئے پھر ان کی زراعت اور

تجارت بھی تباہ ہوئی۔ اس اثناء میں جن لوگوں نے حجاز کی طرف رخ کیا انہوں نے اپنے لہجہ کو غالب کرنے کی کوشش کی۔ اہل مکہ خاص طور سے تجارت پیشہ لوگ تھے دوسری قوموں سے ان کے روابط تھے۔ پھر سوق عکاظ، ذوالمجنہ اور مکہ مکرمہ یہ سب ان کی تجارت گاہیں تھیں یہاں شعر وشاعری کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ قریش تجارت میں آگے بڑھے۔ اہل عرب کی دینی قیادت کے ساتھ تجارت میں بھی یک گونہ غلبہ حاصل کرلیا۔ شمال وجنوب کے لہجوں میں یہ کشمکش جاری تھی کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور ان پر وحی کے نزول نے شمالی یا عدنانی لہجہ کو غالب کردیا اور اس طرح قریش کے لہجہ میں قرآن کے نزول نے فصیح عربی ایک کردی۔ اب تک عرب دنیا نے کوئی مرتب کتاب نہیں دیکھی تھی انہیں کلام الٰہی ان کی زبان میں مل گیا جو ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ پھر وہ اس پر فریفتہ ہوگئے، اسے حرز جان بنالیا۔ اس طرح قرآن نے عربی زبان کو نہ صرف متحد کردیا بلکہ ایک سند عطا کردی اور اسے تاقیامت کے لیے بقاء کی ضمانت دے دی۔

زبان ایک منظم کلام کا نام ہے جس کا مقصد افہام وتفہیم اور ابلاغ وتبلیغ ہوتا ہے۔ اللھجۃ قدیم زمانے میں زبان کے مترادف کے طور پر بھی بولا جاتا تھا اور بولی dailect کے معنی میں بھی ۔ اس طرح اللھجات العربیۃ القدیمۃ کے معنی قدیم عربی بولیاں ہیں۔

دور جدید میں لہجہ کا معنی accent کے ہیں۔ یعنی کسی لفظ کے بولنے کا انداز، طریقہ یا اسلوب۔

عامیہ: دیہاتی زبان یا عوامی زبان جس میں کسی قاعدہ وقانون کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ہر علاقے کے لوگ اپنی سہولت کے لحاظ سے اپنی مادری زبان کو جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا لہجہ، اسلوب اور طریقۂ نطق یا ادائیگی بالکل منفرد اور الگ ہوتی ہے۔

عربی رسم الخط: مختلف رسم الخط کا مطالعہ کرنے کے بعد مختصرا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خط مسند معینی قدیم رسم الخط ہونے کی وجہ سے دیرپا ثابت نہیں ہوئی کیونکہ جنوبی اقوام شمالی اقوام سے اگرچہ زیادہ طاقتور تھیں لیکن روز زمانہ کے ساتھ ہی ان کے رسم الخط ماضی کا حصہ بن گئے اور اس کی جگہ خط آرامی یا خط نبطی نے لے لی جو بہت زیادہ طاقتور ثابت ہوئی اس نے مختلف علاقوں کو متاثر کیا اور جلد ہی یہ ترقی کرتے کرتے عربی رسم الخط کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اور اسی رسم الخط میں قرآن وحدیث اور دیگر اسلامی عربی تصانیف موجود ہیں۔

2.7 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ دور جاہلی میں عربوں کے سماجی اور دینی حالات کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

۲۔ دور جاہلی میں عربوں کے سیاسی اور معاشی حالات پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

۳۔ قدیم عربی لہجات (بولیوں) کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔

۴۔ زبان، لہجہ، بولی اور عامیہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ واضح لفظوں میں لکھیے۔

۵۔ عربی زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

2.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔ تاریخ الادب العربی، احمد حسن زیات، دار نهضة مصر للطبع والنشر، القاهرة۔ سن طباعت غیر مذکور

۲۔ الجامع فی تاریخ الادب العربی (قدیم ادب)، حنا الفاخوری، دار الجیل بیروت، ۱۹۸۶ء
۳۔ تاریخ الادب العربی، ج ۱، دار العلم للملایین، عمر فروخ، بیروت بار چہارم، ۱۹۸۱ء
۴۔ تاریخ الادب العربی، ج ۱، ڈاکٹر شوقی ضیف، دار المعارف قاهرة، گیارھواں اڈیشن، سن طباعت غیر مذکور
۵۔ موسوعة علوم اللغة العربیة، ج ۷، امیل بدیع یعقوب، دار الکتب العلمیة بیروت، سن طباعت ۲۰۰۶ء
۶۔ عربی ادب کی تاریخ، عبد الحلیم ندوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 3 عہد جاہلی میں عربی ادب: نثر وشعر، اقسام وخصوصیات

اکائی کے اجزا

3.1 مقصد

3.2 جاہلی ادب: شعر

3.2 تمہید

3.3 شعرِ جاہلی کی روایت اور تدوین

3.5 شعرِ جاہلی کی اقسام

3.6 شعرِ جاہلی کے موضوعات

3.6.1 ہجائیہ شاعری

3.6.2 شعر الحماسہ

3.6.3 فخریہ شاعری

3.6.4 مرثیہ گوئی

3.6.5 مدحیہ شاعری

3.6.6 غزلیہ شاعری

3.6.7 وصفیہ شاعری

3.7 شعرِ جاہلی کے خصائص

3.8 جاہلی ادب: نثر

3.8.1 نثر

3.8.2 جاہلی دور میں فنِ قصہ

3.8.3 امثال یا محاورے

3.8.4 خطابت

3.8.4.1 قُس بن ساعدہ الایادی

3.8.4.2 اکثم بن صیفی

3.8.4.3 عمرو بن معدیکرب

3.8.4.4 سجع الکہان

3.9 اکتسابی نتائج

3.10 فرہنگ

3.11 نمونے کے امتحانی سوالات

3.12 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

3.1 مقصد

اس اکائی کا اصل مقصد جاہلی دور میں عربی شاعری اور عربی نثر کی اقسام وموضوعات اور خصوصیات سے طلبہ وطالبات کو متعارف کرانا ہے۔شعر ونثر کی مختلف اصناف میں دور جاہلی میں جو ارتقا ہوا اس کو ادبی نمونوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

3.2 تمہید

کوئی بھی قوم جب تہذیب کی راہ پر گامزن ہوتی ہے تو اس کی فکری، علمی، ثقافتی اور سماجی ترقی کا ایک اہم مظہر اس کی شعروشاعری کی شکل میں سامنے آتا ہے، چنانچہ جب یونانی قوم نے ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو ان کی زبان میں بہترین شاعری نے جنم لیا، چنانچہ شعرا اکثر ہرمحاذ پر اپنی قوم کا دفاع اور اس کی نمائندگی کرتے تھے، ان کے اشعار سے اس عہد کے سماجی وثقافتی حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ہر دور کی شاعری اس دور کی بہترین عکاس ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے دور کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔ سماج میں موجود اچھائیاں اور برائیاں سب ہمیں شاعری میں نظر آتی ہیں۔ جاہلی دور کی جو بھی عربی شاعری ہم تک پہونچی ہے وہ بھی اس دور کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

فن شاعری کا شمار فنونِ لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔عربی میں ان کو ''الفنون الجمیلہ'' کہا جاتا ہے۔ ان میں نقاشی، مصوری، موسیقی، اور شاعری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا اصل مقصد تو حسنِ فطرت کا مختلف طریقوں سے اظہار کرنا ہوتا ہے، لیکن دوسرے بہت سے اغراض ومقاصد کے لیے بھی ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔مشہور عربی اسکالر اور ''تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ'' کے مصنف جرجی زیدان کے مطابق شعر اور نظم میں ایک بنیادی فرق ہے جس کو یہاں ذکر کردینا بیجا نہ ہوگا۔ ان کے مطابق نظم وہ کلام ہے جس میں وزن اور قافیہ کا پورا اہتمام کیا جانا چاہیے اس کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو، جبکہ شعر وہ کلام ہے جس میں احساسات وجذبات کا اظہار کیا جاتا ہے خواہ اس میں وزن وقافیہ کی پابندی موجود ہو یا نہ ہو۔ لہذا لفظی اعتبار سے نظم کا درجہ بلند ہے جبکہ معنوی اعتبار سے شعر زیادہ اعلیٰ وبرتر ہے۔ البتہ اگر شعر کو وزن وقافیہ کی پابندی کے ساتھ کہا جائے تو یقینا ایسا کلام بے انتہا مؤثر اور دلپزیر ثابت ہوتا ہے۔ جاہلی دور میں عربوں کی شاعری پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں ایسے اشعار زیادہ ملتے ہیں جن میں شاعر کے سچے احساسات وجذبات کا اظہار نظر آتا ہے، جبکہ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں الفاظ کی خوبصورتی وپختگی تو نظر آتی ہے لیکن معانی ومفاہیم کی گہرائی نظر نہیں آتی۔

جاہلی دور کی جو عربی شاعری ہم تک پہونچی ہے وہ یقینا نہایت اعلی معیار کی شاعری ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے ہمیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ عربی شاعری نے اس سے پہلے اپنی نشوونما کے کئی مراحل طے کیے ہونگے تب کہیں جاکر اس اعلی مقام ومرتبہ پر پہونچی ہوگی۔ لیکن عربی شاعری کے ان اولین مراحل کے بارے میں ہمارے پاس کوئی مستند اور اطمینان بخش معلومات نہیں ہے۔ کچھ اشارے اس سے متعلق ضرور ملتے ہیں جن سے برائے نام ہی معلومات مل پاتی ہے، جیسے امرؤالقیس نے اپنے ایک شعر میں ابن خِذام نامی ایک شاعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم دیارِ حبیب پر ایسے ہی آنسو بہاتے ہیں جیسے ہم سے پہلے ابن خذام نے بہائے تھے۔ لیکن یہ اشارے ان مراحل سے پردہ اُٹھانے کے لیے ناکافی ہیں جن سے گزر کر عربی شاعری نے یہ بلند وبالا مقام ومرتبہ حاصل کیا۔ اوزان وقوافی کا اتنا دقیق اور پختہ استعال یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عربی شاعری دورِ جاہلی سے قبل ایک عرصۂ دراز سے اپنا سفر طے کرتے ہوئے اس اعلی مقام تک پہونچی ہوگا۔

ہر قبیلے میں کئی جید شعرا ہوا کرتے تھے، لیکن قبیلہ کے افراد کسی ایک شاعر کو زیادہ اہمیت دے کر اس کو اکثر آگے بڑھا دیا کرتے تھے اور اس کو ''شاعر القبیلہ'' کہا جاتا تھا۔ جب بھی کسی قبیلہ کے شاعر کو بہت زیادہ شہرت اور اہمیت نصیب ہوتی تھی تو اس قبیلہ کے افراد جشن منایا کرتے تھے، بلکہ دوسرے قبائل کے لوگ بھی آ کر انہیں اس بات کی مبارک باد دیا کرتے تھے۔ اکثر شاعر کو ہی قبیلہ کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ اس دور کی شاعری کا ایک خاطر خواہ حصہ ضائع ہوگیا اور ہم تک نہیں پہونچ سکا، لیکن اس کے باوجود جو سرمایہ بھی محفوظ رہا اور ہم تک پہونچا وہ اس دور کی شاعری کے اعلی معیار کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یقیناً اس دور کے لوگ اپنی روزمرہ کی گفتگو کے لیے نثر کا ہی استعمال کرتے ہوں گے، لیکن ادبی اور فنی سطح پر نثر کے مقابلہ میں شعر کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، اور اس کا رواج زیادہ تھا۔ نثر کے مقابلہ میں لوگ اپنے شعرا کے عمدہ اشعار کو لکھ لیا کرتے تھے، اور انہیں حفظ بھی کر لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس عہد کے اشعار بڑی تعداد میں محفوظ رہے جبکہ نثر کا زیادہ تر حصہ ضائع ہوگیا۔ فطری طور بھی انسان شعر کو بآسانی یاد کر لیتا ہے، اور نثر کو حفظ کرنے میں اسے زیادہ وقت لگتا ہے، جس کی وجہ سے وہ شعر کے مقابلے میں نثر کو زیادہ مدت تک محفوظ نہیں رکھ پاتا۔

اگر عربوں کے یہاں مسجع و مقفی شاعری کے آغاز کی بات کریں تو قدیم عربی شاعری میں سب سے پہلے رجز کا وزن وجود میں آیا جس میں ہر شعر کا اپنا ایک الگ قافیہ ہوتا تھا۔ عربوں کا ماننا ہے کہ سب سے پہلے مضر بن نزار نے اس وزن کو استعمال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ رجز کا استعمال عربوں نے سب سے پہلے اپنے اونٹوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے کیا جسے عربی میں حداء کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی مقصد کے تحت اس وزن کو ایجاد بھی کیا گیا ہو۔ رجز کے بھی دو وزن تھے، ایک مشطور جس کا استعمال اونٹ کی ہلکی رفتار کے لیے ہوتا تھا، اور دوسرا منہوک جس کا استعمال اونٹ کو تیز دوڑانے کے لیے ہوا کرتا تھا۔ پھر شعر کے دوسرے اوزان بھی حسب ضرورت ایجاد ہوئے اور حماسہ، فخر، رثا، ہجا اور غزل وغیرہ کے لیے ان کے موضوعات کی مناسبت سے اوزان استعمال کیے گئے۔ البتہ سب سے قدیم عربی وزن رجز ہی مانا جاتا ہے۔ شروع میں شاعر اس میں دو چار اشعار ہی کہا کرتا تھا، بعد میں اس میں طویل قصیدے بھی کہے جانے لگے، بلکہ دیگر اوزان میں بھی شاعر شروع میں ایک وقت میں چند اشعار ہی کہا کرتا تھا، پھر بعد میں طویل قصیدے کہنے کا رواج عام ہوا۔

3.3 شعرِ جاہلی کی روایت اور تدوین

جاہلی دور میں شاعری کی بقا اور حفاظت کی بنیاد روایت پر تھی۔ قدیم یونان میں بھی شعر کی روایت کا رواج قائم تھا۔ ان کے یہاں بھی راویوں کی ایک جماعت اس کام کے لیے خاص تھی اور اشعار کو حفظ کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتی تھی۔ ان کی زبان میں راویوں کو Rhapodist کہا جاتا تھا۔ اہل یونان کی شاعری اور عربوں کی شاعری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یونان میں بعض ایسے شعرا پیدا ہوئے جو اس فن میں بہت ماہر تھے، جبکہ عربوں کے یہاں شاعری بالعموم ان کے مزاج اور ان کی فطرت میں شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عربوں کے یہاں شاعروں کی حیرت انگیز کثرت نظر آتی ہے۔

جاہلی دور کے اشعار میں ہمیں اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ اسی دور میں عربی اشعار کی تدوین وتحریر کا آغاز ہو چکا تھا، حالانکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس عہد کا زیادہ تر ادبی سرمایہ ہم تک حافظہ کی بنیاد پر ہی پہنچا ہے، کیونکہ اس دور کے عربوں میں خواندگی کا رواج بہت

کم تھا اور وہ لوگ اپنے ادبی سرمایہ اور دیگر معلومات کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے حافظہ کا ہی سہارا لیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جاہلی شاعر المرقش ایک بار قید کر لیا گیا تو اس نے اپنا ایک قصیدہ اپنے اونٹ کے کجاوہ پر لکھ دیا۔ اس کے علاوہ اس دور کے بعض اشعار میں شعرا محبوب کے اُجڑے دیار کے باقی ماندہ آثار کو تحریروں اور نقوش سے تشبیہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ المرقش الاکبر اور لبید وغیرہ ہمیں دیارِ حبیب کے کھنڈرات کو پتھر پر نقش کی ہوئی تحریروں سے تشبیہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے نصوص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاہلی دور میں تحریر وتدوین کا رواج تھا، اگرچہ اس کا دائرہ محدود تھا، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی شعرا اپنے اشعار کو قلم بند کیا کرتے تھے۔ اس دور میں جو اشعار یا قصائد تحریر کیے گئے تھے ان میں جو روایتوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس دور کے ادبی سرمایہ کا اصل کا دارومدار راویوں کے قوتِ حافظہ پر تھا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس دور میں کوئی ایسا شعری مجموعہ یا کوئی ایسی کتاب وجود میں نہیں آئی تھی جس میں کسی خاص شاعر کے قصیدے جمع کر دیے گئے ہوں اور بعد کے عہد میں لوگوں نے اس پر اعتماد کر لیا ہو۔

معلقات کے حوالے سے جو یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ یہ لفظ علّق سے ماخوذ ہے، یعنی اس دور کے وہ منتخب قصائد جنہیں لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا گیا تھا، تو بہت سے محققین نے اس امر کو محض ایک من گھڑت کہانی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور مصنف ابن النحاس کا یہ قول بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے کہ'' (لم یثبت ما ذکرہ الناس من أنھا کانت معلقۃ علی الکعبۃ)، یعنی لوگ جو یہ بات کہتے ہیں کہ ان قصائد کو خانہ کعبہ پر لٹکا دیا گیا تھا یہ ثابت نہیں ہے۔ جدید دور میں بھی شوقی ضیف وغیرہ نے یہی موقف اختیار کرتے ہوئے اسے محض ایک بے بنیاد کہانی قرار دیا ہے۔

جاہلی دور میں اشعار کی تحریر وتدوین کے حوالے سے ایک اور واقعہ ذکر کیا جاتا ہے جس کو بھی بعض محققین نے بے بنیاد قرار دیا ہے۔ کوفہ کے مشہور راوی حماد الراویہ نے بیان کیا ہے کہ جاہلی دور کے بادشاہ نعمان بن منذر نے اپنے دور تک کے مشہور عرب شعرا کے عمدہ قصائد کو جمع کر کے تحریر کرنے کا حکم دیا، پھر ان تحریروں کو اپنے محل کے نیچے دفن کروا دیا۔ پھر تقریباً ۶۷ھ میں مختار بن ابی عبید کو پتہ چلا کہ نعمان نے جاہلی دور کے قصائد جمع کروا کے اپنے محل کے نیچے دفن کروا دیے تھے تو اس نے محل میں کھدائی کروا کے وہ قصائد اہل کوفہ کے سپرد کر دیے۔ اس واقعہ کی بنیاد پر حماد الراویہ نے جو کہ خود ایک کوفی عالم تھے یہ دعوی کر دیا کہ اسی خزانے کی بدولت اہل کوفہ اہل بصرہ کے مقابلہ میں عربی شاعری کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ حماد الراویہ پر بعد کے ادوار میں محققین نے علمی خیانت کا الزام لگایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی طرف منسوب بہت سی روایتیں قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اسی لیے بہت سے متقدم اور متأخر محققین نے مذکورہ بالا واقعہ کو بھی بے بنیاد اور نا قابل اعتماد قرار دیا ہے۔

دور جاہلی میں شعر کی روایت کا طریقہ ہی زیادہ تر رائج تھا اور اس کے لیے شعرا کا ہی ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو اس اہم فریضہ کو انجام دے رہا تھا، چنانچہ کوئی شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کسی مشہور شاعر کی صحبت اختیار کر لیتا اور اس کے قصائد کو حفظ کر کے انہیں روایت کرنے لگتا، یہاں تک کہ خود اس کے اندر شاعری کا ملکہ پروان چڑھنے لگتا۔ ابو الفرج الاصفہانی نے اپنی کتاب ''الاغانی'' میں دور جاہلی کے ان شعرا کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مثال کے طور پر اوس بن حجر التمیمی کے اشعار کو زہیر بن ابی سُلمی نے روایت کیا تو زہیر کے قصائد کو حُطیئہ اور زہیر کے صاحب زادے کعب نے روایت کیا، پھر حطیئہ کے قصائد کو ھُدبہ بن خشرم العُذری نے روایت کیا، پھر

هُد بہ کے قصائد کو جمیل نے روایت کیا اور جمیل کے اشعار کو کثیر عزہ نے روایت کیا۔ بلکہ شاعر کے اپنے اشعار کے علاوہ اس کے پاس سابق شعرا کے جو بھی اشعار ہوتے تھے، اور راوی ان سب کو حفظ کر لیا کرتا تھا اور پھر اگلے راوی تک پہنچا دیتا تھا۔

راویوں کی یہ جماعتیں اکثر قبیلوں کے دائروں میں سمٹی ہوتی تھیں یعنی ایک قبیلہ کے شعرا کے راوی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے ہر قبیلہ سے تعلق رکھنے والے شعرا کے اسلوبِ بیان اور موضوعات میں بھی کافی مماثلت پائی جاتی تھی۔ البتہ اس میں قبیلہ کے دیگر اہل ذوق حضرات بھی حصہ لیتے تھے، کیونکہ ان قصائد میں اکثر ان قبیلوں کے کارناموں، فخر ومباہات اور ان کی شان وشوکت کو نمایاں کیا جاتا تھا اور حریفوں پر کیچڑ اُچھالی جاتی تھی، اور اس میں کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں ہے، کیونکہ شعر وشاعری میں عرب قوم کو جس قدر شغف اور دلچسپی تھی اتنی انہیں کسی بھی دوسرے علم یا فن میں نہیں تھی۔

جاہلی دور کے اشعار کی روایت کا جو سلسلہ خود جاہلی دور میں شروع ہوا تھا اور اسلامی دور میں جاری رہا عصر عباسی آتے آتے وہ سلسلہ اپنے عروج کو پہونچ گیا اور ابوعمرو بن العلاء اور المفضل الضّبی جیسے عظیم راویوں نے بہت ہی اہم کردار ادا کیا اور جاہلی دور کے اشعار کی تدوین میں ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ نُحاۃ اور مفسرین کو بھی جاہلی دور کے اشعار کی ضرورت استشہاد کے لیے پڑتی تھی، چنانچہ اس دور میں جاہلی اشعار کی روایت اور اس کے مقاصد میں مزید توسیع واقع ہوئی۔ عصر عباسی میں ان راویوں کے دو اہم مراکز سامنے آئے ایک کوفہ اور دوسرا بصرہ، ان میں کوفہ کے مقابلہ میں بصرہ کے راویوں کو زیادہ قابل اعتماد اور مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ عصرِ عباسی کے مشہور راویوں میں سے بعض تو ثقات میں شمار کیے جاتے ہیں جیسے ابوعمر وبن العلاء، المفضل الضبی اور الاصمعی وغیرہ، جبکہ بعض کے اوپر وضع واختلاق کا الزام بھی لگا ہے جیسے حماد الراویہ اور خلف الاحمر۔ راویوں کی توثیق وتضعیف کا یہ سلسلہ بھی دراصل اسی دور میں شروع ہو چکا تھا، جبکہ دور جدید میں بھی بعض مستشرقین اور بعض عرب ناقدین نے اسے اپنا موضوع بحث بنایا، اور ان میں سے بعض نے تو عہد جاہلی کے زیادہ تر شعری سرمایہ کو شک کے دائرہ میں لاکھڑا کیا۔ جدید دور میں مصری ناقد طٰہٰ حسین کا نام اس حوالے سے خاص طور سے قابل ذکر ہے جنہوں نے عہد جاہلی کی شاعری کو بالعموم مشکوک قرار دیا۔ حالانکہ المفضل الضبی اور الاصمعی جیسے فاضل اور مستند راویوں کی روایت پر شک کرنا علمی وتحقیقی اعتبار سے قطعاً جائز نہیں ہے۔ محمد بن سلام الجمحی جیسے عظیم القدر اسکالرز نے بھی جاہلی شاعری کے تئیں یہی معتدل موقف اختیار کیا ہے کہ ان جلیل القدر راویوں کی روایت پر شک کرنا مناسب نہیں ہے۔ جدید دور میں بھی شوقی ضیف اور عرب ناقدین ومحققین کی ایک بڑی تعداد نے یہی معتدل موقف اختیار کیا ہے۔

جاہلی دور کے بعد اور خاص طور سے دوسری ہجری شروع میں جو عربی اشعار وضع کیے گئے اور جاہلی شعرا کی طرف منسوب کر دیے گئے اسے ''قضیة الانتحال'' کہا جاتا ہے۔ بہت سے واضعین نے تو خود ہی اس امر کا اعتراف بھی کیا، جبکہ بہت سے واضعین کی قلعی ان کے اپنے دور میں یا بعد کے ادوار میں کھل گئی۔ جن راویوں پر واضع وانتحال کا الزام لگا ہے بلکہ ثابت بھی ہوا ہے ان میں حماد الراویہ اور خلف الاحمر جیسے رواۃ کے نام سرفہرست ہیں۔ لیکن شروع دور سے ہی اسکالرز کی ایک ایسی جماعت موجود رہی جس نے پوری تدقیق وتوثیق کے بعد اس قسم کے اشعار کی نشاندہی کی ان میں محمد بن سلام الجمحی، الاصمعی، اور المفضل الضبی وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اس ضمن میں محمد بن سلام الجمحی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جنھوں نے اپنی مایہ ناز ومشہور کتاب ''طبقات فحول الشعراء ''میں اس امر کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ اور اپنی کتاب میں وضع وانتحال کے دو بنیادی اسباب بتائے ہیں، ایک قبائلی فخر ومباہات اور دوسرا شعار وضع کرنے والے راویوں کی ایک جماعت جس نے یہ' کارنامہ' انجام دیا۔ بعض قبائل کو جب اپنے شعری سرمایہ میں کمی محسوس ہوئی تو اس کے بعض شعرا نے یہ کوشش کی کہ کچھ اشعار وضع کرکے جاہلی شعرا کی طرف منسوب کردیے جائیں تاکہ اس کمی کو دور کرلیا جائے۔ کچھ اصحابِ سیَر جیسے محمد ابن اسحاق وغیرہ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ انہوں نے پنی کتابوں میں بنا تحقیق کیے اس قسم کے من گھڑت اشعار شامل کیے ہیں۔

اس حوالے سے جدید دور میں مستشرقین نے کافی دلچسپی دکھائی اور اسے اپنا موضوع بحث بنایا۔ نولدکہ نامی مستشرق نے ۱۸۶۴ء میں یہ موضوع اٹھایا، جب کہ آلورد نامی مستشرق نے ٦ جاہلی شعرا کے دواوین کو نشر کیا، اور جاہلی دور کے اشعار پر بالعموم شک ظاہر کیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جاہلی اشعار کی بہت ہی قلیل تعداد قابل اطمینان ہے۔ بعد میں بروکلمان اور مرگلیوٹ وغیرہ نے بھی اس فکر کی علمبرداری کی۔ ان سب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جاہلی دور کی شاعری کا زیادہ تر حصہ بعد کے ادوار میں وضع کیا گیا ہے، اور جاہلی شعرا کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔ ان مستشرقین اور ان سے متاثر ہوکر بعض عرب مؤرخین وناقدین نے اپنی رائے کی تائید میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں، لیکن بہت سے عرب اسکالرز نے اور خود بعض مستشرقین نے ان دلیلوں کو غلط ثابت کیا ہے۔

جن عرب مؤرخین اور اسکالرز نے اس موضوع میں خاص دلچسپی دکھائی ان میں مصطفی صادق الرافعی بھی ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ''تاریخ آداب العرب'' میں شعر جاہلی میں انتحال کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اسی طرح طٰہ حسین نے اپنی کتاب ''فی الادب الجاہلی'' میں یہ موضوع اٹھایا ہے اور انہیں اپنے مذہبِ تشکیک کی وجہ سے بہت تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔

3.5 شعرِ جاہلی کی اقسام

دنیا کی دوسری قدیم تہذیبوں میں ہمیں شاعری کی مختلف اقسام نظر آتی ہیں، جن میں چار قسموں کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے: رزمیہ شاعری، تمثیلیہ شاعری، طربیہ شاعری اور تعلیمی شاعری۔ ان تینوں قسموں میں رزمیہ شاعری یا 'الشعر القصصی' سب سے قدیم ہے۔ رزمیہ شاعری میں مختلف واقعات وحوادث کو شعر کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا رواج قدیم یونانی اور ہندوستانی ادب میں بہت تھا، اور اس عہد کے کئی بہترین نمونے ہم تک پہونچے ہیں۔ اس قسم کے قصیدے بہت طویل ہوا کرتے تھے اور ہزاروں اشعار پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں شاعر اپنی قوم کی تاریخ اور اپنے جانبازوں کے قصے بیان کرتے تھا۔ رزمیہ شاعری میں مذہب بھی ایک اہم موضوع ہوا کرتا تھا۔ دیوی دیوتاؤں کو ان میں اہم کرداروں کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قدیم یونانی ادب میں ہومیروس کی اِلیاذہ اور قدیم ہندوستانی ادب میں مہابھارت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ قدیم عبرانی تہذیب کی بھی ہمیں اس کے کچھ نمونے مل جاتے ہیں۔ لیکن قدیم عربی شاعری میں ہمیں اس قسم کی شاعری نہیں ملتی۔ البتہ یہ امکان ضرور ہے کہ عربوں نے بھی عہد جاہلی میں لات وعزیٰ اور اپنے دوسرے معبودوں کی شان میں اس قسم کے اشعار کہے ہوں، اور وہ بعد میں ضائع ہوگئے ہوں، بہر حال جس انداز کے شعری قصے ہمیں یونان اور ہندوستان کے قدیم ادبی سرمایہ میں نظر آتے ہیں وہ عربوں کی قدیم شاعری میں ہمیں نظر نہیں آتے۔ دوسری قسم یعنی شعر تعلیمی میں شاعر کسی علم یا کسی فن کے مبادئ یا اصول کو شعر کی شکل

میں بیان کرتا ہے تاکہ طلبہ اور اہل علم اس سے کچھ علمی استفادہ کر سکیں۔ جبکہ تیسری قسم یعنی شعر تمثیلی بھی ہمیں یونان و رومان کی قدیم تہذیبوں میں ملتی ہے۔ شعر تمثیلی جس میں خیر و شر کی کشمکش کو زندہ کرداروں کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے وہ بھی قدیم عربی شاعری میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ عشق و محبت کے مختلف قصے جو قدیم عربی شاعری میں نظر آتے ہیں وہ بھی شعر غنائی یا طربیہ شاعری کی نوعیت کے ہیں نہ کہ شعر تمثیلی کی نوعیت کے۔

شاعری کی یہ تینوں قسمیں عہد جاہلی کی عربی شاعری میں نہیں ملتی ہیں۔ رزمیہ شاعری کی کچھ جھلکیاں ہمیں جاہلی قصائد میں بہت محدود انداز میں نظر آتی ہیں، البتہ یونانی طرز کے شعری قصے اپنے فنی عناصر کے ساتھ ہمیں یہاں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ تعلیمی شاعری اور تمثیلی شاعری سے جاہلی دور کی شاعری بالکل محروم تھی، البتہ شاعری کی قدیم قسموں میں سے وہ قسم جس میں دور جاہلی میں عربی شاعری خوب کہی گئی اور بہت اعلی معیار کی کہی گئی وہ طربیہ شاعری تھی، جس میں شاعر اپنے حالات و واقعات اور احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دکھ درد یا دوسروں کے تئیں اپنے تصورات و خیالات کو بیان کرتا ہے۔ شاعری کی یہ قسم قدیم یونانی ادب میں بھی ہمیں نظر آتی ہے جہاں شاعر مدح، ہجا، غزل اور وصف جیسے اغراض و مقاصد کے لیے شعر کہا کرتا تھا۔ جاہلی دور کی عربی شاعری میں ہمیں شاعری کی یہ قسم پوری طرح سے حاوی نظر آتی ہے، اور اپنے مختلف موضوعات کے ذریعہ شاعری کے بہترین شاہکار پیش کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جاہلی دور کی شاعری کا اصل محور شاعر کی اپنی ذات اور اپنی حیات ہوتی ہے۔ ذاتی واقعات اور اپنے قبیلے یا قوم کے کارنامے جاہلی شاعر کے اہم موضوعات میں شامل ہوتے تھے۔ جاہلی دور کا شاعر اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اسے اپنے اردگرد جو چیزیں نظر آتی ہیں انہیں اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے، اسے جو چرند و پرند اپنے آس پاس دکھائی دیتے ہیں ان کی وصف بیان کرتا ہے اور ان سے تشبیہات اخذ کرتا ہے۔ جاہلی دور کی شاعری قدیم یونانی شاعری کی طرح غنائیت سے پر تھی اور عرب شعرا اسے مختلف مواقع پر آلاتِ موسیقی کے ساتھ گایا بھی کرتے تھے۔

عصر جدید کے ایک مصنف مارون عبود نے شعر جاہلی کو دو قسموں میں بانٹا ہے: ایک قسم وہ جسے شعرا برجستہ کہا کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ جس کے لیے وہ کافی محنت اور مراجعہ کیا کرتے تھے جیسے زہیر بن ابی سلمی کے 'قصائد الحولیات' جن کے بارے میں مشہور ہے کہ زہیر پہلے چار مہینے اسے کہتا تھا اور پھر ان پر غور کرتا تھا، اور پھر چار مہینے تک انہیں لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا، تب کہیں جا کر اس کے یہ قصائد آخری شکل اختیار کرتے تھے۔

جاہلی دور کی عربی شاعری پر طربیہ شاعری یا 'الشعر الغنائی' کا رنگ غالب تھا جس میں شاعر خود اپنے احوال و کوائف کا اظہار کرتا ہے، دوسرے موضوعات پر گفتگو برائے نام ہوتی ہے، اس کا زیادہ تر حصہ اس کی اپنی ذات اور اس کے جذبات تک محدود رہتا ہے۔ جن قصوں کا جاہلی قصائد میں ذکر ہوتا ہے وہ بھی شاعر کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاہلی شاعر اپنے قبیلے کا ذکر بھی کرتا ہے تو وہ بھی خود اپنے آپ پر فخر کرنے کی غرض سے ہی کرتا ہے، گویا کہ اس میں بھی اس کا مقصد خود اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

3.6 شعرِ جاہلی کے موضوعات

مختلف ادوار میں مؤرخین نے عہد جاہلی کے اہم موضوعات پر گفتگو کی ہے، چنانچہ ابوتمام نے جاہلی شاعری کے دس موضوعات ذکر کیے ہیں جن میں حماسہ، مرثیہ، مدح، وصف اور ہجا وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قدامہ بن جعفر نے اپنی کتاب ''نقد الشعر'' میں جاہلی

شاعری کے چھ موضوعات بیان کیے ہیں، اور یہ بتایا ہے کہ ان کا تعلق بنیادی طور پر مدح اور ہجا سے ہے، جبکہ ابن رشیق القیر وانی نے اپنی کتاب ''العمدۃ'' میں جاہلی شاعری کے نو موضوعات ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے بہت سے موضوعات دراصل مستقل موضوعات نہ ہو کر اہم موضوعات کے ہی کسی نہ کسی پہلو پر مشتمل ہیں۔ اس ضمن میں ابو ہلال العسکری نے جو رائے پیش کی ہے وہ کافی حد تک جامع ہے۔ انہوں نے جاہلی شاعری کے پانچ اہم موضوعات گنوائے ہیں: مدح، ہجا، وصف، تشبیہ، اور مرثیہ۔ اور پھر لکھا ہے کہ نابغہ الذبیانی نے اس میں ایک اور موضوع کا اضافہ کر دیا، اور وہ ہے اعتذار ہے۔ اس طرح العسکری کے مطابق جاہلی دور کی شاعری کے چھ اہم موضوعات قرار پائے، ان میں حماسہ کا اور اضافہ کر لیا جائے تو ان موضوعات میں جاہلی دور کی شاعری کے تقریباً سبھی موضوعات شامل ہو جائیں گے۔

3.6.1 ہجائیہ شاعری

ہجو گوئی کو جاہلی شاعری میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس میں شاعر اپنے مخالف کے عیوب و نقائص کو گنواتا ہے، اور اس کے خاندان یا قبیلہ کی کمیوں کو بتاتا ہے، چنانچہ اس دور کی ہجو گوئی شخصی سطح پر بھی ہوتی تھی اور قبائلی سطح پر بھی ہوتی تھی۔ جاہلی دور میں میدانِ جنگ ہمیشہ تیار رہتا تھا اور مختلف قبائل میں جنگوں کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا۔ لیکن ایک اور جنگ تھی ہجائیہ شاعری کی جو ان کے درمیان ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ اگر کوئی کسی شاعر یا اس کے قبیلہ کے خلاف کوئی ظلم کرتا یا اس پر کیچڑ اُچھالتا تو وہ شاعر بھی اپنی ہجائیہ شاعری کے ذریعہ اس کا جواب دیتا۔ ہجائیہ شاعری میں شاعر اپنے حریفوں کو ہر طرح کے محاسن سے عاری اور ہر طرح کے عیوب میں مبتلا ثابت کرنے کی کوشش کرتا، بلکہ اپنے حریفوں کو ماضی میں ملی شکستوں کا ذکر کرتا، اور اپنے قبیلے کی کامیابی کی داستان سنا کر اس پر فخر کرتا۔

عصر اموی میں ہجو گوئی کی صنف 'شعر النقائض' کی شکل میں سامنے آئی اور جریر و فرزدق کے بیچ سخت مقابلے ہوئے۔ ہجائیہ شاعری کی بہترین مثالیں ہمیں جاہلی دور کی شاعری میں نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر قبیلہ عبد القیس کے شاعر یزید بن الخذاق نے مملکتِ مناذرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے خلاف ہجائیہ شاعری کرتے ہوئے کہا:

نُعمانُ انک خائنٌ خَدِعٌ   یُخفِی ضمیرُک غیرَ ماتُبدِی

یعنی اے نعمان تم خائن اور دھوکے باز ہو، اور تمہارا ظاہر تمہارے باطن کے خلاف ہے۔ ایسے ہی متلمس اور طرفہ نے عمرو بن ہند کے خلاف ہجائیہ اشعار کہے جو بہت مشہور ہوئے۔ ان کی یہ ہجو اکثر ان کے طویل قصیدوں کی درمیان وارد ہوتی تھی، اور شاذ و نادر ہی مکمل ہجائیہ قصیدہ ہمیں اس دور میں نظر آتے ہیں۔ زہیر بن ابی سلمی نے آل حصن کی ہجو کرتے ہوئے کہا:

وما أدری، ولستُ أخال أدری   أقوم آلُ حِصن أم نساء

یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قبیلہ حصن کے لوگ مرد ہیں یا عورتیں ہیں۔ قریط بن انیف العنبری نے اپنی قوم کی ہجو کرتے ہوئے اور انہیں عار دلاتے ہوئے کہا:

لو کنتُ من مازن لم تَستبِح إبلی   بنو اللقیطة من ذُھل بن شَیبابا

یعنی اگر میں خاندان مازن کا فرد ہوتا تو ذہل بن شیبان کی اولاد میرے اونٹوں کو اتنی آسانی سے نہیں لے جا سکتے تھے۔

لکن قومی وإن کانوا ذَوِی عدد   لیسو من الشرِّ فی شیء وإن ھانا

یعنی میری قوم تعداد میں چاہے جتنی بھی زیادہ ہو، برائی میں نہیں پڑتی، چاہے وہ برائی بہت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

3.6.2 شعرالحماسہ

حماسہ یعنی پرجوش اور حوصلہ افزا قسم کی شاعری جس میں شاعر اپنی قوم کو بہادری و دلیری کا مظاہرہ کرنے پر ابھارتا ہے اور اپنے دشمن کو کانٹے کی ٹکر دینے کے لیے ان کے حوصلوں کو بلند کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کو جاہلی دور کی شاعری کا ایک اہم موضوع مانا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عرب قبائل اکثر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے اور جنگوں کا طویل سلسلہ اکثر جاری رہتا تھا۔ اسی لیے شعرا کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی اور وہ اپنی قوم کے جانبازوں کو مہمیز لگانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

جاہلی شاعری میں حماسہ کے اشعار کی کثرت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ابو تمام نے قدیم عربی اشعار کا انتخاب مرتب کیا تو اس نے اس کا نام ''دیوان الحماسہ'' رکھا۔ اس صنف یعنی اشعار حماسہ میں نہ صرف پرجوش شاعری اور قوم کے جانبازوں کی حوصلہ افزائی کی بات کی جاتی ہے، بلکہ اس میں شاعر اپنی محبوبہ کا بھی ذکر کرتا ہے اور اپنے قبیلے کی خوبیوں کو بھی گنواتا ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنے دشمنوں کو دھمکیاں بھی دیتا ہے اور انتقام لینے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اسی انداز کا درید بن الصمہ کا وہ قصیدہ ہے جس میں اس نے اپنے بھائی عبد اللہ کے قاتلوں سے انتقام لینے کی بات کہی ہے۔ ایسے ہی عمرو بن کلثوم کا وہ بہترین قصیدہ ہے جس میں وہ اپنی قوم کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے اور جنگوں میں اپنے فتح و کامرانی پر فخر کرتا ہے۔ اس قصیدے میں وہ اپنے قبیلہ تغلب کو سب سے اعلیٰ اور سب سے بلند و بالا قبیلہ قرار دیتا ہے، اور یہ اعلان کرتا ہے کہ جو بھی اس کے قبیلہ سے ٹکرانے کی کوشش کرے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا۔

مفضلیات اور اصمعیات میں اس قسم کے بے شمار قصیدے موجود ہیں۔ وہ ان قصیدوں میں اپنے اسلحہ اور اپنے گھوڑوں کی تعریف کرتے ہوئے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اسلحہ کی تعریف اور ان پر فخر کرنے میں اوس بن حجر کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جس نے اپنے طویل قصیدہ لامیہ میں اپنے قبیلے کی خوب تعریف کی ہے۔ گھوڑوں پر فخر اور ان کی تعریف کے سلسلے میں ابوداؤد الایادی، زید الخیل اور عمرو بن معدیکرب کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اس عہد کے مشہور گھڑسوار تھے اور ان کی شاعری میں اس موضوع کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

3.6.3 فخریہ شاعری

عرب قوم مختلف قبائل میں تقسیم تھی اور ہر قبیلہ کے افراد اپنے قبیلہ کے اوپر فخر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ اس فخر و مباہات میں شعرا پیش پیش تھے، بلکہ کچھ شاعرات کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جاہلی دور میں جہاں ایک طرف بہت سی سماجی برائیاں رائج تھیں تو وہیں دوسری طرف عرب قوم میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی اچھی عادتیں بھی موجود تھیں، جیسے سخاوت، وفاداری، مہمان نوازی اور امانت داری وغیرہ۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں نے بھی اپنے قبیلوں کی خوبیوں اور خصلتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں جود وسخا اور مہمان نوازی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چونکہ شراب کا بہت رواج تھا اس لیے مہمانوں کے سامنے شراب حاضر کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس دور کی شاعری میں شراب کا بھی کثرت سے تذکرہ ملتا ہے۔

عمرو بن کلثوم اپنے ایک قصیدہ میں اپنے قبیلے پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وقد علم القبائلُ من مَعَدّ　　　إذا قُبَبٌ بأبطحها بنينا

یعنی معد کے قبیلوں کو یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب ہم اپنے گھران کی زمین پر بنائے۔

بأنا المطعون إذا قدرنا　　　وأنا المهلكون إذا ابتُلينا

یعنی جب ہمیں قدرت حاصل ہوجاتی ہےتو ہم خوب نوازتے ہیں اور جب ہمیں آزمایا جاتا ہےتو ہم ہلاک کردیتے ہیں۔

وأنا المانعون لما أردنا　　　وأنا النازلون بحيث شئنا

یعنی ہم جس چیز کو چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اور جہاں ہمارا جی چاہتا ہے ہم وہیں پڑاؤ ڈالتے ہیں۔

وأنا التاركون إذا سَخطنا　　　وأنا الآخذون إذا رضينا

یعنی جب ہم غصہ کرتے ہیں تو ترک تعلق کردیتے ہیں، اور جب خوش ہوتے ہیں تو دست گیری کرتے ہیں۔

وإنا العاصمون إذا أُطِعنا　　　وإنا العازمون إذا عصينا

یعنی جب ہماری اطاعت کی جاتی ہےتو ہم حفاظت کرتے ہیں، اور جب ہماری نافرمانی کی جاتی ہےتو ہم بدلہ کے کر رہتے ہیں۔

3.6.4 مرثیہ گوئی

عرب قبائل میں آپس میں جنگیں کثرت سے ہوا کرتی تھیں جن میں ہر قبیلہ کے لوگ بڑی تعداد میں ہلاک ہوجاتے تھے اور اہل قبیلہ کی نظر میں بلند مقام حاصل کر لیتے تھے۔ شعرا بھی ان کی شان میں خوب مرثیے پڑھتے تھے اور ان کی دلیری وجانبازی کے گن گاتے تھے اور اپنے اشعار میں ان کا تذکرہ کرکے اپنے جانباز جنگجوؤں کے حوصلے اور بڑھاتے تھے۔ اس دور میں مرثیہ گوئی میں شاعروں کے ساتھ ساتھ شاعرات نے بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مشہور جاہلی شاعرہ خنساء عکاظ کے بازار میں اپنے دونوں بھائیوں صخرا اور معاویہ کی شان میں مرثیہ پڑھتی تھی۔ لویس شیخو نے اپنی کتاب ''مراثی شواعر العرب'' میں ان مرثیہ گو شاعروں اور شاعرات کا تذکرہ بخوبی کیا ہے۔

مرثیہ گوئی کا مطلب ہوتا ہے کہ شاعر کسی گزرے ہوئے شخص کو یاد کرے اور اس کی خوبیوں کو بیان کرے۔ جاہلی شعرا اپنے اہل واقارب کی وفات کے بعد ان کا ذکر اپنے اشعار میں کیا کرتے تھے۔ جاہلی دور میں شاعرات بھی اپنے اقربا کی وفات پر ان کو یاد کرتی تھی اور ان کی صفات کو بیان کرتی تھیں۔

قس بن ساعدہ الایادی نے اپنے دو بھائیوں کی قبر پر کھڑے ہوکر مرثیہ کے یہ اشعار پڑھے:

خليليَّ هُبّا طالما قدرقدتما　　　أجد كما لا تقضيان كَراكما

یعنی میرے دونوں دوستو! اب اٹھ کھڑے ہو، بہت دیر سو لیے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی نیند پوری نہیں کر پاؤ گے۔

ألم تعلما أني بسَمعانَ مفردٌ　　　ومالِيَ فيه من حبيب سِواكما

یعنی کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں دیار سمعان میں میں اکیلا رہ گیا ہوں، اور یہاں تم دونوں کے سوا میرا کوئی دوست نہیں ہے

أقيم على قبرَيكما لستُ بارحاً　　　طَوال الليالي أو يجيب صداكما

یعنی میں تم دونوں کی قبروں پر پوری پوری راتوں پڑا رہوں گا، اور وہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، یہاں تک کہ تمہاری طرف سے مجھے

کوئی جواب نہ مل جائے۔

3.6.5 مدحیہ شاعری

ویسے تو عہد جاہلی کے ہر مرحلے میں ہمیں مدحیہ شاعری نظر آجاتی ہے۔لیکن خاص طور سے اس عہد کے آخری مرحلے میں ہمیں اس کا چلن زیادہ نظر آتا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق کی طرف مناذرہ کی عرب مملکت قائم تھی تو دوسری طرف شمال مغرب میں غساسنہ کی عرب مملکت قائم تھی۔ان دونوں ہی مملکتوں سے کئی بڑے عرب شعرا منسلک تھے اوران کے بادشاہوں کی شان میں مدحیہ قصیدے پڑھا کرتے تھے،اور خوب انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔اس حوالے سے زہیر بن ابی سلمٰی ، نابغہ الذبیانی اور حسان بن ثابت کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

زہیر بن ابی سلمٰی نے اپنی قوم کے سرداروں کی شان میں زیادہ مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔حسان بن ثابت غساسنہ کے دربار سے وابستہ تھے، جبکہ نابغہ شروع میں نعمان بن منذر کی مدح سرائی کیا کرتے تھےلیکن پھر ان کے قبیلے کے کچھ افراد غساسنہ کے ہاتھوں قید کرلیے گئےتو انہوں نے ان کی رہائی کی غرض سے غساسنہ کی مدح سرائی شروع کردی، جس کی وجہ سے نعمان بن منذر اوران کے درمیان رنجش قائم ہوگئی۔ اس رنجش کوختم کرنے کے لیے اور نعمان بن منذر کو راضی کرنے کے لیے نابغہ نے اعتذاریات یعنی معذرت پر مبنی قصائد کہے جو اس قسم کی شاعری کے اس دور کے بہترین نمونے مانے جاتے ہیں۔ایک طرح سے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کے معذرت طلب اشعار نے بھی مدحیہ شاعری کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے، حالانکہ اس قسم کے اشعار کی مقدار بہت محدود ہے۔

اس دور کے شعرا کی قدردانی میں مناذرہ پیش پیش تھے، اس لیے مدحیہ شاعری بھی انہیں کے حق میں زیادہ وجود میں آئی ، اوراس دور کے کئی بڑے شعرا ان کے دربار سے وابستہ رہے جیسے نابغہ، المثقب العبدی، الممزق العبدی، متلمس، طرفہ، المسیب بن علس اور حجر بن خالد وغیرہ۔ اس دور کی مدحیہ شاعری کے حوالے سے اعشیٰ کا نام بھی قابلِ ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس نے اس دور کے بیش تر بادشاہوں کے درباروں میں حاضری دی اوران کی شان میں مدحیہ قصیدے کہہ کرخوب واہ واہی لوٹی۔

جاہلی شاعری میں ہمیں دوطرح کی مدحیہ شاعری نظر آتی ہے؛ ایک تو وہ جس میں شاعرممدوح کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یا اس کی کسی بات سے خوش ہوکر اس کی مدح سرائی کرتا ہے۔اس طرح کی شاعری بادیہ نشین شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتی ہے، جیسے امرؤالقیس اور زہیر وغیرہ۔ جبکہ دوسری قسم وہ ہے جس میں شاعر انعام واکرام حاصل کرنے کی خاطر مدح سرائی کرتا ہے، اس قسم کی مدحیہ شاعری ہمیں درباری شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتا ہے جیسے نابغہ اور اعشیٰ وغیرہ۔

زہیر بن ابی سلمی ہرم بن سنان کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

و أبیضَ فیاض یداہ غمامۃٌ   علی معتفیہ ماتغبُ فواضلُہ

یعنی میرا ممدوح (ہرم بن سنان) پاک بازو سرخرو اور بڑا سخی ہے، اس کے ہاتھ ابر رحمت کی طرح ہیں، اور جولوگ اس کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں ان کی داد و دہش ختم نہیں ہوتی۔

أخي ثقة لا تُهلک الخمرُ مالَه و لکنه قد يهلک المالَ نائلُه

یعنی وہ بھروسے کے لائق ہے اور شراب کی محفلیں اس کے مال کو ختم نہیں کر پاتیں ،لیکن اس کی سخاوت البتہ اس کے مال کو ختم کر سکتی ہے۔

تر اہ إذا ما جئتَہ متھللا کأنک تعطیہ الذی أنت سائلہ

یعنی جب تم اس سے کچھ مانگنے کی غرض سے اس کے پاس آتے ہو تو اسے دیکھو گے کہ وہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ جیسے تم ہی وہ چیز اسے دے رہے ہو جو تم اس سے مانگ رہے ہو۔

3.6.6 غزلیہ شاعری

غزل گوئی بھی اس دور کی شاعری کی ایک اہم صنف تھی۔ جاہلی شاعر اپنی جوانی کے ان خوبصورت لمحوں کو یاد کرتا ہے جو اسے اپنی محبوبہ سے ملاقات کے وقت نصیب ہوتے تھے، وہ دیارِ حبیب سے گزرتا ہے تو ماضی کی ان یادوں میں کھو جاتا ہے اور وہاں بِتائے ہوئے ایک ایک پل کو یاد کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے اور اپنے عشق کی داستان بیان کرتا ہے۔ ویسے تو اس عہد کی قدیم ترین غزلیہ شاعری میں امرؤالقیس کا نام سر فہرست آتا ہے لیکن خود امرؤالقیس نے ایک قدیم شاعر ابن خذام کا نام لے کر یہ کہا ہے کہ ہم بھی اپنے محبوب کی یاد میں ایسے ہی آنسو بہاتے ہیں جیسے ہم سے پہلے ابن خذام نے آنسو بہائے تھے۔

جاہلی شاعر اپنی محبوبہ کی صفات اور خوبیوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے، اس کا حسن و جمال اور اس کے پر کشش جسم کی خوب تعریف کرتا ہے، اس کے جسم کے ہر ہر حصے کو تشبیہات و استعارات کے ذریعہ نہارتا ہے اور تعریف کرتا ہے، چنانچہ وہ اپنی محبوبہ کی پیشانی، اس کے رخسار، اس کی گردن، اس کا سینہ، اس کی آنکھوں، اس کے لب، اس کا آب دہن، اس کی کلائی، اس کی پنڈلی، اس کے بال یہاں تک کہ اس کے پستان تک کی تعریف میں اشعار کہتا ہے۔ ایسے ہی اس کے لباس، اس کے زیورات، اس کی خوشبو وغیرہ کو بھی اپنے اشعار میں ذکر کرتا ہے۔ کئی عشقیہ قصے اس عہد کے ذکر کیے گئے ہیں، مثال کے طور پر المرقش الا کبر اور اسما کی محبت کا قصہ، المرقش الاصغر اور فاطمہ بنت منذر کے پیار کی کہانی اور المنخل الیشکری اور نعمان بن منذر کی بیوی متجر دہ کے پیار کے عشق کے داستان وغیرہ۔ چونکہ ان کی زندگی میں نقل مکانی کثرت سے ہوا کرتی تھی اس لیے محبوبہ اور اس کے قافلے کے کوچ کرنے کا ذکر ہمیں اکثر ان کے قصیدوں میں ملتا ہے۔

امرؤالقیس جسے الملک الضّلیل کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اپنی صحرانوردی کے بعد جب ایک دفعہ اپنی محبوبہ عنیزہ کے پاس رات کی تاریکی میں آیا تو اس نے کہا:

فقالت سباک اللہ انک فاضحی الستَ تری السُمارَ و الناسَ أحوالی

یعنی اللہ تجھے غارت کرے تو نے تو مجھے رسوا کر ڈالا، کیا تجھے دکھائی نہیں دیا کہ یہ لوگ میرے پاس ابھی تک جاگ رہے ہیں، اور گپ شپ میں لگے ہوئے ہیں، تو اس کے جواب میں اس نے عنیزہ سے کہا:

فقلتُ یمینَ اللہ ابرح قاعدا و لو قطّعوا رأسی لدیکِ و أوصالي

یعنی اللہ کی قسم میں یہاں سے نہیں اٹھونگا چاہے وہ لوگ میرا سر اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر تیرے پاس رکھ دیں۔ اعشی نے پیرانہ سالی کے

باوجود عورت کو مسیحا بتاتے ہوئے کہا:

لو أسندت میتا الی نحرھا عاش و لم یُنقل الی قابر

یعنی اگر اس کی گردن سے کسی مردہ کو بھی چھوا دو تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پھر اسے قبرستان لے جانے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔ نابغہ الذبیانی نے اپنی محبوبہ کے محاسن کی وصف تشبیہات واستعارت کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

بیضاءُ کالشمس وافت یوم أسعدِھا لم تؤذ أھلا و لم تُفحش علی جار

یعنی وہ سورج کی شعاووں کی طرح گوری ہے، اپنی مرادوں کے دنوں کو پہونچ چکی ہے، یعنی جوان ہو چوکی ہے، نہ تو اس نے اپنے گھر والوں میں سے کسی کو تکلیف پہنچائی ہے، اور نہ ہی کسی پڑوسی کے ساتھ بدکلامی کی۔

والطیب یزداد طیبا ان یکون بھا فی جِیدِ واضحۃِ الخدین مِعطار

یعنی عطر کی خوشبو اس کی گردن سے لگ کر دوبالا ہو جاتی ہے، ایسی جس میں عطر بیز رخسار لگے ہوئے ہیں۔ جاہلی شاعری میں ہمیں عورتوں سے عشق ومحبت کا اظہار بکثرت نظر آتا ہے۔ اس دور کی غزلیہ شاعری دو قسم کی تھی؛ ایک وہ جس میں شاعر اپنی محبت کا اظہار ذرا پاک وصاف انداز میں کرتا ہے، اور دوسری وہ جس میں شاعر بہت صراحت کے ساتھ اور کھل کر اپنی معشوقہ کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے۔

3.6.7 وصفیہ شاعری

یہ بھی جاہلی دور کی شاعری کا ایک اہم موضوع تھا، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عرب قوم کو اس صنف میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اپنی صحرائی زندگی میں جس چیز پر بھی اس دور کے شعرا کی نظر پڑتی تھی وہ اس کی وصف اپنی شاعری کے ذریعہ ضرور بیان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ریگستان، اونٹ، گھوڑے، اور دیگر صحرائی جانور یہ سب ان کی وصفیہ شاعری کے موضوعات بنے۔ طرفہ نے اپنے معلقہ میں اپنی اونٹنی کی وصف بیان کرنا شروع کی تو اس کا کوئی عضو ایسا نہیں چھوڑا جس کی وصف بیان نہ کی ہو۔ مفضلیات اور اصمعیات میں موجود اس دور کے قصیدے وصفیہ شاعری سے لبریز ہیں۔ شعرا وصفیہ شاعری میں تشبیہات کا بھرپور سہارا لیا کرتے تھے، اور اس میں وہ واقعی بڑے ماہر ہوا کرتے تھے۔ اونٹ کی تشبیہ کبھی مضبوط محلوں سے دیتے تو کبھی عالیشان پہاڑوں سے دیتے تو کبھی سمندری جہازوں سے دیتے۔ ایسے ہی گھوڑوں کی بھی بہترین تشبیہات کے ذریعہ خوب وصف بیان کی گئی ہے۔ اس حوالے سے امرؤالقیس کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ایسے ہی شکاری کتوں اور شیروں کی بھی خوب وصف بیان کی گئی ہے، ابوزبید الطائی نے کتے اور شیر کے درمیان ہوئے مقابلہ کو بھی ایک قصیدہ میں ذکر کیا ہے، جبکہ طفیل الغنوی نے بھیڑ کی وصف اپنے ایک قصیدہ میں بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے جانوروں کا ذکر ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔ پرندوں میں عقاب اور غراب کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ جانوروں سے متعلق عہد جاہلی کی شاعری میں جو قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی من گھڑت ہیں اور اس عہد کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ جانوروں کی وصف کے علاوہ سیلاب، سمندر کی ہولناکی، چراگاہیں، اسلحہ، شراب اور اس کے جام جیسے موضوعات بھی ان کی وصفیہ شاعری کا حصہ بنے۔

امرؤالقیس اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

مُهَفْهَفَةٌ بیضاءُ غیرُ مُفاضَةٍ   ترائبها مصقولةٌ کالسَّجَنْجَلِ

یعنی میری محبوبہ گوری اور پتلی کمر والی ہے، اس کا پیٹ ڈھیلا ڈھالا بدنما نہیں ہے، اور اس کا سینہ آئینہ کی طرح چکنا اور صاف وشفاف ہے۔ و

جِید کجید الرِّیم لیس بفاحشٍ   إذا ھی نَصَّته و لا بمعطَّل

یعنی اس کی گردن سفید ہرنی کی گردن جیسی ہے، جب وہ اپنی گردن کو اٹھاتی ہے تو اس کی لمبائی بدنما نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی وہ زیورات سے خالی نظر آتی ہے۔

و فرعٍ یزین المتنَ أسودَ فاحمٍ   أثیث کقنو النخلة المتعثکل

یعنی میری محبوبہ کی چوٹی کے بال اتنے کالے اور گھنے ہیں کہ پشت کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں، اور اتنے گھنے ہیں جیسے خوشوں سے لدی ہوئی کھجور کے درخت کی کوئی ٹہنی ہو۔ گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے امرؤ القیس کہتا ہے:

مِکر مِفر مُقبل مُدبر معاً   کجُلمود صخر حطهُ السیل مِن عل

یعنی وہ ایک ہی وقت میں جب موقع ملے آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور اتنا تیز رفتار ہے جیسے کوئی پہاڑ کی چٹان ہو جسے تیز سیلاب کی دھار نے اوپر سے نیچے پھینک دیا ہو۔

مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ دور جاہلی کی شاعری میں ہمیں پند ونصائح اور حکمتوں پر مبنی اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس حوالے سے زہیر بن ابی سلمٰی، الافوہ الأودی، اور علقمہ بن عَبَدَہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس عہد کے قصیدوں میں ہمیں مختلف موضوعات اکثر یکجا نظر آجاتے ہیں، یعنی ایک ہی قصیدے میں تشبیب یا دیار حبیب کی یاد میں کہے گئے اشعار بھی ہوتے ہیں، محبت کا قصہ بھی ہوتا ہے، صحراؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے، اونٹ اور گھوڑوں کا وصف بھی ہوتا ہے، اور حماسہ، ہجو، مرثیہ، اور مدح جیسے موضوعات بھی شامل ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ قصیدے کسی خاص موضوع یا صنف پر زیادہ مرکوز ہوتے ہیں، ورنہ زیادہ تر قصیدوں میں مختلف موضوعات اور اصناف موجود ہوتی ہیں۔

اس دور کی شاعری میں ہمیں وصفیہ شاعری کی مندرجہ ذیل انواع بطور خاص نظر آتی ہیں:

وصف الاطلال: اس میں شاعر اپنے محبوب سے ملنے کے لیے آتا تو دیکھتا کہ اس کا قافلہ وہاں سے ہجرت کر چکا ہوتا ہے، تو اس کے باقی بچے آثار پر اشک بہاتا ہے، اور

اپنے محبوب و یاد کرتا ہے اور محبوب سے ملاقات کو شوق ظاہر کرتا ہے۔

وصف الراحلہ: اس میں شاعر اپنی سواری خواہ وہ اونٹ ہو یا گھوڑا ہو اس کی وصف میں اشعار کہتا ہے۔

وصف الصید: اس میں شاعر اپنے شکار کا قصہ بیان کرتا ہے اور شکاری جانوروں کی وصف میں اشعار کہتا ہے، یہ شکار شوقیہ بھی ہوتا تھا اور کسبِ معاش کے لیے بھی ہوتا تھا۔

وصف الطبیعۃ: اس میں شاعر صحراؤں اور پہاڑوں کی وصف بیان کرتا ہے، ایسے ہی وادیوں، ہواؤں اور بارش کا بھی ذکر کرتا ہے۔

3.7 شعرِ جاہلی کے خصائص

جاہلی دور کے عرب جس قسم کی سادہ زندگی گزارتے تھے وہی سادگی ہمیں ان کی شاعری میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ ان کا طرز حیات قیصر و کسری کی زرق و برق اور پر شکوہ تہذیبوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ فطرت کی گود میں جیتے تھے اور نہایت فطری انداز کی سوچ رکھتے تھے، جس میں نہ تو بہت زیادہ نمود و نمائش ہوتی تھی اور نہ ہی بہت زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ جن صحراؤں میں وہ رہتے تھے، جن وادیوں سے وہ گزرتے تھے، جن پہاڑوں کے ذریعہ وہ اپنی حفاظت کرتے تھے، جن جانوروں پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا، ان سب میں ایک طرح کی سادگی پائی جاتی تھی، اور اس سادگی کا پورا عکس ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

جاہلی دور کے عرب نہایت سادہ مزاج اور فطرت سے بہت قریب تھے۔ ان کے یہاں کسی بھی طرح کا تصنع یا تکلف نہیں پایا جاتا تھا، وہ لوگ بہت ہی آزاد خیال تھے اور کسی کے بھی ظلم یا دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا جو بھی احساسات وجذبات ہوتے تھے، انہیں وہ نہایت سادہ طریقے سے بلا واسطہ بیان کر دیتے تھے۔ خود ایک جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمی کے اس شعر سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

و ان أشعر بيت انت قائله　　　　بيتٌ يقال اذا انشدتَه صَدَقا

جاہلی دور کا شاعر جب اپنے عشق کا قصہ بیان کرتا ہے تو پوری حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے جو بھی واقعات ہوتے ہیں یا احساسات ہوتے ہیں انہیں پورے صدق وصفا کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ جاہلی شاعر کی یہ سادہ مزاجی اور فطرت سے ہم آہنگی اس کی شاعری کے ہر موضوع میں ہمیں نظر آتی ہے خواہ وہ عشقیہ شاعری ہو یا مرثیہ گوئی ہو یا ہجائیہ شاعری ہو یا وصفیہ شاعری ہو، مبالغہ آرائی ہمیں برائے نام ہی اس عہد کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں ہمیں تشبیہ، مجاز اور کنایہ جیسی بلاغت کی خوبیاں تو ضرور نظر آئیں گی لیکن انمیں بھی اس انداز کی مبالغہ آرائی نظر نہیں آئے گی جس انداز کی بعد کے ادوار میں اور بطور خاص عصر عباسی میں نظر آتی ہے۔

جاہلی شاعری پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں معانی کی گہرائی اور تنوع اس قدر نظر نہیں آتا جس قدر الفاظ کی خوبصورتی اور انوکھا پن نظر آتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی سوچ نہایت مادّی اور سادہ تھی جبکہ زبان پر قدرت بے پناہ تھی جس کی وجہ سے سادہ و سطحی معانی ومفاہیم کو وہ بہترین سے بہترین الفاظ کا جامہ پہنانا بخوبی جانتے تھے۔ نادر الفاظ کا استعمال بھی رائج تھا لیکن بہت عام نہیں تھا بلکہ معلقات وغیرہ میں ہمیں اس کی کثرت نظر آتی ہے، جبکہ اس عہد کے بہت سے قصائد نہایت سہل اور شستہ لب ولہجہ میں کہے گئے تھے۔

جاہلی اشعار پر معنوی سطحیت اور حسیت اس قدر غالب تھی کہ کسی بھی موضوع پر اس دور کے شعرا شاعری کرتے تو اس میں بہت مماثلت نظر آتی، گویا سب کے سامنے وہی مناظر اور شجر وحجر اور چرند و پرند ہوں اور سب یکساں طور پر ان سے اپنے معانی ومفاہیم اخذ کر رہے ہوں۔ شاعری کی کوئی بھی صنف ہو جاہلی شعرا کے یہاں اس کے معانی وموضوعات میں کافی مشابہت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر طرفہ کا اونٹنی کے وصف میں جو انداز ہے وہی انداز دوسرے شعرا کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ایسے ہی امرؤ القیس نے دیار حبیب پر آنسو بہانے کا جو انداز اختیار کیا ہے وہی انداز دیگر شعرا کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ عمرو بن کلثوم جس لب ولہجہ میں اپنی قوم کے حوصلے بلند کرتا ہے، وہی لب ولہجہ دیگر شعرا کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ الغرض معانی کے اعتبار سے بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہر شاعر کا لب ولہجہ اور اسلوبِ بیان جداگانہ ہوتا

ہےلیکن معانی وموضوعات بالعموم وہی ہوتے ہیں۔ جاہلی شاعر اپنی شاعری میں اپنی بات کوتفصیل سے پیش کرتا ہے بلکہ بسا اوقات سیاق سے بھٹک بھی جاتا ہےاور دوسرے موضوعات میں داخل ہوجاتا ہے،جس کی وجہ سے بات مختصر ہونے کے بجائے اکثر طویل ہوجاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جس طرح اس دور کے عربوں کی زندگی میں ثبات و استقرار کی کمی تھی اور وہ ہمیشہ پا بہ رکاب رہتے تھے، پانی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے، اس کا صاف اثر ان کی شاعری میں بھی نظر آتا۔ ایک صنف یا موضوع پر گفتگو کرتے کرتے اچانک دوسری صنف یا موضوع میں داخل ہو جاتے تھے، اور بار بار موضوع بدلنے کی وجہ سے انکے قصیدوں میں معنی وموضوع کا تسلسل یا ربط اکثر ٹوٹ جاتا تھا۔کم ہی ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک قصیدہ ایک ہی موضوع کے اردگرد گھومتا ہو جسے 'وحدۃ الموضوع' کہتے ہیں۔ بلکہ اس دور کے قصیدوں میں اکثر مختلف موضوعات یکجا نظر آتے ہیں ۔

جاہلی دور کی شاعری میں ہمیں اسلوب نہایت پختہ اور تعبیرات نہایت عمدہ نظر آتی ہیں۔الفاظ اوران کے مدلولات میں حسیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ہر لفظ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بالکل سٹیک اور دقیق نظر آتا ہے۔موضوعات تقریباً ایک جیسے ہوتے تھے،لیکن انہی موضوعات کو ہر شاعر اپنے منفرد اسلوب اورلب ولہجہ میں بیان کرتا تھا جس سے زبان پر ان کی قدرت اور ملکہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شعرا اپنے قصائد لکھنے کے بعدان کا بار بار مراجعہ کرتے تھے۔کچھ شعرا تو ایک ایک سال تک ان پر نظر ثانی کرتے تھےجس کی وجہ سے ان کے قصائد کوحولیات کہا جاتا تھا، جیسے زہیر بن ابی سلمی کے قصائد۔ اس کے پیچھے ان کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ ہر معنی ومفہوم کے لیے بالکل موزوں اور مناسب الفاظ وتعبیرات استعمال کی جائیں ۔ بسا اوقات شاعر اپنا قصیدہ کسی دوسرے شاعر کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کرتا تھااور پھرحسب ضرورت الفاظ وتعبیرات میں ردوبدل کرلیتا تھا۔ یا کبھی کبھی اپنے راویوں کے ذریعہ مراجعہ کروایا کرتا تھا، اوراس میں حسب ضرورت تبدیلی کرلیتا تھا۔اس قدراہتمام صرف اس لیےکیا جاتا تھا تا کہ اسلوب زیادہ سے زیادہ پختہ اورمؤثر ہوسکے۔

جاہلی دور کے عربوں میں سے اکثریت کی زبان دوسری زبانوں کے اثرات سے محفوظ تھی اسی لیے ان کے یہاں عربی زبان کی فصاحت و بلاغت ہمیں پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔شمالی اور جنوب جزیرہ نمائے عرب کے کچھ علاقوں میں ضرور دوسری معاصر تہذیبوں کے اثرات مرتب ہوئے تھےلیکن باقی علاقے ان بیرونی اثرات سے محفوظ تھے،جس کی وجہ سے ان کی زبان بھی بہت صاف وشفاف تھی۔

مجاز اور کنایہ جیسی بلاغت کی انواع واقسام جوعباسی دور میں ہمیں اپنے عروج پرنظر آتی ہیں، جاہلی دور میں بہت کم استعمال ہوتی تھیں ۔ ہاں نادرعربی الفاظ کے استعمال کی وجہ سےلب ولہجہ ذراثقیل اور پیچیدہ ضرورمحسوس ہوتا ہے۔لیکن شایداس کی وجہ یہ ہوکہ یہی الفاظ وتعبیرات اس دور میں رائج تھے، اب ہمارے لیے ان کوسمجھنے میں ذرادقت پیش آتی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جاہلی دور کی تمام شاعری ایسے نادر اورثقیل الفاظ سے پر ہے، بلکہ اس میں بھی ہمیں سہل اور شستہ قسم کے اشعار مل جاتے ہیں، چنانچہ عدی بن زید کے اشعار نہایت سہل اورشستہ ہوتے ہیں، کیونکہ کہ اس کا اس دور کی مختلف تہذیبوں سے رابطہ قائم تھا۔اس دور کے عربوں کی اپنی زبان پر مضبوط پکڑ ہوتی تھی، چنانچہ نحوی وصرفی اعتبار سے کسی طرح کا جھول نہیں ہوتا تھا، ہرلفظ اپنی جگہ پر بالکل باریکی کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔

ان کے اسلوب کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک طرح کی نغمگیت اورموسیقیت پائی جاتی تھی، اس میں ایک طرح کی

سلاست اور روانی پائی جاتی تھی، بے مثال حلاوت اور جاذبیت پائی جاتی تھی۔ اپنے کلام کو مزید اثر انداز بنانے کے لیے وہ مختلف قسم کے محسنات لفظیہ کا بھی استعمال کرتے تھے، بطور خاص تشبیہات و استعارات کا خوب سہارا لیتے تھے۔ طباق اور جناس کا استعمال بھی ہمیں اس دور کی شاعری میں نظر آتا ہے، اگر چہ عباسی دور کے مقابلے میں اس دور میں اس کا استعمال بہت محدود تھا۔

اس دور کی شاعری یقینا اس دور کی بہترین آئینہ دار ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ 'الشعر دیوان العرب'۔ قدیم دور سے ہی عرب مصنفین نے عہد جاہلی کے ماحول اور سماج کے بارے میں گفتگو کرتے وقت اس دور کے اشعار سے پورا استفادہ کیا اور خوب استشہاد کیا۔ جاحظ نے ''کتاب الحیوان'' میں اس دور کے حیوانات کی تفصیل بیان کرنے میں بھی اس دور کے اشعار سے پورا استفادہ کیا ہے۔

3.8 جاہلی ادب : نثر

3.8.1 نثر

ہم اپنے گھروں، بازاروں، دفتروں اور ملنے جلنے کی دوسری جگہوں پر اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان سے جو کچھ بولتے ہیں اسے عام طور سے نثر میں بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان سوچ سمجھ کر، خاص ترتیب سے اور اپنی بات میں موزونیت یا موسیقیت پیدا کر کے دوسروں سے مخاطب نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے خیالات و افکار پیش کرنے میں فنی تسلسل کا خیال رکھتا ہے اور نہ ہی عقلی اور منطقی اصولوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہ ہی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے مطلب کو بیان کرنے کے لیے منتخب اور پیچیدہ الفاظ کو استعمال کرے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر جس ترتیب اور موقع محل کے اعتبار سے جس انداز سے خیالات اس کے ذہن میں آتے جاتے ہیں انہیں بیان کرتا جاتا ہے۔ اس طرز تخاطب یا اس انداز سے اپنے دل کی بات کہنے کو اصطلاح میں ''عام بول چال'' کہتے ہیں۔ کیونکہ عام بول چال میں وہ فنی باریکیاں نہیں ہوتیں جو کسی کلام کو عام سطح سے اٹھا کر اس خاص سطح پر پہنچا دیں جہاں کلام ہماری روزمرہ کی بول چال سے ممتاز ہو کر اس بلند اور اعلی سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں سامع کے گوش و ہوش جھنجھنا اٹھتے ہیں، یا کسی ابدی حقیقت کا اس پر انکشاف ہوتا ہے، یا ایسی پتے کی بات معلوم ہوتی ہے جو عام طور سے روزمرہ کی گفتگو میں نہیں معلوم ہوتی، اسی لیے نثر کی اس قسم کو ادب کا درجہ حاصل نہیں۔ کیونکہ جب کسی کلام میں فنی شرائط مفقود ہوں تو وہ کسی زبان ولغت کا وہ حصہ یا جزء نہیں بن سکتا ہے جسے ''ادب'' کا نام دیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ عصر جاہلی میں فنونِ ادبیہ کے حوالے سے جو اہمیت شعر کو حاصل رہی ہے وہ نثر کو حاصل نہیں رہی، اور اس دور میں شعرا کی اس قدر کثرت تھی کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر شخص فطری طور پر ایک شاعر ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اس دور میں نثری ادب مفقود تھا یا اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اپنی روزمرہ کی زندگی میں وہ لوگ جو اسلوب ایک دوسرے سے گفتگو کے وقت اختیار کرتے تھے وہ یقینا نثری اسلوب ہی ہوا کرتا تھا، لیکن ظاہر سی بات ہے کہ وہ سب نثری ادب کا حصہ نہیں تھا، بلکہ جو بات قصداً ادبی لب ولہجہ اور اسلوب میں کہی جاتی تھی اسی کو اس عہد کے نثری ادب کی حیثیت حاصل ہے، یعنی ایسا کلام جس کے ذریعہ سامع کے دل ودماغ میں اس کے متوقع اثرات مرتب ہوں، اور یہ تبھی ممکن ہے جب صاحبِ کلام اپنے کلام کو کسی خاص مقصد سے ادبی پیرائے میں ڈال کر سامع کے سامنے پیش کرے۔ جاہلی دور میں ہمیں اس طرح کے ادبی نثر کی مختلف اقسام نظر آتی ہیں، جن میں قصے، محاورے، خطبے، اور کاہنوں کی مسجع ومقفی

عبارتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔انہیں اقسام پر مختصر گفتگو یہاں کی جائے گی تا کہ جاہلی دور میں نثری فنون کے ارتقا کا ایک اندازہ ہو سکے۔

یقینا شعر کے مقابلے میں نثر زیادہ قدیم ہے، لیکن جاہلی دور میں نثر کو بحیثیت فن اس قدر استعمال نہیں کیا گیا جس قدر شعر کو استعمال کیا گیا۔ابن رشیق القیر وانی کے مطابق قدیم عربی نثر یعنی دور جاہلی کی نثر کا صرف دس فیصد سرمایہ ہی باقی بچا اور ہم تک پہونچ سکا جبکہ شعر کا زیادہ تر سرمایہ باقی رہا اور ہمیں حاصل ہو گیا، حالانکہ بعض دوسرے مؤرخین کے مطابق قدیم عربی شعر کا بھی زیادہ تر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔

جاہلی دور میں جس طرح شعر کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے کہ چند عمدہ قصیدوں کو لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا جاتا تھا جنہیں معلقات کہا جاتا تھا، نثر کے حوالے سے اس قسم کی تحریروں کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتا۔ حالانکہ خود معلقات کو خانہ کعبہ پر چسپاں کیے جانے کے سلسلے میں محققین و مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔جاہلی دور میں عربی نثر کے تحریری شکل میں استعمال ہونے کے حوالے سے ایک روایت یہ بھی نقل کی جاتی ہے کہ ایک بار سُوید بن صامت حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ آیا تو اللہ کے رسولؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ جواب میں اس نے کہا کہ اس طرح کا کلام تو میرے پاس بھی ہے۔اللہ کے رسولؐ نے پوچھا کیا ہے تمہارے پاس؟ تو اس نے کہا کہ میرے پاس مجلۃ لقمان ہے۔تو اللہ کے رسول نے کہا کہ ذرا اسے پیش کرو۔ جب اللہ کے رسول نے اسے سنا تو کہا کہ یہ ایک اچھا کلام ہے لیکن جو میرے پاس ہے وہ اس سے بھی بہتر کلام ہے، میرے پاس قرآن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر نازل فرمایا ہے، جس میں ہدایت ہے اور نور ہے۔اللہ کے رسولؐ نے اسے قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں اور اسے اسلام کی دعوت دی ،لیکن اس کا جواب بھی یہی تھا کہ یہ کلام بھی اچھا ہے۔الغرض یہ کہ سوید بن صامت کے پاس تحریری شکل میں کچھ عربی کلام تھا جس کا نام اس نے مجلہ لقمان بتایا، اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں بھی عربی نثر محدود پیمانے پر ہی صحیح تحریری شکل میں وجود میں آ چکی تھیں۔

جاہلی دور کی نثر کی توثیق کے بارے میں وہی موقف اختیار کرنا بہتر ہوگا، جو اس دور کی طرف منسوب اشعار کے تئیں اختیار کیا جاتا ہے، یعنی اس دور کا جو بھی نثری سرمایہ ہم تک پہونچا ہے اس کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی اس کی تصدیق و توثیق کی جانی چاہیے، کیونکہ شعر نثر کے مقابلے میں اپنے وزن و قافیہ کی وجہ سے تا دیر حافظہ میں محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

3.8.2 جاہلی دور میں فنِ قصہ

جاہلی دور کے جن چار نثری فنون کا ذکر اوپر آیا ان میں سے ایک فن قصہ ہے۔دور جاہلی کے ان چاروں فنون کے حوالے سے کچھ آثار ہمیں ملے ہیں جن سے اس دور میں ان نثری فنون کے رواج اور ان کے ارتقا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اپنے خالی اوقات میں وقت گزاری کے لیے عرب لوگ قصہ گوئی کا سہارا لیا کرتے تھے۔وہ اکثر رات کے سناٹے میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو قصے سنایا کرتے اور ہمہ تن بگوش ان قصوں کو سنتے۔ وہ قصہ گو یقینا اپنے اسلاف سے ان قصوں کو سن کر انہیں اپنے سامعین کے سامنے پیش کرتے ہونگے، اور ان میں اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر بھی ضرور دکھاتے ہونگے۔

دور جاہلی کے یہ قصے اس دور میں تحریر و تدوین سے ہمکنار نہ ہو سکے، بلکہ یونہی نسل در نسل راویوں کے ذیعہ اپنا سفر طے کرتے رہے، یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری میں کہیں جا کر جب عباسی دور میں تدوینِ علوم کا رواج عام ہوا تب یہ قصے قرطاس وقلم کے سپرد کیے گئے۔

چنانچہ عصر عباسی میں جاہلی دور کے جو قصے مدون کیے گئے ان میں مرورِ ایام کے ساتھ یقینا بہت سی تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہونگی، البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بنیادی خاکہ وہی تھا جو عصر جاہلی میں موجود تھا۔

جاہلی دور کے ان قصوں میں سے زیادہ تر کا تعلق ان کی جنگوں اور ان کے کارناموں سے ہوتا تھا۔ کچھ قصے قدیم عرب مملکتوں جیسے شمالی جزیرہ نمائے عرب میں واقع غساسنہ اور مناذرہ کی مملکتوں یا جنوبی جزیرہ نمائے عرب میں واقع حمیری مملکت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بادشاہوں اور ان کے عروج وزوال کے قصے بیان کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری قوموں کے قصے بھی سنائے جاتے تھے، جیسا کہ نضر بن حارث کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ملک فارس کے قصے عربوں کو سنایا کرتا تھا۔ بہت سے قصوں میں ان کے کاہنوں، شاعروں اور مختلف قبائل کے سرداروں کا ذکر ہوا کرتا تھا، جیسے مرقش اور امرؤالقیس وغیرہ کے قصے جو عربی ادب کے قدیم مصادر میں ہمیں جگہ جگہ نظر آجاتے ہیں۔ ان میں بہت سے قصوں کے حقیقت پر مبنی ہونے پر شک بھی ظاہر کیا گیا ہے البتہ اتنا طے ہے کہ زیادہ تر قصے بعد میں تحریف اور حذف واضافہ کا شکار ہوئے ہیں، خواہ ایسا ان کی جزئیات کے اعتبار سے ہوا ہو یا ان کے زبان واسلوب اور لب ولہجہ کے اعتبار سے ہوا ہو۔ محققین کے مطابق دور جاہلی کی طرف منسوب بعض قصوں کے تحلیل وتجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ انمیں بہت سے قصے دوسری قدیم اقوام کے قصوں سے مأخوذ یا متأثر تھے۔ جنوں اور شیاطین پر مبنی قصے بھی اس دور میں بیان کیے جاتے تھے۔

3.8.3 امثال یا محاورے

امثال یا محاورے دراصل ایسے مختصر جملے ہوتے ہیں جن میں کوئی صحیح رائے یا کوئی عام اصول یا کسی واقعہ کا حوالہ محض چند الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان کا تعلق اکثر کسی خاص واقعہ یا پس منظر سے ہوتا ہے، پھر جب بھی اس کے مماثل کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس اصل واقعہ کی طرف حوالہ دیتے ہوئے وہ مثل بیان کردی جاتی ہے۔ جس طرح جاہلی دور کے بعض قصے ہم تک پہونچے ہیں اسی طرح اس دور کے کچھ عربی محاورے بھی ہمیں قدیم مصادر میں ملتے ہیں۔ اس دور کے ان امثال کی جمع وترتیب کا کام تو پہلی صدی ہجری میں شروع ہوگیا تھا جیسا کہ ابن ندیم نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الفہرست میں حضرت معاویہ کے دور کے ایک قصہ گو عُبید بن شَریہ کی امثال پر پچاس صفحات پر مشتمل ایک کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ازخود اس کتاب کو دیکھا ہے، حالانکہ یہ کتاب ہم تک نہیں پہونچ سکی۔ البتہ قدیم عربی امثال پر لکھی گئی ان اولین کتابوں میں سے ایک اہم کتاب دوسری ہجری کے اسکالر المفضل الضبی کی کتاب امثال العرب ہے، اس کے بعد ہمیں تیسری صدی ہجری کے معروف مصنف ابوعبید القاسم بن سلام کی کتاب ملتی ہے جس کی شرح بعد میں ابوعبید البکری نے ''فصل المقال فی شرح کتاب الامثال لابی عبید القاسم بن سلام'' کے نام سے لکھی۔ قدیم عربی امثال پر لکھی گئی دیگر کتابوں میں ابوہلال العسکری کی جمہرۃ الامثال، المیدانی کی مجمع الامثال اور الزمخشری کی المستقصی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ المیدانی کی مجمع الامثال ایک نہایت جامع کتاب ہے۔ ان سب کتابوں میں جاہلی امثال کے علاوہ بعد کے عصور کی امثال بھی شامل ہیں۔

ان کتابوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں صرف امثال کو ذکر کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر مثل کے پس منظر میں جو قصہ یا کہانی بیان کی جاتی تھی اس کو بھی ضمناً ان کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ ان میں سے زیادہ تر قصوں کے مستند ہونے یا نہ ہونے کے بارے

میں یقین کے ساتھ کچھ بھی کہنا مشکل ہے لیکن اتنا یقین کے ساتھ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان امثال میں سے بیش تر کا تعلق جاہلی دور سے ہی رہا ہوگا، اور وہ اپنی اصل شکل وصورت میں راویوں کے ذریعہ سے ان مصنفین تک پہونچی ہونگی۔

اس حوالے سے ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ان مذکورہ بالا کتابوں میں جاہلی دور کی سبھی امثال کی تحدید باقاعدہ طور پر نہیں کی گئی ہے بلکہ بعض امثال کے ساتھ ذکر کیے گئے قصوں کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق جاہلی دور سے ہے، کیوں کہ ان کتابوں میں عہد اسلامی کی امثال بھی موجود ہیں۔جن امثال کے بارے میں مصنف نے یقین کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ ان کا تعلق دور جاہلی سے ہے ان کی نسبت تو عہد جاہلی کی طرف طے ہو جاتی ہے لیکن جن کی تحدید مصنف نے خود نہیں کی ہے ان کی بابت ان سے منسلک قصوں کے ذریعہ ان کے زمانے کی تحدید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جاہلی دور کی طرف جو امثال ومحاورات منسوب ہیں ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کو قوم عاد کے ایک شخص لقمان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔محققین کے مطابق یہ وہ لقمان الحکیم نہیں ہیں جن کا قصہ قرآن کریم میں سورہ لقمان میں وارد ہوا ہے بلکہ ایک دوسرے شخص ہیں جن کی طرف قدیم عربی نثر میں کچھ امثال ومحاورات منسوب کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی جاہلی دور کے مشہور خطیب اکثم بن صیفی التمیمی کی طرف بھی بہت سی امثال منسوب کی جاتی ہیں، اس کی امثال ادب کے بعض مصادر میں موجود ہیں۔ ایسے ہی عامر بن الظرب العدوانی کا نام بھی اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

اس دور کی طرف منسوب زیادہ تر امثال کے قائلین کا ہمیں پتہ نہیں چلتا اور ان میں سے بہت سی امثال ایسی بھی ہیں جن میں نحوی قواعد کی مخالفت پائی جاتی ہے لیکن انہیں ویسے ہی استعمال کیا جاتا ہے جیسا عربوں سے انہیں سنا گیا ہے۔کچھ بھی ہو ان امثال میں سے زیادہ تر امثال کا اسلوب نہایت فصیح وبلیغ ہے اور یہ بات اس دور کے اعلیٰ ادبی معیار اور فصاحت وبلاغت کی بلندی کا واضح ثبوت ہے۔

جاہلی دور کی کچھ امثال:

۱۔	ان البغاثَ بأرضنا تَستنسر	(یعنی: بلی بھی اپنے دروازے پر شیر ہوتی ہے، یا کتا بھی اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے)
۲۔	رُبَّ رَمْيةٍ من غير رامٍ	(یعنی: اندھے کے ہاتھ بٹیر)
۳۔	الحديثُ ذو شُجون	(یعنی: بات سے بات نکلتی ہے)
۴۔	انَّ العَوان لا تُعلَّم الخِمْرَةَ	(تجربہ کار شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی جو انسان تجربہ کار ہو اس کو ہر چیز بتانا نہیں پڑتی)
۵۔	سَبَقَ السيفُ العَذَل	(یعنی اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت)
۶۔	ان كنتَ ريحا فقد لاقيتَ إعصارا	(یعنی سیر کو سوا سیر، یا اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے)
۷۔	انک لا تَجنی من الشوک العنب	(یعنی جیسا بوؤ گے ویسا پاؤ گے)

3.8.4 خطابت

''خطابت'' ''نثر فنی'' کی بہترین قسموں میں شمار جاتی ہے۔ یہ نثر کی وہ قسم ہے جس میں کوئی ممتاز شخص کسی ملکی یا سماجی مسئلہ پر یا زندگی کے کسی اہم پہلو پر کسی مجمع میں اپنی نقطہ نظر کی وضاحت اس غرض سے کرے کہ وہ مجمع کو متاثر کر کے اپنا ہم خیال بنالے۔ جب فنِ خطابت کی یہ غرض وغایت ہے تو خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سننے والوں کی عقلی وذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف ہو، اور وہ جس موضوع پر بول رہا ہے اس میں اسے مہارتِ تامہ حاصل ہو اور زبان پر ایسی قدرت ہو کہ جب بولنا شروع کرے تو اپنی قوتِ بیان کی جاذبیت، الفاظ کے زیر وبم وخوبصورتی، قوت استدلال کے اچھوتے پن اور ندرت سے سامعین کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر وہ سب کچھ کہنے لگے جسے مقرر ان سے کہلوانا چاہتا ہے یا وہ سب کچھ کرنے لگیں جسے مقرر ان سے کروانا چاہتا ہے''۔

فن خطابت قدیم یونانی اور رومانی تہذیبوں میں کافی حد تک رائج اور مقبول تھا، عرب قوم ایک نہایت جری اور خوددار قوم تھی، اسی لیے زبان وبیان کو ان کی زندگی میں بہت اہمیت حاصل تھی، ہر ایک اپنی بات کو قاعدے سے رکھنا اور منوانا جانتا تھا، اسی لیے ان کے یہاں بھی خطابت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ عربوں کو خطابت میں خداداد صلاحیت حاصل تھی ایسے ہی جیسے فن شاعری میں انہیں فطری صلاحیت حاصل تھی۔ وہ اپنے بچوں کو خطابت کی مشق بھی کرایا کرتے تھے۔ قبیلے کا سردار بننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شخص ایک بہترین خطیب بھی ہوتا کہ اہل قبیلہ کی بہترین نمائندگی اپنی خطابت کے ذریعہ کر سکے۔ اس دور میں وفود کی آمد ورفت کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ بلاد روم وفارس، ہندوستان اور چین وغیرہ سے وفد بلاد عربیہ پہونچا کرتے تھے اور خود عربوں کے وفود دور دراز کے علاقوں میں جایا کرتے تھے، کبھی تجارت کی غرض سے اور کبھی سیاسی اغراض ومقاصد کے تحت۔

فن خطابت میں دلچسپی اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا رجحان ہمیں زیادہ تر قدیم تہذیبوں میں نظر آتا ہے، اہل فارس کے بارے میں جاحظ نے لکھا ہے کہ وہ لوگ اس فن میں بے انتہا ماہر ہوا کرتے تھے، جبکہ اہل یونان بھی اس فن میں کسی سے کم نہ تھے۔ خطابت دراصل کوئی آسان فن نہیں ہے اور فی البدیہہ مؤثر انداز میں اپنی بات کو رکھنا اور منوانا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرب قوم میں بدوؤں کو اس فن میں خاص مہارت حاصل تھی، کیونکہ بدو لوگ فطرت سے قریب ہونے کی وجہ سے فطری انداز میں تقریر کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہ نہایت جری اور بے باک بھی ہوا کرتے تھے جس کو خطابت کی اہم شرائط میں گردانا جاتا ہے۔

دور جاہلی میں خطابت کا بہت رواج تھا اور جن حالات میں وہ لوگ اپنی زندگی گزارتے تھے اس کا یہی تقاضا بھی تھا، چنانچہ وہ جس انداز کی آزادانہ زندگی گزارتے تھے، جس طرح ان میں آپس میں ہمیشہ جنگیں جاری رہتی تھی جن کی وجہ سے ان کے سردار کبھی ان کو جنگ کے لیے بھڑکاتے تو کبھی مصالحت کی طرف بلاتے، اس کے علاوہ ان کی فصاحت وبلاغت ان کی حاضر جوابی، ان کے میلے اور راتوں کی محفلیں یہ سب چیزیں خطابت کے لیے اس دور میں ایک سازگار ماحول پیدا کرتی تھیں، بلکہ اس بات کی ضامن تھیں کہ یہ فن اس قوم میں خوب پروان چڑھے اور عظیم خطبا ان میں پیدا ہوں۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں واقع مناذرہ نامی ریاست کے بادشاہوں کے ایران کے بادشاہ کسری سے بہت اچھے تعلقات ہوا کرتے تھے۔ مناذرہ کے ہی ایک بادشاہ نعمان بن منذر نے کبھی کسری کے سامنے اپنے خطیبوں کی فصاحت وبلاغت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ کسری

نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے بھی عرب خطیبوں کے یہ جوہر دیکھنے کا موقع ملے۔ چنانچہ نعمان نے اپنے خطیبوں کی ایک جماعت تیار کی جن میں اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، حارث بن ظالم، قیس بن مسعود، خالد بن جعفر، علقمہ بن علاثہ اور عامر بن طفیل جیسے ماہر خطیب شامل تھے۔ ان سب خطیبوں نے کسری کے دربار میں اپنی خطابت کے ایسے جوہر دکھائے کہ کسری بھی عربوں کی خطیبانہ صلاحیت کا قائل ہوگیا۔

ادب کے مصادر اس دور کے خطبوں سے لبریز ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس دور کے بہترین خطبے ابن عبد ربہ کی ''العقد الفرید'' جاحظ کی ''البیان والتبیین''، ابوالفرج الاصفہانی کی ''الأغانی'' اور دوسرے مراجع میں کثیر تعداد میں نظر آجاتے ہیں۔

خطابت کا استعمال مختلف مواقع پر کیا جاتا تھا۔ کبھی اس کا استعمال اپنی قوم کو دشمن کے خلاف اکسانے کے لیے کیا جاتا تھا، تو کبھی اپنے قبیلے پر فخر ومباہات کے لیے کیا جاتا تھا، تو کبھی مصالحت کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا تھا، تو کبھی اپنے سرداروں اور حاکموں کے دربار میں حاضری کے وقت کیا جاتا تھا، چنانچہ کبھی تو غساسنہ اور مناذرہ کے درباروں میں جب عرب قافلے پہونچتے تو ان کے نمائندے ان بادشاہوں کے سامنے تقریر کر کے اپنی بات رکھتے، تو کبھی بازاروں اور میلوں میں تقریریں کر کے اپنی فصاحت و بلاغت کے جلوے دکھاتے، تو کبھی خطیب اہلِ قبیلہ کو کسی موقع پر نصیحت آمیز تقریر کرتے ہوئے نظر آتا۔ ایسے ہی شادی وغیرہ کے موقع پر بھی خطبے دیے جاتے تھے، جیسا کہ ابو طالب نے اللہ کے رسول کی حضرت خدیجہ سے شادی کے وقت خطبہ دیا تھا۔

ان سبھی موضوعات پر جاہلی دور کے خطبے ادب کے مصادر میں موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دور میں خطابت کو بے انتہا اہمیت حاصل تھی، اور اس کا سہارا کثرت سے لیا جاتا تھا۔ جاحظ نے اپنی معروف کتاب ''البیان والتبیین'' میں اس دور کے خطیبوں کی بڑی تعداد ذکر کی ہے جس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہر قبیلے کے پاس اس دور میں بہترین خطیب ہوا کرتے تھے۔ یوں تو عربوں میں بہت سے ممتاز اور نامور مقرر گزرے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے حالات اور کمالات کا ہمیں علم نہیں۔ پھر بھی قدیم ترین خطبا میں کعب بن لوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباواجداد میں سے تھے، اور حُرثان بن مُحرِّث جو ذوالاصبع العدوانی کے لقب سے مشہور ہیں، بہت نامور گزرے ہیں۔

جاہلی دور کے مشہور خطبا کی ایک لمبی فہرست ہے جو ہمیں ادب کے مختلف مصادر اور بطور خاص الجاحظ کی البیان والتبیین میں نظر آتی ہے، چنانچہ عتبہ بن ربیعہ، سہیل بن عمرو الأعلم، عامر بن الظرب، ربیعہ بن حذار، عمرو بن کلثوم، ہانی بن قبیصہ، زہیر بن خباب، لبید بن ربیعہ العامری، اکثم بن صیفی، عمرو الاہتم، قس بن ساعدہ الایادی اس عہد کے مشہور خطبا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

دور جاہلی میں خطبا کی یہ مقبولیت اور ادب کے مختلف مصادر میں موجود ان کے خطبوں کی کثرت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس دور میں خطابت کو یقینا بہت اہمیت حاصل تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور میں خطیب کا درجہ شاعر کے درجہ سے کہیں بھی کم نہ تھا، بلکہ زیادہ ہی تھا جیسا کہ ابوعمرو بن العلاء نے یہ لکھا ہے کہ شروع میں ان کے نزدیک شاعر کی اہمیت خطیب سے زیادہ تھی لیکن بعد میں جب شعرا کی کثرت ہوگئی اور شاعری کا معیار گرنے لگا تب خطیب کو شاعر سے بھی زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ اس کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ نابغہ اور اعشی جیسے شاعروں نے شاعری کو کسب معاش کا ذریعہ بنا لیا تھا، جس کی وجہ سے شاعری کا معیار گرنے لگا تھا۔ یہی بات جاحظ نے البیان والتبیین میں بھی کہی ہے۔ خطیب کو شاعر کے مقابلے میں جاہلی دور میں جو اہمیت حاصل ہوئی اس کے بارے میں یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ شعرا اکثر جنگ کا ماحول تیار کرنے میں اہم رول ادا کرتے تھے، جبکہ خطیب اکثر صلح اور محبت کا پیغام لوگوں تک پہونچاتے تھے، چنانچہ لوگوں کو بالآخر

یہ احساس ہوا کہ خطیب کا درجہ اس لحاظ سے شاعر کے مقابلے میں زیادہ بلند و برتر ہے۔مؤرخین کا ماننا ہے کہ دور جاہلی کے آخری ایام میں شاعری کے مقابلے میں خطابت کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی تھی۔

اس دور کے خطیبوں کا تقریر کرنے کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا تھا، اور اس کی کچھ خوبیاں تھیں، چنانچہ وہ لوگ بازاروں اور میلوں وغیرہ میں اپنی سواری پر بیٹھ کر تقریر کیا کرتے تھے، اور دوران تقریر اپنے ہاتھوں میں عصا رکھا کرتے تھے۔کبھی کبھی کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر بھی تقریر کرتے تھے۔عربی خطیبوں کے اپنے ہاتھوں میں عصا لیکر تقریر کرنے کو جاحظ نے عرب قوم کی امتیازی خوبیوں میں شمار کیا ہے۔اس کے علاوہ خطابت میں خود اعتمادی، حاضر جوابی، اور بلند آواز کو خاص طور پر سراہا جاتا تھا، جبکہ کپکپانے ہکلانے اور بار بار گلا صاف کرنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

جہاں تک اس دور کی خطابت کے لب ولہجہ کی بات ہے تو اس دور میں مسجع اور مرسل یعنی غیر مسجع دونوں ہی طرح کا اسلوب رائج تھا، جاحظ کے مطابق منافرت یا مفاخرت کی غرض سے جو تقریریں کی جاتی تھیں انمیں اسلوب اکثر مسجع ہوا کرتا تھا، جبکہ جو تقریریں مصالحت کی غرض سے کی جاتی تھیں ان کا اسلوب اکثر مرسل یا غیر مسجع ہوا کرتا تھا۔اس دور میں وصیت کا بھی رواج تھا۔اس کو بھی خطابت کے ہی باب ہیں شمار کیا جاتا ہے۔دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خطبہ ایک جم غفیر کے سامنے یا کسی خاص محفل میں دیا جاتا تھا جبکہ وصیت ذاتی طور پر کسی شخص کو کی جاتی تھی۔اس دور کی کچھ وصیتیں بھی ادب کے مختلف مصادر میں موجود ہیں۔اب ہم جاہلی دور کے کچھ مشہور خطبا کا تعارف آپ کے سامنے پیش کریں گے۔

3.8.4.1 قُس بن ساعدہ الایادی

قس بن ساعدہ الایادی قبیلۂ ایاد کا نامور خطیب اور نجران کا پادری تھا۔اسے صرف دورِ جاہلی کا ایک مایہ ناز اور شہرۂ آفاق خطیب ہی نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ بہت سے اسکالرز کا یہ ماننا ہے کہ وہ پوری عرب قوم میں سب سے ممتاز، قادر الکلام، شعلہ بیان اور سحر طراز مقرر گزرا ہے۔ اس کی فصاحت وبلاغت اور زبان پر بے پناہ قدرت کی وجہ سے خطابت میں اس کی مثال دی جاتی ہے۔عربی تقریروں میں حمد وثنا کے بعد 'اما بعد' کہنے کا جو رواج ہے اس کی شروعات بھی دراصل سب سے پہلے قس نے ہی کی تھی۔جاحظ نے لکھا ہے کہ قبیلۂ ایاد اور قبیلۂ تمیم کے لوگوں کو خطابت میں ایسی امتیازی شان حاصل تھی کہ جو کسی اور قبیلہ کو حاصل نہیں تھی، اور خاص طور سے قس کو اس فن میں بے انتہا مہارت اور دسترس حاصل تھی۔کہا جاتا ہے کہ قس وہ پہلا شخص تھا جس نے تقریر کے دوران چھڑی یا تلوار لیکر تقریر کرنے کا طریقہ شروع کیا۔قس کے بارے میں اللہ کے رسول کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ آپ نے اسے سوق عکاظ میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا، اور اس کا وہ خطبہ بے انتہا مشہور بھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

قس کا انداز بیان نہایت شستہ اور شگفتہ تھا۔اس کے الفاظ بڑے شیریں اور منتخب ہوتے تھے۔وہ چھوٹے چھوٹے مگر نہایت نپے تلے جملے کہا کرتا تھا۔اور بیچ بیچ میں امثال اور کہاوتوں کا استعمال بھی خوب کیا کرتا تھا۔اس کی ایک تقریر بہت مشہور ہے جو ادب کے مختلف مصادر میں موجود ہے، اسی کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"أيها الناس! اسمعوا وَعُوا! من عاش مات، ومن مات فات، وكل ما هو آتٍ آتٌ، ليل داج، ونهار ساج، وسماء ذات ابراج، ونجوم تزهر، وبحار تزخر، وجبال مرساة، وارض مُدحاة، وأنهار مُجراة، ان في السماء لَخَبرا، وان في الارض لَعِبَرا، وما بالُ الناس، يذهبون ولا يرجعون، أَرَضُوا فأقاموا، أم تُرِكوا فناموا، بالله قسما لا اثمَ فيه، ان لله دينا هو أرضَى له وافضل من دينكم الذى انتم عليه"

یعنی اے لوگو! گوش وہوش سے سنو! اور یادرکھو کہ جو زندہ ہے اسے ایک دن مرنا ہے، اور جو مر گیا وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا، اور جو چیز آنے والی ہے وہ آکر رہے گی۔ایک گھٹا ٹوپ اندھیری رات ہے، اور ایک پرسکون انمٹ دن ہے، ایک مختلف برجوں والا آسمان ہے اور اس میں چمکتے دمکتے ستارے ہیں، ایک طرف ٹھاٹھے مارتے ہوئے سمندر ہیں تو دوسری طرف ٹھوس اور مضبوط پہاڑ ہیں اور پھیلی ہوئی یہ زمین ہے اور بہتے ہوئے یہ دریا ہیں۔آسمان میں بھی کچھ چیزیں مخفی ہیں، اور زمین میں کچھ عبرتیں پوشیدہ ہیں۔یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جاتے ہیں تو واپس نہیں آتے، کیا ان کو وہ جگہ ایسی بھا گئی ہے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے، یا ان کو وہاں چھوڑ دیا گیا تو ہمیشہ کے لیے وہیں سو گئے۔قس خدا کی ایسی قسم کھا کر کہتا ہے جس میں ذرہ برابر بھی گناہ کا شائبہ نہیں کہ اللہ کا ایک خاص دین ہے جس کو تمہارے لیے سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، اور وہ اس دین سے بہت بہتر ہے جسے تم مانتے ہو۔

3.8.4.2 اکثم بن صیفی

اکثم بن صیفی نہ صرف یہ کہ دور جاہلی کا ایک عظیم خطیب تھا بلکہ نسب دانی، ضرب الامثال اور قوت استدلال میں بھی نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے جیسا قادر الکلام مقرر اور صحیح فیصلہ لینے والا الحکم اور اپنی قوم میں معزز ومحترم شخص مشکل سے ہی عربوں کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔اس کے حکیمانہ مقولے اور پند ونصیحت کے جملے سارے عربوں کی زبان پر جاری تھے۔اس کی انہی صفات کی وجہ سے نعمان بن منذر نے کسریٰ انوشیرواں کے دربار میں عربوں کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کے لیے جو وفد بھیجا تھا اس کا سردار اسی کو مقرر کیا تھا۔چنانچہ اسی نے سب سے پہلے کسریٰ کے دربار میں تقریر کی۔تقریر کے بعد کسریٰ نے اکثم سے چند سوالات کیے۔کسری اس کے جوابات سے اس قدر خوش اور متأثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر عربوں کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو تم ہی کافی تھے۔اکثم کو جاہلی دور کے صف ِاول کے خطیبوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس نے کسریٰ کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"ان أفضلَ الأشياءِ اعاليها، و أعلى الرجال ملوكها، وأفضل الملوک أعمُّها نفعاً، وخير الأزمة أخصبها، وأفضل الخطباء أصدقها، الصدق مَنجاة، الكذب مَهواة، والشر لَجاجة، والحزم مركب صعب، والعجز مركب وطئى، آفة الرأى الهوى ، والعجز مفتاح الفقر، وخير الأمور الصبر، وحسن الظن ورطة، وسوء الظن عصمة"۔

یعنی دنیا کی چیزوں میں سب سے بہتر اور افضل وہ ہیں جو سب سے اعلی ہوں، اور لوگوں میں سب سے اونچے اور ارفع ان کے بادشاہ ہیں، اور بادشاہوں میں سب بہتر وہ ہیں جن کے ذریعہ نفع عام ہو، اور زمانوں میں سب سے بہتر خوشحالی اور ہریالی کا زمانہ ہے، اور مقررین میں سب سے بہتر حق گو ہیں۔سچائی نجات کا ذریعہ ہے، اور جھوٹ تباہی کا گڈھا ہے، برائی کی جڑ اس میں پھنسے رہنا ہے، عقلمندی اور دانشمندی کی راہ

بہت مشکل ہے، اور عاجزی وانکساری کی راہ بڑی آسان ہے، غلط فیصلوں کا سبب اتباعِ نفس ہے، اور بے عملی غریبی کی کنجی ہے، سب سے اچھی بات صبر کرنا ہے، اور بہت زیادہ حسن ظن میں ہلاکت ہے، جبکہ سوء ظن میں ہی اصل حفاظت ہے۔

3.8.4.3 عمرو بن معدیکرب

عمرو بن معدیکرب ایک اچھا خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین گھڑسوار بھی تھے۔ ۹ھ میں جب آپؐ غزوۂ تبوک سے واپس آرہے تھے تو عمرو اپنی قوم کے ساتھ آپ سے ملے اور اسلام لے آئے، لیکن پھر مرتد ہوگئے، اور ایک بار پھر سے حق نے ان کے دل میں روشنی پیدا کردی اور وہ دوبارہ مسلمان ہوگئے، اور اسلام کی راہ میں کئی جنگوں میں شریک بھی ہوئے۔

عمرو کا شمار دورِ جاہلی کے خطبا اور شعرا کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ تقریر کرتے وقت وہ عام طور سے مختصر جملے استعمال کرتے تھے، بلا تکلف اگر سجع آجاتا تو اس سے اپنی تقریر کو پُر اثر بنادیتے تھے۔ زندگی کے تجربات اور ضرب الامثال سے اپنی تقریر کو مؤثر، دلکش اور دل نشیں بناتے تھے۔ اشعار میں عام طور سے اپنی بہادری، شجاعت اور زبان پر اپنی قدرت کا ذکر کر کے فخر کرتے تھے۔ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے دربار میں جو وفد بھیجا تھا اس میں عمرو بھی شامل تھے۔ ان کی اس تقریر کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"انما المرئُ بأصغرَيه قلبه ولسانه، فبلاغ المنطق الصواب، وملاک النجعة الارتياد، وعفو الرأی خير من اسکراه الفکرة، وتوقيف الخبرة خير من اعتساف الحيرة"

یعنی انسان اپنی دو چھوٹی چیزوں سے پہچانا جاتا ہے: ایک اس کا دل اور دوسری اس کی زبان۔ قوت گویائی کی معراج حق گوئی ہے، منزل پانے کی کنجی تلاش وجستجو ہے، جو بات دل میں غور وفکر سے پہلے آجائے وہ دل ودماغ کو مجبور کر کے قائم کی ہوئی رائے سے بہتر ہے، اور تجربات کی روشنی حیرت وپریشانی کے اندھیرے سے بہتر ہے۔

3.8.4.4 سجع الکہان

دورِ جاہلی میں جہاں قصہ گوئی اور خطابت جیسے نثری فنون رائج تھے وہیں ایک اور نثری فن کا چلن عام تھا جس کا تعلق کاہنوں کی جماعت سے تھا۔ اس دور کے عرب کہانت میں یقین رکھتے تھے اور اپنے بہت سے معاملات میں اس کا سہارا لیتے تھے۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کاہنوں کے پاس غیب کا علم ہوتا ہے، جو انہیں جنوں کی مدد سے حاصل ہوجاتا ہے، چنانچہ وہ لوگ اپنے اہم فیصلوں میں ان کاہنوں سے رائے مشورہ کیا کرتے تھے۔ لوگ ان کے پاس اپنے ذاتی مسائل بھی لیکر جایا کرتے تھے اور اپنے قبائلی مسائل کے سلسلے میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے۔ انہیں کاہنوں کی طرف بہت سی عربی عبارتیں منسوب ہیں جن کا اسلوب اکثر مسجع اور معیار ادبی ہوا کرتا تھا۔ سجع الکہان میں ایک طرح کا غموض وابہام پایا جاتا تھا۔ الفاظ اکثر ذومعانی ہوا کرتے تھے۔ سجع الکہان کا اسلوب جیسا کہ اوپر بی ذکر کیا گیا تھا نہایت مسجع ہوا کرتا تھا۔ سجع الکہان کو خطابت کی ہی ایک قسم مانا جاتا ہے۔ سجع الکہان مین جملے نہایت مختصر اور بے انتہا مسجع ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اس کا نام بھی سجع الکہان رکھا گیا ہے۔ کاہنوں کی کوشش یہ ہوتی تھی اپنے کلام کو اس قدر ذومعانی اور مبہم بنا کر پیش کریں کہ بعد میں اس سے جو معنی ومفہوم بھی مراد لینا مقصود ہو وہ مراد لیا جاسکے۔

چونکہ اس دور میں کاہنوں کے تئیں عربوں کا یہ اعتقاد تھا کہ ان پر وحی والہام کے ذریعہ غیب کا علم نازل ہوتا ہے، اس لیے ہر قبیلے میں کاہنوں کو بہت اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ دور دراز کے علاقوں سے لوگ ان کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کاہنوں کی اس دور میں بڑی کثرت بھی تھی۔ ان کے مشہور کاہنوں میں سلمہ بن ابی کا نام ذکر کیا جاتا ہے، جو عزی سلمہ کے نام سے مشہور ہوا جیسا کہ جاحظ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس دور کی کچھ کاہنات یعنی اس پیشہ سے جڑی کچھ خواتین کے نام بھی ذکر کیے جاتے ہیں جن میں شعثاء، سعدیہ، زرقاء، غیطلہ، اور براء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

لیکن اس حوالے سے ایک بات نہایت اہم ہے کہ ان کاہنوں اور کاہنات کے حوالے سے جو کچھ بھی ادب کے مختلف مصادر میں نقل کی گیا ہے، اس کے ایک بڑے حصے کی اس عہد کی طرف نسبت کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح بہت سے قصے اس دور کی طرف منسوب کر دیے گئے کچھ ایسا ہی سجع الکہان کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

اس دور میں سجع الکہان کی کثرت اور مقبولیت اور اس کے ادبی معیار کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ جو وحی حضرت محمدؐ پر نازل کی جا رہی ہے تم لوگ اسے سجع الکہان مت سمجھو اور مت کہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''ولا بقول کاھن، قلیلاً ماتذکرون'' اور فرمایا: ''فذکر، فما انت بنعمة ربک بکاھن ولا مجنون''۔

3.9 اکتسابی نتائج

ہر دور کی شاعری اس دور کی بہترین عکاس ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے دور کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔ سماج میں موجود اچھائیاں اور برائیاں سب ہمیں شاعری میں نظر آتی ہیں۔ جاہلی دور کی جو بھی عربی شاعری ہم تک پہونچی ہے وہ بھی اس دور کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ جاہلی دور میں عربوں کی شاعری پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں ایسے اشعار زیادہ ملتے ہیں جن میں شاعر کے سچے احساسات وجذبات کا اظہار نظر آتا ہے، جبکہ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں الفاظ کی خوبصورتی وپختگی تو نظر آتی ہے لیکن معانی ومفاہیم کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ دور جاہلی میں شعر کی روایت کا طریقہ ہی زیادہ تر رائج تھا اور اس کے لیے شعرا کا ہی ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو اس اہم فریضہ کو انجام دے رہا تھا۔

دنیا کی دوسری قدیم تہذیبوں میں ہمیں شاعری کی مختلف اقسام نظر آتی ہیں، جن میں چار قسموں کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے: رزمیہ شاعری، تمثیلیہ شاعری، طربیہ شاعری اور تعلیمی شاعری۔ ان میں سے رزمیہ شاعری، تمثیلیہ شاعری، اور تعلیمی شاعری ہمیں قدیم عربی شاعری میں برائے نام ہی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ طربیہ شاعری کا ہی رواج ان کے یہاں عام تھا۔ شعرِ جاہلی کے اہم موضوعات میں ہجائیہ شاعری، شعر الحماسہ، فخریہ شاعری، مرثیہ گوئی، مدحیہ شاعری، غزلیہ شاعری اور وصفیہ شاعری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جاہلی دور کا جو نثری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس میں ہمیں نثر کی مختلف اصناف نظر آتی ہیں، جن میں قصے، محاورے، خطبے، اور کاہنوں کی مسجع ومقفی عبارتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جاہلی دور میں نثر کو بحیثیت فن اس قدر استعمال نہیں کیا گیا جس قدر شعر کو استعمال کیا گیا۔ جاہلی دور میں جس طرح شعر کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے کہ چند عمدہ قصیدوں کو لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا جاتا تھا جنہیں معلقات کہا جاتا تھا، نثر کے حوالے سے اس قسم کی تحریروں کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتا۔

جاہلی دور کی نثر کی توثیق کے بارے میں وہی موقف اختیار کرنا بہتر ہوگا، جو اس دور کی طرف منسوب اشعار کے تئیں اختیار کیا جاتا

ہے، یعنی اس دور کا جو بھی نثری سرمایہ ہم تک پہونچا ہے اس کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی اس کی تصدیق وتوثیق کی جانی چاہیے، کیونکہ شعر نثر کے مقابلے میں اپنے وزن وقافیہ کی وجہ سے تا دیر حافظہ میں محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

3.10 فرہنگ

خَدِع	دھوکہ باز، فریبی
هانَ يهونُ	کم تر اور معمولی ہونا
كَرَى	نیند
صَدى	گونج
مُتهلل	خوش وخرم
ليل داج	تاریک رات
جبال مُرساة	مضبوط اور ٹھوس پہاڑ

3.11 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ جاہلی شاعری کے موضوعات کیا کیا ہیں؟

۲۔ ہجائیہ شاعری سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۳۔ سجع الکہان سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۴۔ جاہلی شاعری کی روایت اور تدوین پر ایک نوٹ لکھیے۔

۵۔ قس بن ساعدہ الأیادی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں مختصراً تحریر کیجیے۔

3.12 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

۱۔	تاریخ الأدب العربي (العصر الجاہلی)	شوقي ضيف
۲۔	تاریخ الادب العربي	عمر فروخ
۳۔	تاریخ آداب العرب	مصطفى صادق الرافعي
۴۔	تاریخ الادب العربي	احمد حسن الزيات
۵۔	ادب العرب	زَبید احمد
۶۔	عربی ادب کی تاریخ (جلد اول)	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

(https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3)

اکائی 4 اصحابِ معلقات، اصحاب مجمہرات اور صعالیک شعرا

اکائی کے اجزا

4.1 مقصد

4.2 تمہید

4.3 امرؤالقیس بن حجر الکندی 500–540ء: حیات اور شاعری:

4.4 زہیر بن ابی سلمی المزنی ۔ حیات اور شاعری

4.5 عمرو بن کلثوم التغلبي

4.6 طرفہ بن العبد البکري: حیات اور شاعری

4.7 عنترہ بن شداد العبسی - حیات وشاعری

4.8 لبید بن ربیعہ العامری: حیات اور شاعری

4.9 حارث بن حلزہ الیشکري: حیات اور شاعری

4.10 نابغہ ذبیانی: تعارف

4.10.1 حالات زندگی

4.10.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات

4.11 عبید بن الأبرص: تعارف

4.11.1 حالات زندگی

4.11.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات

4.12 امیہ بن ابی الصلت: تعارف

4.12.1 حالات زندگی

4.12.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات

4.13 تأبط شرا: تعارف

4.13.1 حالات زندگی

4.13.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات

4.14 شنفری: تعارف

4.14.1 حالات زندگی

4.14.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات

4.15 اکتسابی نتائج

4.16 نمونے کے امتحانی سوالات

4.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

4.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ اصحاب معلقات سے واقف ہوں گے۔

معلقات کی خصوصیات سمجھ سکیں گے۔

اصحاب معلقات کی شاعری کے امتیازی پہلوؤں سے واقف ہوسکیں گے۔

اصحاب مجمہرات کے حالات زندگی اوران کی شاعری کی اہمیت سے واقف ہوسکیں گے۔

صعالیک شعرا کے حالات زندگی اوران کی شاعری کی اہمیت جان پائیں گے۔

عربی شاعری میں ان شعرا کے مقام اور مرتبے سے واقف ہوسکیں گے۔

4.2 تمہید

عرب معاشرے میں شاعری کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اچھے قصیدے کونہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اچھے قصائد کو کعبہ کی دیوار سے یا اس کے پردے سے آویزاں کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان قصائد کو معلقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مکہ چوں کہ تجارتی اور ثقافتی مرکز تھا۔ لہذا جب کوئی قصیدہ کعبہ میں آویزاں کیا جاتا تھا تو لوگ ان قصائد کو پڑھتے تھے اور دوسروں تک انہیں نقل کرتے تھے۔ اس طرح وہ قصائد نہایت تیزی سے دور دراز علاقے تک پھیل جاتے تھے۔ اس کی وجہ شاعر کی اور شاعر کے قبیلہ کی شہرت بھی پھیلتی تھی۔ انہیں عرب معاشرہ میں اس طرح عزت ومقام حاصل ہوتا تھا۔

معلقات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض تذکروں اور تاریخوں میں ان کی تعداد دس اور بعض میں نو اور بعض میں سات مذکور ہے۔ بعض معلقات کے اشعار کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ کیوں کہ عربی ادب کی تاریخوں میں کچھ بعد میں ملائے ہوئے اشعار کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

سبع معلقات کے سات شعرا ہیں اور وہ یہ ہیں:

١۔امرؤالقیس بن حجرالكندي۔ ٢۔زہیر بن ابی سلمی المزني۔ ٣۔عمرو بن کلثوم التغلبي۔ ٤۔طرفہ بن العبد البكري۔

٥۔عنترہ بن شداد العبسي۔ ٦۔لبید بن ربیعہ العامري۔ ٧۔حارث بن حلزہ الیشکري۔

ادب کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ امرؤالقیس کا قصیدہ خانۂ کعبہ پر آویزاں کیے جانے کے اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد طرفہ، زہیر، لبید، عنترہ، حارث اور عمرو بن کلثوم کے قصیدوں کو معلقات میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ یہ ساتوں قصیدے عکاظ کے میلے میں پڑھے گئے اور لبید کے ماسوا سب ہی شاعروں کی وفات بعثتِ نبوی سے پہلے ہو چکی تھی۔

ض صعلوک کے لغوی معنی ہیں غریب اور نادار شخص، جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اس کی جمع صعالیک ہے، صعالیک شعرا جاہلی زمانے کے وہ شعرا ہیں جو اپنے قبیلے کے اصول اور اقدار کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے قبیلے سے نکال دیے گئے۔ چنانچہ ان کو خانہ بدوشی کی زندگی

گزارنی پڑی، ان کی شاعری پرکیف اور اثر آفریں تھی، عربی ادب کی تاریخ ان کا ذکر کیے بغیر نامکمل رہے گی، ڈاکٹر شوقی ضیف نے اپنی کتاب ''العصر الجاہلی'' میں لکھا ہے کہ صعلوک وہ شخص ہے جس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ ہو، بعد میں اس لفظ کی دلالتیں مختلف ہوگئیں، اور اس سے مراد وہ لوگ لیے جانے لگے جو لوٹ مار کا کام کرتے تھے، یہ لوگ امیر قبائل کو لوٹ کر غریبوں کو مدد کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شجاعت اور فخر کا پہلو غالب ہے۔

مجمھرات جاہلی شاعری کے وہ سات قصائد ہیں جن کا شمار معلقات کے بعد دوسرے طبقے میں ہوتا ہے، مجمھرات کا واحد مجمھر ہے، جمھر کے لغوی معنی جمع ہونا جمع کرنا، محکم اور ثابت کرنا ہے۔

لغوی معنی کے اعتبار سے یہ وہ شعرا میں ہیں جن کا شمار گو طبقۂ اولی کے شعرا یا صاحب معلقات میں نہیں ہوتا، مگر اپنی مقبولیت اور فنکاری میں وہ کسی بھی درجے میں طبقہ اولی کے شعرا سے کم نہیں تھے، اپنے کمال فن کی وجہ سے وہ مقبول عام وخاص تھے، اس اکائی میں ہم انہیں دونوں قسم کے شعرا کے بارے میں پڑھیں گے۔

4.3 امرؤالقیس بن حجر الکندی 500-540۔ حیات اور شاعری:

عہد جاہلی میں امرؤالقیس جاہلی شاعروں کا سرخیل ہے۔ اس کو ''الملک الضلیل'' یعنی دربدر پھرنے والا یا گمراہ بادشاہ اور'' ذوالقروح یعنی ''زخموں والا'' کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ اس کا نام ابوالحارث جندح، لقب امرؤالقیس اور کنیت ابو وہب تھی۔ اس کے آبا واجداد جنوبی عرب کے قبیلے بنو کندہ کے شاہی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ حجر نجد میں مضر کے قبائل بنو اسد اور غطفان کا حاکم تھا۔ امرؤالقیس نے ایک شہزادے کی طرح پرورش پائی۔ جب جوان ہوا تو شہزادوں کی عادت کے مطابق سیر و شکار، لہو ولعب، مے نوشی اور آوارگی میں وقت گزارنے لگا اور حسین لڑکیوں کے درمیان وقت بتانے لگا ، ان سے برملا اظہارِ عشق کرنے لگا، اپنے شوق کی تسکین کے لیے شاعری میں ان کا ذکر اور ان کے بارے میں فحش باتوں کا اظہار کرنے لگا۔ باپ اس کی باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے امرؤالقیس کو کئی بار سرزنش کی، لیکن یہ بگڑا ہوا اوباش شہزادہ اپنی اصلاح نہ کر سکا۔ مجبور ہو کر امیر حجر نے اس کو گھر سے نکال دیا۔ گھر سے نکل کر امرؤالقیس نے خاندان اور اس کے وقار کے بندھنوں سے آزادی حاصل کر لی اور اس کے گرد قبیلہ طئ، کلب اور بکر کے اوباشوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ ان آوارہ لڑکوں کے ساتھ در در کی خاک چھاننے لگا۔ یہ لوگ جہاں پانی کا تالاب، نخلستان، یا شکارگاہ دیکھتے، وہیں ڈیرہ ڈال دیتے، دن کو شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتے، شام کو بھنے ہوئے گوشت اور شراب سے پیٹ کی آگ بجھاتے اور شعر وشاعری کی محفلیں منعقد کرتے اور رات دن دادِعیش دیتے۔ ایک دن ان آوارہ گردوں کا قافلہ ''حضرموت'' کے قریب ایک گاؤں'' دموں'' کے اطراف میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور پینے پلانے کا دور چل رہا تھا کہ کسی نے امرؤالقیس کو بتایا کہ اس کے باپ حجر کے خلاف بنو اسد نے علمِ بغاوت بلند کر دیا اور ہنگامہ آرائی میں اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی اس کے نشے کا خمار اتر گیا اور اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس موقعے پر اس نے اپنا یہ مشہور جملہ کہا " ضيعني أبي صغيراً، وحملني دمه كبيرا، لا صحوَ اليوم، ولا سكر غدا، اليوم خمر، وغداأمر." میں چھوٹا تھا تو میرے باپ نے مجھ کو گنوا دیا اور اب میں بڑا ہوا ہوں، تو اپنا خون میرے سر منڈھ دیا، آج میں ہوش میں نہیں آؤں گا اور کل نشہ نہیں کروں گا، آج کا دن جام کے لیے ہے اور کل کا دن

بڑے کام کے لیے ہے۔

والد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اگلے دن قبیلے قبیلے پھرا اور ان سے مدد مانگی، بعض نے ساتھ دیا بعض نے معذرت کا اظہار کیا۔ اپنے مددگاروں کو لے کر اس نے بنو اسد پر چڑھائی کی اور ان کے بہت سے آدمیوں کو تہِ تیغ کر دیا اور بہتوں کو زخمی کر دیا۔ لیکن اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی اور اس نے بنو اسد میں مزید قتل و غارت گری کا ارادہ کیا، تو جہاں دیدہ لوگوں نے اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ دوسرے قبیلوں کے پاس مدد کا طالب ہوا، لیکن کہیں سے اسے حسبِ منشا مدد نہ ملی۔ اسی طرح وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا اپنے آبائی وطن یمن کی طرف جا نکلا اور اپنے خاندان والوں سے امداد کا خواست گار رہا۔ انہوں نے امرؤالقیس کی حالتِ زار کو دیکھ کر پانچ سو جوانوں سے معاونت کی اور وہ ان کی معیت میں بنو اسد کی سرکوبی کے لیے نکلا۔ اسی دوران حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء نے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ امرؤالقیس پر حملہ کر دیا۔ امرؤالقیس کے حمایتی حملے کی تاب نہ لا سکے اور منتشر ہو گئے اور اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

ایسے سنگین حالات میں کسی نے اس کو قسطنطنیہ جا کر قیصر روم سے مدد طلب کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جب امرؤالقیس قیصر کی خدمت میں پہونچا، تو قیصر نے اس کی خوب آو بھگت کی اور اس کی مدد کے لیے ایک فوجی دستہ تیار کرایا، لیکن اس دوران ایک شخص طماح اسدی نے قیصر سے امرؤالقیس کے خلاف کچھ باتیں کہ دیں۔ قیصر نے بظاہر امرؤالقیس سے کچھ نہ کہا، بلکہ ایک قبا برکت کے لیے امروالقیس کو عطا کی اور کہا کہ اس کو زیب تن کرنا اور اپنے معاملات سے آگاہ کرتے رہنا، یہ بہت تیز قسم کے زہر میں بجھی ہوا تھا، جب امروالقیس نے اس کو پہنا، تو اس کے جسم پر چھالے پڑ گئے اور کھال پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے اور ان میں پیپ بھر گیا۔ ان آبلوں کی وجہ سے اس کو ''ذوالقروح'' کہا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ زہر اس کے خون میں سما گیا اور وہ اسی تکلیف میں آخر میں مقام انقرہ میں دفن ہوا۔

امرؤالقیس بچپن ہی سے شعروشاعری کا دلدادہ تھا، بلا کا ذہین تھا، جاہلی دور کے طبقۂ اولیٰ کے شاعروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ مؤرخین اس کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا حصہ والد کے انتقال سے پہلے اور دوسرا حصہ والد کے انتقال کے بعد۔ پہلے حصے میں وہ ایک عیاش، بے فکر اور کھلنڈرے نوجوان کی حیثیت سے نظر آتا ہے اور دوسرے دور میں باپ کے قصاص کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیے ہوئے ناقابلِ حصول امنگوں کی راہوں کا مسافر نظر آتا ہے۔ زندگی کی دونوں قسموں کی چھاپ اس کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ اس کی شاعری میں بھاری بھرکم الفاظ کی کثرت، شعروں میں بندش کی عمدگی، منظرکشی میں دلکشی، خیال میں نزاکت، مضامین میں تنوع، استعارات وتشبیہات کا مناسب استعمال، پیہم سفر، پریشانیوں کو جھیلنے اور مختلف معاشرے کے لوگوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے خیالات میں توسع پیدا ہو گیا تھا۔ یہ پہلا عربی شاعر ہے جس نے محبوب کے کھنڈر پر کھڑے ہونے اور اس کی یاد میں آنسو بہانے کی رسم کو ایجاد کیا اور ذکرِ محبوب سے قصیدے کے آغاز کی طرح ڈالی، عورتوں سے تعشق کا برملا اظہار کیا، انہیں نیل گایوں، ہرنیوں اور گورے رنگ کو شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی۔ اس کا کلام جاہلی دور کی بدوی تہذیب، معاشرت، رسم و رواج اور دوسری اہم معلومات کی دستاویز ہے۔ زمانے کا گلہ اور دوستوں کے ساتھ چھوڑ دینے کا بیان اچھوتے انداز میں موجود ہے اور بہت سے مضامین میں بعد کے شعرا نے اس سے استفادی کیا ہے۔

معلقے کی ابتدا محبوب کی جدائی پر آہ و بکا سے کرتا ہے۔ جب اس کے آثار سے گزرتا ہے، تو اس کی یاد میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ گذشتہ معاشقوں کی یاد اس کو تڑپا دیتی ہے۔ اپنی مردانگی کا عریاں تذکرہ کرتا ہے۔ پھر عنیزہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس ذیل

میں ''دارِ جلجل''، ''لب و رخسار''، ''زلف و کمر'' وغیرہ کا تذکرہ دلکش پیرایے میں کرتا ہے۔ اس کے بعد جدائی کی کسک، تلاشِ یار میں سفر کی صعوبتیں، سفر کے رفیق گھوڑے کی خوبیاں، اس کی برق رفتاری اور چھریرے پن کی رعنائی، دورانِ سفر کے مناظر، شکار پر گھوڑے کا چھلانگ لگانا، کڑکتی بجلیاں، جل تھل میدانوں اور پہاڑوں کی دلکش تصویر کشی کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی کائنات میں گہری نظر تھی۔

معلومات کی جانچ:

۱۔ عربوں کی شاعری کیسی تھی؟

۲۔عرب کیسی زندگی گذارتے تھے؟

۳۔اچھے قصائد کعبے میں کیوں آویزاں کیے جاتے تھے؟

۴۔اصحابِ معلقات کون کون سے ہیں؟

۵۔''الملک الضلیل'' اور ''ذوالقروح'' ایک شاعر کے القاب ہیں یا دو مختلف شعرا کے؟ دونوں کے معانی تحریر کیجیے۔

۶۔امرؤالقیس کے والد کا نام کیا تھا؟

۷۔امرؤالقیس کی وفات کس مقام پر ہوئی؟

۸۔امرؤالقیس کی شاعری کو کتنی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

4.4 زہیر بن ابی سلمی المزنی حیات اور شاعری

زہیر بن ابی سلمی کا تعلق قبیلہ مضر کی شاخ قبیلہ مزینہ سے تھا۔ یہ اور اس کا خاندان بنوغطفان کے علاقے میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا علاقہ نجد میں آتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمی کا شمار جاہلی دور کے تین بڑے شعرا میں ہوتا ہے، جن کو طبقۂ اولی میں شامل ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ زہیر بن ابی سلمی کا درجہ اپنے دونوں حریفوں کے مقابلے میں نمایاں ہے۔ کیوں کہ زہیر بن ابی سلمی کے مزاج میں سنجیدگی اور شرافت کا عنصر زیادہ تھا اور اس کی شاعری ایک معلمِ اخلاق کی شاعری ہے۔ وہ کسی کی مدح و ذم اس میں موجود اوصاف کی وجہ سے کرتا ہے اور مبالغہ آمیزی سے حتی الامکان اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کلام جنگ، نفرت اور امن و آشتی کے پیام سے پُر ہے۔ اس کے کلام کی بلندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس میں بہت غور و فکر کرتا تھا اور ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا تھا اور انہیں اشعار کو باقی رہنے دیتا تھا جو ہر طرح سے اعلی معیار کے ہوں۔

زہیر بن ابی سلمی کے خانوادے میں شعرا کی بہتات تھی۔ زہیر بن ابی سلمی کا حقیقی باپ ابوسلمی ربیعہ بن رباح، سوتیلا باپ اوس بن حجر، ماموں بشامہ بن غدیر، دونوں بہنیں سلمی اور الخنساء، دونوں بیٹے کعب اور بجیر، پوتا عقبہ بن کعب اور پڑپوتا العوام بن عقبہ سبھی نے شاعری میں نام پیدا کیا۔

جاہلی دور میں عبس و ذبیان دو قبیلوں کے درمیان جنگ کا سلسلہ تھا، یہ لڑائی سرزمینِ عرب پر داحس وغبراء کے تاریخی نام سے موسوم ہے۔ جس میں ہزاروں جانیں گئیں، بے شمار بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھا اور انگنت عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ تو دوسری طرف شعر و شاعری کے لیے نئے میدان کھلے، جن میں فخر، ہجو اور انتقامی جذبات کو ہوا دینے والے اشعار کی کثرت ہوئی اور اس سے جاہلی ادب مالا مال ہوگیا۔

قبیلہ عبس وذبیان میں داحس وغبراء کی لڑائی چالیس سال تک چلتی رہی اور اس کی بھینٹ ہزاروں لوگ چڑھے، اس وقت قبیلہ ذبیان کے دو رحم دل سرداروں ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کو اپنی قوم کی تباہی پر رحم آیا اور انہوں نے اپنی کوششوں سے دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرادی اور مقتولین کے خوں بہا کے طور پر تین ہزار اونٹ اپنی طرف سے ادا کیے۔ اس طرح یہ لڑائی ختم ہوئی۔

زہیر بن ابی سلمی ان سرداروں کی امن پسندی سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنے معلقے میں ان کی مدح سرائی کی اور ان کی فیاضی کو اثر انگیز انداز میں پیش کیا۔ خاص طور سے ''ہرم بن سنان'' کی توصیف میں بہت سے اشعار کہے، ہرم بن سنان زہیر بن ابی سلمی کی مدح سے بے انتہا خوش ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ زہیر بن ابی سلمی جب بھی اس کی ثناخوانی کرے گا یا اس سے کسی چیز کا طلب گار ہوگا یا صرف اس کو سلام ہی پر اکتفا کرے گا تو وہ اسے غلام یا لونڈی یا گھوڑا انعام میں عطا کرے گا۔ ہرم بن سنان کے اس طرزِ عمل سے زہیر بن ابی سلمی اس کی داد و دہش اور عطیات لیتے لیتے اُسے شرمندگی کا احساس ہونے لگا، وہ جب بھی کسی مجمع میں ہرم بن سنان کو دیکھتا تو بے ساختہ پکار اٹھتا، آپ سب کو میرا سلام ہو، سوائے ہرم بن سنان کے اور آپ میں جو سب میں بہترین تھا میں نے اسی کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔

زہیر بن ابی سلمی صاحبِ عقل وشعور، اصابتِ رائے رکھنے والا، زہد و ورع کا مجسم، امن و آشتی کا دلدادہ اور اللہ اور یومِ آخرت پر یقین رکھنے والا تھا، وہ ہجرت سے پہلے فوت ہوگیا۔ تاہم اس کے دونوں بیٹوں بجیر اور کعب نے صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اس کی شاعری پیچیدہ، غریب اور مشکل الفاظ سے پاک ہے۔ وہ تھوڑے الفاظ میں کثیر معانی بیان کرنے پر قادر تھا۔ وہ اپنی شاعری کو بنا سنوار کر پیش کرتا تھا، اسی لیے اس کو ''عبید الشعر'' کہتے ہیں۔ اس کے بعض قصائد ''حولیات'' کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک قصیدہ چار ماہ میں کہتا تھا، پھر چار ماہ اس کی نوک پلک سنوارنے میں لگا رہتا تھا، اس کے بعد چار مہینے خاص شعرا کے سامنے پیش کرتا تھا اور اس طرح ایک سال میں ایک قصیدہ مکمل کر کے لوگوں کو سناتا تھا۔

زہیر بن ابی سلمی کا معلقہ میمیہ ہے۔ یہ بحرِ طویل میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون حارث بن عوف اور ھرم بن سنان کی مدح ہے۔ جنھوں نے عبس و ذبیان کی تباہ کاریوں کا خاتمہ کرا کر ان کے مابین صلح کرائی تھی۔ شاعر ان کے فعل سے متاثر ہوتا ہے اور معلقے کی صورت میں ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ جاہلی روایت کے مطابق معلقے کی شروعات اپنی مطلقہ بیوی ام اوفی کی تشبیب سے کرتا ہے۔ اس کے بعد گریز کر کے ان سرداروں کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے جنھوں نے عبس و ذبیان کے خوں چکاں طویل معرکے کو اپنی سعی سے ختم کرایا اور اس ذیل میں جنگ کی ہولنا کی سے نفرت پیدا کرنے کے لیے اس کی تصویر کشی خوفناک اندز میں کرتا ہے۔ معلقے کے آخر میں اپنے تجربات اور طویل زندگی کے مشاہدات کا تذکرہ کرتا ہے اور ان میں آفاقی نقطۂ نظر کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

زہیر بن ابی سلمی ایک سلیقہ منداور ہنر مند شاعر تھا۔ اس کی زمزمہ سازی کا گہرا اثر عربوں کی معاشرتی زندگی پر پڑا اور عرب کے نامور مغنیوں نے اس کو خوب گایا۔

زہیر بن ابی سلمی کا کلام سلیس اور صاف شیریں پانی کی طرح ہے، جو پڑھنے والے کو سیراب کرتا ہے۔ اس کے مضامین میں پاکیزہ اور صاف ستھری باتیں پائی جاتی ہیں، جس سے اس کے کلام میں عفت مآبی کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ بعض دوسرے جاہلی شعرا کے کلام میں بھی حکمت و دانائی کی باتیں پائی جاتی ہیں، لیکن زہیر بن ابی سلمی ان سے ممتاز نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس کے کلام میں جنگ کی ہولنا کی، اخلاقِ

فاضلہ، اقدارِ عالیہ، کارگہِ ہستی کو چلانے والی ذات جس کے سامنے ہر چیز عیاں ہے اور موت وحیات کی حقیقت کا اظہار ایسے پیرایۂ بیان میں ہے جو دوسروں کے یہاں مفقود ہے اور اس کی وجہ سے اس کی شاعری دوسروں کے مقابلے میں فائق تر نظر آتی ہے۔

معلومات کی جانچ:

۱۔ زہیر بن ابی سلمی کو جاہلی دور کے طبقۂ اولی کے شاعروں میں کن خصائص کی وجہ سے شمار کیا جاتا ہے؟

۲۔ زہیر بن ابی سلمی کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۳۔ زہیر بن ابی سلمی کے والد کا کیا نام تھا؟

۴۔ زہیر بن ابی سلمی کے خانوادے میں کون کون سے شعرا تھے؟

۵۔ قبیلہ غطفان کے علاقے میں کون سی جنگ ہوئی؟

۶۔ قبیلہ عبس وذبیان میں ''داحس وغبراء'' کی لڑائی کتنے سال تک چلتی رہی؟

۷۔ کن دو سرداروں کی وجہ سے لڑائی ختم ہوئی؟

۸۔ زہیر بن ابی سلمی کا معلقہ کونسا قصیدہ کہلاتا ہے؟

4.5 عمرو بن کلثوم التغلبی

عمرو بن کلثوم کا تعلق قبیلۂ تغلب سے تھا۔ اس کا باپ کلثوم اپنی قوم کا سردار تھا۔ اس کی ماں عرب کے نامور سردار اور معروف شاعر مہلہل کی دختر تھی۔ عمرو بن کلثوم اپنی غیر معمولی ہمت وشجاعت کی وجہ سے شیرِ عرب کے لقب سے مشہور تھا، اس کی کنیت ابوالاسود تھی، پندرہ سال کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار منتخب ہوا۔ اس کی طبیعت شعرگوئی کے لیے موزوں تھی اور ذہن رسا تھا، یہ اپنے ایک قصیدے کی وجہ سے لازوال شہرت کا حامل ہوگیا۔

عمرو بن کلثوم کا خاندان جزیرہ فرات میں رہائش پذیر تھا، تغلب اور بکر بن وائل کے قبیلوں میں ایک لمبے عرصے تک جنگ رہی، اس کا نام جنگِ بسوس ہے۔ اس جنگ کی وجہ سے ان قبائل میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے درمیان حیرہ کے بادشاہ نے صلح کرادی، ایک موقعے پر غلاموں کے معاملے میں نزاع پیدا ہوا تو دونوں قبیلے تصفیے کے لیے بادشاہ عمر بن ہند کے پاس گئے۔ اس موقعے پر قبیلۂ بکر کا شاعر حارث بن حلزہ الیشکری اٹھا اور اپنا معروف قصیدہ اپنے قبیلے کی تعریف میں پڑھا، اس سے بادشاہ کا جھکاؤ قبیلۂ بکر بن وائل کی طرف ہوگیا۔ اس پر عمرو بن کلثوم وہاں سے ناراض ہوکر نکل گیا۔ بادشاہِ حیرہ کو عمرو بن کلثوم کی یہ روش پسند نہیں آئی اور اس نے عمرو بن کلثوم کو سرزنش کرنے اور اس کو رسوا کرنے کا پلان بنایا اور اپنے حاشیہ نشینوں سے دریافت کیا کہ کیا تم کسی ایسے عرب کو جانتے ہو، جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے میں ہتک محسوس کرے۔ انہوں نے عمرو بن کلثوم کی ماں لیلی کا نام بتایا، بادشاہ نے وجہ پوچھی، تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا باپ مشہور شاعر مہلہل بن ربیعہ ہے۔ اس کا ماموں کلیب بن وائل ہے جو عربوں کے بہادروں میں سے ہے۔ اس کا شوہر کلثوم بن مالک سردارِ قوم تھا اور اس کا بیٹا عمرو اپنے قبیلے کا بہادر سردار ہے۔ اس پر حیرہ کے بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو ملنے کی دعوت دی کہ وہ اپنی والدہ کی معیت میں آئے۔ عمرو بن

کلثوم اپنی والدہ اور اپنے قبیلے کے ہمراہ بادشاہ سے ملنے آیا۔ بادشاہ نے حیرہ اور فرات کے درمیان مہمانوں کے اعزاز کے لیے انتظام کیا اور اپنی سلطنت کے بعض دوسرے سرداروں کو بھی مدعو کیا۔ بادشاہ نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ عمرو بن کلثوم کی والدہ لیلی سے موقعہ دیکھ کر کسی کام کو کرنے کے لیے کہے۔ مہمانوں کے آنے پر ان کا شایانِ شان استقبال کیا، مردوں کو شاہی خیمے میں آرام کرایا اور عمرو بن کلثوم کی والدہ کو زنانہ خیمے میں لے جایا گیا۔ جب دسترخوان چنا گیا تو بادشاہ کی والدہ نے اپنے خدام کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور عمرو بن کلثوم کی والدہ سے کہا کہ بہن! ذرا مجھے یہ طبق بڑھادو۔ اس پر لیلی نے کہا کہ جس کو ضرورت ہو وہ خود ہی اپنا کام کرے لیکن بادشاہ کی والدہ نے دوبارہ درخواست کی تو اس پر لیلی چیخ پڑی: ہائے یہ ذلت! ہائے کہاں ہوائے تغلب والو! جیسے ہی عمرو بن کلثوم نے اپنی والدہ کا یہ واویلا سنا، تو چراغ پا ہو گیا، خیمے میں بادشاہ کی تلوار آویزاں تھی، اس کو جھپٹ کر اٹھایا اور اسی سے بادشاہ عمرو بن ہند کی گردن اڑادی اور اپنے قبیلے والوں کو حکم دیا کہ وہ سب کچھ لوٹ لیں اور واپس روانہ ہوجائیں۔ تغلبیوں نے سارا ساز وسامان لوٹ لیا اور عمرو بن کلثوم ان کے ہمراہ اپنے علاقے میں واپس چلا گیا۔ اس اہم واقعے کے بعد اس نے اپنا معلقہ کہا جو شہرت کی بلندی کو پہونچا۔

عمرو بن کلثوم اس معلقے کی شروعات ساغر و ساقی کے ذکر سے کرتا ہے۔ اس کے بعد محبوبہ کے حسن اور اس کے فراق کا تذکرہ کرتا ہے۔ پھر حیرہ کو مخاطب کرکے اپنی قوم کی معرکہ آرائیوں اور ان کے جان لیوا حملوں کا ذکر دراز کرتے ہوئے آخر تک چلا جاتا ہے۔ عمرو بن کلثوم نے اپنا یہ قصیدہ عکاظ کے میلے میں سنایا تو اسے اس سال کے بہترین قصیدے کا لقب ملا۔ اس قصیدے کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور قبیلۂ تغلب کے لوگوں نے اس کو حرزِ جاں بنالیا۔

عمرو بن کلثوم کے اس قصیدے میں حسنِ الفاظ، موزوں عبارت، جاذب اسلوب، فخر، بلند مقصد اور معنی وخیال کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ عمرو بن کلثوم کی شاعری کم ہونے کے باوجود عربوں کی معاشرتی حالت کے سلسلہ میں معلومات سے بھرپور ہے۔ چنانچہ اس سے عربوں کے مذہبی عقائد، معاشرتی حالات، روزمرہ کے مشاغل، ان کی صنعت وحرفت اور کھیل کود کے مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔ نیز بعض عرب عورتوں کا بتوں کا طواف کرنا، اس کے ساتھ مذہبی رقص میں حصہ لینا، معاشرتی زندگی میں جنگ کے وقت مردوں کے ساتھ رہنا، جانوروں کو چارہ کھلانا، ان کو لڑنے مرنے پر برانگیختہ کرنا، کپڑوں کی رنگائی کے لیے ارغوانی رنگ کا استعمال کرنا، تیروں کو سیدھا کرنے کے لیے ثقاف یعنی لوہے کے خاص اوزار کا استعمال کرنا، کپڑوں کی رنگائی کے لیے دکانوں کا ہونا، دھونکنی کے لیے آگ تیز کرکے کانٹے اور بندے بنانا، بچوں کا لکڑی کی تلواروں سے کھیلنا اور نوجوانوں کا نرم زمین میں فٹ بال کی طرح کھیل میں مصروف ہونا وغیرہ ہے۔ ان تاریخی دستاویزات کے علاوہ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو فخر ومباہات کے ساتھ پیش کرنا، اپنے قبیلہ کی معرکہ آرائیوں میں سبقت اور دشمنوں پر ان کی فتوحات اور اپنے کو ایسے شجاع کے طور پر پیش کرنا جس کے سامنے بڑے سے بڑا سورما ٹھہر نہ سکتا ہو۔ کثرت تعداد کے بیان میں یہ کہنا کہ جب ہم زمین پر چلتے ہیں تو اسے انسانوں سے بھر دیتے ہیں اور جب سمندر میں اترتے ہیں تو اس پر اپنی کشتیوں سے چھاجاتے ہیں اور دوسروں پر ہمارا رعب اس قدر ہوتا ہے کہ جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو پہونچتا ہے تو اسی وقت سے اس کے سامنے بڑے بڑے جابر اور سرکش لوگ سجدہ کرنے لگتے ہیں۔

عمرو بن کلثوم کا معلقہ دوسرے معلقات کے مقابلے میں زبان و بیان کے اعتبار سے سہل ہے اور اس میں ایسی سلاست ہے کہ جب کوئی اسے شروع کرتا ہے تو پڑھتا ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ قصیدے کو ختم کیے بغیر اسے نہیں چھوڑتا ہے۔

معلومات کی جانچ :

۱۔عمرو بن کلثوم کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۲۔عمرو بن کلثوم کے والد کا نام کیا تھا؟

۳۔عمرو بن کلثوم کا قبیلہ کس علاقے میں تھا؟

۴۔عمرو بن کلثوم کا بادشاہِ حیرہ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا؟

۵۔عمرو بن کلثوم کی والدہ کو بادشاہِ حیرہ کی والدہ نے کیا کہا؟

۶۔عمرو بن کلثوم کو بادشاہِ حیرہ نے کیوں بلایا؟

۷۔عمرو بن کلثوم کا معلقہ دوسرے معلقات کے مقابلے میں کیسا ہے؟

4.6 طرفہ بن العبد البکري : حیات اور شاعری

طرفہ بن العبد کا نام عمرو، کنیت ابوعمرو اور شہرت طرفہ سے ہوئی۔اس کے القاب میں قتیل بنی بکر یعنی بنوبکر کا مقتول، ابن العشرین یعنی جوان بست سالہ اور الغلام القتیل یعنی مقتول لڑکا ہے۔اس کا تعلق قبیلہ ربیعہ کی شاخ بکر بن وائل سے تھا۔طرفہ کا نسب عالی اور خاندان ثروت مند تھا، جو بحرین اور یمامہ کے علاقوں میں رہائش پذیر تھا۔یہ خلیج عرب کا ساحلی علاقہ تھا، یہیں طرفہ کی پیدائش ہوئی ، بچپن ہی میں اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، اس کے چچاؤں نے اس کی تربیت پر توجہ نہ دی۔ وہ لاابالی اور منہ پھٹ ہوگیا۔اس کو شاعری ورثے میں ملی۔شاعرانہ صلاحیتیں بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگیں۔اس کا ماموں ''متلمس'' بنوقیس بن ثعلبہ کی محفل میں ایک دن شعر گوئی کر رہا تھا۔اس کے ایک شعر میں ایک نامانوس لفظ "الصیعریة" آیا۔ جو اونٹنی کے ساتھ مخصوص ہے، مگر متلمس نے اس لفظ کو اونٹ کے لیے غلطی سے استعمال کر دیا۔طرفہ قریب میں لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف تھا۔اس نے اس لفظ کو سنا تو اپنے ماموں پر برجستہ جملہ کس دیا کہ "استنوق الجمل" لیجیے اونٹ اونٹنی ہوگیا۔ جملہ اس قدر برمحل تھا کہ آج تک ضرب المثل ہے۔اس کا ترجمہ اونٹ اونٹنی کی طرح مسکین ہوگیا، لیکن محاورے میں عزت کے بعد ذلیل ہونے والے کے لیے مستعمل ہے۔متلمس نے طرفہ کو بلایا اور کہا " زبان نکالو" دیکھا تو زبان سیاہ تھی، اس پر متلمس نے اس کی زبان اور اس کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا" اِس سے اس پر ہلاکت آئے گی" اور یہی ہوا۔

طرفہ بن العبد کے باپ کے انتقال کے بعد اس کے چچاؤں نے اس پر توجہ نہ دی۔اس کی ماں "وردہ" اپنے بچوں کے ساتھ کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہی تھی ، اس سے طرفہ کے معصوم دل پر چوٹ لگی، اس نے اپنے چچاؤں کی ہجو میں کچھ اشعار کہہ دیے۔

طرفہ بن العبد نے لہوولعب میں زندگی گزاری، اس کا ہاتھ کھلا ہوا تھا ، اس کو جو کچھ میسر آتا تھا ، اس کو دوستوں کی محفلوں میں خرچ کر دیتا تھا، طرفہ کی ہمشیرہ عبد عمرو بن بشر سے منسوب تھی ، جو بڑا نامی سردار تھا، حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے درباریوں میں بڑا معزز تھا۔بیوی کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہ تھا۔بہن نے شوہر کی بدسلوکی کا تذکرہ اپنے بھائی طرفہ سے کیا، طرفہ نے اپنے بہنوئی کی ہجو میں کچھ اشعار کہے، جو زبان زد ہوگئے۔ان اشعار میں اس کے کھانے کی کثرت اور زنانہ پن پر پھبتیاں کسی گئی تھیں۔

شعرائے حیرہ کے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتے، اس کی شان میں مدحیہ قصیدے پڑھتے اور انعام سے نوازے جاتے۔ جب طرفہ نے عیش وطرب میں اپنا تمام مال اڑادیا، تو یہ اپنے ماموں متلمس کے ساتھ عمرو بن ہند کے دربار میں پہونچا، بادشاہ نے دونوں ماموں، بھانجے کی خوب آؤبھگت کی اور اپنے بھائی قابوس بن ہند کا مصاحب بنادیا، قابوس عمرو کے بعد بادشاہت کے لیے نامزد تھا۔

طرفہ یتیم ہونے کے بعد اعزہ واقارب کی قساوت قلبی کا شکار ہوگیا، اور گھر کی رہائش کو خیر باد کہہ دیا اور آزاد ماحول میں زندگی کی رنگینیوں کا مزہ لینے کو لگا، اس زمانے میں اس کے بھائی معبد کے بہت سے اونٹ لا پتہ ہو گئے جو تلاش بسیار کے بعد بھی نہ ملے تو طرفہ اپنے چچازاد بھائی مالک کے پاس گیا کہ وہ معبد کے اونٹوں کو ڈھونڈ ھنے میں اس کا ساتھ دے، لیکن مالک نے اس کو جھڑک دیا اور کہا پہلے تو تم کو اونٹوں کی فکر نہ ہوئی تو اب ان کے کھو جانے کے بعد تمہارا غم کرنا کیسا ہے؟ طرفہ کے دل کو مالک کے جواب سے ٹھیس پہنچی، اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوا اور اسی جذباتی اشتعال میں اس نے یہ معلقہ کہا۔ اس کا معلقہ دالیہ ہے اور یہ معلقات میں سب سے طویل ہے۔ اس میں ایک سو پانچ اشعار ہیں۔

معلقہ کی شروعات عربی شاعری کے رواج کے مطابق محبوبہ خولہ کے پڑاؤ کی جگہ بچے نشانات کے تذکرے سے کرتا ہے وہاں شاعر خود کو ماضی کی یادوں میں سونپ دیتا ہے اور جذبات کی رو میں بہ کر محبوبہ کے کوچ کے منظر کو تفصیل سے بیان کرتا ہے اور اس ذیل میں محبوبہ کے سراپا کی تعریف انوکھی تشبیہات سے بیان کرتا ہے جو دلوں کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں اس کے بعد محبوبہ کی اونٹنی کی توصیف بیان کرتا ہے اور اونٹنی کی تشریح اعضا کے ضمن میں ایسی اچھوتی تشبیہیں تراشا ہے جو کہیں نہیں ملتی ہیں، اس کے بعد اپنی صفات فخر کے انداز میں بیان کرتا ہے کہ وہ مرد میدان بھی ہے اور رند میکدہ بھی، کڑے وقت میں قبیلہ کا دفاع کرنے والا بھی، مظلوم کا دادرس اور بے دریغ اونٹ ذبح کر کے ضرورت مندوں کو کھلانے والا بھی، یہ اشعار اس کو لافانی بناتے ہیں اور آخر میں حکمت و دانائی اور فلسفۂ اخلاق کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہایت سادہ لفظوں میں زمانے کے انقلاب کا ذکر کرتا ہے۔

طرفہ موت وحیات کے فلسفے کو انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے، جو لوگ دنیا اور اس کی فنائیت اور سرمستی کی زندگی جینے پر اس کو نشانہ بناتے تھے، ان کو جواب دیتا ہے کہ زندگی ختم ہونے والی ہے، دنیا میں ہیشگی ممکن نہیں، ایک دن موت اپنا شکنجہ کس لے گی، لہذا موت سے پہلے اپنے مال و دولت سے فائدہ اٹھالو اور عیش کوشی میں اس کو خرچ کر ڈالو کیونکہ موت آکر تمام چیزوں سے ہمیں دور کر دے گی، پھر زندگانی کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ موت بخیل اور سخی دونوں کو آتی ہے، دونوں قبر میں ابدی نیند سو جاتے ہیں اور مٹی کے ڈھیروں میں دبے رہتے ہیں اور موت بخیل و سخی دونوں کے مال کو چن لیتی ہے اور زندگی ایک ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جو ہر شب گھٹتا ہے، اور گردش زمانہ جس کو روزانہ گھٹاتے رہیں وہ گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتا ہے اور موت کا معاملہ ڈھیلی رسی کی طرح ہے، جس کے دونوں کنارے کھینچنے والے کے ہاتھ میں ہیں، جب کسی کنارے کی رسی کو کھینچ لیا جائے گا وہ موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔

اس طرح کی بیشمار خصوصیات اس کے معلقے کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ موت نے اس کو موقعہ نہ دیا اور جوانی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے اس کی طرف منسوب کیے جانے والے اشعار کی تعداد قلیل ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے۔ جس میں اس کے کہے ہوئے متفرق اشعار موجود ہیں۔ جمع کرنے والے نے ان کو جمع کرنے میں سخت محنت سے کام لیا ہے۔

معلومات کی جانچ:

۱۔طرفہ بن العبد کا پورا نام کیا تھا؟

۲۔طرفہ بن العبد کو ابن العشرین کیوں کہتے ہیں؟

۳۔طرفہ بن العبد کا قبیلہ کہاں رہائش پذیر تھا؟

۴۔طرفہ بن العبد نے ''استنوق الجمل'' کب کہا؟

۵۔طرفہ بن العبد کی ماں کا نام کیا تھا؟

۶۔طرفہ بن العبد کی موت کیسے ہوئی؟

۷۔طرفہ بن العبد کا معلقہ کونسا قصیدہ کہلاتا ہے؟

۸۔طرفہ بن العبد کے معلقہ میں کتنے اشعار ہیں؟

4.7 عنترہ بن شداد العبسی - حیات وشاعری

عنترہ بن شداد کا تعلق بنوعبس سے تھا۔اس کی ماں "زبیبہ" ایک حبشی کنیز تھی۔عنترہ کی پیدائش اسی لونڈی کے بطن سے ہوئی،عنترہ کو سیاہ رنگت اپنی ماں سے ورثے میں ملی،عربوں کا دستور تھا کہ جو اولاد باندی کے پیٹ سے پیدا ہوتی تھی،اس کو بھی غلام کا درجہ ملتا تھا اور اس سے غلاموں والے کام لیے جاتے تھے،یہی معاملہ عنترہ کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ عنترہ کے ذمہ غلاموں کے بہت سے کام تھے۔اس پر مستزاد گھوڑوں اور اونٹوں کی گلہ بانی کی خدمت بھی اسی کے ذمے تھی،اس کو اپنی سیاہ رنگت اور کنیز زادہ ہونے کا طعنہ بھی دیا جاتا تھا،ان تمام کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کے خاندان میں ایک اچھوت کی زندگی گزارتا تھا، چونکہ وہ بہت حساس تھا،اس لیے اس نے اپنی زندگی کی راہ الگ نکالی اورفنونِ حرب اور شہ سواری میں مہارت حاصل کی اور نام ورشجاع سمجھا جانے لگا،ایک مرتبہ کسی قبیلے نے عبسیوں پر دھاوا بول دیا اور ان کے اونٹ اور گھوڑے بھگا لے گئے،اس موقعہ پرعنترہ کے باپ شداد نے مقابلہ میں اپنی ہزیمت کے آثار دیکھے توعنترہ سے کہا "کرَّ یا عنترۃ" اے عنترہ حملہ کر! چونکہ عنترہ کوغلام کا درجہ دیا جاتا تھا،اس لیے اس نے برجستہ جواب دیا۔ "العبد لا یُحسن الکرّ ، إنما یُحسِنُ الحلاب و الصرّ" یعنی غلام حملہ کرنا کیا جانے،وہ تو دودھ دوہنا اور تھنوں کو باندھنا جانتا ہے،اس پر باپ نے کہا،"کرّ وأَنتَ حُرٌ"تم آزاد ہو،دشمن پر حملہ کرو،یہ سن کرعنترہ پرخوشی کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا،کشتوں کے پشتے لگادیئے،دشمنوں کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ اونٹ اور گھوڑے چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگے اور عنترہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو لے کر واپس آیا،اس قابلِ فخر کارنامہ کا یہ اثر ہوا کہ شداد نے اس کو اپنے نسب میں شمولیت دی اور عرب کے دیگر قبائل کے لوگ اسے عبس کے سردار اور ایک نامور شہسوار کی حیثیت دینے لگے۔ چنانچہ اس نے داحس وغبراء کی معرکہ آرائیوں میں بنوعبس کی قیادت کی اور بڑی جانبازی کا مظاہرہ کیا،اس کی بسالت اورفنونِ حرب وضرب کی لیاقت کی وجہ سے لوگ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور بہادری کی شہرت میں اس کوضرب المثل کا درجہ دیا گیا۔کچھ مبالغہ آمیز حکایتیں بھی اس کی طرف منسوب ہوئیں اور ان کوعوامی داستانوں اور قصوں کے ہیرو کی حیثیت حاصل ہوئی ان کی شہرت اب تک عرب ممالک میں پائی جاتی ہے۔

عنترہ بن شداد کو سپہ گری میں مہارت اور قبیلہ عبس کے نوجوانوں میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ عنترہ کو اپنی چچازاد بہن "عبلہ" سے محبت ہوگئی، اس نے چاہا کہ اس کا چچا اس کو اپنی دامادی میں لے لے، اس کے لیے اس نے جاہ وحشم کے حصول اور بہادری میں نام پیدا کیا، لیکن چچا کو اس کے غلام ہونے کی وجہ سے حائل ہا۔ لیکن جب اس کے باپ نے اس کو آزاد کر دیا، تو اس کے چچا نے اپنی بیٹی "عبلہ" سے بخوشی اس کی شادی کردی۔ چنانچہ جب ہم عنترہ کے غلامی کے دور کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں اس دور کی شاعری روکھی پھیکی انداز کی ملتی ہے۔ لیکن جب اس کو آزادی مل گئی اور غلامی کا طوق اس کی گردن سے اتر گیا تو اس میں ہمت و جواں مردی بھر گئی اور اس کے ساتھ عبلہ کی محبت کے طوفان نے اس کے دل میں ہیجانی کیفیت پیدا کردی۔ اس وقت اس کے اشعار کا پایہ بہت بلند ہوگیا۔

عنترہ بن شداد کے معلقہ کہنے کی وجہ یہ مذکور ہے کہ قبیلۂ عبس کے ایک شخص نے اس کو کالے پن اور حبشی ماں کا طعنہ دیا، تو عنترہ نے کہا کہ تمہارا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ میں جنگوں میں بے دھڑک کود پڑتا ہوں، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا ہوں، مالِ غنیمت میں سے بے دریغ لوگوں کے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔ اس پر عبسی نے کہا کہ میں تم سے اچھے شعر کہتا ہوں۔ عنترہ نے جواباً کہا کہ تم کو جلد معلوم ہوجائے گا کہ کون اچھے اشعار کہتا ہے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اس نے اپنا یہ لاثانی معلقہ نظم کیا اور لوگوں کو سنایا تو اس کے مخالف کا منہ بند ہوگیا۔ جس کو بعد میں سونے کے پانی سے لکھ کر کعبہ شریف کے اندر لٹکایا گیا۔

عنترہ بن شداد کا معلقہ بحرِ کامل میں ایک میمیہ قصیدہ ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد میں اختلاف ہے، جو پچھتر سے پچاسی تک بتائی جاتی ہے۔ قصیدے کی شروعات عرب کے شعرا کے دستور کے مطابق تشبیب سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد محبوبہ کے حسن اور بعض اعضا کی توصیف کی گئی ہے۔ پھر محبوبہ کے قیام گاہ سے کوچ کرنے کی حالت اور اس کو لے جانے والی اونٹنی کے اوصاف کا ذکر کرتا ہے۔ اپنی خوبی بیان کرتا ہے کہ وہ کبھی ظلم نہیں کرتا ہے اور نہ کوئی اس پر ستم کرنے کی ہمت کرسکتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے۔ لیکن تہذیب وشرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ہے۔ پھر اپنی شجاعت کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے اور اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوکر اپنی جوانمردی، بلانوشی اور جود وسخا کا تذکرہ کرتا ہے اور یہ سلسلہ دراز ہوتا ہے پھر اپنے اعلی اخلاق وکردار کا ذکر کرتا ہے اور اس کو اپنی طرف مائل ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ عنترہ کے معلقے کے الفاظ سہل اور شگفتہ ہیں بیان کا انداز دلکشی لیے ہوئے ہے اور فصاحت وبلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔

عنترہ بن شداد کو بہت طویل عمر عطا ہوئی، بڑھاپے نے اس کی طاقت سلب کرلی، وہ قبیلہ بنو طے کے ساتھ ایک معرکہ میں قید کرلیا گیا اور دشمنوں نے اسے قتل کردیا، یہ واقعہ 615 کا ہے اور بعض نے 600 تحریر کیا ہے۔

4.8 لبید بن ربیعہ العامری حیات اور شاعری

لبید بن ربیعہ نام، ابوعقیل کنیت، مضری قبیلہ بنو عامر کا ہر دل عزیز اور مشہور شاعر تھا۔ یہ زمانہ کے اعتبار سے "مخضرم" یعنی زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں سے فائدہ اٹھائے ہوئے ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا اکثر حصہ جاہلی دور کی یادگار رہے۔ اس لیے ان کا شمار جاہلی شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ان کے والد ربیعہ اپنی داد و دہش اور غربا نوازی کی وجہ سے "ربیع المقترین" تنگ دستوں کی بہار کے نام سے جانا جاتا تھا اور چچا ابو براء عامر بن مالک قبیلہ مضر کا بھادر شہسوار "ملاعب الأسنة" کہلاتا تھا اور ماں بنوعبس سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ سنِّ شعور ہی

سے شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ یہ فطری ذوق آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا اور یہ بلند مرتبہ شعرا میں شمار ہونے لگے۔ ایک روایتی صحرا نشینی کی زندگی گزاری۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ حکمت و دانش اور پند و نصیحت سے لبریز ہے۔ یہ وسیم، باعزت، لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے والے، دریا دل اور متحمل مزاج تھے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کی شاعری اور شہسواری کی شہرت تھی، کلامِ ربانی کی اثر انگیزی سے متاثر ہوئے اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔ اس شرف کی وجہ سے عربوں میں ان کی عزت بہت بڑھ گئی، لبیدؓ کو عرب کے "معمرین" میں شمار کیا گیا ہے۔ اسلام کے بعد شاعری کے بجائے قرآن سے شغف بڑھ گیا، اس کو حفظ کیا اور اس کی تلاوت اور اس پر عمل کرنے میں اپنے کو لگا دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کوفہ کے شعرا سے اسلام کے متعلق کچھ اشعار لکھنے کی فرمائش کی، تو انہوں نے تحریر کر دیئے پھر یہی مطالبہ حضرت لبید سے بھی کیا گیا، تو آپ نے معذرت کر دی اور سورہ بقرہ کی آیات تحریر کر کے بھجوا دیا اور کہا کہ اس کلام کی موجودگی میں میں اشعار نہیں کہہ سکتا " قد اَبدلنی اللہ بالشعر سورۃ البقرۃ و آل عمران " یعنی اللہ نے سورہ البقرہ اور سورہ آل عمران شعر کے بدلہ میں عطا کر دیئے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور ڈھائی ہزار دینار وظیفہ مقرر کر دیا اور ایک طویل عمر گذارنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اپنے رب سے جا ملے، رضی اللہ عنہ و رضوا عنہ۔

لبید بن ربیعہ کی شاعری کی ابتدا کی بابت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے قبیلے اور ان کے ماموں کے قبیلے بنو عبس میں دشمنی تھی۔ دونوں قبیلوں کے وفود حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے یہاں جمع ہوئے۔ عبسی قبیلہ کا سردار ربیع بن زیاد تھا، جو نعمان کے مقربین میں سے تھا اور عامریوں کا سردار ملاعب الاسنہ تھا، ربیع نے نعمان کو عامریوں کے خلاف برانگیختہ کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے انہیں وہاں عزت نہیں دی گئی۔ یہ لوگ وہاں سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے واپس آئے۔ لبید ان کے جانوروں کو چرایا کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کا بچپنہ تھا۔ اس لیے اس کو کچھ نہ بتایا۔ لبید نے ان کے چہروں کو دیکھ کر تاڑ لیا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ اس نے اصرار کیا تو انہوں نے اس کو صورتِ حال سے آگاہی دی۔ تو لبید نے کہا کہ ہم بادشاہ کے پاس دوبارہ حاضری دیں گے اور عبسیوں سے اپنی اہانت کا بدلہ ضرور لیں گے۔ لبید نے اس معاملہ میں کلیدی رول ادا کیا اور یہ کہا کہ میں بذاتِ خود اس کی ایسی خبر لوں گا کہ اس کے تعلقات بادشاہ سے بگڑ جائیں گے۔ عامریوں نے اس کا امتحان لیا اور اس کے سامنے تَرِبَہ نامی ایک بوٹی تھی، اس کے عیوب بیان کرنے کو کہا، تو لبید نے برجستہ کہا " هذه التربة لا تذكي نارا، و لا تؤهل دارا، و لا تسرّ جارا، عودها ضئيل و خيرها قليل و فرعها كليل، وأشدّها قلعا ۔۔ " یہ بوٹی نہ آگ جلاتی ہے، نہ گھر میں پیدا ہوتی ہے، اس کے پڑوسی اس سے خوش نہیں ہوتے ہیں، اس کی لکڑی کمزور ہوتی ہے، اس کا فائدہ بہت کم ہے، اس کی شاخ کمزور ہے، چراگاہ کی بوٹیوں میں یہ بری ہیئت کی ہوتی ہے، اس کی شاخ اور اکھاڑنے میں سخت ہوتی ہے۔ اس کو سن کر لوگوں کو سکون ہوا کہ یہ اپنے قبیلے کی دفاع میں مقابل کی بہترین ہجو کر سکتا ہے۔ چنانچہ بنو عامر لبید کو اپنے ساتھ دربار میں لے گئے اور اس نے ربیع بن زیاد کی ہجو سخت الفاظ میں کی، جس میں اس نے یہ بیان کیا کہ ربیع کے دبر پر برص کے چمکتے ہوئے داغ ہیں اور یہ اپنی دبر میں انگلی داخل کرتا ہے اور انگلی کو جڑ تک پہونچا دیتا ہے۔ گویا وہ کسی ودیعت رکھی ہوئی چیز کا طلب گار ہے۔ ربیع بادشاہ کے ساتھ کھانے میں مشغول تھا، بادشاہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ربیع سر سے پاؤں تک ہل گیا اور اس کی چیخ نکل گئی، اس نے دھاڑتے ہوئے کہا کہ یہ جھوٹا ہے اور کمینے کی اولاد ہے، لیکن بادشاہ نعمان نے مخاصمت کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا

اور کہا: اُفّ لهذا الغلام لقد خبث علیٰ الطعام۔

بادشاہ نے دونوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی ۔ اس کا دل ربیع سے پھر گیا اور اس نے عامریوں کی توقیر کی اور اپنی قربت عطا کی اور ان کو بخشش دے کر رخصت کیا۔

ادھر ربیع بن زیاد بھی بادشاہ سے رخصت ہو کر گیا اور زندگی بھر دوبارہ ادھر کا رخ نہ کیا، تاہم نعمان نے اسے تسلّی کا خط لکھ کر بلایا لیکن ربیع نے جواب دیا کہ جو بات آپ کے دل میں آچکی ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ اس کی صفائی کے لیے میں اپنا ستر کھول کر آپ کو دکھاؤں یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ لہذا میری طرف سے معذرت قبول کیجیے۔ اس طرح قبیلہ بنو عامر اپنے مخالف سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارہ پا گئے۔

اس واقعے کی شہرت پورے عرب میں ہوگئی اور لبید کو لوگ بطور شاعر جاننے لگے اور اس کے بعد لبید کے چھوٹی بڑی ہر قسم کے قصیدوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک بار نابغہ ذبیانی نے لبید کو بادشاہ کے یہاں دیکھا، تو اس کی آنکھوں میں نابغہ کو شاعری کی رمق محسوس ہوئی، اس پر نابغہ نے پوچھا کہ کیا تم کچھ کہتے ہو، جواب میں لبید نے اپنے کچھ اشعار اس کو سنایا، تو نابغہ نے خوش ہو کر کہا کہ جاؤ تم قبیلۂ قیس کے سب سے بڑے شاعر ہو۔

لبید بن ربیعہ عامری کی شاعری اس کی زندگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ناقدینِ ادب کا بیان ہے کہ لبید کی شاعری کے سلسلے میں فیصلہ کرنے کے لیے اس کا معلقہ اور اس کی رثائی شاعری معاون ہے۔ لبید نے کم عمری ہی سے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ یہ بہت خوددار تھے۔ اس لیے شاعری کو غمِ روزگار نہیں بنایا۔ اس کی شاعری میں تفاخر کا احساس، بسالت، سخاوت، پڑوسیوں کی معاونت اور قبیلے کی توقیر کا پاس، جوش میں ہوش کا غلبہ، عقیدے کی نظافت، پند و نصائح، الفاظ میں تمکنت اور اس میں نگینے کی طرح جڑاؤ پائے جاتے ہیں۔ مرثیے میں ایک دکھ کے مارے ہوئے غم سے نڈھال انسان کے جذبات کی عکاسی اثر انداز اسلوبِ بیان اور دل کے تاروں کو جھنجھنا دینے والے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے معلقہ میں الفاظ پُرشکوہ اور اسلوب میں البیلا پن ہے۔ اس میں بادیہ نشینوں کی زندگی کی جھلکیاں اور ان کے اخلاق و عادات کی سچی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور اس کے شانہ بہ شانہ رغبت والوں کی خواہشوں کا اظہار اور دل والوں کی تمناؤں کا بیان چلتا ہے۔

لبید بن ربیعہ عامری کے معلّقے میں اٹھاسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک میمیہ قصیدہ ہے اور بحر طویل میں ہے۔ اس کے مضامین روایتی ہیں۔ لیکن اسلوب میں نیا پن ہے۔ قصیدے کی شروعات تشبیب سے ہوتی ہے۔ محبوبہ کے اجڑے دیار کا ذکر غم ناک انداز میں کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنی اونٹنی کی صبا رفتاری کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کی برق رفتاری کو گورخر اور نیل گایوں سے تشبیہ دے کر حیوانی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنی زندگی کے لذیذ مشغلوں کے ضمن میں اپنی سخاوت اور قوت و شوکت کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں صداقت اور توازن پایا جاتا ہے۔

لبید بن ربیعہ عامری کو معلقات کے شعرا میں سب سے کم سن اور موت کے استقبال میں سب سے آخری شخص شمار کیا گیا ہے۔

معلومات کی جانچ:

۱۔ لبید بن ربیعہ کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۲۔ لبید کے والد ربیعہ کو "ربیع المقترین" کیوں کہا جاتا تھا؟

۳۔ ملاعب الاسنہ کس کا لقب تھا؟
۴۔ لبید بن ربیعہ کا انتقال کب ہوا؟
۵۔ لبید بن ربیعہ کی والدہ کس قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی؟
۶۔ لبید بن ربیعہ کا معلقہ کس چیز کی منہ بولتی تصویر ہے؟
۷۔ لبید بن ربیعہ کو معلقات کے شعرا میں عمر کے حساب سے کیسا شخص شمار کیا گیا ہے؟
۸۔ لبید بن ربیعہ کا معلقہ کون سی بحر میں ہے؟
۹۔ لبید بن ربیعہ کے معلقے میں کتنے اشعار ہیں؟

4.9 حارث بن حلزہ الیشکری: حیات اور شاعری

ابو الظلیم حارث بن حلزہ قبیلہ بکر کا شاعر تھا۔ اس کو بھی عمرو بن کلثوم اور طرفہ بن العبد کی طرح صرف ایک قصیدہ کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ یہ قصیدہ اس نے عمرو بن ہند بادشاہِ حیرہ کے سامنے موقعے کے مناسبت سے کہا اور بادشاہ کا فیصلہ اپنے قبیلے کے حق میں کرالیا۔ اس کو بھی طویل عمر عطا ہوئی اور "معمرین" میں شمار کیا گیا۔

بکر اور تغلب دو بھائی تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان دشمنی تھی اور سخت تھی، ان میں نوبت لڑائی تک پہونچی اور اس کا سلسلہ طویل ہوا۔ اس لڑائی کو ایام العرب میں "حرب البسوس" کہتے ہیں۔ حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء نے دونوں کے درمیان مصالحت کرادی اور دونوں قبیلے سے سو سو غلام ضمانت کے طور پر لیے، تاکہ اگر کسی قبیلہ سے دوبارہ زیادتی سرزد ہوجائے، تو مظلوم قبیلہ کو وہ سو غلام دے دیے جائیں گے۔ منذر کے بعد اس کے بیٹے عمرو بن ہند بادشاہ ہوا تو اس نے بھی اس صلح نامہ کا خیال رکھا، ضمانتی غلام بادشاہ کی حمایت میں رہے اور اس کی خدمت کرتے رہے۔ ایک بار انہیں کسی کام کے لیے بھیجا گیا اور یہ بنوشیبان کے ایک کنویں کے پاس پہونچے، وہاں ان کے مابین تو تو میں میں ہوگئی، نوبت لڑائی جھگڑے تک پہونچ گئی، مقابلہ آرائی ہوئی اور اس موقعہ پر بنوبکر کے غلام دبنگ پڑ گئے، انہوں نے بنوتغلب کے غلاموں کو مار پیٹ کر وہاں سے بھگادیا، بھاگنے میں ان کا رخ ریگستان کی طرف ہوگیا اور وہ ان کی گرم ہواؤں کے لپیٹ میں آگئے۔ انہیں وہاں پانی بھی نہ مل سکا اور دم لینے کا موقعہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرم ہواؤں کے جھکڑوں اور پیاس کی شدت نے انہیں ہلاکت سے دوچار کردیا۔ جب تغلبیوں کو اس جاں کاہ حادثہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے بنوبکر سے اپنے غلاموں کی ہلاکت کا تاوان طلب کیا۔ انہوں نے خون بہا دینے سے منع کردیا۔ یہ معاملہ عمرو بن ہند کے سامنے پیش ہوا، اس مقدمے میں تغلبیوں کا وکیل ان کا سردار اور شاعر عمرو بن کلثوم تھا اور بکریوں کا وکیل نعمان بن ہرم۔ مقدمہ کی پیشی میں وکالت کے دوران نعمان نے کچھ ناشائستہ جملے کہہ دیے۔ جس سے بادشاہ کے پندار کو ٹھیس پہونچی، وہ بکریوں سے ناراض ہوگیا۔ مجلس میں حارث بن حلزہ موجود تھا۔ اس نے تاڑ لیا کہ بادشاہ کا فیصلہ تغلبیوں کے حق میں ہونے والا ہے۔ وہ جہاندیدہ، بردبار اور حکیم و دانا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے اپنا مشہور معلقہ برجستہ بادشاہ کے سامنے کہا۔ اس قصیدے میں وہ سوچ سمجھ کر تیکھے وار عمرو بن کلثوم پر کرتا رہا، عمرو بن کلثوم نے اپنے معلقے کے کچھ اشعار فی البدیہ کہے۔ جس میں جوش وطنطنہ تھا۔ بادشاہ پر اس کا اثر ہوا تھا، لیکن اس تاثیر کو حارث بن حلزہ اپنی دانائی سے کافور کرتا رہا اور ایسا میٹھا وار کرتا رہا، جس سے عمرو بن کلثوم کے کلام کی تاثیر زائل ہوتی قوم کے کارناموں کا

تذکرہ دلکش پیرایہ بیان میں کرتا اور تغلبیوں کے جوش وخروش کی وجہ سے ان کو معرکہ آرائی کا مورد قرار دیتا۔ درمیان میں عمرو بن ہند اور اس کی قوم کی توصیف کرتا، تاکہ وہ بکریوں کی طرف مائل ہوجائے اور ان کے حق میں فیصلہ کردے۔ اس دانش مندانہ کلام کی تاثیر یہ ہوئی کہ بادشاہ نے بکریوں کے حق میں فیصلہ سنادیا۔ جس سے ناراض ہوکر عمرو بن کلثوم اپنے قبیلہ کے ساتھ اپنے علاقہ میں چلا گیا۔

اغانی میں یہ مذکور ہے کہ حارث بن حلزہ کے جسم پر کوڑھ کے نشانات تھے۔ جب وہ بادشاہ کے سامنے اپنا قصیدہ سنانے کے لیے کھڑا ہوا تو بادشاہ نے اپنے سامنے سات پردے ڈلوادیئے۔ کیوں کہ اس قسم کی بیماری کا دیکھنا عرب کسرِ شان سمجھتے تھے۔ جب حارث نے اپنا معلقہ پڑھنا شروع کیا، تو بادشاہ پر اس قدر اثر پڑا کہ وہ ایک کے بعد ایک پردے ہٹواتا گیا، یہاں تک کہ سارے پردے ہٹوادیئے اور جب حارث نے اپنا معلقہ پورا کیا، تو اس کی تعظیم کی اور اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور فیصلہ بکریوں کے حق میں دیدیا۔ اس قصیدے نے سارے عرب میں دھوم مچادی اور ایک مدت تک بنوتغلب خفّت میں رہے۔ پھر موقعہ آیا اور عمرو بن کلثوم نے بادشاہ کو قتل کردیا اور اپنا معرکۃ الآراء معلقہ پیش کیا۔ تو دونوں کی وقعت عربوں کی نگاہ میں برابر ہوگئی۔ لیکن فخر میں مبالغہ کی شدت سے جو اثر عمرو بن کلثوم کے معلقہ کا ہوا، وہ حارث کے معلقہ کو نہ مل سکا۔

حارث کو زبان و بیان اور طرزِ ادا کی اثر انگیزی پر مہارت حاصل تھی۔ اس نے کھچا کھچ بھرے دربار میں فوراً اتنا بلند پایہ قصیدہ پیش کردیا، جو عربی ادب میں ایک بڑا کارنامہ اور بہترین نمونہ مانا گیا ہے۔ ایسی عظیم مثال دوسرا کوئی عربی شاعر نہ پیش کرسکا۔

حارث بن حلزہ کا معلقہ ایک ہمزیہ قصیدہ ہے۔ جب حارث نے اپنے قصیدے کو سنانے کی شروعات کی تو وہ ایک کمان پر ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ وہ مضامین کی تخلیق میں پوری طرح منہمک تھا کہ کمان کی نوک اس کی ہتھیلی میں گڑ گیا اور ہتھیلی زخمی ہوگئی، لیکن نہ اسے کوئی خبر ہوئی اور نہ اس کے انہماک میں کوئی فرق آیا۔

حارث معلقے کی شروعات عشقیہ شعر سے کرتا ہے اور وہ اس میں بیان کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ اسماء کے ساتھ کہاں کہاں گیا اور کن کن مقامات کی سیر کی۔ اس کے بعد اونٹنی کی تعریف کرتا ہے۔ پھر قبیلہ تغلب سے اپنے اختلافات اور جھگڑوں کا حال بیان کرتا ہے اور اس میں بنوتغلب کی خامیاں شمار کراتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے "ایامِ عرب" اور عرب قبائل کی جنگوں کا حال بیان کرتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ قصیدہ گذشتہ واقعات اور رونما ہونے والے مقامات کے لیے ایک تاریخی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ عمرو بن ہند کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس کے بعد بنوبکر کی وکالت کرتا ہے اور اس کے موقف کو بہت سوجھ بوجھ سے پیش کرتا ہے۔ قصیدے کا یہ حصہ جاہلیت میں سیاسی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔

معلومات کی جانچ:

۱۔ حارث بن حلزہ کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۲۔ ابوالظلیم کس کو کہا جاتا تھا؟

۳۔ حارث بن حلزہ کو "معمرین" میں کیوں شمار کیا گیا؟

4۔ حارث بن حلزہ نے کس کے کلام کی تاثیر زائل کردی؟

5۔حارث بن حلزہ کے جسم پر کس چیز کے نشانات تھے؟

6۔حارث بن حلزہ کا ہاتھ کیوں زخمی ہوا؟

7۔ حارث بن حلزہ کا معلقہ کون سی بحر میں ہے؟

8۔حارث بن حلزہ کا معلقہ کس چیز کی مثال ہے؟

4.10 نابغہ ذبیانی: تعارف

4.10.1 حالاتِ زندگی:

نابغہ ذبیانی کا اصل نام زیاد بن معاویہ بن سعد بن ذبیان ہے اور اسی وجہ سے اس کی نسبت ذبیانی ہے۔اس سے نابغہ جعدی اور نابغہ بنی شیبان وغیرہ سے امتیاز بھی ہوجاتا ہے۔ پہلے طبقے کے جاہلی شعرا میں نابغہ کا نام بڑی اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کا چرچا پورے عرب میں مدتوں تک رہا اور آج بھی نابغہ کلاسیکی عربی شاعری کے سرخیلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے ساری عمر شعر گوئی کی جدوجہد میں گزار دی۔ بڑھاپے میں جاکر شاعری میں طبیعت موزوں ہوئی۔اس کے بعد اس کی زبان سے اس طرح شعر نکلنا شروع ہوئے، جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔کہا جاتا ہے کہ اس کا نام نابغہ بھی اسی لیے پڑا تھا کہ کافی عمر کے بعد اس نے شعر کہنا شروع کیا۔

نابغہ نے 530ء میں حیرہ کے دربار شاہی سے وابستگی اختیار کی،اسی سال مہلہل کا انتقال ہوا تھا اور حیرہ کا بادشاہ منذر بن ماء السماء تھا۔اس کے بعد جب عمرو بن ہند نے تخت شاہی سنبھالا تو نابغہ کے ساتھ اس کی جم نہیں سکی؛ چنانچہ نابغہ نے حیرہ کو چھوڑ کر حوران کا سفر کیا تاکہ غساسنہ کے دربار میں پہنچ کر بادشاہ کی مدح سرائی کرے،مگر جب عمرو بن ہند کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد نعمان بن ابوقابوس حیرہ کا بادشاہ بنا،تو نابغہ پھر حیرہ لوٹ آیا اور ابوقابوس نعمان بن المنذر کے دربار سے وابستگی اختیار کرلی۔ نابغہ نے نعمان بن المنذر کی اپنے قصائد میں ایسی تعریفیں کیں کہ اس نے نابغہ پر انعامات واکرامات کی بارش کردی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نابغہ امیر ورئیس بن گیا اور شاہانہ زندگی گزارنے لگا۔دولت کی فراوانی کے سبب وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ بادشاہ سے اس درجہ قربت نے نابغہ کے بہت سے حاسدین پیدا کردیے تھے،جو اس تاک میں لگے رہتے تھے کہ نابغہ کے خلاف بادشاہ کے کان بھریں۔ بالآخر انھیں کامیابی حاصل ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے کسی موقع سے نابغہ سے اپنی بیوی کی تعریف میں اشعار کہنے کی درخواست کی،تو نابغہ نے نعمان کی بیوی متجردہ کے حسن و جمال کی تعریف میں اس قسم کے اشعار کہے:

قَامَت تَرائَ ی بَین سِجفَي كِلَّةٍ

كالشّمسِ يوم طُلوعِها بالأسعدِ

أودُرَّةٍ صَدَفيةٍ غِواصُها

بَهِج متى يَرهايَهَلِّ، ويسجُد

سقطَ النصيفُ،ولم تُرِدإسقاطَه

فتناولتَه،　　و　　اتَّقَتنابِاليدِ

بِمُخضَّبٍ　　رَخصٍ، كأنَّ　　بنانَه

عَنمٌ　على　أغصانِه　لَم　يُعقَدِ

ترجمہ: جب وہ ریشمی دوپٹہ اوڑھ کر کھڑی ہوئی، تو اس کا چہرہ آفتاب کے مثل چمکتا دمکتا نظر آرہا تھا جب کہ وہ منزلِ اسعد میں طلوع ہورہا ہو یا وہ سیپی کا ایسا قیمتی موتی ہو کہ اگر غوطہ خور اسے دیکھ لے، تو مارے خوشی کے اس کی چیخ نکل جائے اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ ایک دن اچانک اس کے سر سے دوپٹہ سرک گیا، تو شرم وحیا کے سبب جلدی سے اس نے ایک ہاتھ سے دوپٹے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مکھڑے کو چھپالیا، وہ ہاتھ نازک ونرم اور مہندی سے رچا ہوا تھا، اس کی انگلیاں عنم کے درخت کے مثل خوبصورت اور سرخی مائل تھیں، جس کی شاخیں گتھی ہوئی نہیں ہوتی ہیں۔

ان اشعار میں نابغہ نے نعمان کی بیوی کا ایسا سراپا کھینچا تھا کہ گویا اس کے اعضا وجوارح خود اس نے دیکھے ہوں۔ نعمان تو یہ اشعار سن کر خوش ہوا کہ شاعر نے اس کی بیوی کی خوب صورتی کی اتنی تعریف کی تھی، مگر اس کے ایک دوسرے درباری منخّل یشکری کا دماغ گھوم گیا، اس کا جذبۂ رقابت جوش مارنے لگا کیوں کہ وہ اندر اندر نعمان کی بیوی سے محبت کرتا تھا؛ چنانچہ اس نے نعمان کو نابغہ کے خلاف بھڑکانے کی سازش کی، اس کے پاس گیا اور کہا کہ کسی کے سراپا کا ایسا نقشہ وہی کھینچ سکتا ہے، جو خود اس تجربے سے گزرا ہو اور ممدوح کے تمام اعضا کو دیکھا ہوا ہو۔ یہ سن کر نعمان کو شدید غصہ آیا اور وہ نابغہ سے ناراض ہوگیا، نہ صرف اس کی تمام مراعات بند کردیں بلکہ اس کی جان کے درپے ہوگیا اور اس کے قتل کی عام اجازت دے دی، جس کے سبب نابغہ کو شاہ غسان کے پاس جا کر پناہ لینی پڑی۔ اس نے اسے عزت واحترام سے نوازا اور باضابطہ اپنے دربار سے منسلک کرلیا، نابغہ نے اس کی مدح میں کئی قصائد بھی لکھے، لیکن اس کے باوجود اُسے عمرو بن حارث الغسانی سے قلبی لگاؤ پیدا نہ ہوسکا۔ اُسے نعمان بن منذر کی خفگی کا قلق رہا، بلکہ نعمان کو جب معلوم ہوا کہ نابغہ غسانی بادشاہ کے یہاں مقیم ہے، تو نابغہ پر اسے مزید غصہ آیا اور اس نے نابغہ کو خط لکھ کر سخت ڈانٹ پلائی کہ جس شخص نے میرے آباواجداد کو قتل کیا ہے، تم اس کے یہاں مقیم ہو اور اس کی تعریف میں قصیدے لکھ رہے ہو! اس کے بعد نابغہ کو اپنے کیے پر مزید ندامت ہوئی، چنانچہ اس کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے اس نے اظہار معذرت کرتے ہوئے کئی شاندار قصیدے کہے لیکن نعمان کا دل اس کی طرف سے پھر بھی صاف نہ ہوا۔ یہاں تک کہ عمرو بن حارث غسانی کا انتقال ہوگیا اور نابغہ کی مسلسل معذرت خواہی کے باعث پھر ایک دن ایسا آیا کہ نعمان نے اسے معاف کردیا اور حیرہ بلالیا۔

4.10.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

نابغہ ذبیانی کے مدحیہ قصائد کو ماہرینِ فن نے خوب سراہا ہے اور تعریفیں کی ہیں۔ اس کی مدحیہ قادرالکلامی کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے، جو اس نے نعمان کو مخاطب کرکے کہے تھے۔ وہ کہتا ہے:

اَلم　تَر　اَن　اللہ　اَعطَاکَ　سُورۃً

تَری　کُل　مَلکٍ　دُونها　یَتذَبذَبُ

بِاَنَکَ　شَمسٌ　وَالمُلوکُ　کواکبُ

اِذاطَلَعتُ لَم یبدُ مِنهُن کَوکبُ

ترجمہ: کیا آپ نہیں دیکھتے کہ خدانے آپ کوایسی طاقت اور جاہ وجلال عطا کیا ہے کہ دیگر بادشاہ آپ کے سامنے آتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے کہ آپ آفتاب ہیں اور وہ ستارے۔ظاہر ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ستارے غروب ہوجاتے ہیں۔

نابغہ نے عمروبن الحارث الغسانی کی شان میں یہ شعر کہا:

عَلَیَ لِعَمرٍو نِعمۃٌ بعد نعمۃٍ

لِوَالِدِہ لَیست بِذاتِ عَقَارِبِ

ترجمہ: میرے اوپر عمرو نے مہربانی کی ہے،اس کرم اور مہربانی کے بعد جوان کے والد احسان جتائے بغیر پہلے میرے اوپر کر چکے ہیں۔

نابغہ کا کلام اتنا دل آویز، معیاری اور حسین ہوتا تھا کہ لوگ فوراًاس کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے۔جریر نے نابغہ کو تمام جاہلی شعرا میں سب سے بڑا اور ممتاز شاعر کہا ہے۔اس کا کلام تصنع ،تکلف اور آورد سے بوجھل نہیں ہوتا اس لیے سامعین کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔اخطل نے بھی نابغہ کی تعریف کی ہے حالاں کہ اخطل عہدِ بنوامیہ کا وہ شاعر تھا، جو کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔نابغہ نے چوں کہ زیادہ تر عرصہ غسان و حیرہ کے شاہی درباروں میں گزارا؛ اس لیے اس کی شاعری میں ایک قسم کی تہذیب، شستگی اور شائستگی پائی جاتی ہے،اس کے ساتھ ساتھ فصاحت الفاظ اور تعبیرات وتراکیب کی عمدگی بھی اس کے یہاں امرؤالقیس اور طرفۃ بن العبد جیسے شعرائے بادیہ کے بالمقابل زیادہ ہے۔اس کی شاعری کے الفاظ سہل اور معانی و مراد واضح ہوتے ہیں۔ابن رشیق کے مطابق نابغہ ذبیانی کے اشعار میں حسن و جمال اور فنی کمالات پائے جاتے ہیں،اس کے قصائد طویل اور عمدہ ہوتے ہیں،اس کی مدحیہ،ہجویہ شاعری ہو یا مرثیہ اور وصف بیانی کے اشعار ہوں سب لاجواب ہوتے ہیں۔

مدحیہ شاعری کی طرح معذرت خواہانہ شاعری میں بھی نابغہ کا جواب نہیں ہے۔نابغہ ذبیانی چوں کہ پورے دل کے ساتھ معذرت خواہی کے اشعار کہتا تھا،اس لیے اس نوع کے اشعار اس کی شاعری کی جان بن گئے اور معذرت خواہی کے میدان میں وہ سب سے سبقت لے گیا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے:

أتانی أبَیتَ اللَّعنَ أنَک لُمتَنِی

وتلک الَّتِی تَستَکُ مِنها المَسامِعُ

فبِتُّ کأنِّی ساوَرتنِی ضَئِیلۃٌ

من الرَّقش في أنیابِها السَّمُّ ناقِعُ

ترجمہ: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھے لعنت وملامت کی ہے۔خدا آپ کو لعنت سے بچائے رکھے۔یہ ایسی بات ہے کہ اس سے میرے کان پھٹے جاتے ہیں۔میں نے پوری رات اس قدر بے چینی میں گزاری کہ گویا مجھے چت کبری پتلی زہریلی ناگن نے ڈس لیا ہو۔

معذرت خواہی پر مبنی اشعار کی نابغہ کے یہاں بہتات پائی جاتی ہے۔عمروبن الحارث کی شان میں بھی اس نے معذرت خواہی کے اشعار کہے جب وہ اس سے ناراض ہوگیا تھا۔ایسا لگتا ہے کہ نابغہ کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، خاص طور سے اپنے ممدوحین کی ناراضگی اسے برداشت نہ تھی۔بادشاہوں کی ناراضگی سے وہ خوف زدہ بھی رہتا تھا کہ مبادا وہ اسے تکلیف و پریشانی میں مبتلا کردیں۔اسی لیے اس کے بارے

میں مشہور ہوا کہ ''۔۔۔والنابغة إذا رهب''۔اس کی اس عادت کی وجہ سے بعض لوگوں نے اس پر تنقید بھی کی ہے اور اسے کم ہمت و لالچی قرار دیا ہے کہ جو صرف بادشاہ کو خوش رکھنے اور مال و دولت حاصل کرنے کے لیے اشعار کہتا تھا۔

البتہ نابغہ صرف بادشاہوں کی مدح میں کمال نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ عورتوں کی تعریف و مدح میں بھی اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کرتا تھا جیسا کہ ماقبل میں نعمان کی بیوی کی تعریف میں اس کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔اس کے عام قصائد میں بھی تغزل کا بھر پور رنگ پایا جاتا ہے۔نعمان کی بیوی کے لیے کہے گئے مدحیہ قصیدے میں ہی اس کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

نَظَرتْ بِمُقلةِ شادنٍ مُتربَّبِ

أَحوى أحمّ المُقلتَينِ مُقلَّدِ

صَفراءُ كالسَّيراءِ أُكمِلَ خلقُها

كَالغُصنِ فِي غَلوائِهِ المُتاوِدِ

ترجمہ: اس نے ایسے ہرن کی آنکھوں سے دیکھا، جس کے ہونٹ سیاہی مائل سرخ ہیں، جس کی آنکھیں کالی کجراری ہیں اور جو گردن میں ہار ڈالے ہوئے ہے۔اس کا رنگ پیلی دھاریوں والے ریشمی کپڑے کی طرح زرد ہے، بناوٹ میں مکمل ہے اور اس کا قد لچکدار اور ترو تازہ نازک شاخ کی طرح ہے۔

لَو أَنَّها عُرِضَت لأَشمطَ راهبِ

عَبدالإلٰه، صرورةٍ مُتعبّدِ

لَرَنا لِبهجتِها وحُسنِ حَديثِها

ولَخالَهُ رُشداً و اِن لم يَرشُدِ

ترجمہ: اگر وہ ایسے ادھیڑ عمر غیر شادی شدہ راہب کے سامنے آ جائے، جس کی ساری عمر پروردگار کی عبادت میں بسر ہوئی ہو، تو وہ اس کی خوبصورتی کو ایک ٹک دیکھتا رہے اور اس کی خوب صورت طرزِ گفتگو پر فریفتہ ہو جائے اور اسے وہ اپنی دانشمندی سمجھے، خواہ وہ دانشمندی نہ ہو۔

نابغہ ذبیانی نے مذکورہ اشعار میں متجردہ کے حسن کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی بھی اس سے متاثر ہوئے یا اس پر فریفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔کہتا ہے کہ وہ اتنی خوب صورت اور ناز و ادا میں ڈھلی ہوئی ہے کہ ایک راہب، جو دنیا کی تمام لذتوں سے بے نیاز ہو کر روز و شب اپنے رب کی عبادت و ذکر میں مشغول ہو، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تجرد کی زندگی گزار رہا ہو، اس نے کسی عورت کا قرب نہ پایا ہو اور لذتِ وصل سے نا آشنا ہو، پھر وہ بھی ادھیڑ عمر کا کہ جب خواہشاتِ نفسانی دم توڑنے لگتی ہیں اور جوانی کی امنگیں باقی نہیں رہتیں، وہ بھی اسے دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے اور اپنے ہوش گنوا بیٹھے، تو عام انسان کا کیا کہنا۔حسن و جمال کی تعریف میں نابغہ کے مذکورہ اشعار کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جاہلی شعرا میں نابغہ ذبیانی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ شعرا کے طبقۂ اولیٰ کی فہرست میں شامل ہے۔ویسے نابغہ کے کلام میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں ناقدین نے بعض کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔جن میں سے ایک کمزوری اِقوا کی ہے یعنی اس کے قصائد میں قافیوں کی حرکت بعض اوقات مختلف ہو جاتی ہے، لیکن بعد میں اس نے اپنے اس نقص کو دور کر لیا تھا۔اس کی وفات 604ء میں ہوئی، اس

وقت وہ بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا تھا۔اس کی وفات کے تین سال بعد نعمان بن منذر کا انتقال ہوا۔

4.11 عبید بن الابرص

4.11.1 حالاتِ زندگی:

عبید ابن الأبرص قدیم جاہلی شاعر ہے۔اس کی پیدائش تقریباً 455ء میں ہوئی اور نشوونما نجد میں قبیلہ بنو اسد میں ہوئی۔اس کا تعلق اسی قبیلے سے تھا اور اپنے قبیلے کے مآثر وخصوصیات پر شاعری کیا کرتا تھا۔عبید کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: عبید بن الابرص بن جشم بن مالک بن الحرث بن سعد بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ بن مدرکہ۔جب حجر بن حارث کندی نے 500ء میں بنو اسد پر غلبہ حاصل کیا،تو عبید اس سے مل گیا اور پہلے کی دشمنی پر اظہار ندامت کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہو گیا۔مگر جب کچھ دنوں کے بعد بنو اسد کی طاقت وقوت مجتمع ہو گئی،تو انھوں نے حجر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور ٹیکس دینے سے منع کر دیا۔جب حجر کو معلوم ہوا،تو وہ بنو اسد کی طرف نکلا،انھیں بری طرح مارا،بہت سے سردارانِ قبیلہ کو قتل کر دیا اور بنو اسد کے بے شمار لوگوں کو نجد سے تہامہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔بعد میں عبید کی سفارش پر انھیں نجد واپس ہونے کی اجازت دے دی۔ان لوگوں نے پھر اپنی قوت اکٹھا کی اور علباء بن حارث کاہلی کی قیادت میں حجر کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور کندیوں کا بے تحاشا قتل کیا،اس طرح بنو اسد پر ان کی حکومت وتسلط کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

عبید نے ابتدائی عمر سے ہی اشعار کہنا شروع کر دیا تھا۔اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن ماویہ کے ساتھ بکریاں چرا رہا تھا کہ اسی دوران اسے پیاس لگی اور ایک چشمے پر پانی پینے کے لیے گیا،تو چشمے کے مالک نے اسے پانی بھی نہیں پینے دیا اور اسے اور اس کی بہن کو گالی بھی دی۔عبید کو اس سے بہت تکلیف ہوئی اور اس نے خدا سے دعا کی کہ اسے اس شخص سے انتقام لینے کی صلاحیت عطا کر دے۔اتنے میں اس کی زبان پر اس شخص کی ہجو میں اشعار جاری ہو گئے اور اس کے بعد وہ مستقل شاعری کرنے لگا۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق عبید نے بہت لمبی عمر پائی۔بعض لوگوں نے اس کی عمر تین سو سال تک بتائی ہے۔اس کی موت کے بارے میں دلچسپ واقعہ منقول ہے۔کہتے ہیں کہ حیرہ کا بادشاہ منذر بن ماء السماء ایک دن قبیلۂ بنو اسد کے اپنے دو حاشیہ نشینوں سے خفا ہو گیا اور غصے میں انھیں قتل کروا دیا۔بعد میں جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے اپنے کیے پر افسوس ہوا چنانچہ اس نے ان دونوں کی قبریں بنوائیں اور ان کا نام ''غریان'' رکھا۔وہ سال میں دو دن ان کی قبروں کے پاس بیٹھتا تھا اور اس نے دونوں میں سے ایک دن کا نام ''یوم نعیم''(بخشش کا دن) اور دوسرے کا نام ''یوم بؤس''(نحوست اور سزا کا دن) رکھا تھا۔جو شخص بخشش والے دن سب سے پہلے اس سے ملنے آتا اسے سو اونٹ انعام یا اپنے گناہ کے کفارے کے طور پر دیتا اور جو شخص نحوست والے دن سب سے پہلے اس سے ملتا،اسے قتل کروا دیتا اور اس کے خون سے ان دونوں کی قبروں کو نہلاتا۔اتفاقاً سزا والے دن ہی عبید اس کے دربار میں پہنچ گیا،اسے دیکھ کر منذر نے کہا: تو کہاں مرنے چلا آیا؟ تو عبید نے اپنی چالاکی و ہوشیاری اور شاعرانہ مہارتوں سے کسی طرح جان بچانے کی کوشش کی،خود منذر نے بھی کہا کہ وہ اس کی شاعری کو پسند کرتا ہے اور اس نے اس سے اشعار سنانے کی فرمائشیں بھی کیں،مگر ساتھ ہی اس نے واضح طور پر کہا کہ آج کے دن اگر سب سے پہلے تیری جگہ میرا بیٹا نعمان بھی میرے پاس آیا ہوتا،تو میں اسے بھی قتل کر دیتا؛لہذا تیرا مرنا تو یقینی ہے،بس یہ بتاؤ کہ تم کس طرح مرنا چاہتے ہو،تو اس نے کہا کہ مارنے سے پہلے مجھے

اچھی طرح شراب پلوادیں؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور جب وہ بالکل بے ہوش ہوگیا تو اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے خون سے مذکورہ دونوں قبروں کو نہلایا گیا۔ سوانح نگاروں نے اس کے قتل کے مختلف سال بیان کیے ہیں، کسی نے 545ء، کسی نے 555ء اور کسی نے 598ء لکھا ہے۔

4.11.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

امرؤالقیس عبید کا ہم عصر تھا، مگر چوں کہ عبید کا تعلق بنو اسد سے تھا اور امرؤالقیس کندی تھا اس لیے دونوں میں سخت دشمنی تھی۔ جب بنو اسد نے کندیوں کے ساتھ قتل و غارت گری کی اور اپنے اوپر سے ان کے تسلط کو ختم کر دیا تو اس واقعے سے امرؤالقیس سخت رنجیدہ ہوا۔ وہ خود بھی میدان جنگ سے کسی طرح جان بچا کر بھاگ سکا تھا۔ اب وہ اس تدبیر میں لگا رہا کہ کس طرح بنو اسد سے اپنے قبیلے کی ہزیمت کا بدلہ لیا جائے۔ چنانچہ اس نے عملی تدبیر سے پہلے اپنے اشعار کے ذریعے بنو اسد کو دھمکی دینا شروع کی کہ وہ حجر کے قتل کا بدلہ لے گا۔ اس نے اپنے اشعار میں یہ بھی کہا کہ بنو اسد و بنو کندہ کی جنگ میں اپنے ہاتھوں سے اس نے بنو اسد کے بہت سے سرداروں کو قتل کیا تھا۔ عبید کو جب اس کا علم ہوا، تو اس نے اسے جواب دیا اور امرؤالقیس کو عار دلائی کہ جس دن بنو اسد بنو کندہ پر حملہ آور تھے اور دونوں میدان جنگ میں آمنے سامنے تھے، اس دن تو تمھارے قبیلے نے ہمت ہار دی تھی، اب بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ عبید نے اپنے اشعار کے ذریعے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس دن تو نہ صرف بنو کندہ بلکہ ان کے حلیف بنو غسان کے بھی بہت سے سرداروں کو ہم نے مارا تھا اور اگر تم میدان جنگ سے بھاگ نہ گئے ہوتے، تو تمھارا بچنا بھی مشکل تھا۔ امرؤالقیس کے لیے عبید کے جوابی اشعار کچھ یوں تھے:

يَا ذَاالمُخوِّفُنا بِقتلِ

أَبِيهِ إذلالًا و حَينا

أَزَعمتَ أَنَّک قد قَتَلتَ

سَرااتَنا ؟كِذباً ومَينا

هلَّاعلى جُحربنِ أمِّ قِطامٍ تَبكي، لاعلَينا

هلاَّ سألتَ جموعَ كِندة

يَومَ ولَّوااَيْنَ أينَا

ترجمہ: اے وہ شخص جو ہمارے آبا کو مارنے اور ذلیل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے! تیرا گمان ہے کہ تو نے ہمارے سرداروں کو قتل کیا ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ تو ہمارے بجائے حجر بن ام قطام کی موت پر کیوں نہیں روتا؟ تم اس دن بنو کندہ سے کیوں نہیں پوچھ رہے تھے، جب وہ میدان چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے کہ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟

جب عبید بوڑھا ہو گیا اور ساتھ ہی معاشی تنگدستیوں کا بھی شکار ہو گیا، تو اس کی بیوی، جو خود بھی بوڑھی تھی، اسے ناپسند کرنے لگی۔ تو عبید نے اس پر یہ اشعار کہے:

تِلک عُرسِي غَضبى تُريدُ زَبالِي

أَلِبَينٍ تُريدُ أم لِدلالِ

إن يكُن طِبُک الفِراقُ فلا أحفِل

أَن تَعطَفِي صُدور الجِمالِ

أَو يَكُن طِبُک الدّلالُ، فَلَو فِي

سالِفِ الدّهرِ واللّيالِي الْخَوالِي

كُنتِ بَيضاءَ كالمَهاةِ، وإذ

آتِيک نَشوان مُرخِياً أَذيالِي

فَاترُكِي مَطَّ حَاجِبَيکِ وعِيشي

مَعنَا بِالرّجاءِ والتّأَمالِ

ترجمہ: میری بیوی مجھ سے ناراض ہے اور مجھ سے الگ ہونا چاہتی ہے، کیا وہ واقعی ناراض ہے یا ناز و ادا کا مظاہرہ کر رہی ہے؟ اگر تو واقعی الگ ہونا چاہتی ہے، تو مجھے کوئی پروانہیں، تو جاسکتی ہے اور اگر تو جھوٹی ناراضگی جتا رہی اور نخرے کر رہی ہے، تو یہ تجھے بہت پہلے زمانۂ گزشتہ میں کرنا چاہیے تھا، جب تو موتی جیسی خوب صورت تھی اور جب میں تیرے پاس مستی میں جھومتا ہوا اپنا دامن گرائے ہوئے آتا تھا۔ پس اب تو اپنے ابروؤں کو پھیلانا چھوڑ اور میرے ساتھ پر امید زندگی گزار۔

ان اشعار میں عبید اپنی بیوی کی ناراضگی اور اسے چھوڑ کر جانے کی اس کی خواہش کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اگر واقعی تو مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہے تو جاسکتی ہے، لیکن اگر محض ناز و ادا کے اظہار کے طور پر ایسا کہہ رہی ہے تو اب ہماری وہ عمر کہاں رہی، جب میں مستی اور خوشی کے عالم میں تیرے پاس آتا تھا۔ ان دنوں تو بھی موتیوں جیسی خوب صورت ہوا کرتی تھی اور میں بھی بھرپور جوان ہوا کرتا تھا۔ اب تو ہم دونوں میں ہی دم خم نہیں رہا، لہٰذا اب ناک بھوں چڑھانا بند کرو اور اچھے دنوں کی آس میں میرے ساتھ زندگی بسر کرو۔

حکمت و دانشمندی کے قیمتی نکات پر مشتمل اشعار:

تَصبُووأنّی لکَ التّصابِي

أنّی، وقد راعَک المَشِيبُ

فَكُلّ ذِي نِعمةٍ مَخلُوسُ

وكُلّ ذِي أملٍ مَكذُوبُ

وكُلّ ذِي غَيبةٍ يَؤُوبُ

وغائبُ الْمَوتِ لا يَؤُوبُ

مَن يَسأَلُ النّاسَ يَحرِمُوهُ

وسَائِلُ اللّٰهِ لَا يَخِيبُ

ترجمہ: تم عشق و محبت میں پڑے ہوئے ہو، اس وقت کیسا لگے گا تم بڑھاپا تمھیں ڈرائے گا؟ ہر صاحب نعمت سے ایک دن وہ وہ نعمت

چھن جاتی ہے اور ہر امید پوری نہیں ہو پاتی۔ ہر جانے والا لوٹ آتا ہے، مگر جسے موت غائب کر دے، وہ کبھی نہیں آ سکتا۔ جو انسانوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، وہ محروم رہ جاتا ہے، جبکہ اللہ کے حضور ہاتھ پھیلانے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی بے اعتباری، انقلابات زمانہ اور حادثات وتغیرات کو بیان کرنے والے عبید کے یہ اشعار نہایت قیمتی اور خوب صورت ہیں۔ ان اشعار میں جہاں اس نے حالات کی تبدیلی کی طرف اشارے کیے ہیں، وہیں اچھے حالات میں موت کو یاد کرنے اور برے حالات میں انسانوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے خالق کائنات کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی تلقین کی ہے؛ کیوں کہ اگر ہم ایک انسان کے آگے ہاتھ پھیلائیں تو محرومی ہی ہاتھ لگے گی، جبکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

عبید بن الابرص پرگو شاعر تھا، البتہ اس کے زیادہ اشعار دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے ابن سلّام نے اسے اصحاب المجمہرات کے ضمن میں چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے۔ حالاں کہ دوسرے بہت سے علمائے ادب نے اسے جاہلی شعرا کے طبقۂ اولیٰ میں بھی شمار کیا ہے۔ اس نے کئی قصیدے کہے ہیں، جن میں اس کا قصیدہ ''**عیناک دفعها السروب**'' سب سے طویل اور ۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے کو ابوزید قرشی نے مجمہرات میں شمار کیا ہے، جبکہ تبریزی نے اسے معلقات میں شمار کیا ہے۔

اس قصیدے میں جاہلی شاعری کا پورا رنگ موجود ہے۔ یعنی اپنے اس قصیدے کو دیارِ محبوب کے ویران ہو جانے سے شروع کرتا ہے، وادیوں، پہاڑوں اور مرغزاروں کا ذکر کرتا ہے، جہاں اس کی محبوبہ مست خرام تھی، پھر وہاں کی ویرانی، موت اور تباہی کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح اس جگہ کی ویرانی کی وجہ سے وہاں جانوروں نے اسے اپنی آماجگاہ بنالیا۔

عبید کو فخریہ شاعری، وصف بیانی اور مرثیہ گوئی میں درک حاصل تھا۔ اس کے اشعار میں حکمت و دانش کی باتیں بھی وافر مقدار میں ملتی ہیں۔ اس کی غزلیہ شاعری بھی خوبصورت ہے، جاحظ نے بھی اس کی غزلیہ شاعری کی تحسین کی ہے۔ اس کی شاعری کی ایک اور خوبی الفاظ کی سلاست اور بیان واسلوب کی وضاحت وشفافیت بھی ہے۔ عام طور پر جاہلی شعرا کے یہاں الفاظ واسلوب کی جو پیچیدگی واغلاق پایا جاتا ہے، وہ عبید بن الابرص کی شاعری میں بہت کم ہے۔

4.12 امیہ بن ابی الصلت

4.12.1 حالاتِ زندگی:

اس کا پورا نام ونسب اس طرح ہے: امیہ بن ابی الصلت بن ابو ربیعہ بن عوف بن ثقیف بن بکر بن ہوازن۔ اس کی ماں کا نام رقیہ بنت عبد شمس بن عبد مناف تھا۔ اس کا باپ طائف کے سرداروں میں سے ایک تھا۔ اس کی پیدایش و پرورش طائف میں ہی ہوئی۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز بہ طور ایک تاجر کیا اور شام و یمن کے اسفار کیے۔ اسی دوران اس کا ذہن زہد اور دنیاوی مشاغل سے کنارہ کش ہونے کی طرف مائل ہوا۔ پھر اس نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی، شراب بھی ترک کر دی، ایک خدا کے وجود کا عقیدہ اختیار کیا اور اپنے طور پر اس کی عبادت بھی کرنے لگا۔ اسلام کے ظہور کے بعد قریب تھا کہ وہ اسلام قبول کر لے، مگر اس کی قوم ثقیف کی اسلام دشمنی آڑے آ گئی؛ چنانچہ وہ بھی مسلمانوں اور اسلام کا دشمن بن گیا اور لوگوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اپنے مذہبی مطالعے کے دوران وہ اس نتیجے

پر پہنچا تھا کہ عنقریب کوئی نبی پیدا ہونے والا ہے، اس لیے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ وہی نبی ہولیکن جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی گئی، تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لایا اور کہنے لگا کہ مجھے تو یہ امید تھی کہ نبوت مجھے ملے گی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ''وَاتل علیهم نبأ الذي۔۔۔'' مگر وہ اس کے بعد بھی اسلام دشمنی سے باز نہ آیا اور لوگوں کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف اکساتا رہا۔ جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے فتح حاصل کی، تو اس نے اس غزوے میں مارے گئے مشرکین کا مرثیہ لکھا۔ اس کی وفات ہجرت نبوی ﷺ کے ساتویں یا آٹھویں سال میں 629ء میں ہوئی۔

4.12.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

امیہ بن ابی الصلت کا شمار اصحاب المجمہر ات میں ہوتا ہے۔ اس نے جاہلی دور کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی۔ امیہ کا تمام شعری ذخیرہ دستیاب نہیں ہے، جو دستیاب ہے، اس میں مدحیہ و ہجویہ اشعار کے علاوہ مرثیہ وحکمت پر مشتمل اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ چوں کہ وہ طبعی طور پر دینی رجحان کا حامل تھا، اسی لیے اس کے قصائد میں دینی مضامین، زہد و تقوی اور یاد خدا و آخرت کے مضامین نمایاں نظر آتے ہیں۔ احمد حسن زیات نے لکھا ہے:

''اس کا طبعی رجحان دینی مضامین کی طرف تھا اور اسی سلسلے میں اس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہی رنگ اس کی شاعری پر چڑھا ہوا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے جلال کا وصف بیان کرتا ہے، حشر اور اس کے بھیانک واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ جنت، جہنم اور فرشتوں کے حالات بتاتا ہے۔ تورات کے واقعات مثلاً سدوم کا خرابہ اور حضرات اسحق و ابراہیم علیہما السلام کے قصے نظم کرتا ہے، شاعری میں وہ ایسے جدید موضوعات و اسالیب پیدا کرتا ہے جن سے دیگر شعرا نامانوس تھے۔ زبان میں ایسے الفاظ وتراکیب استعمال کرتا ہے جن سے اہلِ عرب ناواقف تھے۔''

اس اقتباس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی شاعری پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے اور اس نے مذہبی اشعار اس کثرت سے کہے ہیں کہ دوسرا کوئی بھی جاہلی شاعر اس میدان میں اس کے برابر نہیں پہنچتا۔ دوسری بات مذکورہ اقتباس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے بعض ایسے اسالیب اختیار کیے جو اس سے پہلے کسی نے اختیار نہ کیے تھے۔ گویا کہ اس نے جاہلی شاعری کو اسالیب و موضوعات کے اعتبار سے تنوع بخشا، یہاں تک کہ اس کے کلام میں الفاظ وتراکیب کی جدت بھی پائی جاتی ہے۔ جس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امیہ نرا تقلیدی شاعر نہ تھا۔ اس نے جہاں جاہلی شاعری کی تقلید کی، وہیں اس سے بھی آگے کا سفر طے کیا۔ قصائد میں عبرانی اور سریانی زبان کے الفاظ سے اس کی شاعری میں وسعت پیدا ہوئی جس کو بعض ناقدین نے سراہا ہے لیکن بعض علمائے لغت نے اس کے اس تجربے کی وجہ سے اس کی زبان کو سند ماننے سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے اشعار میں بعض دفعہ سخت پیچیدگی و ابہام بھی پیدا ہوجاتا ہے۔

امیہ نے عام روش سے ہٹ کر جو شاعری کی، وہی اس کا امتیاز قرار پایا اور اسی سے اس کی منفرد شناخت قائم ہوئی۔ مثلاً اس نے کہا:

اَلحمدُللهِ ممسَا وَمصبحنَا

بِالْخَيرِ صَبحَنا رَبِّي ومسَانَا

ترجمہ: تعریف اس خدا کے لیے ہے جو ہماری شاموں اور صبحوں کو وجود بخشتا ہے۔ اے میرے رب ہماری صبح و شام میں خیر اور بھلائی لا۔

تَخَافُ الرَّدى نَفسي عَلَيْک وَاِنَّها

لتعلَمُ اَنَّ المَوتَ حَتم مُؤجّل

ترجمہ: میرے دل کو ہر وقت تیری موت کا خدشہ رہتا ہے، حالاں کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے۔

كُلُّ عَيش وَإن تَطَاول دَهراً

مُنتَهِي أَمره إلى أَن يزولا

ترجمہ: ہر راحت وزندگی چاہے وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، انجام کار ایک دن زوال پذیر ہوکر ہی رہے گی۔

لَيتَني كُنتُ قَبلَ مَاقد بَدالی

فِي رُؤُوسِ الجبالِ أرعى الوعُولا

ترجمہ: کاش اس سچائی کو جاننے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلی بکروں کو چرایا کرتا۔

اِجعل الموت نُصبَ عَينَک واحْذَرْ

غَولَةَ الدَّهرِ إنَّ لِلدَّهرِ غَولا

ترجمہ: موت کو ہمیشہ یاد رکھو اور زمانے کے دھوکے سے بچو، بے شک زمانہ دھوکوں کا مجموعہ ہے۔

امیہ بن ابی الصلت پر جب مرض الموت طاری ہوا تو اس نے کہا:

قَددَنا أَجلِي

وهٰذِه المَرضَةُ مِنّي

وأَنَاأعلَمُ أنَّ الحَنِيفِيَةَ حَق

ولكن الشَّک يُداخِلُنِي فِي مُحَمَّد

ترجمہ: میری موت اور مرض الموت میرے قریب آ گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مذہبِ حنیف حق ہے، مگر محمد (ﷺ) کے بارے میں مجھے شک ہے۔

یہ کہتے ہی اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی، پھر جب کچھ دیر بعد ہوش آیا، تو کہا:

لَبَيک لَبَيكا

هٰأَنَذَ الَدَيک

لا مالَ يُفدِيْنِي

ولا عشيرَةَ تُنْجِيْنِي

ترجمہ: لبیک لبیک! (خدایا!) میں تیرے سامنے حاضر ہوں، نہ مجھے میرا مال بچا سکتا ہے اور نہ میرا خاندان نجات دلوا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرتؐ اس کے ایمان ویقین اور توحید ورسالت کے بیان پر مشتمل اشعار سنتے تھے، تو فرماتے تھے کہ ''اس کی زبان تو ایمان لے آئی، مگر اس کا دل منکر رہا''۔ جاحظ نے امیہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ قبیلۂ ثقیف کا ہوشیار ترین انسان تھا اور ثقیف عربوں میں سب سے ہوشیار قبیلہ تھا۔ غالباً یہی ہوشیاری یا روشنیِ طبع تھی کہ اسے اپنے نبی بنائے جانے کا وہم ہونے لگا تھا۔

4.13 تابط شرا

4.13.1 حالاتِ زندگی:

تابط شرّا کا اصل نام ثابت بن جابر فہمی ہے، قبیلۂ قیس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا رنگ روپ سیاہ تھا، دیکھنے میں عام انسانوں سے الگ ڈراؤنا لگتا تھا۔ اس کی ماں حبشیۃ النسل تھی۔ اس کا سنِ وفات 530ء ہے۔ امرؤالقیس سے پہلے یا کم از کم اس کے زمانے کا شاعر تھا۔ تابط شرا کے قصائد میں جاہلیت کا رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے اور اس کی زندگی اس کے قصائد میں میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ 'تابط شرّا' اس کا لقب تھا جس سے اسے شہرت ملی، اس کے معنی ''برائی کو بغل میں دبانے'' کے ہیں۔ اس لقب کی کئی وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عام طور پر گھر سے باہر نکلتا تو بغل میں تلوار دبا کر نکلتا تھا۔ ایک دن کسی نے اس کی ماں سے اس کے بارے میں پوچھا، تو اس کی ماں نے کہا کہ ''پتا نہیں کہاں گیا، مگر وہ بغل میں برائی دبائے ہوئے تھا''۔ اسی دن سے اس کا یہ لقب پڑ گیا۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا، جس پر ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ تیرے دوسرے بھائی گھر کے باہر کچھ کام کرتے اور کما کر لاتے ہیں، تو کوئی کام نہیں کرتا بس یونہی بیکار پھرتا رہتا ہے، تو اس نے اپنی ماں سے کہا آج میں تیرے لیے کچھ لے کر آتا ہوں، چنانچہ وہ جنگل میں گیا اور بہت سے سانپ پکڑ کر اپنی جراب میں ڈالے اور اسے بغل میں دبائے ہوئے گھر آ گیا، گھر پہنچ کر جب اس نے جراب کا منھ کھولا، تو پورے گھر میں سانپ بھر گیا، اس کی ماں مارے ڈر کے باہر بھاگی، تو پڑوس کی خواتین نے اس سے پوچھا کہ تیرا بیٹا بغل میں کیا دبا کر لایا ہے؟ تو اس نے کہا کہ جراب میں سانپ بھر کر لایا ہے، یہ سن کر انھوں نے کہا کہ ''لقد تأبط شرا'' (وہ تو اپنی بغل میں برائی اور مصیبت دبالایا ہے) اور بھی دوسری وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔

سماج کی پابندیوں اور خاندانی ذمہ داریوں سے گھبرا کر وہ بھی صعلوک بن گیا یعنی جنگل کی راہ اختیار کی۔ تابط شرا میں کئی ایسی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہو گیا تھا۔ مثلاً وہ بہت تیز دوڑتا، عاقبت اندیشی اور دور بینی سے کام لیتا، اس لیے معرکوں میں اسی کو سردار بنایا جاتا تھا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ ابوالفرج اصفہانی نے الاغانی میں عمرو بن عمرو شیبانی سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ اس کے علاقے میں قبیلۂ قیس کی ایک جماعت آ کر ٹھہری تو وہ اس کے پاس گیا اور لوگوں سے تابط شرا کے واقعات جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ تو ان میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم بھی اسی کی طرح دشت نورد اور چورڈاکو بننا چاہتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ نہیں! میں صرف اس کے احوال جاننا چاہتا ہوں، تاکہ بعد میں میں بھی لوگوں سے بیان کروں۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم تمھیں سناتے ہیں۔ پھر انھوں نے بیان کیا کہ تابط شرا دو پیروں، گھٹنوں اور دو آنکھوں کے ساتھ نہایت تیز دوڑنے والا تھا، جب اسے بھوک لگتی تو وہ بجو تلاش کرتا تھا، جو سب سے موٹا اور

صحت مند بجو ہوتا، اس پر نشانہ سادھتا، پھر اس کے پیچھے بھاگتا، بھاگتا رہتا یہاں تک کہ اسے پکڑ لیتا، پھر اسے اپنی تلوار سے ذبح کرتا اور بھون کر کھاتا تھا۔اس کے دوڑنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پلک جھپکتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا تھا۔

اپنی بے مثال بہادری، پریشانیوں میں صبر وتحمل اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کی وجہ سے وہ بڑا مشہور ہوگیا تھا اور قبائل اس کے نام سے تھراتے تھے،تاریخ وسوانح کی کتابوں میں اس کی بہادری کے بہت سے افسانوی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک بار اونٹ پر ٹیک لگایا تو وہ اونٹ اس کے بوجھ کو برداشت نہ کرسکا اور گرگیا، ایک گھوڑے کی پشت پر بیٹھا،تو وہ گھوڑا لڑکھڑانے لگا، وہ تیز طرار گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا تھا، اس کی کمان سے ہوا کی رفتار سے تیر نکلتا تھا۔اس کے حوالے سے جن و عفریت کے بھی بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، مگر تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ایک عفریت ہی تھا اور اس کی صورت شکل نہایت خوفناک اور ڈراؤنی تھی۔

اس کی محبت اور شادی کی داستان بھی نہایت دلچسپ ہے۔تابط شرا نے اشعار کے ذریعے اپنی محبوبہ کی بہت زیادہ تعریف بھی کی ہے۔وہ اسے گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔ پھر اس سے ملاقات کا قصہ بیان کرتا ہے کہ ایک رات وہ اپنے ماموں اور لوٹ مار کے کاموں میں اپنے رفیق شنفری کے ساتھ نکلا، تو اسے دور کہیں روشنی نظر آئی، قریب جاکر دیکھا تو ایک قافلہ رکا ہوا تھا اور لوگ آپس میں باتیں کررہے تھے۔شنفری نے تابط شرا سے کہا: ہمیں اس قافلے کو لوٹنا ہے۔تو تابط شرا نے پوچھا کہ: اس کا طریقہ کیا ہوگا، کیوں کہ یہ تو بہت سارے لوگ ہیں اور ہم محض دو ہیں۔توشنفری نے ایک پلان بنایا کہ تم ان لوگوں کے پاس جانا، جب وہ تمھیں دیکھیں گے تو پکڑنا چاہیں گے اور تمھیں دوڑائیں گے،توتم بھاگنا، پھر ان کے آگے سرینڈر کرجانا، پھر اگر وہ تمھیں وہیں لے کر آجائیں جہاں قافلہ ٹھہرا ہے اور باندھ دیں،تو میں دور سے انھیں نظر آنے کی کوشش کروں گا، دوڑکر ان کے سامنے آنے کی کوشش کروں گا، یہاں تک کہ وہ پھر مجھے پکڑنے کو دوڑیں گے اور میں انھیں قافلے کی جگہ سے دور بھگالے جاؤں گا، اس دوران تم اپنی رسی کھول لینا اور جتنا مال واسباب وہاں موجود ہو سب لوٹ کر اپنے کمین گاہ میں لے آنا۔تابط شرا نے اسی منصوبے کے مطابق عمل کیا اور پکڑا گیا۔پھر جب شنفری قافلے والوں کو نظر آیا، تو انھوں نے تابط شرا سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کیا تمہارا ساتھی ہے؟ تو اس نے انھیں جواب دیا کہ تم لوگ اس سے بچ کر رہنا، کیوں کہ وہ پوری دنیاے عرب میں سب سے تیز دوڑتا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ تم لوگ اس کا پیچھا کر پاؤگے۔تو ان میں سے ایک شخص نے جواب دیا: ہم اسے ضرور پکڑ کر یہاں لائیں گے۔ پھر وہ سب شنفری کا پیچھا کرنے لگے، وہ سارے کے سارے گھوڑوں پر سوار تھے، جبکہ شنفری دونوں پیروں کے بل دوڑ رہا تھا، وہ ان سب کو اپنے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے بہت دور لے گیا۔اس دوران تابط شرا نے اپنی رسی کھولی، قافلے کا تمام سامان واسباب اٹھاکر اس غار میں لے گیا، جہاں تابط شرا اور شنفری نے ٹھکانہ بنا رکھا تھا، اس میں اونٹ داخل ہورہے تھے کہ اندر سے ایک نسوانی آواز آئی، تابط شرا نے دریافت کیا کہ کون ہے؟ تو اس کے سامنے ایک نہایت خوب صورت، سڈول جسم والی دوشیزہ کھڑی تھی۔اس نے تابط شرا سے کہا کہ تمھیں مال واسباب تو کافی سارا مل ہی چکا ہے، تو مجھے میری راہ چھوڑ دو۔ یہ سن کر اس نے کہا: کیا تم جیسی چیز کو کوئی چھوڑ سکتا ہے؟ میں تو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔یہ سن کر وہ لڑکی ہنس پڑی اور کہا: مجھے تم دنیا کی سب سے کمزور مخلوق لگتے ہو۔تابط شرا کو یہ سن کر غصہ آگیا، اس نے کہا: میرے جیسے انسان کو تم یہ کہہ رہی ہو؟ اتنے میں اس لڑکی نے اپنا ہاتھ تابط شرا کی طرف بڑھایا اور اسے پٹخ کر اس کے سینے پر بیٹھ گئی، تابط شرا مارے حیرت اور غصے کے پھنکارتا رہا کہ میں تمھیں

زندہ نہیں چھوڑوں گا بھلے ہی تم حسین وجمیل ہو۔اس لڑکی نے اسے اٹھایا اور پھر ایک پٹخنی لگائی اور اس کے سینے پر اپنا پیر رکھ کر بولی: خبیث کہیں کے، اب بولو جو بولنا ہے۔اب تابط شرا ڈھیر ہو چکا تھا۔اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ تیرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آئی؟ تو اس کا سوال سن کر خوشی سے اس لڑکی کی باچھیں کھل گئیں، اس نے کہا کہ میں تو تمہیں سب سے زیادہ طاقت ور سمجھتی ہوں، اس لیے تمہیں معاف کرتی ہوں۔پھر تابط شرا نے پوچھا کہ میں نے تیرے قبیلے کا سب سامان لوٹ لیا، مگر تو نے کچھ نہیں کہا، کیوں؟ تو اس نے کہا کہ: میں نے تیری بہادری کا چرچا سن رکھا تھا اور تجھے پسند کرتی تھی، اس لیے سوچا کہ تو جو کرنا چاہتا ہے کر لے اور میں تجھے حاصل کرلوں۔یہ سن کر پھر تابط شرا کی غیرت جاگ اٹھی اور اس نے کہا: میں تو سوچ رہا تھا کہ میں نے تجھ پر غلبہ حاصل کیا ہے۔تم مجھے قتل کر دو، اس ذلت کے بعد میں اب اور کوئی ذلت برداشت نہیں کرسکتا۔تو اس لڑکی نے کہا کہ میرے پاس قتل سے اچھی تجویز یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کرلو، جب سے میں نے تیری شہرت سنی ہے، تبھی سے تجھ سے محبت کرتی ہوں۔تم مجھ سے شادی کرلو، پھر سرزمین عرب میں ہمارے بچوں سے زیادہ بہادر کسی کے بچے نہیں ہوں گے۔اس طرح دونوں نے شادی کرلی۔تابط شرا کے نہایت بدصورت ہونے کے باوجود اس کے بچے اتنے خوب صورت ہوئے کہ لوگ خوب صورتی میں ان کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

تابط شرا کی موت کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔روایت ہے کہ اس کی ماں نے ابوکبیر ہذلی سے شادی کرلی تھی۔ماں تو پہلے ہی اس کی عادتوں سے پریشان تھی، اس کا نیا باپ بھی تابط شرا کو اس حد تک ناپسند کرتا تھا کہ اس نے کئی بار اسے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی، مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔تابط شرا کو اس کی بھنک لگ گئی؛ چنانچہ اس کے دل میں بھی اپنے نئے باپ اور قبیلۂ ہذیل اور بنوبجیلہ کے تئیں حد درجہ نفرت بیٹھ گئی۔کہا جاتا ہے کہ جبل نمار کے علاقے میں بنوبجیلہ سے لڑتے ہوئے ہی وہ مارا گیا۔ایک روایت یہ ہے کہ اسی جنگ کے دوران ایک سانپ کے ڈسنے سے اس کی موت ہوئی، جبکہ قبیلۂ ہذیل والے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ تابط شرا کو انھوں نے مارا۔

4.13.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

''تابط شرا'' کو دنیائے ادب میں اس کی بے مثال شاعری کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔اس نے کئی ایسے قصیدے کہے جن کی وجہ سے دنیائے عرب میں اس کو پہچان ملی۔اس کے قصائد میں وہ تمام فنی وشعری خصوصیات موجود ہیں، جو بعد کے بڑے بڑے عرب شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔اس کے یہاں زورِ تشبیب دیکھیے:

يَاعِيدُ مالَکَ مِن شَوق وإيراقِ
ومرِّ طَيفٍ علَى الأَهوالِ طَراقِ
يَسرِي على الأَينِ وَالْحَيَاتِ مُحتَفِيا
نَفسِي فَداؤُکَ مَن سَارَ علٰى سَاقِ

ترجمہ: اے بار بار آنے والی غم وخوشی کی کیفیت اور مصیبت کے وقت آنے والا خیال تو کس قدر عظیم ہے! رات کے وقت سانپ بچھوؤں سے بھرے راستے پرشوق وذوق سے چلتا ہے، میری جان ایسے چلنے والے پر قربان ہے۔

یہ اس کے مشہور قصیدے کے ابتدائی اشعار ہیں۔اس قصیدے کو مفضل الضبی نے اپنی شعری تالیف ''المفضليات'' میں شامل کیا ہے۔

قصیدہ اس وقت کا منظر پیش کرتا ہے جب تابط شرا کو قبیلہٗ بجیلہ نے گرفتار کرلیا تھا، مگر عین اسی وقت الشنفری اور ابن برّاق نے اس کی مدد کی اور وہ بھاگ نکلے، یہاں تک کہ شام ہوگئی اور رات کی تاریکی چھانے لگی، عمر بن برّاق اور الشنفری کسی اور طرف نکل گئے تھے اور وہ رات کی تاریکی میں صحرا کے دامن میں تنِ تنہا تھا کہ یکا یک خیالِ محبوب آجاتا ہے اور پورا منظر مذکورہ اشعار میں سمٹ جاتا ہے۔

تشبیب کے مذکورہ اشعار میں محبوبہ کے ذکر کے لیے جو راہ نکالی گئی ہے وہ بالکل اچھوتی ہے کیوں کہ اس میں تخیل کی بلندی تو ہے ہی مگر سچائی بھی ہے۔ یعنی سچائی اور تخیل کی چاشنی سے ذکرِ حبیب کا خمیر تیار کرکے شاعر نے مذکورہ قصیدے کی تشبیب کو تیار کیا ہے۔ اس کے بعد یہیں سے اپنی خود اعتمادی، بہادری اور خودکفیلی کی تعریف کی راہ بھی ہموار ہوجاتی ہے کہ جب دوست احباب ساتھ چھوڑ دیں اور مصائب وآفات میں کوئی مددگار نہ ہو، تو میں اپنے اور اپنی دوڑ پر اعتماد کرتا ہوں اور مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرلیتا ہوں۔ اگلے چند اشعار میں اس نے اپنی دوڑ کی تعریف کی ہے۔ بعد کے شعرا اونٹنیوں اور ہاتھیوں کی برق رفتاری یا خوش رفتاری کی تعریف کرتے ہیں، لیکن تابط شرا خود اپنی دوڑ کی عمدہ انداز میں تعریف کرتا ہے جو حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ اسی قصیدے میں تابط شرا نے حکمت وفلسفے کی باتیں بھی کی ہیں۔ کہتا ہے:

عاذِلتي إنَّ بعضَ اللُّؤمِ مُعنَفَةٌ

وهل متاعٌ وإن أبقيتُه باقِ

ترجمہ: اے ملامت گر تیری ملامت بہت سخت ہے۔ یہ مال و دولت تو آنی جانی چیز ہے، اگر میں بخیلی کے ذریعے اسے روکنا بھی چاہوں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ میرے ہی پاس رہے۔

چھبیس اشعار پر مشتمل تابط شرا کا یہ مشہور قصیدہ نہ صرف اس کی بلکہ اس جیسے تمام صعالیک عرب کی زندگی اور اس سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا عکاس اور ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں حکایتِ غمِ دوراں بھی ہے اور شکایتِ غمِ جاناں بھی۔ ایک سخت کوش تندخو آزاد منش نوجوان کے جذبات کی تصویر کشی بھی ہے اور ان خانماں برباد شاعروں کی فلاکت زدہ انتہائی عسرت وغربت کی ماری زندگی کا نقشہ بھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں اخذ کی ہوئی حکمت وفلسفہ کی باتیں بھی، جن میں اگرچہ آج کل کے اعتبار سے بظاہر کوئی ندرت یا رفعتِ تخیل نہیں ہے، لیکن اس وقت معاشرے اور اُن حالات میں بہت وقیع اور اہم سمجھی جاتی تھیں۔

تابط شرا کے قصائد کے مطالعے اور ان پر ناقدین کی رایوں وتبصروں کو سامنے رکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابط شرا ایک بڑا شاعر تھا۔ اس کے ہمعصروں میں سلیک بن السلکہ، عمرو بن برّاق اور اُسید بن جابر نے بھی میدانِ قصائد میں نام پیدا کیا۔ اسی دور میں اصحاب المجمہرات کا ایک قدآور قصیدہ گو شاعر بشر بن ابی خام بھی تھا۔

4.14 الشنفری

4.14.1 حالاتِ زندگی:

الشنفری بھی زمانۂ جاہلیت کا ایک بڑا شاعر تھا۔ اس کا شمار شعرا کے دوسرے طبقے میں ہوتا ہے۔ یہ تابط شرا کا ماموں تھا۔ اس کا اصل نام ثابت بن اوس الازدی ہے۔ اس کا سن وفات 525ء ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے بڑے غارت گروں اور لوٹ مار کرنے والوں میں تھا، دوڑنے

میں نہایت تیز تھا۔اس کی عادات واطوار سے عاجز آ کر اس کے قبیلے نے اس سے برائت اختیار کر لی تھی۔

بچپن میں اس کے والد کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کی ماں اور خود اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا تھا کہ وہ دادیہال اور نانیہال سے بدظن ہو کر فرار ہو گیا تھا اور بعد میں انھیں پر حملہ بھی کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا تھا۔اس کی ایک چھلانگ تقریباً ساڑھے آٹھ میٹر لمبی ہوتی تھی۔ بہادر اتنا تھا کہ تن تنہا کسی بھی قبیلے پر حملہ کر دیتا تھا یا اس کے ساتھ تابط شرا، عامر بن اخنس اور عمرو بن براق جیسے لوگ ہوتے تھے، جو دوڑنے بھاگنے اور لوٹ مار وقتل وغارت مچانے میں اسی جیسے تھے۔

روایت ہے کہ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ بنوسلامان بن مفرج نے اس کے باپ کو مار دیا اور اسے قید کر لیا تھا۔انہی کے درمیان اس کی پرورش ہوئی۔ پھر بڑے دنوں بعد اسے اس حقیقت کا علم ہوا کہ بنوسلامان تو اس کے قبیلے کے ہیں ہی نہیں اور اسے ان لوگوں نے قید کر رکھا ہے، یہ جاننے کے بعد اس نے قسم کھالی کہ وہ بنوسلامان کے سولوگوں کو قتل کرے گا؛ کیوں کہ انھوں نے اسے قید کیا، غلام بنایا اور اسے اس کے نسب اور خاندان سے بے خبر رکھا، چنانچہ اپنی قسم پوری کرتے ہوئے اس نے بنوسلامان کے 99 لوگوں کو قتل کیا،اس کے بعد وہ خود بھی مارا گیا۔اس کی لاش ایسے ہی پڑی ہوئی تھی کہ بنوسلامان کے ایک شخص کا گزر ہوا،تو اس نے حقارتاً اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارنا چاہی،اس کا پاؤں شنفری کی ہڈی سے ٹکرایا اور زخمی ہو گیا، اسی زخم کی وجہ سے اس شخص کی موت واقع ہوگئی اور اس طرح شنفری کی بنوسلامان کے سولوگوں کو مارنے کی قسم بھی پوری ہوگئی۔اس کے قتل کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بنوسلامان تو اس کے پیچھے لگے ہی ہوئے تھے اور اس بات کا علم سارے اہل عرب کو تھا؛ چنانچہ ایک بار وہ سفر کے دوران پانی پینے کے لیے کسی چشمے پر جھکا تو دو اجنبی لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے بنوسلامان کے حوالے کر دیا۔ان لوگوں نے اسے ایک پیڑ سے باندھ دیا اور پوچھا کہ مارنے کے بعد ہم تمہیں کہاں دفن کریں،تو اس نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

فَلاتَدفنُوني اِنَّ دَفنِي مُحرَّمٌ
عَلَيكُم ولٰكن أبشِرى أمَّ عامِرِ
اِذَا حَملُوا رأسِي وفِي الرَّأسِ أكثرِي
وغُودِرَ عِندَ المُلتَقٰى ثُمَّ سائِرِي
هُنالِكَ لَا أرجُو حَياةً تَسُرُّنِي
سَمِيرَ اللَّيالِي مُبسَلًا بِالجَرائِرِ

ترجمہ: تم میری تدفین نہ کرنا، میری تدفین تم لوگوں پر حرام ہے۔البتہ بجّو کے لیے خوشخبری ہے کہ جب لوگ میرا سرتن سے جدا کر کے لے جائیں گے اور بقیہ جسم کو چھوڑ جائیں گے تو اسے کھانے کا موقع مل جائے گا۔ واضح ہو کہ مجھے کسی پُرمسرت زندگی کی آرزو نہیں ہے،اس حال میں کہ میں دراز راتوں میں بے یارومددگار جرائم کا بوجھ اٹھائے پڑا رہوں۔

4.14.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

اس کا شمار بھی صعالیک شعرا میں ہوتا ہے۔ شنفری کے اشعار میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو کسی اچھے شاعر میں ہونی چاہئیں۔اس کے

یہاں حسن وعشق، مناظرِ فطرت، اخلاق وحکمت اور مشاہدات وتجربات کا بیان ہے۔ دراصل زمانے کے حالات نے اسے ایک سنجیدہ شاعر بنادیا تھا۔شنفری کے اشعار اظہارِ شجاعت وفخر ومباہات پر مشتمل بھی ہیں، کچھ غزلیہ شاعری بھی کی ہے۔اس کے بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں، جن کی نسبت تابط شرا کی طرف کی جاتی ہے۔اس نے متعدد ایسے قصائد کہے جو عرب میں خاصے مشہور ہوئے۔ 86 اشعار پر مشتمل اس کا قصیدہ ''لامیۃ العرب'' عمدہ اور دورِ جاہلی کے شاعرانہ کلام کا بہترین نمونہ ہے۔فصاحت وبلاغت اور بے خانماں زندگی کی عکاسی میں اپنی مثال آپ ہے۔اس قصیدے کی مختلف شروحات لکھی گئی ہیں، جن میں محمود بن عمر الزمخشری کی ''شرح لامیۃ العرب''، محمد بن قاسم کی ''تفریح الکرب عن قلوب اہل الارب فی معرفۃ لامیۃ العرب'' اور عطاء اللہ بن احمد کی ''شہامۃ الارب فی شرح لامیۃ العرب'' بہت مشہور ہیں۔اس کا یہ قصیدہ نہ صرف عربی ادب بلکہ عالمی ادب میں بھی ایک خاص مقام ومرتبے کا حامل ہے اور مختلف عالمی زبانوں میں اسکے ترجمے کیے گئے ہیں۔شارحین نے اس قصیدے کی لغوی وادبی قدر وقیمت کا جائزہ لینے کے ساتھ بے گھری یا صحرا نوردی کی زندگی گزارنے والی جماعت کے تعلق سے پیش کردہ اس کے افکار وخیالات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔اس قصیدے کی شہرت ''لامیۃ العرب'' کے نام سے اس لیے ہوئی کہ اس میں شنفری نے جاہلی دور کے عرب صحرانوردوں اور ان کی مہم جوئیوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔بعض لوگوں نے اس قصیدے کی نسبت خلف الاحمر کی جانب کی ہے، جو حقائق کے اعتبار سے بالکل غلط ہے؛ کیوں کہ اس قصیدے کے جو مضامین ہیں، وہ شنفری کے دوسرے قصیدوں اور دوسری شاعری سے ملتے جلتے ہیں۔اس کا اسلوب بیان اور ذخیرۂ الفاظ بھی اسی قسم کے ہیں جو اس کی دوسری شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس قصیدے میں شنفری نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بنوسلامان پر اپنے حملوں کا ذکر کیا ہے۔اس قصیدے کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ چوں کہ شنفری کے اس قصیدے میں اور مؤیدالدین ابواسماعیل حسین بن علی الطغرائی کے لامیۃ العجم میں موضوع کے اعتبار سے ایک قسم کی مشابہت ومناسبت پائی جاتی تھی؛ اس لیے علماء ادب وتنقید نے اس کا نام لامیۃ العرب رکھ دیا۔بعض ناقدین کا خیال ہے کہ طغرائی نے اپنے قصیدے میں شنفری کی ہی نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔البتہ دونوں قصیدوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ شنفری کا قصیدہ زبان وبیان کے اعتبار سے قدرے پیچیدہ اور مشکل الفاظ وتعبیرات پر مشتمل ہے، جبکہ طغرائی کا قصیدہ سادہ الفاظ اور بڑی حد تک آج کل رائج شعری اسلوب پر مشتمل ہے۔اور دونوں میں نقطۂ اشتراک یہ ہے کہ جس طرح شنفری قتل کیا گیا تھا، اسی طرح طغرائی کی بھی موت ہوئی تھی اور دونوں قصیدوں کا مرکزی موضوع بھی ایک ہی ہے یعنی اظہارِ فخر ومباہات۔

اس قصیدے میں شنفری نے نہ صرف اپنی؛ بلکہ اپنے جیسے تمام صعالیک شعرا کی زندگی کا حقیقی نقشہ بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ایک بے گھر، بے در، بے یار وغمگسار، مگر غیور وخوددار اور بہادر انسان کس طرح اپنی زندگی صحراؤں، بیابانوں میں درندوں اور جنگلی جانوروں کے درمیان گزارتا ہے۔بھوک، پیاس اور گرمی کی شدت، راتوں کی ہوشربا وحشت اور تاریکی، صحرا کی ہولناکی میں کس طرح صرف اپنی اونٹنی کے سہارے ایک منزلِ موہوم کی طرف چلتا رہتا ہے، یہ سب اس قصیدے میں بیان کیا گیا ہے۔

قصیدہ ''لامیۃ العرب'' کے شروع میں میں دکھ بھرے انداز میں شنفری کہتا ہے:

أَقِيمُوا بَنِي عَمِّی صُدورَ مَطِیکم

فإِنّي إِلٰی قومٍ سِواكُم لأَمیَلُ

فَقدحُمَّتِ الحاجاتُ واللّيل مقمِرٌ

وشُدّت لِطَيّاتٍ مَطَايَا وأَرحُلُ

ترجمہ:اے میرے چچازاد بھائیو!تم اپنی سواریوں کی پیٹھ سیدھی کرلو (چلے جاؤ) کیوں کہ میں اپنے آپ کوتمھارے مقابلے میں دوسری قوم سے زیادہ قریب محسوس کررہا ہوں۔ضرورت پورا ہونے کا وقت آچکا ہے،رات روشن ہےاور سواریاں چلنے کو تیار ہیں۔

اسی قصیدے کے دوسرے اشعار میں اس نے عوام الناس کو یہ درس دیا ہے کہ جس جگہ عزت سے زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ہو، وہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے اوراپنی دنیا کہیں الگ بسانی چاہیے۔

شنفری کے قصیدۂ لامیہ کے بارے میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کا ایک قول مشہور ہے، جسے بعض دفعہ بطور حدیث بھی روایت کیا جاتا ہے۔انھوں نے ایک موقع پر فرمایا کہ ’’اپنی اولاد کو قصیدۂ لامیہ پڑھاؤ؛ کیوں کہ اس میں حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے‘‘۔اس سے پتا چلتا ہے کہ شاعر نے اپنے قصیدے میں جو کچھ کہا ہے،اس کا کچھ نہ کچھ اثر اس کی عملی زندگی میں ضرور رہا ہوگا اور حضرت عمر بن خطابؓ اس کی زندگی کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔حضرت عمرؓ کی بات شنفری کی زندگی اور اس کے حالات بیان کرنے والے دیگر مؤرخین اور رُوات سے بہت پہلے کے ہیں،اس لیے بھی ہمیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ بعد میں اس کے بارے میں جو روایات نقل کی گئیں اور تاریخ میں اس کے بارے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں،ان میں حقیقت بیانی کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ ملمع سازیوں سے بھی کام لیا گیا ہے اور شنفری کو ایک نہایت بے رحم،ڈاکو اور لٹیرے کے طور پر پیش کرکے اس کی زندگی کی محض یک رخی تصویر پیش کی گئی ہے۔

شنفری کا ’’تائیہ قصیدہ‘‘ بھی کافی مشہور ہوا۔یہ قصیدہ بھی اس کے فن کا عمدہ نمونہ ہے۔اس میں غزلیہ لب ولہجہ پورے شباب کے ساتھ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔اس میں شنفری نے اپنے ذاتی خیالات اور اپنے اوپر گزرنے والے حالات کی عکاسی کی ہے۔خاص طور پر اپنے باپ کے قتل اور بیوی ام عمرو کے اسے چھوڑکر چلے جانے کا جو اسے غم تھا، اسے اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔قصیدے کا آغاز اپنی بیوی کے چھوڑکر چلے جانے پر اظہارِ افسوس سے کیا ہے۔

ایک جگہ اپنی بیوی (اور محبوبہ) کا سراپا کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

فدَقّت وجَلّت واسبكَرّت وأَكملَت

فلوجُن إنسان من الحسن جُنّت

فبِتناكأن البيت حُجِّر فوقنا

برَيحانةٍ رِيحت عشاء أَوطُلّت

ترجمہ:اس کے اعضا متناسب،اس کی شکل وصورت عمدہ، انداز واطوار بڑے مست اور قد قدِ رعنا ہے،بس یہ سمجھ لیجئے کہ خالق نے اسے ہر اعتبار سے ایسا مکمل پیدا کیا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کی خوبصورتی دیکھ کر دیوانہ ہوجاتا ہے،تو وہ بھی دیوانی ہوجاتی ہے۔ہم نے ایک ایسے

گھر میں ساتھ رات گزاری، جو خوشبودار ہواؤں سے گھرا ہوا تھا اور ہلکی بارش میں ان کی خوشبو اور بھی تیز ہو جاتی تھی۔

محبوبہ کی تعریف وتوصیف کا یہ ایک اچھوتا انداز ہے کہ شاعر فقط ایک شعر میں اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں کو بڑے اچھے پیرائے میں احاطہ کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔حسن کی وجہ سے کوئی اس کا دیوانہ ہوتا ہے تو وہ بھی دیوانی ہو جاتی ہے۔محبوب کے اخلاق کو بیان کرنے کا یہ واقعی نرالا انداز ہے۔یعنی کوئی اس پر مرے اور وہ نہ مرے، یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات ہے،لہذ اخوش اخلاقی کی وجہ سے اپنے مرنے والے پر وہ بھی مرنے لگتی ہے۔پھر اس نے محبوب کے ساتھ اپنے وصال کے لمحات کی نہایت خوب صورت انداز میں منظر کشی کی ہے۔

قصیدے کے اختتام پر اس نے اپنی بہادری،خود داری اور عزت نفس وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔فنی اعتبار سے یہ قصیدہ بھی نہایت اعلی درجے کا ہے اور شنفری کے شاعرانہ کمال ومہارت پر دلالت کرتا ہے۔اس میں اس نے انسانی اخلاق وتعلقات چاہے وہ مرد کے ہوں یا عورت کے دونوں پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔اپنی بیوی، جو اس کی محبوبہ بھی تھی، اس کے تئیں اس کے غائبانے میں بھی دلی محبت وتعلق کا اظہار کیا ہے۔ اور ساتھ ہی صحرانوردی والی زندگی نے اس کے اندر جس قسم کی خصوصیات پیدا کردی تھیں،ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔اس قصیدے میں قصہ گوئی، واقعیت پسندی، سچی منظر کشی، دقتِ تعبیر اور خوب صورت طرز بیان سبھی اوصاف پائے جاتے ہیں۔زبان کے اعتبار سے بھی یہ قصیدہ بہت اعلیٰ ہے،سنجیدہ الفاظ اور تصنع وتکلف سے پاک تعبیرات استعمال کی گئی ہیں۔

4.15 اکتسابی نتائج

عرب معاشرے میں شاعری کو بہت اہمیت حاصل تھی۔کسی قبیلے میں اگر کوئی شاعر پیدا ہو جاتا تو سارا قبیلہ خوشیاں مناتا، کیونکہ یہی شاعر ان کی نیک نامی اور دشمنوں پر غلبہ پانے کا ضامن ہوتا تھا۔شاعری وہ معاشرے اتنی عام تھی کہ کہا گیا: ''الشعر دیوان العرب'' شعر عربوں کا تاریخی دستاویز ہے، کیونکہ اشعار میں عرب اپنی زندگی کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کیا کرتے تھے۔۔وہ لوگ اچھے قصیدے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔سالانہ عکاظ کے میلے میں باضابطہ قصائد کی تنقیح اور تنقید کی جاتی اور جو قصیدہ سب سے اچھا ہوتا اس کا چرچہ سارے عرب میں پھیل جاتا۔''سبع معلقات'' دور جاہلیت کے عربی اشعار کا وہ مایہ ناز مجموعہ ہے، جس کی ثقاہت، معیار اور لسانی خوبیاں اہل عرب کے ہاں مسلم تھیں۔یہ سارے قصیدے اپنے معیار اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے خانۂ کعبہ پر لٹکائے گئے۔اس کلام کی خوبیوں اور محاسن کی وجہ سے ہر دور میں اسے عربی زبان کی اعلی تعلیم کے نصاب میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔سبع معلقات کے سات شعرا ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔امرؤالقیس بن حجر الکندي۔ ۲۔زہیر بن ابی سلمی المزني۔ ۳۔عمرو بن کلثوم التغلبي۔ ۴۔طرفہ بن العبد البکري۔

۵۔عنترہ بن شداد العبسي۔ ۶۔لبید بن ربیعہ العامري۔ ۷۔حارث بن حلزہ الیشکري۔

زمانہ جاہلی میں شعروشاعری کو بڑی قبولیت حاصل تھی، اس دور میں بے شمار شعرا پیدا ہوئے، ان میں زیادہ تر شعرا سماج اور معاشرے کے درمیان زندگی گزارتے تھے،لیکن بعض شعرا وہ تھے جو معاشرے سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزارتے تھے،غربت اور ناداری نے انھیں اس حد تک مجبور کردیا کہ وہ چوری، ڈکیتی اور راہ زنی پر اتر آئے۔جب بھی وہ کوئی چوری وغیرہ کرتے تو اس کو اپنے اشعار میں بیان کرتے،ان کی شاعری پر کیف اور اثر آفریں تھی، یہ لوگ امیر قبائل کو لوٹ کر غریبوں کو مدد کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شجاعت اور فخر کا

پہلو غالب ہے۔ ان شعرائے صعلوک میں سب سے زیادہ مشہور تأبط شرا، شنفری، عروہ بن ورد العبسی، حاجز ازدی وغیرہ ہیں۔

اصحاب مجمھرات وہ شعرا ہیں جو اگرچہ کہ ان کا شمار طبقۂ اولی میں نہیں ہے، لیکن ان کی شاعری طبقۂ اولی کی شاعری سے کم بھی نہیں ہے، اپنے کمال فن کی وجہ سے وہ مقبول عام وخاص تھے۔ اس طبقہ کے شعرا میں سب سے زیادہ مشہور نابغہ ذبیانی، عبید بن الأبرص، امیہ بن ابی الصلت وغیرہ ہیں۔

4.16 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ امرؤالقیس ایک بے باک شاعر تھا؟ ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

۲۔ امرؤالقیس نے گھر بار چھوڑ کر کس طرح کی زندگی گذاری؟

۳۔ امرؤالقیس کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ تفصیل سے تحریر کریں۔

۴۔ امرؤالقیس کے معلقے کی خوبیاں تفصیل تحریر کریں۔

۵۔ زہیر بن ابی سلمی کے بعض قصائد کو حولیات کہا جاتا ہے۔ اس پر ایک نوٹ لکھیے۔

۶۔ زہیر بن ابی سلمی کی شاعری کی خصوصیات مفصل تحریر کریں۔

۷۔ زہیر بن ابی سلمی کی شاعری میں زندگی کے طویل تجربات ہیں۔ ایک نوٹ لکھیے۔

۸۔ عمرو بن کلثوم کی شاعری کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

۹۔ عمرو بن کلثوم نے اپنی شاعری میں کس چیز کا پیغام دیا؟

۱۰- نابغہ ذبیانی کی زندگی کے حالات کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

۱۱۔ عبید بن الأبرص کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔

۱۲۔ تأبط شرا کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۱۳۔ امیہ بن ابی الصلت کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔

۱۴۔ شنفری کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

4.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔ كتاب الشعر و الشعراء۔ ابن قتيبه

۲۔ طبقات فحول الشعراء۔ ابن سلام الجمحي

۳۔ جمهرة أشعار العرب۔ ابن زيد القرشي

۴۔ في الأدب الجاهلي۔ طه حسين

٥ـتاريخ آداب اللغة العربية ـ جرجي زيدان
٦ ـتاريخ الأدب العربي ـ دكتور شوقي ضيف
٧ـ تاريخ الأدب العربي ـ أحمد حسن زيات
٨ـ الجديد فى الأدب العربي ـ حنا الفاخوري
٩ ـ كتاب الأغاني ـ ابو الفرج الأصبهاني
١٠ ـ العمدة فى صناعة الشعر و نقده ـ ابن رشيق القيرواني

اکائی 5 عصر اسلامی کا تعارف اور اس کی خصوصیات

اکائی کے اجزا

5.1 مقصد

5.2 تمہید

5.3 اسلام کا ظہور اور عرب معاشرے پر اس کے اثرات

5.4 عصر اسلامی کی ادبی و علمی سرگرمیاں: ایک تعارف

5.5 ادب کے حوالے سے عہدِ نبوی و عہد صحابہ کی امتیازی خصوصیات

5.6 اکتسابی نتائج

5.7 نمونے کے امتحانی سوالات

5.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

5.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ عصرِ اسلامی کے ادبی ماحول اور اس کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔ انھیں یہ معلوم ہو سکے گا کہ اسلام نے عرب معاشرہ اور عربی فکر پر وہ کون سے اثرات مرتب کیے تھے جن کی وجہ سے علم و ادب کو ایک نئی جہت میں فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد کی وہ کیا خصوصیات تھیں جنھوں نے آنے والے ادوار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے راہ ہموار کی؟

5.2 تمہید

عصر اسلامی عربی ادب کی تاریخ کے باب میں ایک اہم مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقی معنوں میں اسی عہد میں ان علوم وآداب کی بنیاد رکھی گئی تھی جنہیں اموی اور عباسی عہد میں عروج و ارتقا حاصل ہوا۔ انہیں علوم وفنون کی وجہ سے بلند اور عالمی معیار کی ادبی تخلیقات منظر عام پر آئیں جو عربی علم و ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔

5.3 اسلام کا ظہور اور عرب معاشرے پر اس کے اثرات

610ء میں نبی عربی محمد بن عبداللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت سے اسلام کی تاریخ کا آغاز ہوا۔ اس اعلان نے عرب معاشرہ میں ایک بھونچال کی سی کیفیت پیدا کردی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس حیثیت سے لوگ قبول کرنے کو تیار تھے کہ آپ ﷺ صادق اور امین ہیں لیکن اس حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے کہ آپ ﷺ عرب کے فکری اور سماجی سانچے کو بدلنے کی کوشش کریں، وہ بھی اس عنوان سے کہ خدا نے آپ ﷺ کو اس مشن پر مامور کیا ہے۔ آپ ﷺ کی اس دعوت کی توقع کے عین مطابق مخالفت کی گئی جس کا نتیجہ متعدد جنگوں کی شکل میں سامنے آیا، جن میں رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو کامیابی اور فتح حاصل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ موقع ملا کہ وہ مدینہ میں ایک نئے سماج کی تشکیل کریں۔

یہ نیا معاشرہ اپنی منفرد اور ممتاز خصوصیات رکھتا تھا۔ اس معاشرہ نے اپنے ماقبل جاہلی معاشرہ کی اُن خصوصیات اور صالح عناصر کو اپنالیا جو فطرت انسانی کے مطابق تھیں اور جو کسی بھی انسانی معاشرہ میں خیر و عدل کے قیام کے لیے ضروری تھیں اور اُن فاسد عناصر کو ترک کر دیا جو کسی بھی انسانی معاشرہ کی فلاح و ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ اسلام نے افراد کی اُن خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جن کو مظاہر پرستی اور اوہام وخرافات پر مبنی تصورات اور رسوم و رواجات کی پابندیوں کی وجہ سے اب تک ظہور میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسلام نے عربی ذہن کو آزادی عطا کی تا کہ وہ فکر کی شاہراہ پر آگے بڑھ سکے اور اس کے فطری ذوق کو جلا اور قوت حاصل ہو۔

اسلام نے عرب معاشرہ میں جو تغیرات پیدا کیے ان کی مختلف نوعیتیں تھیں۔ ایک بڑا تغیر اسلام نے یہ پیدا کیا کہ عرب کے قبائلی سماج کو جو انتشار و پراگندگی کا شکار تھا، وحدت و اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا۔ یمن اور حجاز اور مُضری اور حمیری کے مابین قبائلی عصبیت کی بنیاد پر جو چپقلش تھی وہ دب گئی۔ جس کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ’’اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو باہم ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور اس طرح تم اللہ کی اس نعمت و احسان سے ایک دوسرے کے بھائی ہوگئے۔‘‘ (آل عمران:103)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ایها الناس إن ربکم واحد وان أباکم واحد۔ کلکم بنی آدم و آدم من تراب و اکرمکم عنداللّٰہ اتقاکم۔ لیس لعربیٍ علی عجمیٍ فضلٌ الا بالتقویٰ۔

’’اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تم سب کے باپ بھی ایک ہیں۔ تم میں سے ہر کوئی آدم کی اولاد ہے اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی بنا پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ کے۔ (مسند احمد)

☆ دوسرا فرق اس اتحاد و اجتماعیت کے نتیجے میں یہ آیا کہ عرصۂ دراز سے جو خوں ریزی اور جنگ و فساد کی فضا بنی ہوئی تھی، معمولی باتوں پر شروع ہونے والی جنگیں جو کئی کئی دہائیوں سے جاری تھیں، جیسے ’’داحس‘‘ اور ’’غبرا‘‘ کی جنگیں؛ وہ ختم ہوگئیں اور مکمل امن قائم ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کو خصوصی اہمیت دی۔

☆ جاہلی معاشرہ میں خواتین اور غلاموں کی حیثیت بہت کمزور تھی، اسلام نے انھیں مستضعفین میں شمار کرتے ہوئے، ان کی حیثیت کو معاشرہ میں بلند کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اس طبقہ نے علم وادب کے ہر میدان میں نمائندگی کی اور اہم کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

☆ عربی اور عجمی کے فرق کو مٹا دینے کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ بڑی تعداد میں خطۂ عرب کے اندر غیر عربوں کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔ چنانچہ عباسی دور میں اس طبقہ کو علم وادب میں عربوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہوگئی، یہاں تک کہ خالص اسلام علوم — تفسیر، حدیث اور فقہ — میں بھی عرب کے مقابلہ میں اہلِ عجم آفاقِ علم پر زیادہ نمایاں نظر آنے لگے۔

☆ مجموعی طور پر ایک بڑا فرق انسان کے تصور میں آیا۔ اسلام سے قبل انسان اور انسانیت کا تصور بہت دھندلا اور انسان کی اپنی فطری حیثیت کے اعتبار سے نہایت منفی تھا۔ اسلام نے تکریمِ انسانیت کے حوالے سے انسانیت کے معیار کو بلند کیا۔ اس طرح عرب معاشرہ پہلی مرتبہ اپنے حقیقی معنوں میں انسانی اقدار سے آشنا ہوا۔

بہر حال یہ مختلف عوامل اور اسلام کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات تھے جنھوں نے عرب معاشرے کی نئی صورت گری کی اور ایک ایسا معاشرہ تیار کیا جس نے تاریخ کے اگلے مرحلوں میں عالمی نوعیت کی معیاری تخلیقات سے عالمی ادب کے دامن کو زینت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس میں شک نہیں کہ عہدِ جاہلی میں تخلیق کیا جانے والا شعری سرمایہ اپنی منفرد اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے آج بھی توجہ کا مرکز ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو عرب کی فکری اور ادبی صلاحیت اسلام سے قبل حقیقی معنوں میں صرف شعر تک محدود تھی۔ اسلام کے انقلاب نے عربی فکر کو وہ زرخیزی اور قوت عطا کی کہ وہ علوم و آداب کے سینکڑوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے قابل ہوگئی۔ نیز وہ شعری ادب جس پر فخر، ہجو، قبائلی عصبیت، شراب اور ان جیسی دیگر اخلاقی رذائل کی چھاپ تھی، اسلام کی آمد کے بعد اس کا رنگ بدل گیا۔

اخلاقی رذائل سے فضائل کی طرف عربوں کے رخ کو موڑنے کے ساتھ، اسلام کا ایک دوسرا بڑا کارنامہ یہ رہا کہ اس نے عرب معاشرہ میں امن کا ماحول پیدا کر دیا جس کا تصور عرب کی قبائلی معاشرت میں نہایت مشکل تھا۔ امن و عافیت کے ماحول میں بدوی ذہن کو حیات

وکائنات کے مختلف موضوعات پر غور وفکر کرنے کا موقع ملا۔ بہرحال اسلام نے جو نظریۂ حیات و کائنات (world view) پیش کیا، اس نے عرب معاشرت میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کردی، ایک ایسی تبدیلی جس سے عرب معاشرہ اب تک دوچار نہیں ہوا تھا۔

5.4 عصر اسلامی کی ادبی وعلمی سرگرمیاں: ایک تعارف

اسلام نے دینی وسیاسی اور معاشی سطح پر عرب معاشرہ میں جو تبدیلیاں پیدا کیں اُن کے نتیجے میں عربی فکر کو جلا حاصل ہوئی اور بڑے پیمانے پر علمی و ادبی سرگرمیاں ظہور میں آگئیں۔ عربوں کے پاس نثری سرمایہ بہت محدود تھا بلکہ صرف معدودے چند۔ البتہ شعری سرمایہ بہت باثروت اور وسیع تھا۔ چنانچہ عصرِ اسلامی میں ایک اہم تاریخی وادبی سرمایہ کی حیثیت سے لوگوں کی توجہ اس پر مرکوز رہی۔ قرآن کی تفہیم میں یہ جاہلی شاعری لسانی سطح پر معاون تھی اس لیے اس کو پڑھنے پڑھانے کی خلفائے راشدین نے ترغیب دی۔ چنانچہ ایسے لوگ سامنے آئے جنھیں ہزاروں کی تعداد میں جاہلی دور کے اشعار یاد تھے۔ قرآن میں بہت سے ایسے الفاظ تھے عرب جن سے نامانوس تھے یا قرآن نے جن معنوں میں انھیں استعمال کیا ہے، وہ اُن سے کما حقہ آشنا نہیں تھے۔ بنا بریں متلاشی ذہنوں کو تگ و دو کا موقع ملا اور اس طرح ادبی ولسانی سرگرمیوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

قرآن نے ایک ادبی نمونہ کی حیثیت سے بھی لوگوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کیں۔ قرآن کا یہ نمونہ نہ تو شعر تھا اور نہ معروف معنوں میں نثر بلکہ حقیقت میں وہ دونوں کے مابین کی صنف تھی۔ اسی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ۔ اس حیثیت سے ادبی وعلمی ذوق کو پروان چڑھانے میں سب سے اہم رول قرآن نے ہی ادا کیا ہے۔

دوسری سطح پر یہ رول حدیث نے نبھایا۔ رسول اللہ ﷺ افصح العرب والعجم تھے۔ حالاں کہ آپ ﷺ اُمی تھے۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے بہت سے جملے اور ترکیبیں اعلیٰ نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ جوامع الکلم کی خوبصورت مثال ہیں۔ صحابہ کرام کے ادبی ذوق کو ان سے بھی جلا حاصل ہوئی اور ان کی نقل کی جانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ کا حجۃ الوداع کا خطبہ آپ ﷺ کے بلاغت آمیز کلام کی عمدہ مثال ہے۔ عصر اسلامی کے ابتدائی حصے میں خطبہ کو ایک اہم صنف کے طور پر ابھرنے اور ترقی پانے کا موقع ملا۔ ان خطبات کی اصل خوبی بلاغت ہے جو جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ البتہ اس کو خالص منطقی اور عقلی پیمانے پر قائل کرنے والا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد عرب اور عرب سے باہر مختلف شہروں میں بکھر گئی جس کا مقصد اسلام کے پیغام کو عام کرنا اور دنیا کی قوموں کو اس کی دعوت دینا تھا۔ ان صحابہ میں سے ایک بڑی تعداد افاضل صحابہ کی تھی۔ وہ اور ان کے شاگردوں نے علم وادب کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ انھیں نئے ماحول سے واسطہ پڑا جس کے لیے انھوں نے نئے انداز واسالیب اختیار کیے جس کی وجہ سے بھی علم وادب کو فروغ حاصل ہوا۔

عصر اسلامی کو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی کہ اس عہد میں علم وادب کی جو سرگرمیاں پروان چڑھیں اُن میں مقصد حیات پر زور تھا۔ اس طرح وجود میں آنے والا علم وادب کا یہ سرمایہ خالص مقصدیت کی اساس پر مبنی تھا۔ اس کا کوئی عنصر ایسا نہیں تھا جو مقصدیت سے خالی ہو۔ ادب کا یہ پہلو دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ اسی دور اور اس کے ادب میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانیوں کی

طرح کے ادبی نمونے اس دور میں سامنے نہیں آسکے جن میں مجرد تخیل کو بنیاد بنا کر علم و ادب کی تخلیق کی کوشش کی گئی ہو۔ البتہ بعد کے ادوار میں متعدد ایسے نمونے نظر آتے ہیں۔

یونان کی طرح ہندوستان میں بھی اس دور میں اور اس سے پہلے ادب اور فلسفہ کے میدان میں اس طرح کی کوششیں نظر آتی ہیں، جن کی اپنی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تاہم ان کا تعلق قوتِ خیال اور حکمت سے ہونے کے باوجود وہ مقصدیت سے بہت دور نظر آتی ہیں۔ عصر اسلامی کے ادب میں یہ مقصدیت توحید و آخرت کا عقیدہ تھا جس نے زندگی کو ایک نئے معنی دے دیے جو ادب برائے دنیاوی و اُخروی زندگی سے عبارت تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عصر اسلامی میں ادب کی تخلیق اپنی کمیت اور مقدار کے لحاظ سے کم تھی تاہم اپنی کیفیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ یہ اسی کیفیت اور اثر کا کمال تھا کہ اس دور میں لکھے جانے والے علوم و افکار نے آنے والے دنوں میں ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جس نے انسانی تاریخ کو ایک نئے مرحلہ میں داخل کر دیا۔

5.5 ادب کے حوالے سے عہدِ نبوی و عہد صحابہ کی امتیازی خصوصیات

گزشتہ صفحات میں اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ ظہورِ اسلام نے عرب کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتِ حال پر کس طرح گہرے اثرات مرتب کیے اور اس کے نتیجہ میں متنوع قسم کی علمی و ادبی سرگرمیاں پیدا ہوئیں۔ حسب ذیل سطور میں عہدِ نبوی و عہد صحابہ بطورِ خاص خلفائے راشدین کے عہد کی خصوصیات کا جائزہ علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے لیا جائے گا۔

عہد نبوی اس لحاظ سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس دور میں علم و ادب کے لحاظ سے ساری اہمیت قرآن کو حاصل تھی۔ اسی کو مرکزیت حاصل تھی۔ وہ علم و داب کا سر چشمہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث بھی اس دور میں ظہور پذیر ہونے والے علم و ادب کا دوسرا بڑا سر چشمہ تھیں، لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکید تھی کہ حدیث کو تحریر میں نہ لایا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ بھی دراصل لوگوں کو قرآن کو مرکز توجہ بنانے کی ترغیب دینا تھا۔ قرآن کے اسلوب کی بلاغت اور ایجاز نے لوگوں کو اس کی پیروی پر مائل کیا۔ چنانچہ صحابہ کرام کے جملوں اور نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے کلام میں اس کی نقل و اتباع کی جھلک ہمیں نظر آتی ہیں۔

قرآن کی تدوین کے بعد جب خصوصیت کے ساتھ حدیث کو تحریر میں لانے اور جمع کرنے کی تحریک آگے بڑھی تو حدیث کی بلاغت آفرینیوں اور جوامع الکلم (گہرے معانی رکھنے والے معنی خیز جملے) نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ حدیث اور خصوصیت کے ساتھ قرآن کے اثرات ہم اس عہد کے نثری و شعری ادب پر نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔

عربی ادب و ثقافت پر حدیث کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد امین "فجر الإسلام" میں لکھتے ہیں:

> "عالم اسلام میں ادب و ثقافت کے پھیلاؤ میں حدیث نبوی نے — خواہ وہ صحیح ہو یا گھڑی ہوئی — غیر معمولی کردار ادا کیا۔ لوگ اس کے درس و تدریس پر ٹوٹ پڑے۔ علمی و ادبی سرگرمیاں اس کے گرد گھومتی تھیں۔ علمائے صحابہ و تابعین کی علمی شہرت قرآن کی تفسیر اور حدیث (کے تعلیم و تعلّم) پر مبنی تھی۔" (فجر الإسلام ،دار الكتاب العربي،

بیروت، 1969ص، 223)

صحابہ کرام میں ایسے بھی لوگ تھے جنھیں اشعار پڑھوا کر سننے سے دلچسپی تھی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن زبیر، معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص شامل ہیں۔ اس کا ذکر ابوالفرج اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب "الأغاني" میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس سے اشعار خوانی کی وہ روایت جو پہلے سے عربی معاشرے میں موجود تھی وہ ختم نہیں ہوئی کیوں کہ وہ اسلام کے اصولوں کے خلاف نہیں تھی بلکہ اسے مزید پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ البتہ شعر کو سننے اور سنانے کی یہ روایت اپنے حدود و قیود میں رہی۔ اس لیے اس پر اس ''غنا'' کا اطلاق نہیں ہوتا جس کی ممانعت حدیث میں آئی ہے۔

5.5.1 عہد اسلامی کے ادب کی خصوصیات:

☆ اس عہد کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو ادب اس عہد میں پروان چڑھا، اس میں تکلف اور تصنع کی آمیزش نہیں تھی، اسلوب میں سادگی و صفائی اور برجستگی تھی۔ ایک اہم عربی ادیب شکری فیصل لکھتے ہیں:

> ''اس عہد میں عربی ادب خالص فطری نوعیت کا تھا۔ جس میں نہ کوئی تکلف تھا اور نہ تصنع۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مطلق طور پر برجستگی اور بے ساختگی کا نمونہ تھا تاہم یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ اس میں تکلف کی آمیزش تھی۔ یہ وہ ادب تھا جس کی تخلیق، اپنی قدرت واستعداد کے حدود میں، فطری صلاحیتوں کے زور پر عمل میں آئی تھی۔ ان صلاحیتوں کو یہ فکر نہیں تھی کہ اُن کو جلا حاصل ہو اور اس میں خاطر خواہ اضافہ ہو...... اس لیے جب ہم اس ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بہاؤ ہے، ہم اس بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جارہے ہیں۔''
>
> (حنا فاخوری: الجامع في تاريخ الادب العربي، دار الجيل، بیروت: 1986ص، 322)

اس عہد کے ادب کی ایک دوسری خصوصیت اس کا ایجاز واختصار ہے۔ اس ایجاز واختصار کی دو اہم وجہیں سمجھ میں آتی ہیں: ایک تو یہ کہ جاہلی ادب کی بھی اہم خصوصیات میں اختصار شامل ہے۔ دوسرے اب فتوحات کی وسعت اور دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط کے نتیجہ میں، نیز قرآن نے ذہنوں میں جو بالیدگی پیدا کی تھی، اس کی بنا پر عربی ذہن، خواہ عوام کا ہو یا خواص کا؛ لمبی اور طول طویل عبارتوں کے بجائے حکمت سے پُر مختصر جملوں سے زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ خود حدیث میں بھی اس سے منع کیا گیا تھا کہ کلام میں تکلف اور بال کی کھال اتارنے والا اسلوب اختیار کیا جائے۔ اس اسلوب میں فرق خلفائے راشدین کے عہد کے بعد عہدِ اموی میں اس وقت پیدا ہوا جب وسیع پیمانے پر شعر وادب کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔

☆ اس عہد میں پرورش پانے والے ادب کی ایک تیسری خوبی اور وصف یہ ہے کہ اس میں اسے ایک خاص نظریۂ حیات یعنی اسلام کی تبلیغ و دعوت اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا گیا۔ ادب کی تخلیق کرنے والوں کے سامنے دنیوی کے ساتھ اخروی سعادت کا حصول تھا۔ عہد نبوی میں شعر کو دشمنوں کے ساتھ قلمی و لسانی جہاد اور عقائد و ملت اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا گیا، جس میں خصوصیت کے ساتھ مشہور صحابی رسول حسان بن ثابت کو اہمیت حاصل ہے۔

☆ اسی تیسرے وصف سے وابستہ چوتھا وصف وہ ہے جس پر اوپر کے مضمون میں روشنی ڈالی جاچکی ہے کہ جو ادب عہد نبوی و عہد صحابہ

میں وجود میں آیا، اس میں مقصدیت پر زور تھا۔ یعنی وہ ادب برائے سعادت دنیوی و اُخروی کا نمونہ تھا نہ کہ ادب برائے ادب کا۔

5.5.2 عہد اسلامی کے ادب کے اصناف:

اس عہد میں ادب کے جن نمونوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا یا دوسرے لفظوں میں جن اصناف پر اس عہد کی سرگرمیاں حاوی تھیں، وہ ہیں: شعر، خطابت، خطوط و مراسلات، عہد نامے اور میثاقات۔ ان میں شعر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اگرچہ شعر کی اسلام میں بہت زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ چنانچہ قرآن میں ان الفاظ میں اس کی مذمت کی گئی کہ ’’گمراہ لوگ شعرا کی پیروی کرتے ہیں اور یہ کہ شعرا باطل خیالات کی وادیوں میں اڑان بھرتے رہتے ہیں اور خود اپنے قول کو عملی سانچے میں نہیں ڈھالتے‘‘ (الشعراء: 226-223) تاہم کسی کو شعر گوئی سے روکا نہیں گیا اور اس پر بندش نہیں لگائی گئی۔ شعرا کی مذمت اس پس منظر میں کی گئی تھی کہ دورِ جہالت کی شاعری میں کوئی مقصدیت موجود نہیں تھی، بلکہ اس کے بجائے وہ اخلاقی رذائل کا آلۂ کار تھی جیسے جاہلی عصبیت کا اظہار، حسب و نسب پر فخر، شراب کی تعریف اور بے حیائی کی منظر کشی وغیرہ۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کا رخ اخلاق و آداب کے فروغ اور مقصدِ حیات کی اشاعت کی طرف موڑ دیا۔ بعض صحابہ جیسے حضرت عمرؓ کے تعلق سے روایات میں آتا ہے کہ انھوں نے بعض شعرا کو سزائیں دیں یا انھیں شعر گوئی سے روکا، اس کا تعلق ہجو گوئی سے ہے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور شاعر حُطیئہ کے ساتھ سختی برتی کہ وہ اس سے باز آجائے۔ ورنہ صورت حال یہ تھی کہ خود حضرت عمرؓ اشعار پسند کرتے اور سنتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف بعض قصائد منسوب ہیں، جب کہ حضرت علیؓ کے اشعار مشہور زمانہ ہیں اور اب وہ دیوان کی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں البتہ ناقدین کی رائے میں بہت سے اشعار اُن کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہد نبوی و خلفائے راشدین میں شعر کی گرم بازاری تو نہیں تھی لیکن اس کا قافلہ رواں دواں تھا۔ اس کی سرگرمی میں کمی کی دو وجہیں تھیں: ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلمان فتوحات میں مصروف ہو گئے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اب شعر و شاعری اپنے جاہلی دور کی موروثی خصوصیات کے ساتھ اسلامی معاشرے میں پَر نکالنے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے صحابہ میں سے بعض افراد نے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ کہہ کر شاعری ترک کر دی کہ اب قرآن کے نزول کے بعد شعر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

شعر گوئی کے علاوہ جس دوسری صنف کو عہد نبوی خصوصاً عہدِ صحابہ میں فروغ حاصل ہوا، وہ خطابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے خطابت کا خصوصی ملکہ عطا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے مختلف مواقع پر دیے گئے آپ ﷺ کے خطبات آپ ﷺ کی معجز بیانی کا شاہکار ہیں۔ حجۃ الوداع اور فتح مکہ کے موقع پر دیے گئے خطبات اسی ضمن میں آتے ہیں، ان کا اسلوب عربی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

خلفائے راشدین میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ چاروں کو خطابت کا ملکہ حاصل تھا۔ تاہم حضرت علیؓ کو ان میں امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے خطبات کی جو جھلک ان کے خطبات کے مجموعہ ’’نهج البلاغة‘‘ میں نظر آتی ہے، وہ عربی ادب کی پوری تاریخ کے اہم ادبی نمونے اور شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

خطوط و مراسلات اور عہد ناموں کے ضمن میں عہد نبوی کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب آتے ہیں جو آپ ﷺ نے عرب و عجم کے حکمرانوں کے نام لکھے۔ ان حکمرانوں میں: ہرقل شاہ روم، خسرو پرویز شاہ ایران، نجاشی شاہ حبشہ، منذر بن ساوی شاہ بحرین وغیرہ شامل ہیں۔ ان خطوط و فرامین کو ڈاکٹر حمید اللہ (م 2002ء) نے اپنی مرتب کردہ کتاب: ’’**مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي**

والخلافة الراشدة'' میں جمع کردیا ہے۔اسی طرح وہ خطوط ومراسلات اورفرامین ہیں جوخلفائے راشدین نے اپنے گورنروں کو لکھے اور بھیجے اور وہ وثائق ہیں جو معاہدے نامے کی شکل میں پائے جاتے ہیں جو غیر مسلم ریاستوں پر فتح پانے کے بعدان کے حکمراں اورعوام کے ساتھ کیے گئے تھے۔

عہدِ نبوی وعہد خلفائے راشدین کی ایک اور خوبی جس کا ذکر ضروری ہے، تحریر و کتابت کا فروغ اور پھیلاؤ ہے۔ظہور اسلام کے وقت عربوں میں لکھنے کا رواج نہیں تھا۔تحریر کے بجائے علمی وراثت کو زبانی سطح پر دوسری نسلوں تک منتقل کرنے کی روایت موجود تھی۔اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مشہور عربی مورخ بلاذری کے مطابق اس وقت مکہ میں صرف 17افراد پڑھنا جانتے تھے۔جن میں کبار صحابہ شامل ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہدایت کی کہ ''تحریر کے ذریعے علم کو محفوظ کرلو' (قیدوا العلم بالکتابۃ) (طبرانی) ہدایت نبوی اور خلفائے راشدین کی خصوصی توجہ سے تحریر و کتابت کو سیکھنے کا ذوق لوگوں میں پیدا ہوا۔اس طرح عربوں میں زبانی سے تحریری روایت کی طرف منتقلی نے علم و ادب کی نشر و اشاعت میں نیز اصحابِ علم کے درمیان باہم تبادلہ فکر کی روایت کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں قرآن کوفی خط میں لکھا گیا، اس کے بعد عہد بنوامیہ میں اس سے تحریر و کتابت کے چار مزید نمونے ظہور میں آئے اور اس کے بعد اس نے باضابطہ ایک نفیس و پائیدار فن کی شکل اختیار کرلی جس نے اسلام کی ادبی وعلمی روایت پر گہرے نقوش مرتب کیے۔

معلومات کی جانچ

۱۔قرآن نے عربی فکر کو کس طرح متاثر کیا؟

۲۔کن صحابہ کو خصوصیت کے ساتھ اشعار سے دل چسپی تھی؟

۳۔عہد نبوی وعہد صحابہ میں کن اصناف کو مقبولیت حاصل تھی؟

۴۔عصر اسلامی کے ادب میں کس پہلو پر زیادہ زور تھا؟

5.6 اکتسابی نتائج

اسلام کا ظہور عربی سماج کے لیے ایک زلزلہ اور انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔اس نے عرب کو فکری، ادبی، سیاسی، سماجی ہر سطح پر متاثر کیا۔اس نے عرب معاشرہ میں جو تغیرات پیدا کیے ان کی مختلف نوعیتیں تھیں۔عرب کے قبائلی سماج کو جو انتشار و پراگندگی کا شکار تھا، اسے اسلام نے وحدت و اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا۔عرصۂ دراز سے جو خوں ریزی اور جنگ و فساد کی فضا بنی ہوئی تھی وہ ختم ہوگئی اور مکمل امن قائم ہوگیا۔جاہلی معاشرہ میں خواتین اور غلاموں کی حیثیت بہت کمزور تھی، اسلام نے انھیں مستضعفین میں شمار کرتے ہوئے، ان طبقے کی حیثیت کو معاشرے میں بلند کرنے کی کوشش کی۔دینی و سیاسی اور معاشی سطح پر اسلام نے عرب معاشرے میں جو تبدیلیاں پیدا کیں اُن کے نتیجے میں عربی فکر کو جلا اور قوت حاصل ہوئی۔

قرآن نے ایک ادبی نمونہ کی حیثیت سے لوگوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کیں۔قرآن کا یہ نمونہ نہ تو شعر تھا اور نہ معروف معنوں

میں نثر بلکہ حقیقت میں وہ دونوں کے مابین کی صنف تھی۔عربوں کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں سب سے اہم رول قرآن نے ادا کیا۔دوسری سطح پر یہ رول حدیث نے نبھایا۔آپ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے بہت سے جملے اور ترکیبیں اعلیٰ نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔صحابہ کرام میں ایسے بھی لوگ تھے جنھیں اشعار پڑھوا کر سننے سے دلچسپی تھی۔ان میں عبداللہ بن عمر،عبداللہ بن جعفر،عبداللہ بن زبیر،معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص وغیرہ شامل ہیں۔

عصر اسلامی کو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی کہ اس میں علم و ادب کی جو سرگرمیاں پروان چڑھیں اُن میں مقصد حیات پر زور دیا گیا تھا۔اس طرح علم وادب کا وجود میں آنے والا یہ سرمایہ خالص مقصدیت کی اساس پر مبنی تھا۔

اس عہد کی مختلف خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ جو ادب اس عہد میں پروان چڑھا، اس میں تکلف اور تصنع کی آمیزش نہیں تھی۔اس میں ایجاز واختصار پر زور دیا گیا تھا۔اس عہد میں ادب کی جن اصناف کو پروان چڑھنے کا موقع ملا ان میں شعر،خطابت،خطوط و مراسلات،عہد نامے اور میثاقات وغیرہ شامل ہیں۔تاہم ان میں شعر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

5.7 نمونے کے امتحانی سوالات

ا۔ عرب معاشرے پر اسلام نے کیا اثرات مرتب کیے۔تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

۲۔ سماجی سطح پر کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔وضاحت کیجیے۔

۳۔ عصر اسلامی میں جو ادب تشکیل پایا اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے

۴۔ ادب کے حوالے سے عہد نبوی عہد صحابہ کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

5.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

(1) **الجامع فی تاریخ الادب العربی،** حنا فاخوری

(2) **تاریخ الادب العربی (جلد دوم)،** ڈاکٹر شوقی ضیف

(3) **تاریخ الادب العربی (جلد اول)،** عمر فروخ

(4) **تاریخ الادب العربی،** احمد حسن زیات

(5) **عربی ادب کی تاریخ (جلد دوم)** عبدالحلیم ندوی

اکائی 6 قرآن وحدیث کی تدوین اوران کا ادبی مقام

اکائی کے اجزا

6.1 مقصد

6.2 تمہید

6.3 قرآن کا مختصر تعارف

6.4 وجہ تسمیہ

6.5 وحی کی حقیقت

6.6 وحی کے نازل ہونے کی مختلف صورتیں

6.7 قرآن کریم کا نزول

6.7.1 قرآن کی حفاظت وتدوین

6.7.2 قرآن کی کتابت وتدوین کے تین مراحل

6.8 قرآن کا اعجاز اورعربی ادب پراس کے اثرات

6.8.1 قرآنی اسلوب کے عربی ادب پر اثرات

6.9 حدیث کی تعریف

6.10 حدیث کی اہمیت

6.11 حدیث کی تدوین

6.12 حدیث کا طرز بیان

6.13 حدیث کی ادبی قدرو قیمت

6.14 اکتسابی نتائج

6.15 فرہنگ

6.16 نمونے کے امتحانی سوالات

6.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

6.1 مقصد

☆اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ وحی قرآنی کی حقیقت ،قرآن کے نزول اوراس کی تدوین سے واقف ہو پائیں گے۔اس کے علاوہ انہیں قرآن کے اعجاز کی حقیقت معلوم ہوگی اوراس ضمن میں وہ قرآن کی ان خصوصیات سے بھی آگاہ ہوں گے جو اس کو دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

☆اس اکائی کے ذریعہ طلبہ کوحدیث کی ادبی قدرو قیمت سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔حدیث کی تشریعی حیثیت جس طرح مسلّم ہے،اسی طرح حدیث کی ادبی قدر و قیمت بھی کم نہیں، کیونکہ حدیث قرآن پاک سے مستفاد ہے۔ وہ سیّد الاولین والآخرین ﷺ کا کلام ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے۔ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کے کلام کی بلاغت سے کوئی دوسرا کلام کرہی نہیں سکتا ہے۔اس اکائی سے طلبہ حدیث کے ادبی مقام اورفصاحت و بلاغت اورعربی زبان وادب پراس کے اثرات واحسانات سے واقف ہوسکیں گے۔

6.2 تمہید

قرآن کی تدوین پیغمبراسلام کی وفات کے بعد اسلامی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ یہ صحابہ کرام خصوصا ابوبکرؓ وعمرؓ کی بے پناہ بصیرت اور دوراندیشی کی سب سے اہم مثال ہے۔610ء سے شروع ہونے والے اس سلسلہ وحی قرآنی کے ذریعہ انسانی تاریخ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔قرآن متعدد ایسی منفرد خصوصیات کا حامل ہے، جو دوسری آسمانی کتابوں کو حاصل نہیں۔تدوین کا معاملہ بھی انہیں خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا میں جوبھی صالح انقلاب پیدا کیا،وہ دراصل قرآن کا ہی فیض ہے۔عربی زبان وادب پرقرآن کے زبردست اثرات مرتب ہوئے اوراس نے اسلام کی اجتماعی فکر کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔قرآن پاک نے جس طرح دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اسی طرح اس نے عربی زبان کوبھی زندہ وجاوید بنادیا۔

قرآن پاک کے بعد حدیث کا نمبرآتا ہے۔حدیث نے عربی زبان کے ذخیرۂ ادب کواپنی زبردست فصاحت، لازوال بلاغت،حکمت کے موتیوں اور جوامع الکلم سے ثروت مند کیا، اس میں بہت ساری تراکیب کا اضافہ کیا، نئے محاورے دیے اورنئی لفظیات سے اُس کو مالامال کیا۔ انھیں سب پہلوؤں کوتفصیل سے ہم اس اکائی میں زیربحث لائیں گے اورمختلف ذیلی سرخیوں اورعنوانات سے طلبہ کوموضوع کے مالہ وماعلیہ سے واقف کرائیں گےاورحدیث کی ادبی اہمیت ومقام پرمختلف حوالوں سے روشنی ڈالیں گے،تاکہ موضوع ان کی گرفت میں اچھی طرح سے آسکے۔

6.3 قرآن کامختصرتعارف

قرآن آخری آسمانی کتاب ہے جوآخری پیغمبرمحمد بن عبداللہ ﷺ پرخدا کی طرف سے نازل کی گئی۔اس کے نزول کا سلسلہ غارحرا سے شروع ہوا۔

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ،قرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہرقسم کی انسانی تحریفات اورتبدیلیوں سے پاک ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خودخدا نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے **(الحجر:9)** جب کہ اس سے قبل نازل ہونے والی کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ یاتواب وہ سرے سے دنیا سے ناپید ہوچکی ہیں یا پھرتحریف وتبدیلی کی وجہ سے ان کی حیثیت خدا کے مکمل سرچشمۂ ہدایت کی نہیں رہی۔

قرآن کے نزول سے تاریخ انسانی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔قرآن کی پہلی وحی ''پڑھنے کی تلقین'' **(اقرأ)** سے شروع ہوئی تھی، چنانچہ قرآن کے ذریعہ دنیا میں علم وتمدن کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

قرآن سے مختلف علوم کی سیکڑوں شاخیں نکلیں جن پر مختلف زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں جو دنیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ قرآن کا عملی معجزہ ہے۔علمی معجزہ یہ ہے کہ اس نے انسانی فکر میں ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا۔قرآنی تعلیمات کا سب سے اہم امتیاز اس کا نظریہ توحید ہے۔قرآن کے نزول سے قبل توحید کی اصل روح اور بنیادی حقیقت دنیا کی اکثر قوموں کی نگاہوں سے اوجھل ہوچکی تھی۔قرآن نے اپنی مؤثر تعلیمات کے ذریعہ اس حقیقت کو بے غبار شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔قرآن کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بار بار اور شدت کے ساتھ انسان کے اپنے وجود اور کائنات میں غور وتدبر کی لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔

6.4 وجہ تسمیہ

قرآن کو قرآن کہنے کی وجہ کیا ہے؟ قرآن کا لفظ دراصل **قَرَأَیَقرَأُ** سے ماخوذ ہے جس کے معنی 'پڑھنا' کے ہیں۔ یہ لفظ 'مصدر' ہے لیکن اسے 'اسم مفعول' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی پڑھی ہوئی یا پڑھی جانے والی کتاب۔قرآن کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: ''قرآن اللہ تعالی کا وہ کلام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا اور آپ ﷺ سے بغیر کسی ادنی شبہ کے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔'' قرآن کے علاوہ اس کے مختلف نام ہیں: جیسے **الفرقان، الکتاب، التنزیل** اور **الذکر** وغیرہ لیکن ان میں سب سے مشہور نام ''القرآن '' ہی ہے۔خود قرآن میں قرآن کے نام کے طور پر سب سے زیادہ اسی لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

6.5 وحی کی حقیقت

عقل وحواس کے بعد وحی دوسرا ذریعہ علم ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی کے ذریعہ غیب کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اگر وحی کو بیچ سے نکال دیا جائے تو پھر غیب سے تعلق رکھنے والے امور کا علم حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس کائنات کی حقیقت، اس کائنات میں انسان کی حیثیت اور اس کی تخلیق کا مقصد بھی صرف وحی کے ذریعہ ہی معلوم ہوسکتا ہے۔

وحی نبوت کی خاصیت ہے۔حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ پیغمبر محمد صلی علیہ وسلم اور دوسرے انبیا پر نازل ہونے والی وحی میں فی نفسہ سرے سے کوئی فرق نہیں۔ ظاہر ہے دونوں کا ماخذ اور مقصد ایک ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''یقینا ہم نے آپ ﷺ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف کی، اور ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے داوَد کو زبور عطا کیا۔ ہم نے بعض رسولوں کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں، اور اللہ تعالی نے موسیٰ سے صاف طور پر کلام کیا۔'' (النساء: 164-163) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکمل حد تک وحی خداوندی کے پابند تھے۔ وہ محض اپنی خواہش اور مرضی سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس بات کی وضاحت قرآن میں کی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی۔اِنۡ ھُوَاِلَّا وَحیٌ یُّوۡحٰی ''وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے''۔(النجم:4-3)اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

قُلۡ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَایُوۡحٰی اِلَیَّ مِن رَّبِّی ''آپ کہہ دیجیے کہ میں اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف کی جاتی ہے۔''(الاعراف:7)

''وحی'' یا اس سے مشتق لفظ ''اِیحا'' کے معنیٰ عربی میں اشارہ کرنے کے ہیں۔قرآن میں اس معنیٰ میں اس لفظ کا استعمال اس آیت میں کیا گیا ہے:

فَخَرَجَ عَلٰی قَومِہٖ مِنَ المِحۡرَابِ فَاَوۡحٰی اِلَیھِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡہُ بُکۡرَۃً وَّعَشِیًا ''پس وہ اپنی قوم کے سامنے محراب سے نکلے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح وشام تسبیح کرتے رہا کرو'' (مریم:11)۔اس طرح وحی کا ایک توسیعی معنیٰ ''کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا'' بھی ہے۔ قرآن میں متعدد جگہوں پر وحی کا استعمال اس معنیٰ میں کیا گیا ہے۔جیسے شہد کی مکھی کے تعلق سے قرآن میں کہا گیا:

وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اَلیٰ النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتاً ''اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے''۔(النحل:68)

وَ اَوۡحَیۡنَا اِلٰی اُمِّ مُوۡسیٰ اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ''ہم نے موسیٰ کی والدہ کو یہ الہام کیا (ان کے دل میں یہ بات ڈال دی) کہ موسیٰ کو دودھ پلاؤ'' (القصص: 7)۔شیطان انسان کے دلوں میں جو وسولہ ڈالتا ہے، اس کے لیے بھی قرآن میں اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے: **وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنَالِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّاَشَیَاطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ یُوحٰی بَعۡضُھُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ** ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے ایک نہ ایک دشمن کو ضرور پیدا کیا ہے، جن وانس کے شیاطین میں سے؛ جو ایک دوسرے کے دل میں وسوسہ ڈالتے ہیں'' **(الانعام:112)**۔

یہ معانی اور مثالیں وحی کے لغوی مفہوم سے تعلق رکھتی ہیں، جہاں تک اس کے اصطلاحی معنیٰ کا معاملہ ہے۔تو اس کے معنیٰ ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہو''۔مسلمانوں کے اجماعی عقیدہ کے مطابق وحی کا سلسلہ قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے۔اس لیے اس تعلق سے کسی شخص کی طرف سے کوئی بھی دعوی مسلمانوں کے بنیادی عقیدہ سے متصادم اور اس اعتبار سے باطل ہے۔ اس طرح یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ وحی اور کشف والہام میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔کشف والہام کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں ہے، نہ ہی اس کا انکار وتسلیم عقیدہ کا جز ہے، جب کہ وحی کا انکار ایمان کے منافی ہے۔اس کا منکر ایمان سے نکل جاتا ہے۔

6.6 وحی کے نازل ہونے کی مختلف صورتیں

پیغمبر خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی۔اس کا ذکر خود حدیث میں آیا ہے۔ایک صحابی کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بعض اوقات نزول وحی کے وقت مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے۔یہ میرے لیے بہت سخت ہوتی ہے۔جب یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے تو جو کچھ مجھے بتایا گیا ہوتا ہے وہ مجھے یاد ہو جاتا ہے۔بعض اوقات فرشتہ انسانی صورت میں آکر بات چیت کرتا ہے اور اس کو سن

کر میں یاد کرلیتا ہوں''۔ (صحیح بخاری، باب بدء الوحی، عن حارث بن ہشام)۔اس حدیث سے نزول وحی کے دو طریقوں کا علم ہوتا ہے۔ تاہم دوسری روایات اور صحابہ کرام کے اقوال کے مطابق، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی کا نزول ہوتا تھا جن کا ذکر درج ذیل سطور میں کیا جا رہا ہے:

6.6.1 صلصلۃ الجرس

صلصلہ گھنٹی بجنے اور جرس گھنٹی کو کہتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گھنٹیوں کی آواز کی شکل میں وحی آتی تھی۔ وحی کی یہ شکل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بہت مشکل ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے موسم میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی اونٹنی پر بیٹھے ہوئے ہوتے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بوجھ سے دبنے لگتی۔ بعض اوقات اس وحی کی ہلکی آواز دوسروں کو بھی سنائی دیتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بقول یہ آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہ ہوتی تھی۔

6.6.2 فرشتے کا انسانی شکل میں آنا

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ (جبریلؑ) انسان کی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچا دیتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وحی کی یہ صورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نہایت آسان ہوتی تھی۔

6.2.3 فرشتے کا اپنی اصل شکل میں آنا

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبریلؑ اپنی اصل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھائی دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔ لیکن ایسا صرف دو یا تین مرتبہ ہی پیش آیا۔

6.2.4 ہم کلامی

انبیائے کرام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا جو شرف حاصل ہوا اس کا تذکرہ قرآن میں بھی وارد ہوا ہے۔ ''اللہ تعالی نے موسی سے گفتگو کی'' (النساء:164) لیکن یہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ یہ شرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معراج کے موقع پر بیداری میں اور ایک مرتبہ خواب میں حاصل ہوا ہے۔

6.6.5 سچے خواب

وحی کی ایک صورت سچے خوابوں کی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ: ''ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند میں وحی کے طور پر سچے خواب آیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام خواب صبح کی روشنی کی طرح سچے نکلتے تھے'' (متفق علیہ)۔

6.6.6 القائے قلب

ایک صورت وحی کی یہ تھی کہ فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آئے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں خدا کے پیغام کو القا کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی شخص اس وقت تک دنیا سے جا نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کرلے''۔

بعض اہل علم نے بعض اور دوسری صورتوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن وہ عموماً انھی صورتوں کے ضمن میں آجاتی ہیں۔

6.6.7 وحی کی قسمیں

یہاں یہ سمجھ لینا بھی بہتر ہے کہ وحی کی علما نے دو قسمیں کی ہیں: ''وحی متلوّ' اور ''وحی غیر متلوّ'۔

وحی متلو: یعنی تلاوت کی جانے والی وحی اور یہ قرآن ہے۔ جس کے الفاظ و معانی دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور ان میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

وحی غیر متلو: یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی یا وہ قرآن کا جز نہیں۔ یہ صحیح و متواتر احادیث ہیں۔ اس وحی کا مفہوم تو خدا کی طرف سے ہے لیکن الفاظ خود آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یا حضرت جبریلؑ کے ہیں۔ البتہ حدیث قدسی سے متعلق علما کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ اس کے الفاظ بھی اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بعینہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہوں اور وہ مکمل طور پر محفوظ بھی ہوں۔ نیز اپنی حیثیت اور معنی و مفہوم میں وہ کسی بھی طرح قرآن کے برابر نہیں ہیں۔

6.7 قرآن کریم کا نزول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول 23/سالوں میں مکمل ہوا۔ اس پوری مدت میں قرآن تدریجی طور پر آپ ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ یہ مدت مکہ میں ہجرت سے قبل آپ ﷺ کے قیام کے 13/سال اور ہجرت کے بعد مدینہ میں قیام کے 10/سالوں پر مشتمل ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات اور سورتیں اپنے نزول میں واقعاتی پس منظر رکھتی ہیں یعنی عموماً ایسے واقعات و حادثات پیش آتے رہے، جن میں خدا کی طرف سے رہنمائی کے لیے قرآن کی چھوٹی بڑی، مکمل یا غیر مکمل شکل میں آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہیں۔

قرآن کے یکبارگی کے بجائے تدریجی طور پر نازل ہونے کی علما نے مختلف مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں۔ ایک کا ذکر تو خود قرآن میں بھی آیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کے قلب کی تقویت کا ذریعہ ہے (الفرقان: 23)۔ یعنی آپ ﷺ کو اپنے تبلیغی مشن میں مختلف سطحوں پر جو مصائب و مشکلات درپیش تھیں، حضرت جبریلؑ کا آپ ﷺ کے پاس خدا کی طرف سے پیغام لے کر آنا آپ ﷺ کے دل کی تقویت اور اطمینان کا باعث بنتا تھا۔ دوسری حکمت یہ تھی کہ اگر پورا قرآن ایک مرتبہ نازل ہوجاتا تو شریعت کے سارے احکامات کی پابندی بیک وقت ضروری ہوجاتی اور یہ بات انسانی طبیعت کے لحاظ سے قرین مصلحت نہیں تھی۔ سب سے اہم یہ کہ قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، واقعات و حوادث سے مربوط تھا، اس لیے متعلقہ واقعات کے پیش آنے سے قبل ان کا نزول کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔

قرآن کے نزول کا آغاز شب قدر سے ہوا اور پہلے پہل غار حرا میں سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ یہاں نزول کے ایک دوسرے پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''میں نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے''۔ (القدر: 1) اس کا مطلب حدیث کی روشنی میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اولاً قرآن مکمل طور پر لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے ایک مقام ''بیت العزت'' پر نازل کیا گیا پھر وہاں سے حسب موقع و واقعہ جستہ جستہ آپ ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔

اس وقت قرآن مصحف میں جس ترتیب سے موجود ہے، آنحضرت ﷺ پر اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا۔ البتہ یہ ترتیب آپ

ﷺ کے حکم کے مطابق ہی قائم کی گئی۔ جب بھی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کاتب وحی کو یہ بتاتے کہ اسے کس سورت میں اور کس مقام پر لکھا جائے گا؟ بظاہر یہ اجتہاد بھی آپ ﷺ کا نہیں تھا بلکہ غالبا متعلقہ آیات کی تعلیم کے ساتھ قرآن میں ان کی متعلقہ جگہ کی نشان دہی بھی حضرت جبریلؑ فرمایا کرتے تھے۔

معلومات کی جانچ

1۔ قرآن کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

2۔ وحی کے لغوی و اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

3۔ پیغمبر اسلام پر وحی کے نزول کی عمومی صورتیں کیا تھیں؟

4۔ تدریج کے ساتھ قرآن کے نزول کی حکمتیں کیا ہیں؟

5۔ وحی متلو کسے کہتے ہیں؟

6.7.1 قرآن کی حفاظت وتدوین

قران کی جمع وتدوین کا کام عہد رسالت میں شروع ہو چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے دو طریقے اختیار فرمائے۔ جمع صدور یعنی قرآن کو یاد کر کے سینے میں محفوظ کرنے کا ذریعہ اور جمع مکتوب یعنی تحریر و کتابت کے ذریعہ۔ آنحضرت ﷺ پر جو آیتیں نازل ہوتیں انہیں وہ پہلے خود یاد کر لیتے پھر کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر انہیں فوراً لکھوا دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں آپ کا زیادہ زور حافظے پر تھے۔ آپ ﷺ کو اس تعلق سے اس قدر فکر و اضطراب ہوتا کہ جب حضرت جبریل آپ ﷺ پر وحی لے کر نازل ہوتے تو آپ ﷺ اشتیاق و اضطراب میں اسے تیزی سے دہرانے لگتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وحی قرآن کو جلد از جلد یاد کر لینے کی تڑپ میں آپ ﷺ زبان کو زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت دینے کی کوشش نہ کریں۔ اس کو جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ (القیامۃ: 17-61)

وحی قرآنی کی کتابت کروانے کے بعد وہ آیات صحابہ کرامؓ کے درمیان پھیل جاتیں۔ وہ انہیں یاد کرتے اور بہت سے صحابہ کرامؓ ان کی نقلیں بھی تیار کر کے اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ چونکہ قرآن کا حفظ نسبتاً تمام افراد صحابہ کے لیے زیادہ آسان بھی تھا اور ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو اس کے اہتمام کا اشارہ بھی ملا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حفظ قرآن کی ترغیب دی۔ مزید برآں تعلیم قرآن کے تعلق سے آپ ﷺ نے لوگوں کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ کسی مستند استاد سے ہی قرآن کو پڑھیں۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مستند استاد کون ہوسکتا تھا، اس لیے لوگوں نے آپ ﷺ سے قرآن پڑھنے اور سیکھنے کا التزام کیا۔ جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے فہم وقرأت کے ماہر بعض صحابہ کرامؓ کو بھی اس پر مامور کیا کہ وہ لوگوں کو قرآن پڑھایا کریں۔ قرآن پڑھانے والے صحابہ کرام میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ، اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ خاص طور پر حضرت ابی بن کعبؓ سے صحابہ کی کثیر تعداد نے قرآن پڑھا۔ قرآن پڑھنا اور قرآن سمجھنا صحابہ کا سب

سے اہم معمول اور مشغلہ بن گیا۔ مسجد نبوی قرآن کی تلاوت سے گونجنے لگی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کو لوگوں کو یہ حکم دینا پڑا کہ وہ آہستگی کے ساتھ قرآن پڑھا کریں تاکہ دوسروں کو ان کے پڑھنے سے خلل نہ ہو۔ قرآن کے ساتھ اس انتہائی شغف کے نتیجے میں صحابہؓ کے درمیان حفاظ کی بہت بڑی تعداد پیدا ہوگئی۔ یہ تعداد بلاشبہ سینکڑوں میں تھی۔ کیونکہ جیسا کہ روایات سے اندازہ ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلہ میں تعلیم قرآن کے لیے ستر (70) حفاظ بھیجے تھے۔ چنانچہ واقعہ بئر معونہ میں شہید ہونے والے صحابہ کی تعداد ستر (70) تھی۔ تقریباً اتنی ہی تعداد جنگ یمامہ کے موقع پر شہید ہونے والے صحابہ کی ہے۔ حفاظ صحابہ کے علاوہ بہت بڑی تعداد ان اصحابؓ کی ہے جنہوں نے قرآن کے مختلف اجزا اور سورتوں کو یاد کر رکھا تھا۔

قرآن کے تعلق سے یہ اہتمام وانتظام قرآنی تعلیمات کی امت میں اشاعت کے علاوہ، قرآن کی حفاظت کی ہی ایک مضبوط شکل تھی۔

6.7.2 قرآن کی کتابت وتدوین کے تین مراحل

6.7.2.1 پہلا مرحلہ: عہد نبوی

سینوں کے ساتھ سفینوں کے ذریعے قرآن کی حفاظت اور اس کی تدوین کا کام بھی عہد نبوی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم متعدد صحابہ کرامؓ سے قرآن کی کتابت کا کام لیا کرتے تھے۔ کاتبین وحی میں خاص طور پر چاروں خلفائے راشدین: ابوبکرؓ، عمر فاروقؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے علاوہ زید بن ثابتؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، ابی بن کعبؓ، خالد بن ولیدؓ اور ثابت بن قیسؓ شامل ہیں۔ کتابت وحی کے تعلق سے آپ کا طریقہ یہ تھا کہ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر اسے پہلے لکھواتے، پھر اس کی صحت کے اطمینان کے لیے متعلقہ صحابی سے پڑھوا کر سنتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اس کی اصلاح فرما دیتے تھے۔ اس کا اندازہ حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ: ''(وحی نازل ہونے کے بعد) میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا کوئی ٹکڑا آپ ﷺ کے پاس لے آتا۔ آپ ﷺ لکھواتے اور میں لکھتا۔ پھر جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے قرآن نقل کرنے کے بوجھ سے میری ٹانگ ٹوٹی جاری ہے۔ یہاں تک کہ میں کہتا کہ اب میں کبھی اپنی ان ٹانگوں سے نہیں چل سکوں گا پھر جب میں لکھ کر فارغ ہو جاتا تو آپ ﷺ اس لکھے ہوئے حصے کو پڑھنے کو کہتے۔ اگر اس میں کوئی چیز چھوٹ گئی ہوتی تو آپ اس کی تصحیح فرما دیتے۔ پھر اسے لوگوں کے درمیان لے آتے'' (طبرانی)۔ اس وقت قرآن زیادہ تر کھجور کی شاخوں، جانوروں کی ہڈیوں، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھر کی سلوں اور درخت کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔

یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باضابطہ مصحف کی شکل میں اپنے عہد میں قرآن کو یکجا اور مرتب نہیں کرایا، تاہم یہ بات بھی صحیح ہے کہ متعدد صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن کے اہم حصے نبوی ترتیب کے ساتھ محفوظ تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایسا ہی کچھ حصہ حضرت عمر فاروق کی بہن اور بہنوئی کے پاس تھا جسے وہ اس وقت پڑھ رہے تھے، جب وہ ان کے اسلام لانے کی خبر سن کر ان کے پاس پہنچے تھے۔ بخاری میں رسول اللہ کی ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ قرآن کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کیا جائے۔ ظاہر ہے جب تک قرآن کا معتدبہ اور قابل ذکر حصہ مرتب شکل میں موجود نہ ہو اس پر قرآن کا اطلاق کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟

مختلف روایات واضح طور پر اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ متعدد صحابہ کرامؓ کے پاس مکمل یا نامکمل نسخے لکھے ہوئے موجود تھے۔

6.7.2.2 دوسرا مرحلہ: عہد ابوبکرؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت قرآن سینکڑوں صحابہ کرام کے سینوں میں نیز ان کے پاس تحریری شکل میں محفوظ ہو چکا تھا۔ وہ ان کی تلاوت کرتے اور دوسروں کو ان کی تعلیم دیتے تھے۔ بعض اصحاب کے پاس باضابطہ قرآنی سورتوں کے مجموعے بھی موجود تھے لیکن یہ مجموعے مکمل نہیں تھے۔ بعضوں کے پاس کچھ سورتیں تھیں اور دوسرے کے پاس دوسری سورتیں جب کہ بعض اصحاب رسول ﷺ کے پاس صرف چند آیات ہی لکھی ہوئی تھیں۔ اب تک قرآن کو یکجا اور مکمل شکل میں جمع کرنے کا اہتمام نہیں ہو سکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن کو مدون کرنے کی غالباً اس لیے بھی کوشش نہیں کی کہ وحی قرآنی کا نزول جاری تھا اور رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کس آیت یا سورت کو قرآن میں کس مقام پر رکھنا ہے۔ آپ ﷺ ایسا حضرت جبریلؑ کی ہدایت پر کرتے تھے۔

قرآن کے منتشر اجزا کو یکجا اور ایک مرتب نسخے کی شکل میں محفوظ کر دینے کا کام حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہوا۔ آپ ﷺ کے عہد میں یہ المناک واقعہ پیش آیا کہ نبوت کے مدعی مسیلمہ کذاب اور اس کی جماعت کے ساتھ جنگ میں جسے اسلامی تاریخ میں جنگ یمامہ کے نام سے جانا جاتا ہے؛ قرآن کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ بعض لوگوں نے ان شہید ہونے والے اصحاب کی تعداد ستر (70) لکھی ہے۔ اس واقعے سے حضرت عمرؓ کے دل میں یہ تشویش پیدا ہوئی کہ اگر اسی طرح حفاظ قرآن کی شہادت یا موت ہوتی رہی تو اسباب کی سطح پر قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے قرآن کے تحفظ کو یقینی بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس فکر و اندیشے سے حضرت ابوبکرؓ کو آگاہ کیا، حضرت ابوبکر ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو جواب دیا کہ جو کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے، وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس کام میں خیر ہی خیر ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کو اس پر شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کاتبین وحی میں سے تھے اور قرآن سے ان کا شغف ظاہر و باہر تھا؛ بلایا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی نگرانی میں یہ کام شروع کریں۔ خود حضرت زید بن ثابت کی روایت کے مطابق، انہوں نے بھی اپنا وہی اشکال دہرایا جو حضرت عمر کے مشورے پر حضرت ابوبکر نے کیا تھا کہ جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے انجام دینے کی کوشش نہیں کی اس میں ہم اپنا ہاتھ کیوں ڈالیں۔ فرماتے ہیں کہ: ''خدا کی قسم اگر ابوبکر مجھے کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کا حکم دیتے تو وہ میرے لیے اس ذمہ داری کی انجام دہی قرآن کی تدوین کی بہ نسبت زیادہ آسان ہوتی تاہم حضرت ابوبکر مجھ سے بتاکید یہ بات کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح اس کام کے تئیں اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی شرح صدر عطا کر دیا۔ چنانچہ میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی سلوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کیا''۔ (صحیح بخاری۔ کتاب فضائل القرآن)

6.7.2.3 عہد صدیقی میں جمع قرآن کا طریقہ کار

حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ میں یہ منادی کرادی کہ جس کے پاس قرآن کا جو بھی حصہ تحریری صورت میں موجود ہو، وہ زیدؓ کے پاس لا کر جمع کر دے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بعض دوسرے حضرات کے علاوہ حضرت عمرؓ کو حضرت زیدؓ کی اس کام میں معاونت پر مامور کیا تھا۔ چنانچہ

جب کوئی شخص ان کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لے کر حاضر ہوتا تو مختلف طریقوں سے اس کی تصدیق کی جاتی تھی:

☆ حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں حافظ تھے۔ وہ اپنے حافظے سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

☆ اس کے بعد قرآن کے اس تحریر شدہ حصے پر دو مستند اور قابل اعتبار لوگوں کی یہ گواہی لی جاتی تھی کہ قرآن کا یہ حصہ تحریر کیے جانے کے بعد آپ ﷺ کی وفات کے سال آپ ﷺ کے سامنے آپ ﷺ کی تصدیق کے لیے پیش بھی کیا گیا تھا۔

☆ زیر ترتیب مجموعۂ قرآنی میں کسی آیت یا سورت کو شامل کرنے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ کسی دوسرے مکتوب نسخے سے اس کا موازنہ بھی کرلیا جائے۔ گویا متعلقہ آیت یا سورت کم از کم دو جگہ تحریر شدہ شکل میں موجود ہو۔

تقریباً ایک سال کی مدت میں قرآن کی جمع وتدوین کا کام مکمل ہوا اور قرآن کا ایک مرتب و مدون نسخہ وجود میں آ گیا۔ اس نسخے کو ''ام'' کہا جاتا ہے۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر کے پاس رہا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کی تحویل میں آ گیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد یہ صحیفہ قرآنی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل کردیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی تحویل میں یہ اس لیے نہیں دیا گیا کہ حضرت عمرؓ کے انتقال کے وقت ابھی خلیفہ کے طور پر ان کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی خلافت و جانشینی کا معاملہ شوریٰ کے سپرد کردیا تھا۔

6.7.2.4 تیسرا مرحلہ: عہد عثمان غنیؓ

حضرت عثمانؓ کے وقت تک اسلام حدود عرب سے نکل کر روم و ایران کے ایک بڑے حصے میں پھیل چکا تھا۔ اہل عجم کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہوچکی تھی جن کی زبان عربی نہیں تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ خاص طور پر ان کے درمیان قرآن کی قرأت میں اختلافات سر ابھارنے لگے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رسول اللہ کی حدیث کے مطابق، قرآن عرب کے سات حرفوں پر نازل ہوا تھا۔ چنانچہ لوگ مختلف طرح سے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جب تک لوگوں کو قرآن کے سات حروف پر نازل ہونے کی حقیقت معلوم رہی، اس وقت اس اختلاف نے سر نہیں اٹھایا لیکن پھر مختلف انداز کی قرأتوں کی بنیاد پر ان کے درمیان شدید ترین اختلافات پیدا ہوگئے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق، حذیفہ بن یمانؓ نے آرمینیہ اور آذربائیجان کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ اس موقع پر قرأت قرآن کے معاملے میں لوگوں کے باہمی لڑائی جھگڑوں کو دیکھ کر انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن کی متواتر قرأتیں ہی لوگوں کے اختلاف اور جھگڑوں کا شکار ہوکر لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجائیں یا انہیں ہی غلط نہ قرار دینے لگیں۔ اس وجہ سے حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ قرآن کو صحیفوں سے باضابطہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کریں۔ اس اہتمام کے ساتھ کہ اس میں سورتیں بھی مرتب شکل میں ہوں۔ ان چاروں صحابہ میں سے حضرت زید کے علاوہ باقی تینوں قریشی تھے۔ حضرت عثمان نے ان حضرات سے فرمایا کہ اگر ان کے درمیان قرآن کی کسی آیت کو تحریر کرنے میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھا جائے کیوں کہ قرآن بنیادی طور پر انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا تیار کردہ اصل نسخہ دوبارہ حضرت کے حفصہ کے پاس بھجوا دیا گیا۔

ان چار(بعض روایت کے مطابق بارہ)افراد پر مشتمل کمیٹی نے قرآن کا جونسخہ تحریری شکل میں مرتب کیا اس کی خصوصیات یہ تھیں:
حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جونسخہ تیار کیا گیا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں۔ ہر سورت الگ الگ صحیفوں کی شکل میں لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ تمام صحیفوں کو ایک ہی مصحف میں مرتب شکل میں لکھا گیا۔ لکھنے میں ایسے رسم الخط کا استعمال کیا گیا کہ اس میں تمام متواتر قرأتیں جمع ہو جائیں۔ چناں چہ اس پر نقطے اور اعراب تک نہیں لگائے گئے۔ نیز یہ کہ اس کے پانچ یا سات نسخے تیار کرائے گئے۔ ان میں سے ایک کو مدینہ منورہ میں اور باقی نسخوں کو مکہ مکرمہ، شام، یمن اور کوفہ وغیرہ علاقوں میں بھیج دیا گیا اور مختلف لوگوں کے پاس قرآن کے جو مختلف نسخے اب تک موجود تھے، انہیں نذر آتش کر دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے کسی مصحف قرآنی کی بنیاد پر اب دوبارہ کسی قسم کے اختلاف اور جھگڑے کو سر ابھارنے کا موقع نہ ملے اور پوری امت ایک نسخہ قرآنی کی قرأت و تلاوت پر متفق ہو جائے۔ تمام وہ صحابہ کرام جن کے پاس انفرادی نسخے تھے وہ بخوشی اس پر آمادہ ہو گئے۔ البتہ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو اس میں کچھ تردد اور تکدر رہا۔ تاہم بعد میں وہ بھی حضرت عثمانؓ کی رائے سے متفق ہو گئے، جو دراصل امت کی اجماعی رائے تھی۔

6.7.2.5 چوتھا مرحلہ: قرآن پر نقطے اور اعراب

حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عثمانؓ نے قرآن کا جونسخہ تیار کروایا اس میں قرآن کے الفاظ و حروف پر نقطے اور حرکات (زیر، زبر، پیش وغیرہ) نہیں لگائے گئے تھے۔ عربوں میں اب تک نقطے اور حرکات کے بغیر ہی تحریر کا رواج تھا۔ اہل زبان ہونے کی بنیاد پر لوگ اس سے اس قدر مانوس تھے کہ عموماً اس میں انہیں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن اہل عجم کے لیے یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ اس لیے تلاوت کو آسان اور غلطیوں سے پاک کرنے کے لیے الفاظ قرآنی پر نقطے اور حرکات لگانے کی ضرورت پیش آئی اور وقت کے علما و اہل نظر نے اس سے اتفاق بھی کر لیا۔

اس تعلق سے کوئی ایک رائے نہیں ہے کہ یہ اہم خدمت کس اہل علم کے ذریعہ انجام پائی؟ زیادہ شہرت ابوالاسود دؤلی کو حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی ایما پر یہ کارنامہ انجام دیا۔ بعض اصحاب علم کے مطابق، یہ کام حجاج بن یوسف ثقفی کی فرمائش پر حسن بصریؒ، یحیٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم لیثی نے انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ نقطے کی باضابطہ ایجاد کا سہرا خلیل بن احمد فراہیدی (175ھ) کے سر ہے۔

اس کے بعد قرآن کی تلاوت، حفظ اور تعلیم و تفہیم کے عمل کو آسان تر کرنے کے لیے مزید اقدامات بھی کیے گئے۔ جیسے ہر سورت کے شروع میں اس کا عنوان تحریر کرنا، آیت کے اخیر میں اختتامی علامت، قرآن کو اجزا یعنی پاروں میں تقسیم کرنا اور پارے کو نصف اور ربع میں تقسیم کرنا، رکوع لگانا، اسی طرح احزاب اور منزلوں کا تعین۔ بعض صحابہ و تابعین کو ان چیزوں میں تامل رہا لیکن اکثریت کے اتفاق رائے اور احساس ضرورت کے تحت یہ کام انجام دیا گیا۔ مثلاً قران کو سات منزلوں یا تیس پاروں میں تقسیم کرنا بعض علما کے قول کے مطابق، مدارس میں طلبہ کی تعلیم کی سہولت کے لیے تھا۔

آگے چل کر بعض علمانے رموز اوقاف کی تشکیل و تعیین کی جن سے تلاوت و تجوید کا عمل مزید آسان ہو گیا۔ پریس کی ایجاد کے بعد سب سے پہلے بعض عیسائیوں اور مستشرقین کی طرف سے قرآن کی اشاعت عمل میں آئی لیکن ان کے نسخوں کو عالم اسلام میں قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ پھر 1787ء میں مولائے عثمان نے روس کے شہر ''سینٹ پیٹرس برگ'' میں قرآن کا ایک نسخہ طبع کروایا پھر قازان اور تہران وغیرہ مقامات

پر قرآن کے نسخے طبع ہوئے اور اس طرح عالم اسلام میں قرآن کی طباعت واشاعت کی تحریک عام ہوتی چلی گئی۔

6.8 قرآن کا اعجاز اور عربی ادب پر اس کے اثرات

قرآن اپنے اندر اعجاز کے متعدد پہلو رکھتا ہے۔ ان میں بعض کا تعلق زبان و بیان سے تو بعض دوسرے پہلوؤں کا تعلق اس کے معانی وافکار سے ہے۔ یہاں ان سطور میں اس کے اعجاز کی پہلی قسم مراد ہے۔ قرآن نے منکرین کو چیلنج کیا کہ وہ اس کے جیسی ایک سورت ہی پیش کردیں (البقرۃ:23) اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کردیا کہ تمام جن وانس مل کر بھی وہ اس عمل پر قادر نہیں ہو سکتے (الاسراء:88)۔ قرآن کے اس دعوے میں دونوں پہلو شامل ہیں کہ نہ تو الفاظ واسلوب کے لحاظ سے اس جیسا بلیغ ومؤثر کلام کسی سے ممکن ہے اور نہ ہی افکار ومعانی کے وہ جواہر جو قرآن اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے۔

اس کا لغوی اعجاز دراصل اس کی بلاغت ہے۔ نزولِ قرآن سے قبل عرب نظم ونثر دونوں سے واقف تھے۔ البتہ نثر کا نمونہ بہت محدود تھا، کیوں کہ عربوں میں لکھنے کی روایت بہت کم تھی۔ تاہم ادبی روایت کا بڑا سرمایہ محفوظ تھا، جس پر اہلِ عرب کو فخر و ناز تھا۔ وہ اشعار، خطبات کے اقتباسات اور فقروں، امثال ومحاورات کو بلاغت کا اعلیٰ نمونہ تصور کرتے تھے۔ قرآن نے جس اسلوب کو اختیار کیا وہ نہ تو شعر ہے اور نہ ہی خالص اور مجرد نثر، بلکہ وہ ان دونوں کے مابین ہے۔ اس میں بکثرت قافیہ کا حسن ہے، لیکن شعری اوزان اور پیمانوں سے خالی۔ اس میں نثری عبارتیں ہیں: طویل بھی، مختصر اور درمیانہ نوعیت کی بھی، لیکن یہ نثر سپاٹ نہیں ہے۔

قرآن کے لغوی وادبی اعجاز کے دوسرے پہلو یہ ہیں:

ایجاز واختصار

قرآن مختصر جملوں میں طویل عبارتوں کو سمودیتا ہے جیسے:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ (ھود:112)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّـٰٓأُولِي الْأَلْبٰبِ (البقرۃ:179)،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۔ (الاعراف:199)

امثال وحکم

قرآن بلیغ محاوروں، ضرب الامثال اور حکمت آفریں جملوں اور فقروں سے معمور ہے۔ ان سے کلام میں حسن بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ ذہن وفکر پر گہرا اثر بھی ڈالتے ہیں۔ جیسے یہ جملے اور فقرے:

كُلُّ امْرِيءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور:21)

لِكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ (الانعام:67)

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعاً وَّ قُلُوبُهُمْ شَتّٰى (الحشر:14)

مَنْ يَعْمَلْ سُوٓءً ا يُجْزَ بِهٖ۔ (النساء:123)

کنایۃ

قرآن میں کنایوں، استعاروں اور مجازات وتشبیہات وغیرہ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔جن سے کلام کا حسن واثر دوبالا ہوگیا ہے۔

نظم

قرآن کے اسلوب کا ایک کمال اس کا نظم ہے۔نظم کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مضامین میں باہم ایک خوب صورت ربط پایا جاتا ہے حالاں کہ عموماً قرآن کی ایک سورت کی مجموعی آیات مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔یہ قرآن کا لفظی اور معنوی دونوں اعجاز ہے۔

6.8.1 قرآنی اسلوب کے عربی ادب پر اثرات

عربی زبان وادب پر قرآن کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے۔حقیقتا یہ اصلاً قرآن کریم ہی ہے جس نے اس زبان کو وہ پائیداری، حسن اور استحکام عطا کیا اور اس کو دیگر ایسی خصوصیات سے نوازا کہ وہ دنیا کی چند قدیم ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک تصور کی جاتی ہے۔وہ ایسی منفرد خصوصیات کی حامل ہے، جن کا تصور دوسری زبانوں کے تعلق سے نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ ہزار سالوں کے درمیان اس زبان کی ساخت، اس کی ترکیب، اس کی قواعدی خصوصیات اور اصول اپنی جگہ برقرار ہیں۔دوسری زبانوں کا معاملہ یہ ہے کہ صرف چند صدیوں کے بعد ان کے الفاظ اور ان کی قواعدی ساخت اتنی بدل جاتی ہیں کہ ان میں لکھی تحریروں کو پڑھنا اور سمجھنا عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں رہتا۔لیکن عربی زبان اس معاملے میں منفرد ہے کہ اس کی ڈیڑھ ہزار سال قبل کی زبان واسلوب اور آج کے سلوب میں کوئی بڑا اور بنیادی فرق نظر نہیں آتا-

قرآن جس وقت نازل ہوا، عربی زبان عرب قبائل کے متعدد لہجات کے زیر اثر پراگندگی کا شکار تھی۔قرآن کے ذریعے اس پراگندگی اور انتشار کی کیفیت ختم ہوئی۔اس طرح پورا عالم عرب ایک لسانی سانچے میں ڈھل گیا۔قرآن کا ہی فیض ہے کہ اس زبان کے جو ہزاروں الفاظ اور محاورے جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں بدو قبائل کے خیموں تک محدود تھے، قرآن کی آیات کی تفہیم کے لیے مسلم لغت نگاروں اور ماہر لسانیات کی انتھک کوششوں سے عربی زبان وادب میں آئے اور ہمیشہ کے لیے عربی ادب کا حصہ بن گئے۔

قرآن نے نئی اصطلاحات وضع کیں۔ پرانے الفاظ کو نئے معانی دیے یا دائرہ معنیٰ کو وسعت دی جیسے: صلاۃ، زکاۃ، کافر، مسلم، مومن، رکوع، سجود وغیرہ۔دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ ہیں جو قرآن میں جگہ پاکر عربی ادب عالیہ کا حصہ بن گئے۔

معلومات کی جانچ

۱۔قرآن کی جمع وتدوین کی کمیٹی کا سربراہ حضرت ابوبکر نے کس صحابی کو بنایا تھا؟

۲۔قرآن کا جو پہلا نسخہ مرتب کیا گیا، اس کا نام کیا تھا؟

۳۔حضرت عثمان کے عہد میں تدوین قرآن کی دوبارہ ضرورت کیوں پیش آئی؟

6.9 حدیث کی تعریف

لفظی طور پر حدیث کے معنی بات، گفتگو اور نئی چیز ہوتا ہے۔اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات، آپ ﷺ کا قول وعمل

اور آپ ﷺ کی تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔تقریر کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں کوئی بات کہی گئی یا کوئی کام کیا گیا اور آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہیں کی۔حدیث کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کرتے ہوئے صحابہ کرام کے فیصلے اور اقوال و آرا کو بھی حدیث میں شامل کیا جاتا ہے اور اسی طرح صدر اوّل کے مسلمان معاشرہ کے مجموعی طرزِ عمل کو بھی بعض ائمہ مثلاً امام مالک حدیث میں شامل کرتے ہیں، مگر عمومی طور پر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل وتقریر ہی کو کہتے ہیں۔

اگرچہ قرآن پاک کے بعد حدیث کا درجہ ہے اور اُس کی بہت سی فنی اقسام صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ ہوتی ہیں، لیکن ادبی مطالعہ میں حدیث کے صحت وسقم کو یا جرح وتعدیل کو زیرِ بحث نہیں لایا جاتا۔حدیث صحیح ہو یا غیر صحیح، ادیب ان کو اس نظر سے دیکھے گا کہ وہ کلام کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اور معانی ومطالب کے سرچشموں میں ایک سرچشمہ ہیں اور قرآن سے ماخوذ ومستفاد ہونے کی وجہ اعلیٰ درجہ کے اسلوب بیان کی حامل ہیں، یہاں تک کہ یہ اسلوب بیان ضعیف وکمزور احادیث میں بھی پایا جاتا ہے۔اس لیے ان کی ادبی ولسانی قدر و قیمت مسلّم ہے۔

6.10 حدیث کی اہمیت

حدیث کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ وہ قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا مصدر اور ماخذ ہے اور اس کی ادبی ولسانی حیثیت اور اہمیت یہ ہے کہ جس طرح قرآن پاک نے عربی ادب کو ایک لازوال زبان بنا دیا۔اسی طرح حدیث نے بھی اس کو مختلف طرح سے مالا مال کیا ہے۔حدیث کے ادب، لفظیات، محاورات واصطلاحات کے زبردست اثرات عربی نثر پر پڑے ہیں۔قرآن کے بعد مذہبی، تہذیبی وثقافتی امور میں اسی کا کردار سب سے بڑا ہے۔عبادات وحقوق کے متعلق قوانین اور قواعد وضوابط بنانے کا سب سے بڑا ماخذ اور مرجع یہی ہے۔قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ مضبوط ومعتبر ذریعہ حدیث ہے، کیونکہ وہ قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اُس کے اجمال کو کھولتی ہے، اس کے مطلق حکم کو مقید کرتی اور اس کے عام حکم کو خاص بنا دیتی ہے۔اگرچہ وہ احادیث جو صحیح وثابت سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کی تعداد کم ہے، تاہم فصاحت وبلاغت اور فیضان سماوی کی چھاپ ان پر بالکل ظاہر وباہر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں پیدا ہوئے جو قریش کا فصیح ترین قبیلہ تھا۔بنوسعد جو عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا اس میں آپ ﷺ نے دودھ پیا۔قرآن کریم کا نزول آپ ﷺ پر ہوا، اس کی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔اسی طرح عربوں کی زبان پر وسیع اطلاع اور نئے نئے اسالیب اختراع کرنے کی کامل مہارت اور بلند معانی کی تعبیر کے لیے جامع تعبیرات اختیار کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔دینی ومذہبی، اخلاقی وتعلیمی وتربیتی مطالب ادا کرنے کے لیے نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔غرض حدیث کے ادبی مطالعہ کی بڑی اہمیت ہے اور عربی زبان وادب خصوصاً نثر کے ارتقا کا کوئی بھی مطالعہ حدیث کے جائزہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، اس لیے ہر مؤرخ ادب حدیث کی ادبی حیثیت اور اس کے مقام ومرتبہ کا جائزہ لیتا ہے کہ عربی زبان کا کوئی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

6.11 حدیث کی تدوین

جس طرح قرآن کی کتابت وتدوین اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ہی ہوتی رہی اس طرح حدیث کی تدوین نہیں ہوئی۔اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ کتابت وتدوین کے آلات ووسائل کم تھے۔پڑھنے لکھنے کا رواج عرب معاشرہ میں ابھی شروع ہوا تھا۔دوسرے یہ خوف تھا کہ

کہیں قرآن و حدیث دونوں باہم مختلط نہ ہوجائیں، اس لیے شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرما دیا تھا، بعد میں اجازت دے دی، تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کے احکام اور بعض دوسرے احکام بعض صحابیوں کے لیے لکھوائے۔ مختلف ملوک وسلاطین عالم کے نام خطوط لکھوائے، جنھیں تاریخ نے محفوظ رکھا۔ مختلف قبائل کے ساتھ تحریری معاہدے کیے۔ مدینہ کی مردم شماری کروائی وغیرہ۔ یہ ساری لکھی ہوئی چیزیں بعد میں مجموعہائے احادیث کے لیے اساس اور بنیاد بن گئیں۔ اس کے علاوہ متعدد صحابیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اپنے ذاتی مجموعوں میں جمع کیے اور یہ مجموعے ان کے اخلاف و اولاد اور شاگردوں کو منتقل ہوئے۔ ایسے صحابیوں کی تعداد بہت ہے۔ ان ذاتی چھوٹے بڑے مجموعوں نے بھی بعد میں احادیث کی کتابوں کے لیے بنیادی سورس کا کام دیا۔ تیسرا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی زبانی نقل و روایت اور حفظ و نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل کرنے کا تھا، جس میں حضرت ابوہریرہ وحضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی مرویات ہزاروں سے تجاوز کرگئیں۔ صحابہ سے تابعین اور ان سے اتباع تابعین نے علم وتحقیق اور درس وتعلیم حدیث کے متعدد حلقے مختلف شہروں میں بنا لیے اور اس طرح علم حدیث ایک مفصل ومنقح شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ پھر اموی دور حکومت میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باضابطہ طور پر اپنے گورنروں کو حدیث کی تدوین کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد مختلف شہروں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ میں باضابطہ حدیث کے اوّلین مجموعے ترتیب دینے کی کوششیں شروع ہوگئیں، چنانچہ امام مالک کی مؤطا، مصنف عبدالرزاق، جامع معمر بن راشد وغیرہ لکھی گئیں۔ اس کے بعد پورے عالم اسلام میں درس حدیث کی مجلسیں، محدثین کے حلقے اور طالبانِ علم حدیث کے اخذ حدیث کے لیے دور دراز کے اسفار کا دور شروع ہوا۔ نقل درنقل اور روایت در روایت کی ایسی گرم بازاری میں حدیث کا حجم بھی بہت زیادہ بڑھا۔ فتنہ وضع حدیث بھی شروع ہوا جس کے سدباب کے لیے علمائے حدیث نے متعدد علوم مثلاً اصول حدیث، علم جرح وتعدیل وغیرہ کے اصول وقواعد مرتب کیے۔

ایک بڑا مسئلہ یہ پیش آیا کہ علما نے سالہا سال تک زبانی روایت کی بنا پر حدیث کے الفاظ بعینہٖ رکھنے کو محال قرار دیتے ہوئے اپنے الفاظ میں حدیثوں کے مفہوم کو روایت کرنے کی اجازت دے دی، جس کو روایت بالمعنی کہتے ہیں۔ سیاسی نزاعات، مسلکی، جماعتی اور مشربی اختلافات نے ہزاروں حدیثیں اپنی دعوت کی تائید اور اپنے میلان کی ترجیح میں اختراع کروادیں۔ بعض عابد زاہد لوگوں نے معاشرہ کی اصلاح کے مقصد سے بھی فضائل اعمال کی بہت سی حدیثیں گھڑلیں۔ قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل، بعض شہروں اور شخصوں کے فضائل پر مشتمل حدیثیں وضع کی گئیں۔ قریش کی تمام عرب پر فضیلت، عجم پر عرب کی فضیلت، بعض صحابہ کی بعض پر فضیلت کے باب میں بھی حدیثیں بنائی گئیں۔ وضع حدیث کی اس تحریک کے ذریعہ ان لوگوں نے عربی معقولات، محاورے، کہاوتیں، دانش مقولے اور عجمی آرا وافکار کا ایک بڑا حصہ حدیث میں شامل کردیا، جس نے تقریر وخطابت، بحث ومناظرہ، شعروشاعری اور مذہبی وعظ وخطابت نیز زہد ورقاق کی کتابوں پر گہرا اثر ڈالا۔

اس میں شک نہیں کہ گروہ محدثین نے حدیث کے غث وثمین کو چھانٹنے کی بڑی کوششیں کی ہیں۔ مسلمانوں کے علوم وفنون میں علم حدیث کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے اور اس فن میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں حدیث کے وہ مستند مجموعے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ مدوّن کیے گئے جن کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔

6.12 حدیث کا طرز بیان

تاریخ ادب عربی کے معروف مصنف استاذ احمد حسن زیات حدیث کے طرزِ بیان کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر باوجود برجستگی کے فیضان سماوی کا اثر، غیر معمولی صلاحیت کا نشان اور بلاغت و دل نشینی کی مہر نظر آتی ہے اور آپ ﷺ کا طرز بیان، قرآن مجید کے اسلوب کی نسبت زمانۂ نبوت کے طرز بیان سے قریب تر ہے۔ تاہم وہ اپنی ظاہری چمک دمک، عبارت کی ترتیب و روانی، واضح و معین غرض و غایت کو بیان کرنے کے لیے سلجھے ہوئے مناسب الفاظ لانے، بیان کے حسن حال ہونے اور جس سے گفتگو کی جائے اس کی بولی کے مطابق ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے۔ دوسری زبانوں سے مطابقت ایسی شکل میں بہت زیادہ نمایاں ہوجاتی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے آنے والے وفود سے مخاطب ہوتے تھے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب الفاظ استعمال کرتے، مقفّٰی عبارت کا التزام کرتے اور وفود سے گفتگو کرنے کے لیے آپ ﷺ ایسے الفاظ بھی بول دیتے تھے جو قریش کے ہاں تو متروک تھے، مگر ان وفود کے قبائل کی زبانوں میں مستعمل تھے۔ ابن عبد ربہ نے اس سلسلے میں آپ کا وہ کلام نقل کیا ہے جو آپ نے عیینہ ابن ابی زہیر فہدی اور لقیط بن عامر بن منتفق کے ساتھ گفتگوؤں میں استعمال کیا۔ (العقد الفرید ۲/ ۱۸۲)

حدیث اپنے طرز بیان میں نہایت ممتاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم دیے گئے تھے، چنانچہ حدیث میں طبعی روانی کا جمال، الفاظ کا جلال اور قدرتی وطبعی استدلال نمایاں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تشبیہ و تمثیل، کلیمانہ کلام اور حسن جواب اور فی البدیہہ گفتگو پر قدرت حاصل تھی۔ انبیائے کرام اصل میں انسانیت کے معلم ہوتے ہیں اور تعلیم و تربیت میں سب سے بہتر طریقہ اور مؤثر اسلوب تمثیل و تشبیہ کا طریقہ ہے۔

6.13 حدیث کی ادبی قدر و قیمت

جاحظ عربی زبان و ادب کا بے نظیر ادیب، متکلم اور ناقد ہے۔ اس نے حدیث کی ادبی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے کلام کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: **لم يتكلم الابكلام قدحف بالعصمة وشيدبالتائيدويسر بالتوفيق**" (البیان والتبیین ۲/ ۱۷) یعنی رسول اللہ ﷺ کا کلام عصمت سے ڈھکا ہوا ہے، تائید غیبی سے مضبوط ہے اور توفیق الٰہی اس کی ہم عناں ہے۔ جاحظ نے حدیث کی فصاحت و بلاغت پر دال جوامع الکلم مثال میں پیش کیے ہیں جن کے حروف کی تعداد کم اور معانی کثیر ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے انصار کی منقبت میں فرمایا: "**اماوالله ماعلمتكم الالتقلون عندالطمع وتكثرون عندالفزع** (خدا کی قسم میں نے تم کو نہیں جانا مگر یہ کہ تم فائدہ کی امید کے وقت کم ہوتے ہو اور جنگ کی ضرورت پڑے تو سب آجاتے ہو" اور فرمایا: **المسلمون تتكافؤدمائهم ويسعى بذمهتم أدناهم وهم يدعلى من سواهم**" "مسلمانوں کے خون برابر ہیں، ان میں کا ادنی آدمی بھی ان کی طرف سے گارنٹی لے سکتا ہے اور وہ دوسروں کے خلاف سب متحد ہیں" اور آپ ﷺ کا قول: **لاتزال أمتي صالحاًأمرهامالم ترالأمانة مغنماًوالصدقة مغرما**" "میری امت میں بھلائی رہے گی جب تک امانت کو مال غنیمت اور صدقہ کو جرمانہ نہ سمجھائے۔ اور آپ ﷺ کا قول: **المستشار مؤتمن** یعنی جس سے مشورہ مانگا جائے وہ پوری امانت داری سے مشورہ دے۔ اور آپ ﷺ کا قول: **إن أحبكم إلي وأقربكم مني مجالس يوم القيامة أحسنكم أخلاقاًالمؤطئون أكنافاالذين يألفون ويؤلفون وإن أبغضكم إلي وأبعدكم مني مجالس يوم القيامة الثرثارون المتفيهقون**" "تم میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب اور قیامت میں مجھ سے قریب تر وہ ہوں گے جن کے اخلاق

اچھے ہیں جونرم خو ہیں جولوگوں کو جوڑتے ہیں اورتم میں سے مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو بہت بولتے ہیں، بال کی کھال نکالتے ہیں اور چبا چبا کر بولتے ہیں"۔ اور آپ ﷺ کا قول: **مااملق تاجر صدوق**: صادق وامین تجارت کرنے والا کبھی محتاج نہ ہوگا۔ اور آپ ﷺ کا فرمان: **رحم الله عبداًقال خيرافغنم أوسكت فسلم**" اللہ اس بندے پر رحم کرے کہ بولے تو اچھی بات بولے اور بھلائی پائے یا چپ رہے تو سلامتی پائے"۔

اور فرمایا: **ان الله يرضى لكم ثلاثاويكره لكم ثلاثاً:يرضى لكم أن تعبدوه لاتشركوابه شيئاًوأن تعصموابحبله جميعاًولاتتفرقواوأن تناصحوامن ولاه الله امركم ويكره لكم قيل وقال وكثرة السوال واضاعة المال**" اللہ تم سے تین چیزیں چاہتا ہے اور تین چیزیں ناپسند کرتا ہے، پسند یہ کرتا ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو، متفرق نہ ہو، آپس میں ہمدرد بنو، اپنے حکمراں کے خیر خواہ رہو، قیل وقال، کثرت سوال اور مال کی بربادی کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ اور فرمایا: **يقول ابن آدم :مالي مالي ،وانمالك من مالك ماأكلت فافنيت اولبست فابليت اووهبت فامضيت** "۔ابن آدم میرا مال میرا مال چلاتا ہے، حالانکہ تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے کھا کر ختم کردیا یا پہن کر پرانا کردیا یا ہدیہ میں دوسرے کو دے کر آگے بھیج دیا۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد: **ان قوما ركبواسفينة في البحرفاقتسموافصارلكل رجل موضع فنقررجل موضعه بفأس فقالواماتصنع؟قال هومكاني أصنع به ماشئت،فان أخذواعلى يديه نجاونجواوان تركوه هلك وهلكوا**۔ کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے اور قرعہ ڈال کر کشتی میں جگہیں آپس میں بانٹ لیں، اب ہر آدمی کو ایک جگہ مل گئی تو ایک آدمی نے کلہاڑی لیکر اپنی جگہ کھودنی شروع کردی، لوگوں نے کہا یہ کیا کررہے ہو بھئی؟ کہنے لگا میری جگہ ہے میں اس کا جو چاہوں کروں، اب اگر سب لوگ اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تو وہ بھی بچے گا اور دوسرے لوگ بھی ورنہ وہ بھی ہلاک ہوگا دوسرے بھی۔ اور آپ ﷺ کا قول: **أوصاني ربي بتسع ،أوصاني بإخلاص في السروالعلانية وبالعدل في الرضاوالغضب وبالقصدفي الغنى والفقروأن أعفوعمن ظلمني ،وأعطي من حرمني وأصل من قطعني وأن يكون صمتي فكرا،ونطقي ذكراونظري عبراً**" میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے مجھے حکم دیا ہے کہ کھلے اور چھپے اخلاص برتوں، رضامندی وناراضگی ہر حال میں انصاف کروں، مالداری وفقر ہر حال میں اعتدال سے کام لوں، جو مجھ پر ظلم کرے اس کو معاف کردوں جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں جو میری قطع رحمی کرے میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں، اور یہ کہ میری خموشی فکر، میرا بولنا خدا کا ذکر اور میرا دیکھنا عبرت پکڑنا ہو۔"

اس کے علاوہ کتب امثال میں رسول اللہ ﷺ کے بعض اقوال وکلمات بھی نقل کیے گئے ہیں جو محاورے اور ضرب الامثال بن گئے ہیں مثال کے طور پر: **ان المنبت لاأرضاًقطع ولاظهراًابقى**: سواری کو تیز دوڑا کر قافلہ سے کٹ جانے والا نہ مسافت طے کرتا ہے اور نہ سواری ہی بچا پاتا ہے۔ **المؤمن هين لين كالجمل الآنف،ان قيدانقادان انيخ على صخرة استناخ**: مؤمن نکیل پکڑے ہوئے اونٹ کی طرح نرم خو اور اطاعت شعار ہوتا ہے، اگر اسے ہانکا جائے تو چلنے لگتا ہے اور اگر اُسے چٹان پر بٹھا دیا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ **لوتوكلتم على الله لرزقكم كمايرزق الطيرتغدوخماصاًوتعودبطاناً**: اگر تم خدا پر بھروسہ کرلو تو وہ پرندوں کی طرح تم کو روزی پہنچائے گا کہ صبح

کوخالی پیٹ نکل جاتے ہیں اورشام کو بھرے پیٹ لوٹ کرآتے ہیں۔ **مثل المؤمن کالنحلة لایاکل الاطیباو لایطعم الاطیبا**: مؤمن شہد کی مکھی کی طرح ہے خوش ذائقہ چیز کھاتا ہے اورخوش ذائقہ چیز ہی کھلاتا ہے: **انکم لن تسعو الناس باموالکم فسعوهم باخلاقکم** تم تمام انسانوں کواپنے مال سے خوش نہیں کرسکتے توان کواپنے اخلاق سے خوش کرو۔

آپ ﷺ نے فرمایا: **المؤمن الف مألوف ولاخیرفی من لایألف ولایؤلف**: مؤمن ملنساراور ہردل عزیز ہوتا ہے اور جوشخص ملنساراورخوش اخلاق نہ ہواس میں کوئی بھلائی نہیں۔ **ایاکم وخضراء الدمن، المرأة الحسناء فی المنبت السوء**: دیکھوگھورے کی سبزی سے بچویعنی اُس حسینہ سے جوخراب ماحول میں پلی ہو۔ **المرأة کالضلع ان رمت قوامها کسرتها**: عورت پسلی کی طرح ہے اگرتم اُسے سیدھا کرنے لگوگےتواس کوتوڑ ڈالوگے۔

الناس کلهم سواسية کاسنان المشط: تمام انسان کنگھی کے دانتوں کی طرح برابر ہیں۔ **جنة الرجل داره**: انسان کی جنت اس کا گھر ہے۔

حدیث میں آئے یہ محاورے ،ضرب الامثال اورکہاوتیں عربی زبان وادب پر بہت مؤثر ہوئے ہیں۔اس کی خاص وجہ یہ ہے ک مسلمانوں نے تمام علوم اسلامیہ میں جوزبردست اعتنا اورتوجہ حدیث کودی اتنی کسی علم کونصیب نہیں ہوئی۔ ہرزمانہ میں حدیث کی کتابیں،دواوین ،ان کی شرحیں،معاجم ،انڈیکس اورتشریحات پرمبنی کتابیں لکھی گئیں۔حدیث کی کتابوں کے اختصار،ترجمے اورحاشیے لکھے گئے۔حدیث کی کتب کے مختلف عالمی زبانوں میں ترجمے ہوئے ،محدثین ،رواۃ اوررجال حدیث پرعظیم الشان کتابیں لکھی گئیں۔یوں حدیث کے حوالہ سے بالواسطہ عربی زبان وادب کی خدمت بھی ہوتی رہی ہے۔حدیث نے عربی نثرکوایک خاص آہنگ اوراسلوب دیااوراس کی ثروت مندی میں زبردست اضافہ کیا۔اس لیے علماومؤرخین ادب قرآن پاک کے بعدعربی زبان وادب پرحدیث کے گہرے اوروسیع الاطراف اثرات کا تذکرہ کرتے اورحدیث کی شان میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

6.14 اکتسابی نتائج

☆ قرآن کی جمع وتدوین کا کام عہد رسالت میں شروع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا۔آپ ﷺ نے اس کے لیے دوطریقے اختیارفرمائے۔جمع صدوریعنی قرآن کو یاد کرکے سینے میں محفوظ کرنے کا ذریعہ اورجمع مکتوب یعنی تحریر وکتابت کے ذریعہ۔قرآن کے منتشر اجزا کو یکجا اور ایک مرتب نسخے کی شکل میں محفوظ کردینے کا کام حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہوا۔اس کے بعد اپنے تیسرے مرحلے میں قرآن کی تدوین حضرت عثمان کے عہد میں ہوئی۔عہدعثمانی میں جونسخہ قرآنی مرتب ہواوہ نسخہ مصحف عثمانی کہلاتا ہےاور یہ وہی نسخہ ہے جوپوری امت مسلمہ میں کے درمیان آج متداول ہے۔اس کے بعد چوتھے مرحلے میں ابواسود دولی یا حجاج بن یوسف کی کوششوں سے قرآن پراعراب اورنقطے لگائے گئے۔اس طرح قرآن کی تدوین پوری طرح مکمل ہوگئی۔

☆ قرآن اپنے اندراعجاز کے متعدد پہلو رکھتا ہے۔ان میں بعض کاتعلق زبان و بیان سے توبعض دوسرے پہلوؤں کاتعلق اس کے معانی وافکار سے ہے۔قرآن نے منکرین کوچیلنج کیا کہ وہ اس کے جیسی ایک سورت ہی پیش کردیں (البقرۃ: 23)۔اوراس کے ساتھ یہ اعلان

بھی کر دیا کہ تمام جن و انس مل کر بھی وہ اس عمل پر قادر نہیں ہو سکتے (الاسراء:88)۔ قرآن کے اس دعوے میں دونوں پہلو شامل ہیں کہ نہ تو الفاظ و اسلوب کے لحاظ سے اس جیسا بلیغ و مؤثر کلام کسی سے ممکن ہے اور نہ ہی افکار و معانی کے وہ جواہر جو قرآن اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی نظیر پیش کی جا سکتی ہے۔

☆ قرآن کی نثر ایک اہم ادبی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ وہ مجرد نثر ہے اور نہ ہی شعر۔ وہ ان دونوں کے مابین کی صنف ہے۔ اس میں بکثرت قافیہ کا حسن ہے، لیکن شعری اوزان اور پیمانوں سے خالی۔ اس میں نثری عبارتیں ہیں: طویل بھی، مختصر اور درمیانہ نوعیت کی بھی، لیکن یہ نثر سپاٹ نہیں ہے۔ یہی قرآنی اسلوب کا کمال ہے جو اسے اعجاز کی صفت عطا کرتا ہے۔

☆ حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو کہتے ہیں۔ حدیث نے عربی زبان کے ذخیرۂ ادب کو اپنی زبردست فصاحت، لازوال بلاغت، اپنی حکمتوں اور جوامع الکلم سے ثروت مند کیا۔ اس میں بہت ساری تراکیب کا اضافہ کیا، نئے محاورے دیے، نئی لفظیات سے اُس کو مالا مال کیا۔

☆ حدیث کی ادبی و لسانی حیثیت اور اہمیت یہ ہے کہ جس طرح قرآن پاک نے عربی ادب کو ایک لازوال زبان بنا دیا۔ اسی طرح حدیث نے بھی اس کو مختلف طرح سے مالا مال کیا ہے۔ حدیث کے ادب، لفظیات، محاورات و اصطلاحات کے زبردست اثرات عربی نثر پر پڑے ہیں۔ قرآن کے بعد مذہبی، تہذیبی و ثقافتی امور میں اسی کا کردار سب سے بڑا ہے۔ عبادات و حقوق کے متعلق قوانین اور قواعد و ضوابط بنانے کا سب سے بڑا ماخذ اور مرجع یہی ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے یہی سب سے زیادہ مضبوط و معتبر ذریعہ ہے، کیونکہ وہ قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اُس کے اجمال کو کھولتی ہے، اس کے مطلق حکم کو مقید کرتی اور اس کے عام حکم کو خاص بنا دیتی ہے۔ اگرچہ وہ احادیث جو صحیح و ثابت سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کی تعداد کم ہے، تاہم فصاحت و بلاغت اور فیضان سماوی کی چھاپ ان پر بالکل ظاہر و باہر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں پیدا ہوئے جو قریش کا فصیح ترین قبیلہ تھا۔ بنوسعد جو عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیا اور قرآن کریم کا نزول آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان پر مکمل عبور تھا نئے نئے اسالیب اختراع کرنے کی کامل مہارت، بلند معانی کی تعبیر کے لیے جامع تعبیرات اختیار کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ دینی و مذہبی، اخلاقی و تعلیمی و تربیتی مطالب ادا کرنے کے لیے نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔ غرض حدیث کے ادبی مطالعہ کی بڑی اہمیت ہے اور عربی زبان و ادب خصوصاً نثر کے ارتقا کا کوئی بھی مطالعہ حدیث کے جائزہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

☆ شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرما دیا تھا لیکن بعد میں اجازت دے دی۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے احکام اور بعض دوسرے احکام بعض صحابیوں کے لیے لکھوائے۔ مختلف ملوک و سلاطین عالم کے نام خطوط لکھوائے، جنھیں تاریخ نے محفوظ رکھا۔ مختلف قبائل کے ساتھ تحریری معاہدے کیے۔ مدینہ کی مردم شماری کروائی وغیرہ۔ یہ ساری لکھی ہوئی چیزیں بعد میں مجموعہائے احادیث کے لیے اساس اور بنیاد بن گئیں۔ اس کے علاوہ متعدد صحابیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اپنے ذاتی مجموعوں میں جمع کیے اور یہ مجموعے ان کے اخلاف و اولاد اور شاگردوں کو منتقل ہوئے۔ ایسے صحابیوں کی تعداد بہت ہے۔ ان ذاتی چھوٹے بڑے مجموعوں نے بھی بعد میں احادیث کی کتابوں کے لیے بنیادی سورس کا کام دیا۔ تیسرا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی زبانی نقل و روایت اور حفظ و نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل کرنے کا تھا، جس میں حضرت ابوہریرہ و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی مرویات ہزاروں سے تجاوز

کر گئیں۔صحابہ سے تابعین اوران سے اتباع تابعین نے علم وتحقیق اور درس وتعلیم حدیث کے متعدد حلقے مختلف شہروں میں بنالیے اوراس طرح علم حدیث ایک مفصل شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ پھر اموی دور حکومت میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باضابطہ طور پر اپنے گورنروں کو حدیث کی تدوین کی طرف متوجہ کیا۔اس کے بعد مختلف شہروں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ میں باضابطہ حدیث کے اوّلین مجموعے ترتیب دینے کی کوششیں شروع ہوگئیں، چنانچہ امام مالک کی مؤطا، مصنف عبدالرزاق، جامع معمر بن راشد وغیرہ لکھی گئیں۔اس کے بعد پورے عالم اسلام میں درس حدیث کی مجلسیں، محدثین کے حلقے اور طالبانِ علم حدیث کے اخذ حدیث کے لیے دوردراز کے اسفار کا دور شروع ہوا۔یہ علم حدیث کا زرین دورتھااورحدیث کی وہ کتابیں جوصحاح ستہ کہی جاتی ہیں اسی دور میں وجود پذیر ہوئیں۔

☆ حدیث کے ذخیرہ میں جوامع الکلم بہت بڑی تعداد میں ہیں جن کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے۔مؤرخین ادب ان کو اپنی کتابوں میں ادب کے شہ کارٹکڑوں کی مثال میں پیش کیا کرتے ہیں مثال کے طور پر آپ ﷺ نے فرمایا: **ان اللّٰہ یرضی لکم ثلاثاویکرہ لکم ثلاثاً:یرضی لکم ان تعبدوہ لاتشرکوابہ شیئاًوان تعصموابحبلہ جمیعاًولاتتفرقواوان تناصحوامن ولاہ اللّٰہ امرکم ویکرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال**'' اللہ تم سے تین چیزیں چاہتا ہے اورتین چیزیں ناپسند کرتا ہے، پسند یہ کرتا ہے کہ تم اسی کی عبادت کرواس کے ساتھ کسی کوشریک نہ کرواس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو،متفرق نہ ہو،آپس میں ہمدرد بنو، اپنے حکمراں کے خیرخواہ رہو، قیل وقال ، کثرت سوال اور مال کی بربادی کووہ ناپسند کرتا ہے۔اورفرمایا: **یقول ابن آدم :مالی مالی ،وانمالک من مالک ماأکلت فافنیت اولبست فابلیت اووھبت فامضیت** ''۔ابن آدم میرامال میرامال چلاتا ہے،حالانکہ تمہارامال تووہ ہے جوتم نے کھا کرختم کردیا یاپہن کر پرانا کردیا یاہدیہ میں دوسرے کودے کرآگے بھیج دیا۔

☆ اس کے علاوہ کتب امثال میں رسول اللہ ﷺ کے بعض اقوال وکلمات بھی نقل کیے گئے ہیں جومحاورے اورضرب الامثال بن گئے ہیں مثال کے طور پر: **ان المنبت لاارضاًقطع ولاظھراًابقی**: سواری کوتیز دوڑا کرقافلہ سے کٹ جانے والا نہ مسافت طے کرتا ہے اورنہ سواری ہی بچا پاتا ہے۔**المؤمن ھین لین کالجمل الآنف، ان قیدانقادان انیخ علی صخرۃ استناخ**: مؤمن نکیل پکڑے ہوئے اونٹ کی طرح نرم خواوراطاعت شعارہوتا ہے، اگراسے ہانکا جائے توچلنے لگتا ہے اوراگرُاسے چٹان پر بٹھادیا جائے تووہ بیٹھ جاتا ہے۔غرض یہ کہ حدیث کی ادبی قدروقیمت بہت زیادہ ہے اوراس کی تشریعی حیثیت کے ساتھ ہی عربی ادب کے طالب علم کوحدیث کی بلاغت اوراس کے ادبی اثرات پربھی نظررکھنی چاہیے۔

ہے اوراگراُسے چٹان پر بٹھادیا جائے تووہ بیٹھ جاتا ہے۔غرض یہ کہ حدیث کی ادبی قدروقیمت بہت زیادہ ہے اوراس کی تشریعی حیثیت کے ساتھ ہی عربی ادب کے طالب علم کوحدیث کی بلاغت اوراس کے ادبی اثرات پربھی نظررکھنی چاہیے۔

6.15 فرہنگ

مسلّم	:	تسلیم شدہ
جوامع الکلم	:	وہ الفاظ جن میں الفاظ کم اورمعانی زیادہ ادا کردیے جائیں
مالہ وماعلیہ	:	کسی موضوع کے مثبت اورمنفی تمام پہلو

اجمال	:	ایسا اختصار جس میں بات پوری نہ کھل سکے
مطلق	:	بغیر کسی شرط کے، پورا
مختلط	:	ملا جلا
حجم	:	سائز
وضع حدیث	:	حدیث گھڑنا
مشرب	:	مکتب فکر سے متعلق
رقاق	:	زہد و تقوی سے متعلق باتیں جو دل کو نرم کریں
غث و ثمین	:	کوڑا کرکٹ، بودی چیزیں، تلچھٹ
متکلم	:	بولنے والا، علم کلام کا جاننے والا
فقر	:	غربت
گھورا	:	گندگی و میل کچیل
دواوین	:	دیوان کی جمع، مجموعہ کلام یا کسی بھی موضوع پر متعلقہ مواد کا مجموعہ
اعتنا	:	توجہ
معاجم	:	ڈکشنریاں
رواۃ	:	راوی کی جمع، روایت کرنے والا
مستعار	:	ماخوذ، ادھار لیا ہوا
رطب اللسان	:	یعنی زبان پر ہمیشہ اس کا چرچا رہتا ہے، تعریف
منقح	:	کانٹ چھانٹ کر الگ و ممتاز کیا ہوا، اصلاح یافتہ

6.16 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ عہد نبوی میں قرآن کی تدوین کی صورت کیا تھی؟ اظہار خیال کیجیے۔

۲۔ عہد عثمانی میں تدوین قرآن سے متعلق کیا کام ہوا؟ وضاحت کیجیے۔

۳۔ حضرت ابوبکر نے قرآن کے جمع و تدوین کا کیا طریقہ کار اختیار کیا؟ تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

۴۔ تدوین کے حوالے سے قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کیا فرق ہے؟ بحث کیجیے۔

۵۔ حدیث کی تدوین پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۶۔ قرآن و حدیث کے متن میں ادبیت کے لحاظ سے کیا فرق ہے؟

۷۔ حدیث نے عربی زبان وادب کو کس طرح متاثر کیا؟

۸۔ جوامع الکلم پر روشنی ڈالیے اور بعض مثالیں دیجیے۔

۹۔ حدیث کی روایت باللفظ اور روایت بالمعنی سے ادبی لحاظ سے کیا فرق پڑتا ہے وضاحت کریں؟

6.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

(1) علوم القرآن، مکتبہ دارالعلوم کراچی — مولانا محمد تقی عثمانی

(2) علوم القرآن (ترجمہ: غلام احمد حریری) — صبحی صالح

(3) محاضرات قرآنی، اریب پبلی کیشنز، نئی دہلی — ڈاکٹر محمود احمد غازی

(4) مطالعہ قرآن، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور — مولانا محمد حنیف ندوی

(5) نقوش، لاہور، قرآن نمبر۔

(6) تاريخ الأدب العربي، المجلد الثاني، العصر الإسلامي، — د۔شوقي ضيف

(7) تاريخ الأدب العربي، اردو ترجمه عبدالرحمن طاهر سورتی — د۔أحمد حسن الزيات

(8) تاريخ الأدب العربي — د۔عمر فروخ

(9) فجر الإسلام — د۔أحمد أمين

(10) اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور مادہ حدیث

اکائی 7 مخضرمی شعرا اور ان کی شعری خصوصیات

اکائی کے اجزا

7.1 مقصد

7.2 تمہید

7.3 کعب بن مالک

7.3.2 حسان بن ثابت

7.3.3 حطیئہ

7.3.4 الخنساء

7.3.5 نابغۃ جعدی

7.4 اکتسابی نتائج

7.5 نمونے کے امتحانی سوالات

7.6 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

7.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ مخضرمی عہد کے نمائندہ شعرا اوران کی شاعری خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔اس اکائی میں مخضرمی عہد کے پانچ اہم شعرا کعب بن مالک، حسان بن ثابت، حطیئہ، خنساء، نابغہ جعدی کے مختصر سوانحی حالات بیان کیے جائیں گے اور ان کی شاعری کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار بھی بطور مثال پیش کیے جائیں گے۔

7.2 تمہید

عربی زبان و ادب کی تاریخ میں مخضرم شعرا کے ادبی کارنامے قابل ذکر قرار دیے جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف جاہلی شاعری کی بعض صفات پائی جاتی ہیں وہیں وہ دوسری طرف اسلامی تعلیمات و اقدار سے بھی مزین نظر آتی ہے۔عربی شاعری میں ان شعرا کو ''مخضرم شعرا'' کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے جنہوں نے زمانہ جاہلیت کے ساتھ ساتھ عصر اسلامی میں شاعری کی تھی اور اپنے اسلام لانے کے باوجود بھی کوچہ شاعری میں اپنے وجود کو منواتے رہے۔دراصل عربی زبان میں خضرم کے کئی معنی ہیں۔ان تمام معانی میں قدر مشترک یہ ہے کہ اس میں ملانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔یعنی دو چیزوں کو ملانا، حالانکہ یہ ملانا کئی طرح کا ہو سکتا ہے لیکن شعری اصطلاح میں اس سے مراد زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کا ملانا ہے۔یعنی ایسے شعرا جنھوں نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں شاعری کی ہو۔ان شعرا کا کلام زمانہ جاہلیت کے شعرا سے ممتاز ہے۔ان کے یہاں اخلاقی اقدار، زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور مشکلات کا مقابلہ حوصلہ مندی کے ساتھ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں زمانہ جاہلیت کی طرح قنوطیت نہیں ہے بلکہ رجائیت اور امید کی فضا ہے۔ساتھ ہی ان شعرا نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت گوئی کا بھی آغاز کیا جو آج تک ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت سے مختلف زبانوں میں موجود ہے۔

7.3 اہم مخضرم شعرا

7.3.1 کعب بن مالک

حضرت کعب بن مالک ایک جلیل القدر صحابی تھے۔انصار کے قبیلہ بنی خزرج سے نسبی تعلق تھا۔انصار میں سے جو لوگ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک ہوئے یہ بھی ان میں شامل تھے۔ان کی پیدائش ہجرت سے کم وبیش ۲۵ سال قبل ۵۹۸ء میں ہوئی۔شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہ پختہ کار شعرا میں تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے بعض اشعار پسند فرمائے تھے اور ان کو اپنے بہت قریب رکھتے تھے۔شاعری کے ساتھ وہ میدان کارزار میں بھی داد شجاعت دیا کرتے تھے۔غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑی بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خوش ہو کر ان کی زرہ بکتر خود زیب تن فرمائی اور اپنی زرہ حضرت کعب کو دی۔

غزوہ تبوک کے موقع پر جب تمام مسلمانوں کو میدان جنگ میں جانے کا حکم تھا، اس موقع پر جو چند لوگ شریک نہ ہو سکے ان میں حضرت کعب بن مالک بھی تھے۔حالاں کہ کعب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت چہیتے تھے لیکن یہاں دین کا مسئلہ آ گیا تھا لہذا آپ ﷺ کے حکم پر مدینہ کے تمام لوگوں نے ان سے بات چیت بند کر دی۔بیوی بھی علیحدہ ہو گئی اور وہ اکیلے اس مصیبت کو جھیلتے رہے۔بہت سخت امتحان

تھا۔ان حالات میں ایک آزمائش یہ ہوئی کہ غسان کے عیسائی حکمراں نے ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔لیکن ان حضرات کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا، دنیا کی ہر چیز ان کی نظر میں بے معنی تھی، وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنی غلطی کے لیے استغفار کرتے رہے۔آخر اللہ تعالی نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پچاس دن کے بعد ان کے لیے قرآن پاک کی آیات نازل ہوئیں۔حضرت کعب نے خود بھی ان واقعات کا بہت موثر انداز میں تذکرہ کیا ہے جو عربی ادب کا ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔

حضرت کعب نے طویل عمر پائی۔خلافت راشدہ کا پورا زمانہ دیکھا۔حضرت عثمان کی شہادت کے بعد انھوں نے بھی حضرت علیؓ سے قصاص کا مطالبہ کیا تھا۔امیر معاویہ کے عہد خلافت میں سنہ ۵۰ یا ۵۱ ء میں ان کی وفات ہوئی۔حضرت کعب بن مالک اچھے شاعر تھے۔تاہم ان کو صف اول کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔حضرت حسان کا مقام بہر حال ان سے بلند ہے۔لیکن دوسری صف کے شعرا میں ان کا نمایاں مقام ہے۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔اس دیوان میں اس دور میں رائج تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی ملتی ہے۔ان کے کلام میں نعت، نقائض، مرثیہ اور رزمیہ شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔یہ اتفاق ہے کہ حضرت کعب بن مالک کی شاعری پر قدما کے یہاں کم کلام ملتا ہے۔غالباً حضرت حسان بن ثابت کی وجہ سے ان کو عربی ادب کی تاریخ میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے مستحق تھے۔البتہ جدید عہد کے تذکرہ نگار عام طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔انھوں نے ان کی شاعرانہ خوبیوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ان کے دیوان پر سامی العانی نے تحقیق کی ہے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

نعت گوئی میں ان کا رجحان حقائق نگاری کی طرف تھا۔انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان، آپ کی شخصیت کے اوصاف، آپ کے فضائل ومناقب اور اطاعت رسول ﷺ کے مضامین باندھے ہیں۔ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فينا الرسول شهاب يتبعه

نور مضيئ له فضل على الشهب

بد النا فاتبعناه مصدقه

و كذبوه فكنا اسعدُ العرب

ترجمہ: رسول ﷺ ہمارے درمیان شہاب ثاقب کی طرح ہیں، جس کی اتباع کی جاتی ہے، بلکہ وہ شہاب ثاقب سے بھی زیادہ پرنور ہیں چمکدار ہیں، ہم نے تصدیق کرتے ہوئے ان کی اتباع کی، اور ان لوگوں نے ان کو جھٹلایا، پس ہم عربوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب تھے۔

اسی طرح:

وفينا رسول الله نتبع امره

اذا قال فينا القول لا نتطلع

تدلى عليه الروح من عند ربه

ينزل من جو السماء ويرفع

ترجمہ: اور ہمارے درمیان اللہ کے رسول ﷺ ہیں جن کی ہم اتباع کرتے ہیں، جب وہ ہمیں کوئی حکم دیتے ہیں تو ہم بے توجہی نہیں کرتے، اپنے رب کے حکم سے روح (جبرئیل علیہ السلام) ان کے پاس آتے ہیں، آسمان کی فضا سے اترتے ہیں اور چڑھتے ہیں۔

اسی طرح:

الحق منطقه و العدل سيرته

فمن يجبه اليه ينج من تبب

ترجمہ: ان کی گفتگو برحق ہے، اور عدل وانصاف ان کی سیرت ہے، پس جو بھی ان کی اتباع کرے گا وہ ہلاکت سے بچ جائے گا۔

اس طرح ان کی نعت گوئی میں اتباع رسول ﷺ کی دعوت اور رسول اللہ ﷺ کے فضائل ومناقب کا ذکر بڑے دل نشیں انداز میں ملتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جو وہ دیکھ رہے ہیں اس کو بیان کر رہے ہیں۔

نقائض یعنی اللہ کے رسول ﷺ پر کفار ومشرکین کے اتہامات کا جواب بھی انھوں نے بڑے سلیقے اور اچھوتے انداز میں دیا ہے۔ مکہ کے ایک شاعر ضرار بن خطاب نے بدر کے میدان میں جو قصیدہ کہا حضرت کعب نے اس کا جواب اسی لب ولہجہ میں دیا جو ان کا بہترین قصیدہ مانا جاتا ہے۔ اس طرح ابوسفیان کو بھی ایک تہدیدی قصیدہ لکھا۔ احد کے موقع پر عمرو بن عاص کے جواب میں قصیدہ لکھا۔ غزوہ خندق کے موقع پر عبداللہ بن زہری اور غزوہ بنی نضیر کے موقع پر عبداللہ بن مرداس کی نقیض کی، ان کے یہ نقائض کافی مشہور ہیں۔ بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت حسان کے ہم پلہ ہیں۔ ان کے نقائض میں مشرکین کے جوابات، ان کے الزامات کی تردید اور دین اسلام کی عظمت وخوبیوں کا اعتراف شامل ہے۔ ان کے اس طرح کے بعض اشعار کو رسول اللہ ﷺ نے بھی پسند فرمایا۔ روایت ہے کہ غزوہ حنین کے موقع پر انھوں نے ایک قصیدہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں:

قضينا من تهامة كل ريب

و خيبر ثم اجمعنا السيوفا

نخيرها ولو نطقت لقالت

قواطعهن دوسا اور ثقيفا

ترجمہ: تہامہ اور خیبر میں ہم نے تمام شک کو زائل کر دیا، پھر تلواروں نے ہمیں جمع کر دیا، ہم نے ان کو اختیار کر لیا، اگر تلواریں بول سکتیں تو وہ کہتیں کہ دوس اور ثقیف کا فیصلہ کرنے والی ہیں۔

مشہور ہے کہ اس قصیدہ کو سن کر قبیلہ دوس نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان اشعار کو پسند فرمایا۔ امام بیہقی نے ان اشعار کے سلسلے میں آپ ﷺ کا جملہ نقل کیا ہے ''**لهوا سرع فيهم من السهم فى غلس الظلام**۔'' (بے شک وہ ان پر اندھیاری کے تیروں سے زیادہ اثر کرنے والا ہے۔)

مرثیہ نگاری میں بھی حضرت کعب کا اسلوب بڑا منفرد تھا۔ انھوں نے متعدد مرثیہ کہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات پر انھوں نے مرثیہ کہا وہ بڑا مؤثر ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

یاعین فابکی بدمع ذری

لخیر البریة والمصطفی

علی خیر من حملت ناقة

وأتقی البریة عندالتقی

علی سید ماجد جحفل

وخیرالانام و خیراللها

ترجمہ: اے آنکھ تو آنسو چھلکا دے اس ذات کے لیے جو مخلوق میں سب سے بہتر اور اللہ کی طرف سے منتخب ہے، اس شخصیت پر جو اونٹ پر سوار ہونے کے اعتبار سے سب سے بہترین ہے، اور مخلوق میں سب سے زیادہ تقوے والی ہے، بزرگیت میں سب کی سب کی سردار ہے، اور مخلوق میں سب سے بہتر ہے،

حضرت حمزہ کی شہادت پر انھوں نے جو مرثیہ کہا تھا وہ بھی ان کے بہترین مراثی میں شمار ہوتا ہے۔ اس قصیدہ میں حضرت حمزہ کی بہن حضرت صفیہ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:

صفية قو مي! ولا تعجزي

و بكی النساء علی حمزة

ولا تسأمی ان تطيل البكا

علی اسداللہؓ فی الهزة

يريد بذاک رضا أحمد

و رضوان ذی العرش و العزة

ترجمہ: اے صفیہ! اٹھو! کمزور مت پڑو، درآنحالیکہ عورتیں حضرت حمزہ پر آنسو بہا رہی ہیں، اللہ کے شیر پر جو جنگ میں شہید ہو گیا زیادہ رو کر تم اپنے آپ کو مت تھکاؤ، وہ اس شہادت کے ذریعے حضور ﷺ اور اللہ رب العزت کی رضا چاہتے ہیں۔

مجموعی طور پر حضرت کعب بن مالک اپنے عہد کے بہترین شاعر تھے۔ شاعری میں انھوں نے اجتہادی بصیرت سے کام لیا۔ ان کی شاعری میں روایتی عرب شاعری سے انحرافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے قصائد میں تشبیب کی رعایت نہیں کی جب کہ عرب شعرا اپنے قصائد تشبیب سے شروع کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے نئی لفظیات کا استعمال کثرت سے کیا۔ خاص طور پر اسلامی اصطلاحات کو انھوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا، ان کی شاعری ایک مکمل اسلامی شاعری تھی۔ قرآن وحدیث کے مضامین بھی انھوں نے نظم کیے۔ دین کی دعوت اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ نعت اور مدح وثنا بھی ان کے کلام میں موجود ہے لیکن انھوں نے کبھی بھی بے مبالغہ یا غلو کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ خاص طور پر قصائد میں زور بیان کے لیے انھوں نے ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ

کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شاعری بوجھل نہیں معلوم ہوتی ہے۔انھوں نے حسن وعشق اور رنگین مضامین نہیں باندھے ہیں۔شاید ایک وجہ یہ بھی ہے جس کی وجہ سے متقدمین نے ان کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ورنہ حقائق نگاری اور شعریت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔

7.3.2 حسان بن ثابت:

حضرت حسان بن ثابت کا شمار دور جاہلیت اور عہد اسلام کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کو معلقات کے شاعروں کے ہم پلہ قرار دیا گیا اور زمانہ اسلام میں تو کوئی شاعر نہ مسلمانوں میں اور نہ مشرکین ان کے ہم سر اور ہم پلہ ہوا۔ ساتھ ہی ان کی دوسری فضیلتیں مستزاد ہیں۔ وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے منبر سے اپنے اشعار سنائے۔ ان کو شاعر النبی کا معزز خطاب ملا، اور ان کو باضابطہ دربار رسالت کی طرف سے شعر گوئی کے لیے مقرر کیا گیا اور حضرت ابوبکر کے ذریعہ باضابطہ ان کی تعلیم وتربیت کی گئی تاکہ وہ مکہ والوں کی ہجو کا اسی لب ولہجہ میں جواب دے سکیں۔

حضرت حسان بن ثابت کو قدرت کی طرف سے لمبی عمر ملی۔ ان کی ولادت ہجرت سے تقریباً ساٹھ سال قبل ۵۶۵ء میں ہوئی۔ ان کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا اور وہ بنی نجار سے تھے۔اس طرح رسول اللہ سے نانیہالی رشتہ داری بھی تھی۔ ان کا گھرانہ بھی اپنے دور میں بہت معزز مانا جاتا تھا اور جب ان کی شاعری کے چرچے شروع ہوئے رفتہ رفتہ وہ خزرج کے قومی شاعر بن گئے۔ چوں کہ بنی غسان اور بنی منذر سے ان کا خاندانی تعلق تھا اس لیے وہ ان کے بادشاہوں کے یہاں بھی جانے لگے اور ان کے دربار میں قصیدے کہے۔حضرت حسان کے قصیدے اس قدر پسند کیے گئے کہ ان بادشاہوں نے نہ صرف ان کو انعام واکرام دیا بلکہ ان کا مستقل وظیفہ بھی مقرر کر دیا جو ان کو تاحیات ملتا رہا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی یہ وظیفہ جاری رہا حالانکہ غسانی بدستور عیسائی ہی رہے۔

غسانی حکمراں حضرت حسان کی اتنی رعایت کرتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ دربار میں گئے، اتفاق سے معلقات کا مشہور شاعر نابغہ ذبیانی بھی دربار میں تھا۔غسانی بادشاہ کو ڈر ہوا کہ نابغہ کی موجودگی میں حضرت حسان نے شعر پڑھے تو ان کی سبکی ہوسکتی ہے اس لیے انھوں نے حضرت حسان سے کہا کہ آپ قصیدہ نہ سنائیں آپ کا انعام آپ کو مل جائے گا،لیکن حضرت حسان نے اپنا قصیدہ سنایا اور وہ ان لوگوں سے بھی زیادہ پسند کیا گیا۔ اپنی قوم کی مدح وثنا اور غسانی بادشاہوں کی مدح میں قصیدہ کہتے ہوئے حضرت حسان نے اپنی زندگی کے تقریباً ساٹھ سال بسر کیے۔ انھوں نے مکہ کے میلوں میں بھی اپنے قصیدے پڑھے اور داد وتحسین وصول کی۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مکہ کے چند شعرا جیسے عبداللہ بن زبعری، ابوسفیان بن حارث اور عمرو بن عاص، ضرار بن خطاب اور امیہ بن ابی صلت وغیرہ شعرا نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو شروع کی۔ اس زمانے میں شاعری وہ کام کرتی تھی آج کا میڈیا کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا جواب دینے کے لیے انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگوں نے تلوار سے ہماری مدد کی ہے۔ زبان سے مدد کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ اس پر حضرت حسان آگے بڑھے اور انھوں نے اپنی زبان پکڑ کر کہا کہ اب اس زبان سے سوائے آپ ﷺ کی حمایت اور مدافعت کے اور کوئی بات نہیں نکلے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان کو کچھ ہدایات دیں۔

حضرت ابوبکر کے پاس بھیجا کہ اہل مکہ کے عیوب و نقائص معلوم کریں۔اس کے بعد انھوں نے مکہ کے مشرکین کی ہجو شروع کی اور اس طرح شروع کی کہ اس ہجو میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خاندان کو پوری طرح بچا لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت حسان کو دعا بھی دی کہ حسان تم پڑھے جاؤ جبرئیل تمھاری مدد کریں گے۔

حضرت حسان نے ہجرت سے قبل ہی اسلام قبول کرلیا تھا اور مشرکین مکہ کے اعتراضات کا جواب دینے لگے تھے۔لیکن اس میں سب سے اہم مسئلہ جنگ بدر کا ہے۔اس موقع پر حضرت حسان کے اشعار نے وہ کام کیا جو مجاہدین کے تیروں نے کیا۔ مکہ کے تقریباً ۷۰ سردار اس میں مارے گئے تھے، ان کی لاشیں ایک گڑھے میں ڈال دی گئیں۔اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو مخاطب کر کے اللہ کے وعدہ کی تکمیل کا ذکر کیا تھا۔حضرت حسان نے اس منظر کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ان اشعار میں بیان فرمایا:

يناديهم رسول الله لما
قذفناهم كبا كب فى القليب
الم تجدوا حديثى كان حقا
وامر الله يأخذ بالقلوب
فما نطقوا ولو نطقوا لقالوا
صدقت وكنت ذا رأى مصيب

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انھیں (کفار) کو مخاطب کیا، جب ہم نے ان کے لشکر کے بیچ و بیچ حملہ کیا، کیا تم نے میری بات کو برحق نہیں سمجھا، کہ اللہ کا حکم دلوں کو پکڑنے والا ہے، تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، اگر وہ بولتے تو کہتے کہ آپ سچے اور درست رائے والے ہیں۔

غزوہ بدر کے موقع پر بھی انھوں نے متعدد قصیدے کہے۔حضرت حمزہ کی دردناک شہادت پر جو قصیدہ کہا وہ ان کے رثائی کلام میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر انھوں نے بہت شاندار قصیدہ لکھا۔اس کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

فان أبى و والده و عرضى
لعرض محمد منكم وقاء

ترجمہ: میرے والد اور ان کے والد اور میری عزت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عزت کے لیے ڈھال ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات اور اس کے بعد پورے خلافت راشدہ کے عہد میں وہ زندہ رہے۔حضرت عثمان کی دردناک شہادت پر بھی انھوں نے نہایت موثر مرثیہ لکھا اور اس میں حضرت علیؓ پر تنقید کی تھی۔غالباً ان کو یہ غلط فہمی تھی کہ حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دینے میں حضرت علیؓ نے مطلوبہ سرگرمی نہیں دکھائی۔

حضرت حسان تقریباً ۱۲۰ سال کی عمر پا کر ۵۴ھ میں امیر معاویہ کے دور حکومت میں فوت ہوئے۔ان کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ہے۔لیکن سبھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے اسلام سے قبل ساٹھ سال گزارے اور اسلام لانے کے بعد بھی وہ ساٹھ سال زندہ

رہے۔اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ مذکورہ بالا سنہ وفات زیادہ معتبر ہے۔انھوں نے ہجرت سے دو سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔اس طرح یہ ۵۶ سال ہوتے ہیں اور عربی زبان میں ۵۶ کو ساٹھ کہنے کا یعنی دو چار سال کے کسر کو پورا کہنے کا رواج ہے۔

حضرت حسان اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور چوں کہ لمبی عمر پائی اس لیے کلام بھی ان کا سب سے زیادہ ہے۔ان کی شاعری کے موضوعات میں تنوع ہے۔قصیدہ، ہجو، مرثیہ اور نعت ان کے خاص موضوعات ہیں۔جیسا کہ سب جانتے ہیں غزل دراصل قصیدہ کے تشبیب کا حصہ ہے جس نے اپنی علیحدہ پہچان قائم کر لی۔حضرت حسان کے قصائد میں تشبیب بلکہ بعض مراثی میں بھی تشبیب کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ گویا جس کو آج غزلیہ شاعری کہا جاتا ہے حضرت حسان کے یہاں وہ بھی کافی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔حضرت حسان کا سب سے اعلیٰ کلام وہ ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا میں کہا ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صلہ کی خواہش کی وجہ سے تملق اور چاپلوسی ہے اور نہ تخیلات کی جھوٹی پرواز ہے، بلکہ بیانیہ انداز میں اعلیٰ ترین حقائق کا بیان ہے۔

نعت نبی ﷺ صرف حضرت حسان نے نہیں کہی بلکہ اس کے دور کے اور بھی بہت سے شعرا نعت گوئی کرتے تھے بلکہ مکہ میں بھی نعت کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔حضرت ابو طالب کو تو نعت گوئی کا موجد کہا جا سکتا ہے کہ نعت سب سے پہلے انھوں نے ہی شروع کی تھی لیکن اس میدان میں امامت کا درجہ حضرت حسان کو حاصل ہے۔انھوں نے نعت میں ایسے اشعار کہے ہیں جو آج بھی ضرب المثل ہیں۔مثلاً یہ دو شعر:

و أحسن منک لم ترقط عيني

وأجمل منک لم تلدالنساء

خلقت مبرأً من كل عيب

كأنک قدخُلقت كما تشاء

ترجمہ: مری آنکھ نے آپ سا حسین دیکھا نہیں، کسی عورت نے آپ جیسا خوبصورت جنا نہیں، آپ ہر عیب سے پاک پیدا کئے گیے ہیں ، گویا کہ آپ کو پیدا کیا گیا ہے جیسا آپ چاہتے تھے۔

نعت گوئی کی تاریخ میں ان سے بہتر اور ان سے زیادہ مبنی برحقیقت اشعار اور کسی نے نہیں کہے۔اس نعت کے علاوہ بھی ان کا نعتیہ کلام بہت ہے اور اس میں نہایت معیاری اشعار موجود ہیں۔یہ چند شعر بھی نعت کے بہترین نمونے ہیں:

أغر عليه للنبوه خاتم

من الله مشهود يلوح و يشهد

وضم الاله اسم النبى الى اسمه

إذا قال فى الخمس المؤذن اشهد

و شق له من اسمه ليسجله

فذو العرش محمود و هذا محمد

فامسى سراجا مستنير او هاديا

يلوح كمالاح الصقيل المهند

ترجمہ: مجھے خاتم الانبیاء کے امتی ہونے پر فخر ہے، اس واضح گواہی پر اللہ شاہد ہے جو آج تک دی جاتی ہے، اللہ نے اپنے نام کے ساتھ نبی کے نام کو ملا دیا ہے، جبکہ مؤذن پانچ مرتبہ گواہی دیتا ہے، اللہ نے اپنے نام سے ان کے نام کو نکالا ہے، پس عرش والا محمود ہے اور یہ محمد ہیں، پس وہ روشنی دینے والے چراغ اور ہدایات دینے والے ہوگئے، وہ ایسے چمکتے ہیں جیسے ہندوستان کی تلوار چمکتی ہے۔

ان کے نعتیہ اشعار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات، اہل مکہ میں اور اہل عرب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قربان ہو جانے کا جذبہ پایا جاتا ہے ان نعتیہ اشعار میں خوشامدانہ انداز نہیں ہے جو قصائد کی جان ہوتا ہے بلکہ فدویانہ اور عقیدت مندانہ اسلوب ہے۔

فخر ومباہات، نسب اور قبیلہ پر فخر کرنا اسی طرح دشمنوں اور مخالفوں کی ہجو کرنا اس دور کی عربی شاعری کا پامال مضمون تھا۔ حضرت حسان نے بھی اس طرح کی شاعری کی ہے۔ حضرت حسان کے فخریہ اشعار نے اسلام کی سربلندی کا سامان فراہم کیا تو ہجو یہ اشعار نے مشرکین کو منھ توڑ جواب دیا۔ غزوہ بدر کے موقع پر انھوں نے جو فخریہ قصیدہ کہا تھا وہ بڑا معیاری ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

لقد علمت قريش يوم بدر

غداة الأسروالقتل الشديد

بأنا حين تشجرالعوالي

حماة الروع يوم أبى الوليد

قتلنا ابنى ربيعه يوم سا روا

إلينا فى مضاعفة الحديد

ترجمہ: قریش نے بدر کے دن جب کہ لوگوں کو قیدی بنایا جا رہا تھا اور زبردست قتل عام برپر تھا جان لیا کہ ہم جب مصیبتیں آتی ہیں، تو ہم جنگ کے شہسوار ہیں ابوالولید کے مقتل کے دن، ہم نے ربیعہ کے دونوں بیٹوں کو اس وقت قتل کیا جب کہ وہ دوہرے اسلحہ سے لیس تھے۔

ایک اور قصیدہ میں اپنے قومی فضائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

و كنا ملوک الناس قبل محمد

فلما اتى الاسلام كان لنا الفضل

ترجمہ: ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بادشاہ تھے، جب اسلام آیا تو ہم کو ہی فضیلت حاصل ہوئی۔

نقائض اس دور کی عربی شاعری کا خاص مضمون تھا۔ حضرت حسان کے نقائض بھی بڑی شہرت رکھتے تھے بلکہ مسلمان ہونے کے بعد ان کی شاعری کا زیادہ حصہ ان نقائض پر ہی مشتمل ہے۔ اگرچہ ہجو نگاری اور نقائض ملتی جلتی اصطلاحیں ہیں، لیکن ہجو عام ہے اور نقائض ان ہجویہ قصائد کو کہا جاتا ہے جو کسی کے جواب میں کہے گئے ہوں۔ چونکہ مشرکین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشعار کے ذریعہ بھی پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے، اس لیے حضرت حسان نے کفار ومشرکین کے ان الزامات کا جواب دیا اور کم وبیش دس سال تک وہ یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس

طرح کے قصائد میں غزوہ احد کا وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے ابوسفیان بن حرب کے جواب میں کہا تھا۔ اس طرح کا ایک مشہور قصیدہ وہ ہے جو بنو تمیم کے ایک شاعر کے جواب میں کہا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

إن الذوائب من فهروإخوتهم

قد بينوا سنة للناس تتبع

ترجمہ: بیشک سرداران قریش اور ان کے بھائیوں نے لوگوں کے لیے ایک طریقہ بنایا ہے جس کی پیروی کی جاتی ہے۔

معرکہ بدر کے موقع پر جو قصیدہ انھوں نے لکھا تھا اس کی مثال نقائض کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ عبداللہ بن زبعری نے بدر کے مشرک مقتولین کا مرثیہ لکھا تھا۔ حضرت حسان نے اس کا جواب دیا۔ یہ جواب اپنی اثر آفرینی، پرشکوہ الفاظ، ندرت بیان اور حقیقت پسندی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ یہ قصیدہ مکہ میں بھی بہت مقبول ہوا۔ خود زبعری اس پر تلملا اٹھا اور موقع کی تاک میں تھا کہ احد کا معرکہ پیش آ گیا اور اس میں مسلمانوں کو یک گونہ ہار ہوئی تھی تو اس نے خاص حضرت حسان کو مخاطب کر کے اس قصیدہ کا جواب لکھا تھا۔ جنگ بدر کے بارے میں ہبیر نے بھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ حضرت حسان نے اس کا جواب بھی دیا تھا۔ اس میں ان کی حقیقت بیانی اور فیصلہ کن انداز بہت نمایاں ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

سقتم كنانة جهلا من سفاهتكم

إلى الرسول فجندالله يخزيها

أورد تموها حياض الموت ضاحية

فالنار موعدها والقتل لاقيها

أنتم أحابيش جمعتم بلا نسب

ائمة الفكر غرتكم طواويها

اعتبرتم بخيل الله إذ قتلت

أهل القليب و من أردينه فيها

ترجمہ: تم نے بے وقوفی کرتے ہوئے کنانہ قبیلے کو اللہ رسول ﷺ کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا، اور اللہ کا لشکر اس کو شکست دیگا، تم نے اس کو موت کے گڑھے میں لا یا ہے قربان ہونے کے لیے، تو آگ ان کے وعدے کی جگہ ہے اور قتل ان کا ہونے والا ہے، تم احابش ہو جو بغیر نسب کے جمع کر دیے گئے ہو، تم کفر کے سرخیل ہو تم کو تمہارے طاغوتوں نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

مرثیہ نگاری میں انھوں نے کوئی منفرد اسلوب تو نہیں نکالا بلکہ وہ بڑے مرثیہ گو بھی نہیں تھے۔ ان کے ابتدائی ساٹھ سال کی شاعری میں ایک غسانی شہزادہ کا مرثیہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جیسے مرثیہ نگاری کا بند کھل گیا ہوا۔ آپ ﷺ کی وفات پر انھوں نے متعدد مرثیے کہے اور نہایت پردرد مرثیہ کہے، جن میں یہ مرثیہ بہت مشہور ہے:

مابال عينک لاتنام کانما

کحلت ماقیها بکحل الارمد

جزعا علی المهدی أصبح ثاویا

یاخیر من وطی الحصی لاتبعد

بابی وأمی من شهدت وفا ته

في یوم الاثنین النبی المهتدی

ترجمہ: میرے آنکھوں کو کیا ہوگیا کہ وہ نہیں سو رہی، ایسا لگتا ہے جیسے کہ آنکھوں میں مٹی کا سرمہ لگ گیا ہے، مہدی پر غم کرتے ہوئے جو دفن ہوگیا، اے وہ جس کو کنکریوں نے چھپا دیا ہے دور مت ہو، میرے ماں باپ کی قسم پیر کے دن جس کی وصال میں شریک ہوا وہ نبی رحمت ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات سے قبل حضرت حمزہ کے بارے میں بھی انھوں نے رثائی اشعار کہے۔ بعض اور صحابہ کی وفات پر بھی مرثیے کہے، خلفائے راشدین کی وفات پر بھی مرثیے لکھے۔ ان میں سب سے اہم اور سب سے مشہور وہ مرثیہ ہے جو انھوں نے حضرت عثمان کی وفات پر کہا تھا یہ مرثیہ اس میں درد و غم کے سچے بیان کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔

حضرت حسان بن ثابتؓ اپنے عہد کے مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سب سے زیادہ قصائد اور نقائض ہیں۔ اس کے علاوہ نعت، مرثیہ اور قبائلی فخر و مباہات کے مضامین بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت حسان کے یہاں غزلیہ شاعری کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے قصائد کی تشبیب میں حسن و عشق کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

7.3.3 حطیئہ

عام طور پر لوگ مدح و ثنا کو پسند کرتے ہیں اور ہجو و مذمت کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی انسان کی ذاتی شخصیت، اس کی وجاہت، اس کی شکل وصورت کا معاملہ ایسا ہوتا ہے جس میں اس کا دخل نہیں ہوتا لیکن اس کی وجہ سے لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کو قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمام منفی صفات مجتمع ہو کر ایک شخص کی صورت میں مجسم ہو جاتی ہیں۔ نہ اس میں خاندانی وجاہت ہوتی ہے نہ حسن صورت اور نہ حسن سیرت، زبان دہکتا ہوا انگارہ اور الفاظ چبھتے ہوئے تیر بن جاتے ہیں۔ بظاہر ایسا وجود ملنا مشکل ہے، لیکن عربی ادب کی تاریخ میں حطیئہ ایک ایسی شخصیت ہے جس کے لیے یہ سب کچھ ثابت ہے اور اس کے باوجود اس کا نام تاریخ کے روشن اوراق میں ثبت ہے۔

حطیئہ کا اصل نام جرَوَل ہے۔ ماں اوس بن مالک کی حبشی باندی تھی۔ اس اعتبار سے ان کو قبیلہ اوس کا ایک فرد ہونا چاہیے لیکن اس کی ماں کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہیں تھی اور ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حطیئہ نے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تو ان کی ماں جن کا نام ضریر تھا، اپنے مالک کی بیوی کے بھائی افقم کا نام بتا دیا جو قبیلہ بنی ذہل سے تھا۔ اس طرح اس کا وجود دو قبیلوں میں بٹ گیا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ انتہائی لاغر اور کمزور تھا، چہرہ سوکھا ہوا اور بے رونق تھا، نچلے جبڑے کی ہڈی ابھری ہوئی تھی اور چھوٹا سا قد تھا۔ عربی زبان میں حطیئہ کا مطلب ناٹا قد کا آدمی ہوتا ہے۔ اس کے قد کی وجہ سے اس کو حطیئہ کہتے تھے۔ غرض حطیئہ کے ساتھ نہ جسمانی خوبصورتی تھی،

نہ خاندانی وجاہت، نہ اس کا کوئی قبیلہ تھا، نہ خاندان۔شکل وصورت ایسی تھی کہ اپنے بھی دیکھ کر منھ چھپا لیتے تھے۔اوس بن مالک کے بیٹوں نے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لیے اس کو باپ کی وراثت میں سے حصہ نہیں ملا۔ پھر وہ بنی ذہل میں افقم کی اولاد کے پاس گیا۔ ان کی بڑی مدح وثنا کی۔ انھوں نے اس کو کھجور کے تین درخت گزارے کے لیے دے دیے جو اس کے لیے ناکافی تھے۔اس نے پوری میراث کا مطالبہ کیا۔ یہاں بھی وہ مطالبہ پورا نہیں ہوا۔اسی دوران اس کی شادی بھی ہوگئی اور ایک بیٹی بھی جس کا نام ملیکہ تھا جو باپ کے برخلاف بڑی خوبصورت تھی۔

حطیئہ کی شخصیت جس طرح بیان کی جاتی ہے اس کی شاعری اس کے مقابلے میں اعلیٰ درجہ کی تھی۔قافیہ وضع کرنے میں اس کو کمال حاصل تھا اور دیگر شعرا کے کلام پر اس کی گہری نظر تھی۔اس نے دوسرے شعرا کے بارے میں جو تبصرے کیے ہیں وہ اس کی دقت نگاہ اور تنقیدی بصیرت کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

جیسے جیسے حطیئہ کی ہجوگوئی کا چرچا ہونے لگا اس کی عزت وتکریم بھی ہونے لگی۔لوگ اس غیر اہم شخصیت کو اہمیت دینے لگے۔اس دوران عرب میں اسلام کا آغاز ہوا۔سارے عرب نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر لی۔ بنی عبس اور بنی ذہل بھی مسلمان ہو گئے۔ان کے ساتھ حطیئہ نے بھی اسلام قبول کر لیا لیکن اس کی زبان کی تیزی اسلام لانے کے بعد تیز ہی رہی۔حطیئہ کو صحابیت کا شرف نہیں مل سکا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمان ہوا تھا۔حطیئہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور دلیل کے طور پر حطیئہ کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

أطعنا رسول الله اذ كان صادقا

فيا عجبا ما بال دين ابي بكر

ترجمہ: ہم نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی جب کہ وہ صادق (سچے) تھے، کہ ابوبکر کے دین پر تعجب ہے یہ کا چیز ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس نے ردۃ کی جنگوں میں حصہ لیا لیکن مرتدین کی ہار کے بعد وہ پھر مسلمان ہو گیا۔ طٰہٰ حسین اور دوسرے ناقدین نے اس کے اسلام کو مجبوری بتایا ہے ورنہ ان کا خیال ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔اس لیے ساری زندگی طرح طرح کی خرافات میں مبتلا رہا حتیٰ کہ اس نے وصیت بھی ایسی کی جس کی امید کسی مسلمان سے نہیں کی جاسکتی۔

حضرت عمر کے دور خلافت میں حطیئہ اور زبرقان کا واقعہ پیش آیا۔ زبرقان حضرت عمر کی طرف سے صدقات کی وصولی پر مامور تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ان کے اور ان کے چچازاد بھائیوں میں چشمک تھی۔ان کے چچازاد بھائی 'بنی انف ناقہ' کے نام سے مشہور تھے جو توہین آمیز لقب تھا۔اتفاق سے ایک سال ملک میں بڑا قحط تھا۔حطیئہ اپنی بیوی اور اولاد کو لے کر عراق کی طرف جا رہا تھا۔راستہ میں زبرقان سے ملاقات ہوگئی۔ زبرقان ان کو پہچانتا تھا۔اس نے اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی۔حطیئہ نے قبول کر لیا لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ وہ زبرقان کے مخالف بھائیوں کے پاس چلا گیا اور اس نے وہاں رہ کر ایک تو ان کے لقب بنی انف ناقہ کو اپنی شاعری کے ذریعہ معزز لقب بنا دیا، دوسرے زبرقان کی ہجو میں ایک شعر کہا کہ:

دع المكارم لاترحل لبغيتها

و اقعد فانک انت الطاعم الکاسی

ترجمہ: عزتوں کو چھوڑ دے، اس کے حاصل کرنے میں کدو کاوش مت کر، بیٹھ جا بیشک تو کھانے والا ہے اور پہننے والا ہے۔

زبرقان نے اس شعر پر حضرت عمر سے شکایت کی کہ حطیئہ نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے شعر سن کر کہا کہ اس میں تو کوئی ہجو نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت حسان کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس میں بڑی ہجو ہے اس لیے حطیئہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں حطیئہ نے معافی نامہ لکھا اور حضرت عمر کی مدح بھی کی۔ حضرت عمر نے اس کو رہا کر دیا اور تاکید کی کہ اب کسی کی مذمت مت کرنا۔ اس نے کہا کہ میرا تو ذریعہ معاش ہی یہ ہے، اگر یہ نہ کروں گا تو کھاؤں گا کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو تین ہزار دینار دیے اور وعدہ لیا کہ اب کسی کی مذمت نہیں کرے گا۔ حطیئہ جنگ قادسیہ میں شریک ہوا اور اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کا حوصلہ بلند کیا۔

حطیئہ کی زندگی کے بہت سے واقعات تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں مرقوم ہیں اور اس کے دیوان میں قصائد کے ساتھ بھی بعض واقعات کا تذکرہ ہے۔ بہر حال حطیئہ نے خلافت راشدہ کا زمانہ دیکھا اور حضرت امیر معاویہ کے عہد میں ۵۹ھ میں وفات پائی۔

بہر حال، حطیئہ اپنے دور کا عظیم لیکن تیکھا شاعر تھا۔ اس کے یہاں اگر چہ کئی صنف سخن ملتی ہیں لیکن اس کا امتیاز ہجو گوئی ہے۔ ہجو کے علاوہ مدح بھی کسی قدر ہے اور غزلیہ شاعری میں بھی اس کا قلم بڑا رواں ہے۔ غزلیہ شاعری میں جاہلی عہد کے شعرا کی طرح اس کے یہاں فحش گوئی اور عریانیت پائی جاتی ہے۔ وہ مجموعی طور پر حسن و عشق اور محبوب کے سراپا کا نقشہ بڑی چابکدستی سے کھینچتے ہیں۔

مدح میں بھی حطیئہ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ اور اس کے مدحیہ قصائد، ہجو کے مقابلے میں زیادہ نپے تلے اور سجے ہوئے یعنی مرصع ہیں۔ ہجو نگاری میں ان کے یہاں والہانہ پن ہے جب کہ مدح نگاری میں ٹھہراؤ اور طمانیت ہے۔ مدح میں اس نے کم لکھا اور جو کچھ لکھا اس کا بھی اکثر حصہ ضائع ہو گیا۔ اس وقت ان کا جو مدحیہ کلام موجود ہے اس میں ایک تو حضرت عمرؓ کی مدح میں کہا گیا قصیدہ ہے جو اگر چہ مختصر ہے لیکن بڑا موثر ہے۔ یہ قصیدہ ایک معذرت نامہ ہے اور عربی ادب میں مثالی معذرت نامہ مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دو قصیدے بنی انف ناقہ کے نام کے ہیں یہ دونوں قصیدے زمانہ جاہلیت کے قصائد کی طرح ہیں۔ اسلوب و انداز بھی وہی ہے۔ خاص طور پر امرؤالقیس کے معلقہ کی بازگشت اس میں سنائی دیتی ہے۔ اجڑی ہوئی بستیوں کا ذکر، محبوب کی یاد اور اس کے بعد روئے سخن ممدوح کی طرف کرتے ہیں۔

محبوب کے سراپا کا بیان بھی عربوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ قصیدہ کی تشبیب کا موضوع وہی ہوتا تھا۔ حطیئہ نے بھی اپنے محبوب کا سراپا اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات کو نہایت رنگین انداز میں بیان کیا ہے۔ حطیئہ نے اپنی ایک محبوبہ ام معبد کا نام لیا ہے۔ غالباً اس کی غزلیہ شاعری کی محرک ام معبد ہی ہے۔ اس کے انداز و نیاز کو بیان کرنے میں اس نے کبھی تو پاک بازی کی حد کر دی ہے اور کبھی عریانیت اور فحش نگاری میں زمانہ جاہلیت کے شعرا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کی پاک باز شاعری کے چند اشعار یہ ہیں:

ولمارأت من فی الرحال تعرضت

حیاءً و صدّت تتقی القوم بالید

فبتنا ولم نکذبک لو أن لیلنا

إلی الحول لم نملل وقلنا له ازدد

و في كل ممسى ليلة أو معرس

خيال يوافي الركب من أم معبد

ترجمہ: جب اس نے کجاوے میں موجود لوگوں کو دیکھا تو وہ حیا کے مارے ہٹ گئی اور قوم سے اپنے ہاتھ کے ذریعے سے بچنے لگی، ہم نے رات گزاری اور ہم نے آپ کو جھوٹ نہیں کہا، اگر رات سال جتنی طویل بھی ہوتی تو ہم نہیں اکتاتے اور ہم زیادہ کی آرزو رکھتے، ہر رات گزارنے والے اور رات کو اترنے والے کا یہ خیال ہے کہ ام معبد کے قافلے والوں کے خیال سے میل کھاتا ہے۔

حطیئہ کی شاعری میں حکمت و دانش، زندگی کے حقائق اور اخلاق و کردار کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے بعض اشعار بڑے حکیمانہ ہیں اور بعض اشعار میں مذہب کی بھی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

ولست أرى السعادة جمعَ مالٍ

ولكن التَقِيَ هو السعيد

و تقوى الله خيرالزاد ذخرا

و عندالله للاتقى مزيد

وما لابد أن ياتى قريب

ولكن الذى يمضى بعيد

ترجمہ: میں مال کو جمع کرنے میں سعادت نہیں سمجھتا، لیکن متقی ہی ہے جو خوش قسمت ہوتا ہے، اللہ کا تقوی ذخیرہ اندوزی کا بہترین تحفہ ہے، اور اللہ کے نزدیک متقیوں کے نزدیک مزید انعامات ہیں، جو آنے والا ہے وہ قریب ہے لیکن جو گزر گیا بہت دور ہے۔

ان اشعار میں حطیئہ نے مذہب سے لگاؤ اور اللہ پر بھروسے کا تذکرہ مومنانہ شان سے کیا ہے۔ دراصل حطیئہ ستم ظریف تھے۔ ان کی نظر زیادہ تر ان عوارض اور کمیوں پر رہی جو ان کو فطری طور پر ملی تھیں۔ بدل میں فطرت نے جو اس کو بے پناہ قیمتی دولت دی تھی اس کا احساس پس منظر میں چلا گیا۔ اسی لیے کمیوں کا زیادہ رونا رویا ہے اور منفی رجحان کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ اس کے یہاں معاشرہ سے بغاوت اور حالات کا شکوہ زیادہ ملتا ہے۔

7.3.4 الخنساء

حضرت خنساء عرب کی عظیم ترین خاتون شاعر گزری ہیں۔ عربوں میں شاعری کا عام رواج تھا۔ بہت سی خواتین بھی شاعری کرتی تھیں اور ان کے اشعار متفرق طور پر کتابوں میں ملتے ہیں لیکن حضرت خنساء پہلی باضابطہ صاحب دیوان شاعرہ ہیں۔

حضرت خنساء کا نام تماضر تھا۔ قبیلہ مضر کے عمرو بن حارث خنساء سلمی کی بیٹی تھیں۔ ان کے دو بھائی تھے معاویہ اور صخر۔ دونوں بڑے وجیہ اور ابھرتے ہوئے نوجوان تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے والد کو ان پر اتنا ناز تھا کہ میلہ میں ان کو لے جاتے اور ان کے ہاتھ پکڑ کر کہتے کہ میں مضر کے دو سب سے اچھے جوانوں کا باپ ہوں۔ اہل قبیلہ کو بھی ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ حضرت خنساء بھی اپنے علم و فضل اور شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے قبیلہ میں بہت مقبول تھیں اور ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ان کے حسن و جمال کا بھی چرچا تھا۔ ان کے بہت سے رشتے

آئے لیکن انھوں نے اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان رواحہ بن عبدالعزیز سلمی سے شادی کر لی۔ اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا لیکن اس کے بعد رواحہ کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے انھوں نے عبدالعزی سے شادی کی۔ لیکن عبدالعزی فضول خرچ بھی تھا اور شراب بھی پیتا تھا، اس نے اپنا بھی سارا مال برباد کر دیا۔ خنساء کے بھائی صخر نے کئی مرتبہ مدد کی لیکن عبدالعزی کی عادتیں نہیں سدھریں اور پھر اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مرداس بن عامر سے شادی کی لیکن یہ شادی بھی زیادہ دن نہیں چلی۔ ان سے تین بچے ہوئے اور شوہر کی وفات ہوگئی۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے چوتھی شادی بھی کی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ صحیح ہو تاہم حضرت خنساء رفیق حیات کے معاملے میں بہت خوش نصیب نہ ثابت ہوسکیں انھوں نے تین شادیاں کیں اور تینوں شوہر فوت ہو گئے جنھوں نے حضرت خنساء کو بہت سکھ بھی نہیں دیے تھے۔ اس کے ساتھ دو حادثے اور ان پر ایسے گزرے جن کی کسک وہ ساری زندگی جھیلتی رہیں۔ وہ حادثے ان کے چہیتے بھائیوں کی موت کے تھے۔ خنساء کے ایک بھائی معاویہ کو قبیلہ مرہ کے دو نوجوانوں نے قتل کر دیا تھا۔ حضرت خنساء کو اس کا شدید قلق ہوا۔ دوسرے بھائی نے اس کا بدلہ لے لیا لیکن وہ بھی عین جوانی میں بری طرح زخمی ہوگیا اور زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔ حضرت خنساء کو اپنے بھائیوں سے شدید محبت تھی۔ وہ یہ غم برداشت نہ کرسکیں اور ان کی یاد میں مستقل روتی رہتی تھیں۔ اسی طرح روتے روتے ان کی بینائی بھی متاثر ہوئی۔

قبیلہ مضر کے لوگ اسلام لائے تو یہ بھی مسلمان ہوگئیں اور صحابیت کا شرف بھی ان کو حاصل ہوا۔ ان کے چار بیٹے تھے وہ جوان ہو چکے تھے۔ جنگ قادسیہ میں وہ چاروں شریک ہوئے اور چاروں اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے۔ بوڑھی ماں نے جب ان کی شہادت کی خبر سنی تو زبان سے ارشاد فرمایا "**الحمدللہ الذی شرفني بقتلهم**"۔

حضرت خنساء کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق ان کی وفات حضرت عثمان کے عہد خلافت میں سنہ ۲۴ھ میں ہوئی۔

حضرت خنساء اپنے قبیلہ کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو کچھ اپنے اشعار اللہ کے رسول ﷺ کو سنائے۔ آپ ﷺ انہیں پسند فرمائے اور مزید سننے کی خواہش کی۔ حضرت خنساء کی شاعری کے لیے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا۔ اس کے علاوہ بھی اجلہ صحابہ میں ان کی شاعری مقبول تھی۔ حضرت حسان کے بعض اشعار پر انھوں نے اصلاح بھی دی تھی۔

حضرت خنساء کے لیے شاعری ذریعہ اظہار تھی۔ یہ نہ ان کا ذریعہ معاش تھا اور نہ انھوں نے دیگر شعرا کی طرح شاعری کو اپنی پہچان بنانے کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ ان کے لیے شاعری صرف واردات قلبی کا بیان تھا۔ ان کے سرمایۂ شاعری میں زیادہ تر مراثی ہیں اسی وجہ سے ان کو فن مرثیہ میں عرب کی سب سے بڑی شاعرہ کہا جاتا ہے۔ اپنے بھائیوں خاص طور صخر کی موت سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئیں اور ان کی یاد میں انھوں نے مرثیے کہے۔ اس کے شوہر مرداس بن عامر کی وفات بھی اس کے لیے بڑا حادثہ ثابت ہوئی اور ان کی وفات کے بعد بھی حضرت خنساء نے متعدد مرثیے کہے جو ان کے بہترین مراثی میں شمار ہوتے ہیں۔ مرداس کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے چند اشعار یہ ہیں:

أَلا اختار مِرْدَاسًا على الناس قاتله

ولو عاده كُناتة و حلائِلُه

فلما راه البدر أظلم كاسفا

أرن شواذ بطنه وسوائله
و فضل مرداسا على الناس حلمه
و إن كل همّ همه فهو فاعله
متى تعادل ماجدا يُعتدل به
كما عدل الميزان بالكف ثاقله

ترجمہ: مرداس کے قاتل نے تمام لوگوں میں سے اسی کا انتخاب کیا، ۔۔۔میں نے جب چاند کو دیکھا تو وہ گرہن سے تاریک ہو چکا تھا، اور شواذ پہاڑ اس کی وادیاں اور اس کے جھرنے رو رہے ہیں، بردوباری نے مرداس کو تمام لوگوں پر فضیلت دیدی، اور وہ اپنے ہر ارادے کو کر گزرتا ہے، بزرگی کو جب کبھی ناپا جائے گا تو اسی سے ناپا جائے گا جس طرح کہ ترازو کو اس کے رطل سے نوازا جاتا ہے۔

شوہر کے ساتھ فطری محبت انسانی معاشرہ کی بڑی حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ زن وشوہر ایک دوسرے کے سہارے اور ایک دوسرے کے ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بچھڑ جانا بڑا حادثہ ہوتا ہے اور خاص بیوی کے لیے شوہر کی جدائی کا غم اور بڑا ہوتا ہے۔ لیکن حضرت خنساء کو جو تعلق اپنے بھائیوں سے تھا ایسا لگاؤ شوہر سے بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اپنے سوتیلے بھائی صخر کی موت کا تو انھیں اتنا سخت صدمہ ہوا کہ ان کی یاد میں زندگی بھر روتی رہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خنساء حضرت عائشہ سے ملنے آئیں۔ اس وقت وہ بوڑھی ہو چکی تھیں اور لکڑی کے سہارے سے چلتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے پہچان لیا اور پوچھا کہ تمھاری یہ حالت کیوں ہوگئی؟ حضرت خنساء نے جواب دیا صخر کی وجہ سے۔ اس کے بعد حضرت خنساء نے صخر کے احسانات گنوائے۔

صخر کے علاوہ اپنے حقیقی بھائی معاویہ کے لیے بھی انھوں نے بہت سے مرثیے کہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اگرچہ معاویہ کے مراثی بھی اعلیٰ درجہ کے ہیں لیکن صخر کی یاد میں انھوں نے جو مرثیے کہے ہیں وہ اپنی اثر آفرینی اور درد وغم کی حقیقی تصویر کھینچنے میں بے مثال ہیں۔ حضرت خنساء کی اصل شاعری تو مرثیہ نگاری ہے لیکن ان کے یہاں حکمت و دانش اور زندگی کے حقائق کا بیان بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے۔

حضرت خنساء کی شاعری کا بڑا حصہ مرثیہ نگاری پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کے مراثی جہاں درد وغم کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں وہیں ان اشعار میں ان کیفیات اور ان وسائل کا بھی بڑا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے غم کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو بھلاتا ہے اور غموں کو بھلاوا دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بدوی زندگی اور اس کے انداز اور وسائل حیات کا بھی مرقع سامنے آجاتا ہے۔

اسلام لانے کے بعد ان کے درد وغم کم تو نہیں ہوئے لیکن اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت کی امید نے ان کا حوصلہ بڑھا دیا اور انھوں نے غموں کو صبر وشکر کے گھونٹ کے ساتھ جھیلنا شروع کر دیا اور بڑی مجاہدہ خاتون بن گئیں۔ جنگ قادسیہ میں ان کی قربانیاں بے مثال ہیں۔

7.3.5 نابغۃ جعدی

مخضرمی شعرا میں نابغہ جعدی کا نام اہمیت سے لیا جاتا ہے۔ وہ اچھے شاعر اور بڑے باہمت مجاہد تھے۔ طویل عمری میں بھی وہ بہت سے لوگوں پر سبقت لے گئے۔ ان کی عمر ایک سو بیس سال بتائی جاتی ہے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے ابتدائی عہد اسلامی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے عہد میں ان کی وفات ہوئی۔

نابغہ کا اصل نام عبداللہ بن عدس بن جعدہ ہے۔ اس لیے نام کے ساتھ جعدی لکھا جاتا ہے۔ اندازہ کے مطابق ظہور اسلام سے ۵۵ سال قبل پیدا ہوئے۔ مورخین نے ان کی طویل عمری کے لیے ان کے اشعار سے شواہد جمع کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی اس کی عمر ۱۲۰ سال رہی ہوگی۔

اسلام سے قبل اس دور کے دیگر شعرا کی طرح قصیدہ گوئی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور لخمی بادشاہوں کے یہاں جا کر مدح و ستائش کرتے اور صلہ پاتے۔ اور انعام و اکرام کے سہارے اپنی زندگی گزارتے تھے۔

نابغہ کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ دین حنیف کے پیروکار تھے۔ انھوں نے اسلام سے پہلے کبھی بھی نہ بت پرستی کی اور نہ فال نکالا جو اسلام میں حرام ہے اور جس کو قرآن نے ازلام کہا ہے۔ وہ روزے بھی رکھتے تھے اور عرب کی دوسری برائیوں شراب، رنداور فحش و عریانیت سے بھی ہمیشہ دور رہے۔ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا متبع بتاتے تھے۔ ایسے شخص کے لیے اسلام نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ۹ ہجری تک ان کا براہ راست اسلام سے واسطہ پیش نہیں آیا۔ نابغہ کے زمانہ جاہلیت کا ایک شعر ہے:

الحمدللہ لاشریک له

من لم یقلها فنفسه ظلما

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں، جو ان تعریفات کا قائل نہیں پس اس کا دل تاریک ہے۔

نابغہ نے زمانہ جاہلیت میں طویل زمانہ پایا اور کافی شاعری کی۔ اسی دور میں ایک مرتبہ ان کی زبان شاعری کے لیے ایسی بند ہوئی ہے کہ باوجود کوشش کے وہ شعر نہیں کہہ پائے۔ ۹ ہجری میں جب ان کا قبیلہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو اللہ نے ان کی زبان شعر گوئی کے لیے دوبارہ کھول دی اور شان رسالت میں ایک قصیدہ کہا۔ اس قصیدہ کو سن کر روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعا دی کہ خدا ساری عمر تمھارے دانت سلامت رکھے۔ یعنی تم پوپلے نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا ہو کہ اگر دانت گر جاتے تو اسلوب باقی نہیں رہتا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا دی ہو۔

نابغہ نے دربار رسالت میں جو قصیدہ پڑھا تھا وہ بہت طویل ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں دو سو شعر تھے اور وہ تمام شعر انھوں نے رسول اللہ کو سنائے اور آپؐ نے بڑی توجہ سے سنے۔ اس قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

أتیت رسول الله اذا جاء بالهدی

و یتلو کتابا کالمجرة نیرا

تذکرت والذکری تهیج للهوی

و من حاجة المحزون أن یتذکرا

ترجمہ: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب کہ وہ ہدایت کا پیغام لے کر آئے، اور ایسی کتاب کی تلاوت کرتے ہوئے آئے جو روشن کہکشاں کی طرح ہے، میں نے ان کو یاد کیا، اور کسی کی یاد عشق کو برانگیختہ کرتا ہے، اور غم زدہ شخص کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ محبوب

کو یاد کرے۔

نابغہ اس قصیدہ میں جب اس شعر پر پہنچے:

بلغنا السمائَ مجداً وجوداً وسؤدداً

وانا لنرجو فوق ذلک مظهرا

ترجمہ: ہم بزرگی، سخاوت اور قیادت کے اعتبار سے آسمانوں پر پہونچ گئے، اور اس سے بھی اوپر جو مظہر ہے وہاں تک پہونچنا چاہتے ہیں۔

یہ شعر سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بھائی وہ مظہر کہاں ہے، تو نابغہ نے جواب دیا کہ جنت۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انشاء اللہ کہو۔

اس قصیدہ کے درج ذیل شعر پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعا دی تھی:

ولا خیر فی حلم اذا لم تکن له

بوا در تحمی صفوه ان یکدّر

ترجمہ: اس بردباری میں کوئی خیر نہیں ہے جب کہ اس میں غیض وغضب نہ ہو، جو اسے مکدر ہونے سے بچالے۔

نابغہ کا یہ قصیدہ بہت مقبول ہے۔ متعدد لوگوں نے اس کو نقل کیا ہے اور ان کے دیوان میں بھی شامل ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ قصیدہ دراصل انھوں نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا پھر اسلام لانے کے بعد اس قصیدہ کو مزید بڑھا کر دوسو اشعار کا کر دیا۔ اس لیے اس قصیدہ میں دونوں انداز کی جھلک موجود ہے۔ دوسرے حصہ میں قرآنی تعلیمات اور اسلام کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔

نابغہ نے مدینہ آکر اسلام قبول کیا اور پھر مدینہ میں ہی مستقل بود وباش اختیار کر لی۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بہادر تھے۔ انھوں نے متعدد جنگوں میں شرکت کی، خاص طور پر ایران کی جنگوں میں شریک رہے۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں انھوں نے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی لیکن حضرت عثمان نے اجازت نہیں دی اور ان کو سمجھایا کہ ہجرت کرنے کے بعد واپسی درست نہیں ہے۔ لیکن وہ نہیں مانے اور اپنے علاقے میں چلے گئے۔

نابغہ کا علاقہ جو بادیہ کہلاتا ہے، وہ عراق کے ماتحت تھا۔ وہاں کے گورنر حضرت ابوموسی اشعری تھے ان سے کسی اختلاف کی بنا پر ان کی ہجو کہہ دی اس پر حضرت ابوموسی اشعری نے ان کو سزا دی۔ وہاں سے بڑی مشکل سے رہائی ملی۔

امیر معاویہ اور حضرت علی کے اختلاف میں وہ حضرت علی کے پرزور حامی تھے۔ حالانکہ کافی ضعیف ہو چکے تھے لیکن صفین کی جنگ میں شریک ہوئے۔ حضرت علی کی مدح میں اور امیر معاویہ کی ہجو میں قصیدے بھی لکھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد جب اقتدار امیر معاویہ کو حاصل ہو گیا تو کہتے ہیں کہ انھوں نے مدینہ کے حاکم مروان کو حکم دیا کہ نابغہ کا مال واسباب ضبط کر لیا جائے۔ جب نابغہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ امیر معاویہ کے پاس آئے اور انھوں نے کچھ اشعار پڑھے جن میں سے دو شعر یہ تھے:

فإن تاخذ و أهلی و مالی بظِنَّة

فإني لجرّاب الرجال مجرّب

صبور على مايكرهُ المرئُ كله

سوى الظلم أني إن ظلمت سا غضب

ترجمہ: اگرتم میرے مال اور خاندان والوں کو کسی خام خیالی میں لیتے ہو،تو میں لوگوں میں سب سے زیادہ تجربہ کار ہوں، میں ان تمام چیزوں پر صبر کرنے والا ہوں جس کو انسان ناپسند کرتا ہے،سوائے ظلم کے کیوں کہ کوئی مجھ پر ظلم کرتا ہے تو میں غصہ ہوجاتا ہوں۔

امیر معاویہ نے فوراً اپنا سابقہ حکم واپس لے لیا۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ تو حاکم وقت ہونے کے باوجود ان کی دھمکیوں سے ڈر گئے؟ امیر معاویہ نے کہا کہ یہ نابغہ ہیں۔ مجھے سارے عرب میں رسوا کر دیں گے۔

نابغہ کی زندگی کا ایک واقعہ اور ملتا ہے۔ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے عہد کا ہے۔ یزید کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر نے خلافت قائم کی۔ اگرچہ مروان اور عبدالملک کے مقابلے میں ان کو شکست ہوگی لیکن پھر بھی کئی سال ان کی خلافت قائم رہی۔ ان کے زمانے میں نابغہ ان سے ملنے گئے اور ان کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے ارشاد فرمایا کہ تمھارے قصیدہ کی وجہ سے نہیں بلکہ تمھارے مسلمانوں کے مال میں دوسرے حقوق ہیں ان کی وجہ سے ہم تمھاری مدد کریں گے اور ان کو کافی مال و دولت عطا کی۔

نابغہ کی وفات ان کے اپنے علاقہ میں سنہ ۶۵ ہجری کے آس پاس ہوئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کے قریب تھی۔

نابغہ مخضرمی شعرا میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ عہد جاہلیت میں انھوں نے راگ رنگ اور حسب ونسب پر فخر اور قومی بہادری کے گن گائے۔ اپنے قبیلہ کے بہادروں اور ان کی جنگ جوئی کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ عام موضوعات ہیں لیکن نابغہ کا انداز بیان بڑا منفرد ہے۔ نابغہ نے نہ صرف اپنے قبیلہ کے بہادروں بلکہ ان کے گھوڑوں کی بھی بہادری کے گن گائے ہیں اور میدان جنگ میں ان کے قبیلہ کے بہادروں کی خوں ریزی کا نقشہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ہمارے بہادر میدان جنگ میں اس بے جگری سے لڑتے ہیں کہ ان کے گھوڑے خون میں تر ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہم لال گھوڑوں کو کالا اور کالے گھوڑے کو لال سمجھنے لگتے ہیں۔

نابغہ کے کلام میں مبالغہ آرائی کا عنصر بہت بڑھا ہوا ہے۔ خاص طور پر میدان جنگ کے مناظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس میں بہادروں کے مقابلے، ان کی تلواروں کی جھنکار، نیزوں کی بوچھار اور تیروں کی بارش میں مرد میدان کس طرح ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے قبیلے کے لوگ کس طرح میدان جنگ میں شیروں کی طرح بہادری سے جنگ کرتے ہیں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نابغہ کے یہاں مبالغہ میں منظر کشی کا عنصر بھی اوروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر جنگی مناظر کو تو وہ اپنی شاعری میں مجسم کر دیتے ہیں۔

اسلام کے بعد ان کی شاعری میں اخلاقیات اور قرآن وسنت کی تعلیمات کا عنصر غالب آ گیا۔ شعر کے مضامین میں تقویٰ، طہارت اور آخرت کی فکر کے مضامین باندھنے لگے، نعت نبی بھی انھوں نے کہی اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مرثیے اور قصیدے بھی لکھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اسلامی تعلیمات پر غور وفکر کرنے سے ان کے کلام میں فلسفیانہ سوچ اور حیات وممات کے مسائل پر غور کرنے کی بھی عادت پڑی۔ ان کے چند شعر یہ ہیں:

وجا هدتُ حتی ما أُحِسُّ و من معی
سهیلاً اذا ما لاح ثُمَّتَ غَوَّرا
أقیمُ علی التقوی و أَرضی بفعلها
وکنتُ من النار المَخُوفَةِ أَوْجرا

ترجمہ: میں نے جہاد کیا یہاں تک کہ جو میرے ساتھ تھے، ہم نے ایک ستارے کو محسوس کیا جو چمکا اور پھر دشمنوں کو شکست دے دیا، میں تقوے پر قائم رہوں گا اور اس کے مطابق کام کروں گا، کیوں کہ میں مہیب آگ سے ڈرتا تھا۔

دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری کے بارے میں چند شعر یہ ہیں:

ولا تَجْزَعا إن الحیاة ذَمیمَةٌ
فَخِفَّا لروعات الحوادث أوقِرا
وإن جاء أمرٌ لا تُطِیقان دَفعَه
فلا تجزعا مِمَّا قضی اللہ و اِصبِرا
تهیج البکاء والندامة ثم لا
تُغیر شیئا غیرما کان قُدِّرا

ترجمہ: تم دونوں پریشان مت ہو، بلا شبہ زندگی حقیر ہے، حوادث زمانہ کے سامنے نرم ہوجا، اور اگر تجھ کو کوئی ایسا معاملہ درپیش ہوجائے، جس کو حل کرنے کی تو طاقت نہیں رکھتا تو اللہ کے فیصلے پر پریشان مت ہو اور صبر کا دامن تھامے رکھ، تو رونے کو اور پشیمانی کو برانگیختہ کرے گا، اور جو کچھ مقدر میں لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوگا۔

نابغہ کے بارے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ وہ شاعر تو بہت بڑے تھے اور میدان کارزار میں بہادر بھی تھے لیکن میدان شعر میں کمزور تھے۔ اگر کوئی شخص شاعری میں ان کا مقابلہ کرتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ تذکرہ نگاروں نے متعدد نام لکھے ہیں جن کے ساتھ ان کے مباحثے ہوئے اور بہت جلد انھوں نے ہار مان لی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے کسی کی مذمت یا ہجو کی جب اس کی طرف سے کسی نے جواب دیا تو فوراً ہار مان لی اور میدان چھوڑ دیا۔ اس کمزوری کے باوجود وہ عظیم شاعر تھے۔ قصیدہ نگاری میں وہ اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں تھے اور گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے میں تو ان کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ اصمعی نے لکھا ہے کہ دور جاہلیت کے شعرا میں صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کو گھوڑے کے اوصاف ہو بہو بلکہ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرنے کے اندر سب سے زیادہ مہارت ہے۔ ان میں ایک نابغہ جعدی ہیں۔

نابغہ کی اولیات میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قصائد کی تشبیب اور اپنی عشقیہ شاعری میں اپنے محبوب کی پردہ داری بھی کی ہے۔ وہ اپنے محبوب کا نام نہیں لیتے بلکہ ایسا نام لیتے ہیں جس سے کنایۃً محبوب کی طرف اشارہ ہوجاتا ہے۔ دراصل عرب شعرا اس معاملے میں بڑے منھ پھٹ تھے وہ سرعام اپنے محبوب کا نام لیتے تھے اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی منظر کشی بھی کرتے تھے۔ نابغہ نے دوسرے حصے کو تو باقی رکھا لیکن محبوب کو پردہ میں چھپا دیا۔ اس طرح کی شاعری میں وہ منفرد شخصیت ہیں اور عہد جاہلیت کی شاعری میں اس کنایے کی

مثالیں کم ملتی ہیں۔

7.4 اکتسابی نتائج

عربی شاعری کو بالعموم تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک عہد جاہلیت کے شعرا، دوسرے وہ شعرا جنھوں نے جاہلیت کے عہد میں ہوش سنبھالا پھر اسلام قبول کر کے عہد اسلام میں بھی شاعری کی اس طرح کے شعرا کو مخضرمی شعرا کہا جاتا ہے۔مخضرم کا مطلب ہوتا ہے ملانے والا۔یعنی یہ شعرا ایسے تھے جنھوں نے دو عہدوں کو ملایا۔تیسرا دور عہد اسلامی کے شعرا کا دور ہے۔

اس یونٹ میں ہم نے مخضرمی شعرا میں سے چند کا مطالعہ کیا ہے۔ان میں ایک نام کعب بن مالک انصاری کا ہے۔حضرت کعب بن مالک بہت بڑے شاعر ہیں۔ان کی شاعر کے خاص موضوعات میں نعت رسول، مرثیہ اور وصف نگاری ہے۔ان کے یہاں غزل بالکل نہیں ہے ان کے قصائد تشبیب سے خالی ہوتے ہیں۔دوسرے شاعر حضرت حسان ہیں جن کو شاعر الرسول اور شاعر النبي کا خطاب حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے خاص شاعر ہیں۔ان کا بنیادی کام کفار و مشرکین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہے گئے نازیبا الفاظ کا جواب ہے۔اس کے علاوہ نعت گوئی میں وہ بے مثال تھے۔بعض لوگ ان کو معلقات کے درجہ کا شاعر مانتے ہیں۔تیسری شخصیت حطیئہ کی ہے۔یہ مخضرمی شعرا میں اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے منفرد ہیں۔اصلاً یہ ہجوگوئی کے شاعر تھے اور انھوں نے زیادہ ہجو و مذمت ہی لکھی ہیں۔ان کے قصائد میں حضرت عمرؓ کی تعریف میں کہا ہوا قصیدہ زیادہ مقبول ہے۔حطیئہ کی عشقیہ شاعری بھی عربی زبان کی بہترین شاعری مانی جاتی ہے۔چوتھی شخصیت حضرت خنساء کی ہے۔یہ بڑی جلیل القدر صحابیہ ہیں اور مخضرمی عہد کی سب سے بڑی شاعرہ ہیں۔ان کا کلام بنیادی طور پر مراثی پر مشتمل ہے۔انھوں نے اپنے دو بھائیوں کی یاد میں متعدد مرثیے کہے ہیں جو اپنی اثر آفرینی اور درد و غم کی مختلف کیفیات کی تصویر کشی میں بے مثال ہیں۔حضرت خنساء نے نعت بھی لکھی ہیں۔تذکروں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت خنساء سے شعر سنا کرتے تھے۔ پانچویں شخصیت نابغہ جعدی کی ہے۔یہ بھی مخضرمی عہد کے بڑے شاعر تھے۔ان کے موضوعات بالعموم وہی ہیں جو اس دور کے دیگر عرب شعرا کے موضوعات تھے۔بہترین شاعر تھے، اور ان کو گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے میں خصوصی مہارت تھی۔عربی شاعری میں ان کی بعض اولیات بھی ہیں۔

7.5 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ مخضرمی لفظ سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

۲۔ حضرت کعب بن مالک کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

۳۔ حضرت حسان بن ثابت کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

۴۔ حطیئہ کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

۵۔ حضرت خنساء کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

۶۔ حضرت نابغہ جعدی کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

7.6 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔ الجامع فی تاریخ الأدب العربي — حنا فاخوری

۲۔ تاریخ الأدب العربي (جلد دوم) — ڈاکٹر شوقی ضیف

۳۔ تاریخ الأدب العربي (جلد اول) — عمر فروخ

۴۔ تاریخ الأدب العربي — احمد حسن زیات

۵۔ عربی ادب کی تاریخ (جلد دوم) — عبدالحلیم ندوی

اکائی 8 الخطابة في العهد الإسلامي (عہد اسلامی میں خطابت)

اکائی کے اجزا:

8.1 مقصد

8.2 تمہید

8.3 خطابت کا تعارف

8.4 عصر اسلامی کے بڑے خطبا

8.4.1 حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

8.4.2 حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

8.4.3 حضرت علی رضی اللہ عنہ

8.4.4 سحبان وائل

8.4.5 زیاد بن ابیہ

8.4.6 حجاج بن یوسف ثقفی

8.4.7 شیخ حسن بصری

8.5 اکتسابی نتائج

8.6 فرہنگ

8.7 نمونے کے امتحانی سوالات

8.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

8.1 مقصد

اس اکائی سے آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ عصر اسلامی کی خطابت میں مقصد، اسلوب، مضامین اور تاثیر کے لحاظ سے کیا فرق آیا اور اس زمانہ میں بڑے بڑے خطبا کون کون تھے اور ان کی خصوصیات کیا تھیں، عربی ادب میں انھوں نے کیا اثرات ڈالے اور اس کو کس طرح متاثر کیا۔

8.2 تمہید

خطابت کلام کا لازمی جزو ہے اور عربی زبان میں تو اس کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ عصر اسلامی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی بلاغت اور اس کے سحر نے ایک زمانہ کو متاثر کیا۔ قرآن پاک کا اسلوب بھی خطابی ہے۔ قرآن و حدیث یہ دونوں عربی زبان کے ایسے لازوال نمونے ہیں جن پر کبھی اضمحلال طاری نہ ہوگا، نہ ان کی تاثیر میں کمی آئے گی۔ ان دونوں کے زبردست اثرات عربی زبان پر پڑے۔ قرآن و حدیث نے مضامین کے اعلیٰ اور لازوال خزانے عربی کی جھولی میں ڈال دیے۔ ان دونوں نے اس کو اتنی حکمتیں، وسعتیں، برکتیں، مضامین کی گہرائیاں، معانی کی پہنائیاں عطا کیں کہ جن سے عربی زبان ثروت مند اور بے نظیر بن گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ و تابعین نے اس فن کو آگے بڑھایا اور حسن بصری، سحبان وائل اور حجاج بن یوسف کی خطابت میں یہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ ان سب کی تفصیلات آنے والے صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گی۔

8.3 خطابت کا تعارف

استاذ احمد حسن زیات فن خطابت کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاعری کی طرح فن خطابت کا تانا بانا بھی خیالات و افکار اور فصاحت و بلاغت ہیں۔ یہ آزادی و شجاعت، ہمت و اولوالعزمی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا، دلائل سے (مخالف کو) خاموش کرنے اور اہم کاموں پر ابھارنے اور اکسانے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے۔ اس فن کے لیے چرب زبانی، خوش بیانی اور برجستہ گوئی لازمی شرائط ہیں۔'' (تاریخ ادب عربی، اردو، ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی، ص ۴۳، البلاغ پبلی کیشنز، 2015)

جاہلی زمانہ کے عربوں میں خطیب کی بڑی اہمیت تھی۔ اگر شاعر عرب کا دیوان تھے تو خطیب قبیلہ کا فخر۔ خطیب اپنی تقریر میں دل نشین اسلوب، سحر بیانی، سلیس و رواں الفاظ، صاف صاف باتیں، چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملے، مسجع و مقفیٰ عبارتیں، ضرب الامثال اور کہاوتیں استعمال کرتے۔ وہ مخاطب کو اپنا مضمون ذہن نشین کرنے کے لیے تقریروں میں اختصار مدنظر رکھتے۔ دستور یہ تھا کہ خطیب اونچی جگہ کھڑا ہوتا یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا، اثنائے تقریر ہاتھ ہلاتا، مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرتا اور ہاتھ میں عصا، نیزہ یا تلوار لے لیتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہاتھ میں عصا لے کر جمعہ و غیر جمعہ میں تقریر کرنا منقول ہوا ہے۔ ہر قبیلہ اپنے بچوں میں بچپن سے ہی خطابت کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ خطابت کی ضرورت اکثر باپ دادا کے حسب و نسب کے مفاخر بیان کرنے، دو قبیلوں کے باہمی تعلقات کی اصلاح، قبائل کے سرداروں اور اپنے شیوخ نیز حکمرانوں اور امرا کے مابین سفارت کاری جیسے مقاصد کے لیے پڑتی تھی۔ خطیب کے لیے بلند آواز، خوش بیان، دلیر اور بے باک ہونے کی صفات لازمی تھیں۔ جاہلی زمانہ کے عربوں میں بہت سارے خطیب ہوئے ہیں اور اسلام کے بعد اس فن کو اور ترقی

ہوئی۔خطابت کے فنون اور مضامین میں بلندی اور وسعت خیالی آ گئی۔ یہاں ہم عہد اسلامی کے اہم خطبا پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام خطیبوں کے سردار اور ان کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں ہی، حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے خطبے بھی تاریخ میں منقول ہوئے ہیں۔ وہ فوجوں کو جہاد پر روانہ کرتے وقت خطبے دیتے اور انھیں نصیحتیں کرتے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات کے خطبے بھی منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قادسیہ کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ ؓ کا، خالد بن ولیدؓ کا یرموک میں اور ایلہ کی جنگ میں عتبہ بن غزوانؓ کا خطبہ طبری نے نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے کہا:

"أما بعد، فإن الدنيا تولت حذاء مدبرة، وقد آذنت أهلها بصرم وإنما بقي منها حبابة كصبابة الإناء يحطبها صاحبها، ألا وإنكم منقولون منها إلى دار لا زوال لها، فانتقلوا امنها بخير ما يحضر كم۔"

اما بعد، دنیا بہت جلد چلی جانے والی ہے، اُس نے دنیا والوں سے رخصتی کی اجازت مانگ لی ہے۔ اب اس کے چلے جانے میں اتنی سی دیر باقی ہے جیسے پانی کے برتن میں ذرا سا پانی بچ جائے۔ آگاہ رہو کہ تم سب اِس دنیا سے اس دنیا کی طرف جاؤ گے جس کو زوال نہیں، اس لیے اچھا زادراہ لے کر اس دنیا کی طرف چلو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف مختلف موقعوں پر خود خطبے دیتے بلکہ ان کے سامنے فوجوں کے آگے مشاہیر عرب آ کر خطبے دیتے، جن میں بنوتمیم کے سردار احنف بن قیس نے متعدد خطبے ان کے سامنے دیے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی صحابہ کو کوفہ، بصرہ اور دوسرے شہروں میں دینی علوم کی ترویج اور اسلامی تربیت کے لیے بھیجا جن میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بار اہل کوفہ کو یوں خطاب کیا:

"إن أصدق الحديث كتاب الله، وأوثق العرى كلمة التقوى، وخير الملل ملة إبراهيم، وأحسن السنن سنة محمد صلى الله عليه وسلم وشر الأمور محدثاتها وخير الأمور عزائمها، ما قل وكفى خير مما كثر والهى، خير الغنى غنى النفس، الخمر جماع الآثام، اعظم الخطايا اللسان الكذوب، سباب المؤمن فسق وقتاله كفر وأكل لحمه معصية۔۔۔ مكتوب في ديوان المحسنين من عفا عفى عنه، السعيد من وعظ بغيره۔۔۔ أحسن الهدى هدي الأنبياء۔"

"سب سے بہتر بات اللہ کی کتاب ہے۔ تقویٰ سب سے مضبوط دستہ ہے، سب سے اچھا طریقہ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ سب سے بہترین سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ سب سے برے امور بدعات ہیں۔ سب سے بہتر بات وہ ہے جو پختہ ہو۔ جو کلام کم ہو اور کافی ہو جائے وہ اس زیادہ سے بہتر ہے جو غفلت میں ڈالے۔ بہترین غنا نفس کا غنا ہے۔ شراب بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے۔ سب سے بڑی گناہ کی بات جھوٹی زبان ہے۔ مومن کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کفر ہے، اس کی غیبت معصیت ہے۔ احسان کرنے والوں کے رجسٹر میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو معاف کرتا ہے اس کو معاف کر دیا جاتا ہے اور سب سے بہترین ہدایت انبیا کی ہدایت ہے۔"

خلافت راشدہ کے اخیر میں مشاجرات صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک گروپ عثمانی وامویوں کا بن جاتا ہے اور ایک گروپ شیعوں کا، ایک خوارج کا، یہ سب فرقے اپنے فکر وعقیدہ کے حق میں خطابت کے زور کو کام میں لاتے ہیں۔ خوارج کا مشہور خطیب قطری بن فجاءۃ ہے۔ حضرت امام علی رضی اللہ عنہ عربی زبان کے ایک اہم اور عظیم الشان خطیب ہیں، ان کی خطابت میں قرآنی اسلوب، منہج نبوی سے تاثر اور اعلیٰ

درجہ کی فصاحت و بلاغت منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ان کے خطبوں کا بڑا حصہ نہج البلاغہ میں جمع کیا گیا ہے، تاہم تاریخ ادب عربی کے محققین مثلاً ڈاکٹر شوقی ضیف اس کتاب کے بیشتر مشتملات کو غیر مستند اور گڑھا ہوا قرار دیتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ شریف رضی یا شریف مرتضی نے اختراع کر کے حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔(تاریخ الادب العربی، شوقی ضیف)

جہادی مہمات اور سیاسی اختلافات، تفسیر قرآن کے حلقوں اور سیاسی فضا سے الگ وعظ و ارشاد کی مجلسیں بھی سرگرم ہوتی ہیں اور ان میں سماک بن حرب اور حسن بصری جیسے زہاد اپنی فصاحت و بلاغت اور مذہبی خطابت کے ذریعہ لوگوں میں دینی شوق اور جذبہ پیدا کر دیتے ہیں۔ یوں ان مختلف اسباب کے تحت عصر اسلامی میں خطابت کا فن عروج کو پہنچتا ہے۔

8.4 عصر اسلامی کے بڑے خطبا

ذیل میں عصر اسلامی کے بڑے خطبا کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جس میں ایک ترتیب سے ان کا مختصر تذکرہ اور ان کی خطابت کے اہم خصائص کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اس فہرست میں اوّل نمبر پر بجا طور پر افصح العرب والعجم اور سید الخطبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتا ہے:

8.4.1 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے۔ آپ ﷺ بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ شیرخوارگی کا زمانہ بنوسعد میں گزارا، نوخیزی قریشی قبائل میں۔ خود آپ ﷺ نے اپنے متعلق افصح العرب ہونے کا دعویٰ کیا اور کبھی کسی عرب نے اس کی تردید نہیں کی۔ نہ آپ ﷺ کی زبان و بیان پر کبھی کوئی اعتراض کر سکا، حالانکہ مکہ کے لوگوں نے آپ ﷺ کو ساحر مجنون اور سب کچھ کہا۔ آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت میں آمد ہی آمد تھی۔ آپ ﷺ کی زبان قرآن سے مستعار و Inspired تھی، لہٰذا آپ ﷺ کی زبان مبارک بھی الہامی تھی کہ جس کی شہادت میں وما ینطق عن الھوی إن ھو الا وحی یوحی کہا گیا۔ آپ ﷺ کے طرز بیان میں کوئی جھول نہ تھا، نہ کبھی کوئی بھدا، غیر معیاری اور غیر موزوں لفظ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا۔ بچپن بنوسعد میں گزارنے اور نوجوان میں تجارتی اسفار کی وجہ سے عرب کی بولیاں آپ ﷺ کے علم میں تھیں۔ آپ ﷺ کے کلام کی جاحظ نے یوں تعریف کی ہے:

”وہ ایسا کلام تھا جس کے حروف کی تعداد کم، معانی کی مقدار زیادہ تھی، جو صنعت و آورد سے بالاتر اور تکلف سے منزہ ہوتا، اُس میں تفصیل کی جگہ تفصیل اور اجمال کی جگہ اجمال تھا۔ وہ بے قاعدہ، غریب و توحش کن الفاظ سے خالی نیز بازاری و عامیانہ الفاظ سے پاک وصاف تھا۔ سرمایۂ حکمت سے لبریز نیز غلطیوں و خامیوں سے محفوظ و مامون تھا۔ اس کو تائید غیبی اور حمایت ربانی حاصل تھی۔ الغرض لوگوں نے آپ ﷺ کے کلام سے زیادہ مفید، سچا، مناسب و موزوں، خوش اسلوب و خوش معنی، پراثر و دل نشیں، آسان و زود فہم اور اپنے مقصود و مطلوب کو کھول کر وضاحت سے بیان کرنے والا کوئی کلام نہیں سنا۔“ (البیان والتبیین، جلد دوم، ص ١٧)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنی بات کو تین مرتبہ دہراتے۔ خطابت میں بڑے پرشوکت الفاظ استعمال کرتے اور اسلوب خطابت میں زیر و بم ہوتا۔ اس اتار چڑھاؤ کی وجہ سے آپ ﷺ کے کلام میں بلا کی تاثیر پیدا ہو جاتی۔ آپ ﷺ جوامع الکلم استعمال کرتے، جس میں ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ایک لاکھ لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

أيها الناس إن ربكم واحد وإن أباكم واحد، كلكم لآدم وآدم من تراب، ان اكرمكم عند الله اتقاكم، إن الله عليم خبير، وليس لعربي على عجمي فضل إلا بالتقوى۔ (البیان والتبیین للجاحظ، طبع مطبعة لجنة التالیف والترجمه والنشر، ۳۳/۲)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل تیرہ سال مکہ میں رہے اور دین کی دعوت کے لیے آپ ﷺ نے خطابت کو حکمت اور موعظت کے ساتھ استعمال کیا۔ اس کے لیے آپ ﷺ کا سب سے بڑا وسیلہ اور سرچشمہ قوت قرآن پاک تھا، جس کی فصاحت و بلاغت اور اعجاز خطابت نے تمام عرب کو مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔ آپ ﷺ پوری قوت سے لوگوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرتے اور طرح طرح کے اسلوبوں سے ان کو توحید کی طرف بلاتے۔ ہجرت کے بعد آپ ﷺ کے خطبات کے مضامین میں اور وسعت آئی اور اب توحید رسالت و معاد کے اثبات کے علاوہ دینی احکام کی وضاحت بھی شامل ہوگئی۔ خاندانی مسائل، میراث، لین دین، زکوۃ وصدقات، پڑوسیوں سے تعلقات کے ساتھ مکارم اخلاق وغیرہ کی تعلیم، جیسا کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں: "بعثت لأتمم مکارم الأخلاق۔"

جمعہ کے خطبوں کے علاوہ عیدین میں بھی آپ ﷺ خطبے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ خاص خاص مواقع پر بھی حدیث وسیرت کی کتابوں میں آپ ﷺ کے خطبے منقول ہیں، جن میں بہت مشہور خطبہ وہ ہے جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد دیا تھا۔ ہوا یوں کہ آپ ﷺ نے مؤلفۃ القلوب کی مد میں اہل مکہ کو کچھ مال دیا تھا اور انصار کو چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بعض انصاریوں کو شکایت ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کو ایک خیمہ میں جمع کیا، پھر ایک مؤثر خطبہ دیا، جس سے انصار زار و قطار رونے لگے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کا سب سے مشہور خطبہ وہ ہے جو آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونتوب إليه، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله۔

أوصيكم عباد الله بتقوى الله وأحثكم على طاعته وأستفتح بالذي هو خير۔ أما بعد أيها الناس اسمعوا مني أبين لكم فإني لا أدري لعلي لا ألقاكم بعد عامي هذا في موقفي هذا۔

أيها الناس إن دمائكم وأعراضكم حرام عليكم إلى أن تلقوا ربكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا - ألا هل بلغت اللهم فاشهد، فمن كانت عنده أمانة فليؤدها إلى من ائتمنه عليها۔

وإن ربا الجاهلية موضوع ولكن لكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون وقضى الله أنه لا ربا۔ وإن أول ربا أبدا به ربا عمي العباس بن عبد المطلب۔ وإن دماء الجاهلية موضوعة، وإن أول نبدأ به دم عامر بن ربيعة بن الحارث بن عبد المطلب وإن مآثر الجاهلية موضوعة غير السدانة والسقاية، والعمد قود وشبه العمد ما قتل بالعصا والحجر وفيه مائة بعير، فمن زاد فهو من أهل الجاهلية۔

أيها الناس! إن الشيطان قد يئس أن يعبد في أرضكم هذه، ولكنه قد رضي أن يطاع فيما سوى ذلک مما تحقرون من أعمالكم فاحذروه على دينكم، أيها الناس إنما النسيء زيادة في الفكر يضل به الذين كفروا يحلونه عاما ويحرمونه عاماً ليوطئوا عدة ما حرم الله فيحلوا ما حرم الله ويحرموا ما أحل الله۔ وإن الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السماوات والأرض، وإن عدة

الشهور عند الله اثنا عشر شهرا في كتاب الله يوم خلق الله السماوات والأرض، منها أربعة حرم ثلاثة متواليات وواحد فرد: ذو القعدة و ذو الحجة والمحرم ورجب مضر الذي بين جمادى وشعبان - ألا هل بلغت اللهم فاشهد۔

أيها الناس إن لنسائكم عليكم حقاً ولكم عليهن حق۔ لكم أن لا يواطئن فرشكم غيركم، ولا يدخلن أحداً تكرهونه بيوتكم إلا بإذنكم ولا يأتين بفاحشة، فإن فعلن فإن الله قد أذن لكم أن تعضلوهن وتهجروهن في المضاجع وتضربوهن ضرباً غير مبرح، فإن انتهين وأطعنكم فعليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف، واستوصوا بالنساء خيراً فإنهن عندكم عوان لا يملكن لأنفسهن شيئاً، وإنكم إنما أخذتموهن بأمانة الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله فاتقوا الله في النساء واستوصوا بهن خيراً - ألا هل بلغت؟ اللهم فاشهد۔ فلا ترجعن بعدي كافراً يضرب بعضكم رقاب بعض، فإني قد تركت فيكم ما إن أخذتم به لن تضلوا بعده: كتاب الله وسنة نبيه، ألا هل بلغت۔۔۔ اللهم فاشهد۔

أيها الناس إن ربكم واحد وإن أباكم واحد كلكم لآدم وآدم من تراب أكرمكم عند الله اتقاكم، وليس لعربي على عجمي فضل إلا بالتقوى - ألا هل بلغت۔۔۔ اللهم فاشهد، قالوا نعم - قال فليبلغ الشاهد الغائب۔

ترجمہ:

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اس کی حمد کرتے اور اسی سے مدد و استغفار چاہتے ہیں اور اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ہم اپنے نفس کے شرور اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، جس کو اللہ ہدایت دے دے اُس کو کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ گمراہ کردے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اے اللہ کے بندو! میں تم سب کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اس کی اطاعت پر ابھارتا ہوں اور جو اچھا ہے اس کو طلب کرتا ہوں۔ امابعد، اے لوگو! میری بات سنو، میں تمھیں کھول کھول بیان کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ پر نہ مل سکوں۔

اے لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تم پر حرام ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملاقات کرو۔ ایسے ہی حرام ہیں جیسے تمہارا یہ آج کا دن محترم ہے، تمہارا یہ مہینہ محترم ہے، تمہارا یہ شہر محترم ہے۔ دیکھو کیا میں نے پہنچادیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ جس کسی کے پاس بھی کوئی امانت ہو تو اسے اس کے مالک کو لوٹادے۔ جاہلیت کے زمانہ کے سود سب کالعدم ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سود کو کالعدم کرتا ہوں اور جاہلیت کے خون معاف ہیں، میں سب سے پہلے عامر بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے خون کو معاف قرار دیتا ہوں۔ اور یقینا جاہلیت میں جو اچھے کام ہوتے تھے وہ بھی کالعدم ہیں، سوائے خانۂ کعبہ کی دیکھ بھال اور حاجیوں کو پانی پلانے کے۔ قتل عمد میں قصاص ہوگا، شبہ عمد وہ جو لکڑی پتھر مارنے سے مرجائے اور اس میں سو اونٹ ہیں، جو اس پر زیادہ کردے گا تو وہ اہل جاہلیت میں ہوگا۔''

''اے لوگو! شیطان اس سے تو مایوس ہوگیا ہے کہ تمہاری اس سرزمین میں اُس کی پوجا کی جائے، لیکن اس کے علاوہ تمہارے چھوٹے کاموں میں اپنی اطاعت کیے جانے پر وہ راضی ہوگیا ہے۔ سو اس سے اپنے دین کے معاملہ میں ہوشیار رہو۔ اے لوگو! بیشک نسیء کفر میں

بڑھائی گئی چیز ہے جس کے ذریعہ کافروں کو گمراہ کیا جاتا تھا کہ وہ ایک سال کو حلال کر لیتے اور ایک سال کو حرام کہ اس طرح اللہ کی حرام کی گئی گنتی کے مطابق ہو جائیں، یوں حرام کو حلال کرڈالیں۔ بلاشبہ آج زمانہ اپنی اصل حیثیت پر لوٹ آیا ہے، جس دن کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، لہٰذا اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ ہوگی، یہ اللہ کے قانون میں ہے جب اس نے آسمانوں وزمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔تین مہینے پہ بہ پے اور ایک اکیلا۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب جو جمادی (الثانی) اور شعبان کے درمیان پڑتا ہے۔ بتاؤ کیا میں نے پہنچادیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

اے لوگو! یقیناً تمہاری عورتوں کا تمہارے اوپر حق ہے اور تمہارے لیے ان پر حق ہے۔تمہارے لیے ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو غیروں سے نہ روندوائیں اور تمہارے گھر میں کسی ایسے شخص کو بلا اجازت داخل نہ کریں جسے تم پسند نہ کرتے ہو۔ اور کسی کھلی برائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اگر وہ کرتی ہیں تو اللہ نے تم کو اجازت دی ہے کہ ان کو بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کی ہلکی پھلکی پٹائی کردو۔ پس اگر وہ باز آجائیں اور تمہاری اطاعت کریں تو تمہارے اوپر ان کی روزی روٹی اور معروف کے مطابق کپڑے پہنانا ہے۔عورتیں تمہارے پاس گویا قیدی ہیں، وہ اپنے لیے کسی چیز کا حق نہیں رکھتیں۔ ان کو تم نے اللہ کی امانت کے بطور لیا ہے اور ان کی شرم گاہیں تم نے حلال کرلیں ہیں، اللہ کے کلمہ کے ذریعہ لہٰذا عورتوں کے بارے میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ان کے بارے میں میری خیر کی وصیت کو قبول کرو۔ کیا میں نے پہنچادیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ اے لوگو! تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔کسی مسلمان کے لیے اس کے مسلمان بھائی کے مال میں سے وہی حلال ہے جس سے وہ رضامند ہو۔توتم میرے بعد کفر اختیار نہ کرلینا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، میں تمہارے لیے کتاب اللہ اور رسول کی سنت چھوڑ کر جارہا ہوں جس کو اگر تم پکڑے رہوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ بتاؤ کیا میں نے پہنچادیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ بلاشبہ اللہ علیم وخبیر ہے۔کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری نہیں، سوائے تقویٰ کے ذریعہ، بتاؤ کیا میں نے پہنچادیا؟ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔لوگوں نے کہا: ہاں آپ ﷺ نے پہنچادیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو جو یہاں موجود ہے وہ غیر موجود کو پہنچادے۔''

8.4.2 حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

عہد اسلامی کے دوسرے بڑے خطیب خلیفہ ثانی حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔وہ مکہ کے تاجروں میں تھے اور اپنے قبیلہ کے اشراف میں گنے جاتے تھے اور قریش کے ان لوگوں میں سے ایک تھے جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا۔عرب میں ان کی دلیری، بے باکی اور اولوالعزمی کی شہرت تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ ابوجہل اور عمر دونوں میں سے کسی ایک کے دل کو اسلام کے لیے کھول دے اور اسلام کی تقویت کا سامان کردے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، جس کا قصہ مشہور ہے۔ اسلام لاکر سب سے پہلے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو لے کر کعبہ پہنچے، وہاں ببانگ دہل اپنے اسلام کا اعلان کیا، تبھی بارگاہِ نبوت سے انہیں فاروق کا خطاب ملا۔

اسلام میں حضرت ابوبکر کے بعد انہیں کا رتبہ ہے۔ وہ عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں اور ان کی ایک صاحب زادی حضرت سیدہ حفصہ امہات

المؤمنین میں سے ہیں۔ خلیفہ اوّل ابوبکر صدیق کے بعد انہیں کو دوسرا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ ان کے زمانہ میں ایران، شام، مصر وعراق کی فتوحات کی تکمیل ہوئی جس کی ابتدا عہد ابوبکر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے نہایت حکمت و تدبر اور غایت درجہ کی فراست وفقہی بصیرت کے ساتھ بارہ سال تک لاکھوں کلومیٹر کے رقبہ پر حکومت کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شعر فہمی کا ذوق عطا ہوا تھا۔ ان کی خطابت میں ہیبت و جلال اور شفقت و عدل کے عناصر جمع ہیں۔ ایک موعظت پر یہاں اکتفا کی جاتی ہے:

إن الله سبحانه وبحمده قد استوجب عليكم الشكر، واتخذ عليكم الحجيج فيما آتاكم من كرامة الآخرة والدنيا من غير مسألة منكم له، ولا رغبة منكم فيه إليه؛ فخلقكم تبارك وتعالیٰ ولم تكونوا شيئًا، لنفسه وعبادته، وكان قادرًا أن يجعلكم أدنى خلقه عليه؛ فجعل لكم عامة خلقه، ولم يجعلكم لشيء غيره، وسخر لكم ما في السموات وما في الأرض، وأسبغ عليكم نعمه ظاهرة وباطنة، وحملكم في البر والبحر، ورزقكم من الطيبات لعلكم تشكرون، ثم جعل لكم سمعًا وبصرًا، ومن نعم الله عليكم نعم عم بها بني آدم، ومنها نعم اختص بها أهل دينكم، ثم صارت تلك النعم خواصها وعوامها في دولتكم وزمانكم وطبقتكم، وليس من تلك النعم نعمة وصلت إلى امرء خاصة إلا لو قسم ما وصل إليه منها بين الناس كلهم أتعبهم شكرها، وفدحهم حقها إلا بعون الله مع الإيمان بالله ورسوله، فأنتم مستخلفون في الأرض، قاهرون لأهلها، قد نصر الله دينكم والله المحمود مع الفتوح العظام في كل بلد۔۔۔ فنسأل الله الذي لا إله هو الذي ابلانا هذا أن يرزقنا العمل بطاعته والمسارعة إلى مرضاته۔

ترجمہ:

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر شکر واجب کیا ہے، تمہارے خلاف دنیا وآخرت کی اس عزت کو دلیل بنادیا ہے جو اُس نے تم کو بلا مانگے عطا کردی ہے، جس سے تم بے رغبت بھی نہیں ہو۔ تم کچھ نہ تھے تو اللہ نے تم کو اپنے لیے اور اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور آسمانوں وزمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے لیے مسخر کردیا۔ تمہارے اوپر اپنی ظاہری و باطنی ہر نعمت تمام کردی۔ تمھیں بحر و بر میں اٹھایا۔ تمھیں طیبات سے رزق دیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔ پھر تمہارے لیے آنکھ اور کان بنائے۔ اللہ کی تم پر کچھ نعمتیں وہ ہیں جن میں سارے ہی بنی آدم شریک ہیں اور کچھ نعمتیں تمہارے دین والوں کے ساتھ خاص کردی ہیں۔ پھر یہ خاص و عام نعمتیں تمہاری مملکت، زمانہ اور طبقہ میں ہوگئی ہیں۔ ان میں سے کوئی نعمت بھی ایسی نہیں جو کسی ایک آدمی کے ساتھ خاص ہو اور وہ اُسے تمام انسانوں میں بانٹ دے کہ اُس کے شکر سے سب درماندہ رہ جائیں اور اللہ کی مدد کے بغیر اس کا حق ادا نہ کرسکیں۔ ایمان باللہ و بالرسول سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ تم کو اللہ نے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، تم زمین والوں کو مطیع بنانے والے ہو۔ اللہ نے تمہارے دین کی مدد کی۔ ہر شہر بڑی بڑی فتوحات عطا کی ہیں۔ تو ہم اللہ تعالیٰ سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے ہمیں یہ سب کچھ دیا دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو وہ اپنا اطاعت گزار اور اپنی مرضی کا پابند بنا دے۔“

8.4.3 حضرت علی رضی اللہ عنہ

فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کاشانۂ نبوت میں پرورش پائی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی بھی تھے، جن کی پرورش کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے لے لی تھی جب وہ ایک کمسن بچہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سابقون اوّلون میں سے

ہیں کہ وہ بچوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔حضرت علیؓ کو بوقت ہجرت آپ ﷺ کے بستر پر سونے کا شرف حاصل ہوا۔ بعد میں آپ ﷺ کے داماد بھی بنے۔ فیضانِ نبوت سے مستفید ہونے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ حکمت وموعظت کا خزانہ تھے اور فصاحت و بلاغت کی کان۔صحابہ کرام میں ان سے بڑھ کر کوئی فصیح وبلیغ، صائب الرائے اور حکیم نہ تھا۔ ان کے خطبے زیادہ تر البیان والتبیین، عیون الأخبار اور طبري میں نقل کیے گئے ہیں۔ جہاں تک نہج البلاغۃ کی بات ہے جو ان کے سیاسی خطبوں، مواعظ،تقریروں، بیانات اور اقوال کا مجموعہ ہے، جس کو ابن ابی الحدید نے ترتیب دیا تھا تو اس کے بارے میں ڈاکٹر شوقی ضیف کی رائے یہ ہے کہ اس کا بڑا حصہ غیر مستند اور گڑھا ہوا ہے، جس کو شریف رضی یا شریف مرتضی نے لکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا تھا۔نمونہ کے طور پر ایک خطبہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

"إن الجهاد باب من أبواب الجنة، فمن تركه رغبةً عنه ألبسه الله ثوب الذلّ وشمله البلاء، ولزمه الصغار، وسيم الخصف ومنع النصف۔ ألا وإني قد دعوتكم إلى قتال هؤلاء القوم ليلاً ونهاراً وسراً وإعلاناً وقلت لكم: اغزوهم قبل أن يغزوكم، فوالله ما غزى قوم قط في عقر دارهم إلا ذلوا، فتواكلتم وتخاذلتم، وثقل عليكم قولي، واتخذتموه ورائكم ظهريا، حتى شنت عليكم الغارات۔۔۔ فيا عجبا من جد هؤلاء القوم في باطلهم وفشلكم عن حقكم۔۔۔ حتى صرتم هدفاً يرمىٰ وفيئا ينتهب، يغار عليكم ولا تغيرون وتغزون ولا تغزون، قد ملأتم صدري غيظا، وجرعتموني الموت انفاساً وافسدتم علي رائي بالعصيان والخذلان۔"

ترجمہ:

یقینا جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، جو شخص جہاد کو بے رغبتی سے چھوڑ دے اللہ اس کو ذلت کا لباس پہنائے گا، اس پر بلائیں آئیں گی اور اسے چھوٹا بن کر رہنا ہوگا، اسے ذلت کا مزہ چکھنا ہوگا اور اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ یاد رکھو میں نے تم کو ان لوگوں سے قتل کے لیے دن رات، چپکے سے اور پکار پکار کر بلایا۔ میں نے تم سے کہا کہ اس سے پہلے کہ وہ تم پر حملہ کریں تم ان پر حملہ آور ہو، خدا کی قسم کسی قوم پر اس کے اپنے گھر میں حملہ نہیں کیا جاتا مگر وہ ذلیل ہوجاتی ہے۔تم نے ٹال مٹول کی، مجھے چھوڑ دیا، میری بات تم پر بھاری ہوگئی،تم نے میری باتوں کو پس پشت ڈال دیا، یہاں تک کہ تم پر حملے ہونے لگے۔ مجھے تعجب ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہیں، پھر بھی کوشش کر رہے ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی ناکام ہو۔۔۔نوبت بایں جا رسید کہ اب تم پر نشانہ لگایا جا رہا ہے،تم نے میرے سینے کو غصہ کی آگ سے بھر دیا ہے۔تم نے مجھے موت کے کڑوے گھونٹ پلائے ہیں اور میری نافرمانی اور سرکشی کرکے میری رائے کو کنفیوژ کر دیا ہے۔

8.4.4 سحبان وائل

سحبان بن زفر بن زیاد، بنو ربیعہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درباری تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی بڑی قدر افزائی کرتے تھے۔سحبان غیر سیاسی اور غیر جماعتی مقرر تھے۔ وہ نہایت برجستہ گو تھے،مگر ان کی خطابت کے موضوع وعظ ونصیحت تک محدود تھے۔ دوسرے ان کے خطبے بڑے طویل اور یک موضوعی ہوتے تھے جس کی وجہ سے راویانِ ادب نے ان کے خطبات کو محفوظ نہیں رکھا۔خلافت معاویہ ہی میں سنہ ۵۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔سحبان تقریر کرتے وقت اپنا عصا ضرور استعمال کرتے تھے۔ اُنھیں

اپنی خطابت پر ناز تھا اور حضرت معاویہ نے انھیں اخطب العرب قرار دیا تھا۔ وہ نہایت روانی سے ایک ہی موضوع پر تقریر کرتے چلے جاتے تھے۔ احمد حسن زیات نے اپنی کتاب تاریخ الأدب العربي میں ان کا ایک مختصر خطبہ نقل کیا ہے، جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

''لوگو! دنیا آخرت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور آخرت ہمیشہ رہنے کی جگہ۔ اے لوگو! اپنی گزرگاہ سے دائمی اقامت گاہ کے لیے سامان لے لو اور جس پر تمہارے بھید آشکارا ہیں اُس کے سامنے اپنے پردے چاک نہ کرو۔ اپنے جسموں کے نکلنے سے پہلے دنیا سے اپنے دلوں کو نکال لو، تم اس دنیا میں جیتے ہو لیکن دوسری جگہ رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ جب آدمی مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں ''کیا چھوڑا؟ اور فرشتے کہتے ہیں کیا لایا؟ لہٰذا کچھ اپنے لیے پیشگی روانہ کرو اور سب یہاں نہ چھوڑ جاؤ کہ وہ تمہارے لیے وبال نہ بن جائے۔''

8.4.5 زیاد بن ابیہ

زیادہ بن ابیہ اپنی خطابت، انتظامی صلاحیتوں، بیوروکریسی کے جوہر اور طلاقت لسانی میں ایک بے نظیر انسان تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کے والد عبد نامی غلام اور سمیہ نامی لونڈی تھی۔ جبکہ بعض روایات ان کا نسب حضرت ابوسفیان سے جوڑتی ہیں، اسی وجہ سے مؤرخوں میں وہ زیاد بن ابیہ کے نام سے معروف ہوئے۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے اُنہیں بڑے بڑے انتظامی و مالی عہدوں پر مامور بھی کیا، لیکن بہت زیادہ صلاحیتوں کی بنا پر عمرؓ نے اس خوف سے اسے معزول بھی کر دیا تھا کہ کہیں لوگ فتنہ ہی میں نہ پڑ جائیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے ایک بار ان کی تقریر سن کر کہا: ''سبحان اللہ، کیا کہنے ہیں اس نوجوان کے، اگر اس کا باپ قریش سے ہوتا تو سارے عرب کا قائد بن جاتا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں انھوں نے زیاد کو کوفہ و بصرہ دونوں جگہوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ انہوں نے دونوں جگہوں کا اچھا انتظام کیا، فضا کو سازگار بنایا، سیاسی استحکام پیدا کر دیا اور سرحدوں کو مضبوط کر دیا۔ جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ زندہ رہے زیاد ان کے وفادار رہے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہ جو پہلے سے ہی اپنے کیمپ میں لانے اور اپنا ہم نوا بنانے کے لیے کوشاں تھے، اپنے ارادہ میں کامیاب ہوئے اور زیاد نے اپنی خدمات ان کو دے دیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں کوفہ و بصرہ کا گورنر بنائے رکھا۔

نمونہ: زیاد بن ابیہ جتنی زیادہ لمبی تقریر کرتے ان کی تقریر کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان بڑھتا چلا جاتا تھا۔ امام شعبی نے بھی ان کی طول خطابت کی تعریف کی۔ ان کی تقریروں سے خطبہ بتراء یعنی بغیر حمد و ثنا کا خطبہ مشہور ہے۔

''اما بعد! جاہلیت خالص، اندھی گمراہی اور آگ میں لے جانے والی سرکشی جس میں تمہارے نادان اور دانش مند سب پڑے ہوئے ہیں، وہ چیزیں ہیں جن سے چھوٹے تباہ ہوجاتے ہیں اور بڑے بچ کر نہیں نکلتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کتاب اللہ کو نہیں پڑھا اور اللہ نے اطاعت شعار بندوں کے لیے جو اجر وثواب اور نافرمانوں کے لیے جو سخت عذاب ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں رکھا ہے، وہ نہیں سنا۔ تم میں سے ہر ایک کی آنکھ دنیا پر لگی ہوئی ہے۔ تمہارے کانوں میں خواہشات کی صدائیں گونج رہی ہیں اور تم فانی حیات کو ابدی زندگی پر ترجیح دے رہے ہو۔ تم یہ بھولے ہوئے ہو کہ تم نے کمزور پر ظلم روا رکھ کر دن دہاڑے کمزور لٹی ہوئی اور دکھیاری عورت کو بے یار و مددگار چھوڑ کر - حالانکہ دشمن کثیر اور متحد ہیں - اسلام میں ایک ایسی بری مثال قائم کی ہے جس کی نظیر تم سے پہلے کبھی نہیں مل سکتی۔ کیا تم میں روک تھام کرنے والے نہیں جو سرکشوں کو راتوں میں شب خون مارنے اور لوٹ مار کرنے سے روکیں؟ تم نے رشتے داری کا پاس رکھا اور دین کو چھوڑ دیا ہے۔ بغیر کسی معقول وجہ کے تم معذرتیں پیش کرتے ہو، خلاف شرع اعمال اپنے سامنے ہوتے دیکھ کر چشم پوشی کرتے ہو۔ ہر شخص اپنے نادان و مجرم سے اس طرح بے

توجہی برتتا ہے گویا اُسے نہ عاقبت کا خوف ہے نہ قیامت کی امید۔تم عقل والے نہیں،تم بے وقوفوں کی پیروی کرتے ہو۔تم نے ان کو ڈھیل دے کر اس قدر دلیر کر دیا ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے ہیں اور انھوں نے تمہاری آڑ لے کر بدمعاشی کے اڈے بنا لیے ہیں۔مجھ پر اس وقت تک کھانا پینا حرام ہے جب تک میں ان اڈوں کو منہدم نہ کر دوں یا جلا نہ ڈالوں (الخ)۔''

8.4.6 حجاج بن یوسف ثقفی

حجاج بن یوسف ثقفی ۴۱ھ میں پیدا ہوئے۔طائف میں تعلیم حاصل کی۔بچپن سے زیرک و ذہین تھے۔خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حجاج کی صلاحیتیں دیکھ کر اُنہیں اپنی فوج میں افسر مقرر کر دیا۔انہوں نے فوج میں نظم وضبط پیدا کیا۔حضرت عبداللہ بن زبیر سے لڑنے کے لیے بھی حجاج کو مکہ پر فوج کشی کے لیے بھیجا گیا۔اس مہم میں اُنہیں کامیابی ملی اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور حضرت ابن زبیر شہید ہو گئے۔مکہ میں زبیریوں کی حکومت ختم کرنے کے بعد حجاج کو عراق کا گورنر مقرر کیا گیا۔حجاج خلافت بنی امیہ کا بہت بڑا خدمت گار تھے اور اپنے آقاؤں کی وفاداری میں بہت سے علما،فقہا،تابعین (جو بنی امیہ کے مخالف تھے) کو قتل کروایا اور ہزاروں کو جیل میں ڈالا دیا۔ اُن کا ایک کارنامہ قرآن پاک پر نقطے لگوانا تھا اور دوسرا بڑا کارنامہ محمد بن قاسم کو سندھ فتح کرنے کے لیے بھیجنا تھا۔۹۵ھ میں بمقام واسط حجاج نے انتقال کیا۔

خطبہ کا نمونہ: حجاج بن یوسف کا مشہور خطبہ وہ ہے جب عراق کی امارت ملنے کے بعد وہ کوفہ پہنچے تھے۔اُنہوں نے سر پر عمامہ باندھ رکھا تھا اور چہرہ اس میں چھپا لیا تھا۔وہ گلے میں تلوار اور شانہ پر کمان لٹکا کر مسجد میں داخل ہوئے۔منبر پر چڑھ کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔فتنہ باز کوفیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ایک شخص عمیر بن ضابی نے اُنہیں پتھر مارنے کا ارادہ تک کر لیا۔تمام لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف اٹھتی دیکھ کر حجاج نے اپنے چہرے سے عمامہ ہٹایا اور یہ شعر پڑھا:

انا ابن الجلا طلاع الثنایا

متی اضع العمامة تعرفوني

''میں مشہور اور تجربہ کار شخص ہوں، جب اپنا عمامہ اتاردوں گا تو تم مجھے پہچان لوگے۔''اس کے بعد گرم اور دہکتی ہوئی تقریر کی جس نے اہل کوفہ کو سراسیمہ کر کے رکھ دیا۔انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:

''اے کوفیو! میں دیکھ رہا ہوں کہ سروں کی کھیتی پک کر تیار ہو گئی ہے اور اب اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔میں اُسے کاٹنے کے لیے آیا ہوں۔مجھے عماموں اور داڑھیوں میں خون لگا ہوا نظر آ رہا ہے۔

اے عراقیو! مجھے کسی چیز سے خوف زدہ نہیں کیا جاسکتا، نہ مجھ پر زور یا دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔میں بہت جانچ پڑتال کے بعد ہوشیار و لائق ثابت ہوا ہوں اور بڑے تجربہ کے بعد ڈھونڈ کر منتخب کیا گیا ہوں۔امیر المؤمنین نے اپنے ترکش کے تمام تیر نکالے، پھر ان کی لکڑیوں کو جانچا اور مجھے سب سے زیادہ تلخ اور مضبوط لکڑی کا تیر پا کر تمہارے اوپر مسلط کر دیا، کیونکہ تم فتنوں میں پیش پیش ہو اور گمراہیوں میں پڑے رہتے ہو۔ بخدا میں تمھیں اس طرح گٹھری میں باندھ دوں گا جس طرح ببول کی لکڑی کا گٹھا باندھا جاتا ہے اور اس طرح بے دردی سے ماروں گا جس طرح پرائے اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔تمہاری مثال ان بستی والوں کی ہے جن کو ہر جگہ سے امن واطمینان کے ساتھ رزق ملتا تھا،لیکن انھوں نے

خدا کے انعامات واحسانات کی قدر نہ کی تو اللہ نے ان کے اعمال کی سزا میں اُنھیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا۔

بخدا میں جو کچھ کہوں گا پورا کروں گا، جس کا ارادہ کرلوں گا اُسے پورا کر کے چھوڑوں گا اور جو کروں گا وہ ٹھیک اور مناسب کروں گا۔ امیر المؤمنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے وظیفے تم کو دے دوں اور تم کو تمہارے دشمنوں سے لڑائی کے لیے مہلب بن ابی صفرہ کی قیادت میں بھیج دوں۔ خدا کی قسم جس کو میں وظیفہ وصول کرنے کے تین دن بعد گھر میں بیٹھا پاؤں گا اُس کی گردن اڑا دوں گا۔"

8.4.7 خواجہ حسن بصری

اس زمانہ میں دینی وعظ ونصیحت اور زہد وورع پر ابھارنے والی خطابت بھی سامنے آئی۔ لوگوں نے درسِ قرآن دینا اور قصص ومواعظ کہنے شروع کیے۔ اس قسم کی خطابت میں سب سے اہم نام حسن بصری کا ہے۔ حسن بصری ۲۱ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد یسار تھے جو انصار کے مولی تھے اور ان کی ماں خیرۃ حضرت امّ سلمہ امّ المؤمنین کی مولاۃ تھیں۔ حسن اپنی والدہ کے ساتھ امہات المؤمنین کے پاس آیا جایا کرتے اور اس طرح نور نبوت سے کسب فیض کرتے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وہ جہاد پر بھی نکلے، پھر دس سال تک کسی خراسانی والی کے پاس منشی کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ واپس آکر بصرہ میں سکونت اختیار کرتے ہیں اور دینی درس وتدریس اور وعظ ونصیحت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ ۱۱۰ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔

حسن بصری بڑے زاہد واعظ اور اوّلین متکلمین میں شامل ہیں۔ ان کی واعظانہ خطابت کا مختصر نمونہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

"رحم اللہ أمرأ کسب طیباً، وانفق کسبا، وقدّم فضلاً، ووجه هذه الفضول حيث وجهها الله ووضعها حيث أمر الله، فان من كانت قبلكم كانوا يأخذون من الدنيا بلاغهم ويؤثرون بالفضل۔ ألا إن هذا الموت قد أخر بالدنيا ففضحها، فلا والله ما وجد ذو لب فيها فرحاً، فإياكم وهذه السبل المتفرقة التي جماعها الضلالة وميعادها النار، أدركت من صدر هذه الأمة قوماً كانوا اذا أجنهم الليل فقيام على أطرافهم يفترشون وجوههم، تجري دموعهم على خدودهم، يناجون مولاهم في فكاک رقابهم۔۔۔ یا ابن آدم إن كان لا يغنيک ما يكفيک فليس هاهنا منشيء يغنيک وإن كان يغنيک ما يكفيک فالقليل من الدنيا يغنيک۔"

"اللہ ایسے شخص پر رحم کرے جس نے حلال کمایا اور اپنی کمائی سے خرچ کیا اور فاضل مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور وہاں رکھ دیا جہاں اللہ نے رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ دنیا سے قدرے حصہ لیتے اور فاضل مال کو دوسروں کو صدقہ میں دے دیتے۔ آگاہ رہو کہ اس موت نے دنیا کو نقصان پہنچایا اور اس کو ذلیل ورسوا کر دیا۔ پس خدا کی قسم کسی عقل مند کو اس سے کبھی خوشی نہیں ملی، اس لیے ان تمام متفرق راستوں سے بچو جن کا سرمایہ ضلالت اور جن کا انجام آگ ہے۔ اس امت کے پہلے حصہ میں میں نے ان لوگوں کو پایا تھا کہ جب رات آجاتی تو وہ اپنے قدموں پر (نماز) کے لیے کھڑے ہوجاتے، ان کے چہرے زمین میں بچھ جاتے، ان کے آنسو رخساروں پر بہتے۔ وہ اپنے مولیٰ سے سرگوشیاں کرتے کہ ان کی گردنوں کو دنیا کی غلامی سے آزاد کر دے۔۔۔ اے ابن آدم! اگر وہ چیز جو تمھیں کفایت کرتی ہے تمھیں بے نیاز نہ کرے تو دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تمھیں بے نیاز کر دے اور اگر جو تمھیں کفایت کر جائے وہ تمہارے لیے کافی ہو جائے تو دنیا کا قلیل حصہ بھی تمھیں کافی ہو جائے گا۔"

8.5 اکتسابی نتائج

شاعری کی طرح فن خطابت کا تانا بانا بھی خیالات وافکار اور فصاحت و بلاغت ہیں۔ یہ آزادی وشجاعت، ہمت واولوالعزمی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے، دلائل سے (مخالف کو) خاموش کرنے اور اہم کاموں پر ابھارنے اور اکسانے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے۔

عرب میں خطابت اور خطیب کی بہت اہمیت تھی جس طرح شاعر قبیلہ کی ناک ہوتا تھا اسی طرح وہ خطیب پر بھی فخر کرتے تھے۔ خطیب اپنی تقریر میں دل نشیں اسلوب، سحر بیانی، سلیس و رواں الفاظ، صاف صاف باتیں، چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملے، مسجع ومقفیٰ عبارتیں، ضرب الامثال اور کہاوتیں استعمال کرتے تھے اور مخاطب کو اپنا مضمون ذہن نشین کرنے کے لیے تقریروں میں اختصار مدنظر رکھتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ خطیب اونچی جگہ کھڑا ہوتا یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا تھا، اثنائے تقریر ہاتھ ہلاتا تھا، مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرتا تھا اور ہاتھ میں عصا، نیزہ یا تلوار لے لیتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہاتھ میں عصا لے کر جمعہ میں تقریر کرنا منقول ہوا ہے۔

نبی ﷺ تو تمام خطیبوں کے سردار اور ان کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں آپ ﷺ کے خطبوں میں فتح مکہ کے بعد دیا گیا خطبہ اور خطبہ حجۃ الوداع حدیث وسیرت کی کتابوں میں روایت کیے گئے اور بڑے مؤثر ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے اللہ کے بندو! میں تم سب کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اس کی اطاعت پر ابھارتا ہوں اور جو اچھا ہے اس کو طلب کرتا ہوں۔ اما بعد، اے لوگو! میری بات سنو، میں تمھیں کھول کھول بیان کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ پر نہ مل سکوں۔

اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملاقات کرو۔ ایسے ہی حرام ہے جیسے تمہارا یہ آج کا دن محترم ہے، تمہارا یہ مہینہ محترم ہے، تمہارا یہ شہر محترم ہے۔ دیکھو کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ بلاشبہ اللہ علیم وخبیر ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری نہیں، سوائے تقویٰ کے ذریعہ، بتاؤ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ لوگوں نے کہا: ہاں آپ ﷺ نے پہنچا دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو جو یہاں موجود ہے وہ غیر موجود کو پہنچا دے۔''

اس کے علاوہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے خطبے بھی تاریخ میں منقول ہوئے ہیں۔ وہ فوجوں کو جہاد پر روانہ کرتے وقت خطبے دیتے تھے اور انھیں نصیحتیں کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات کے خطبے بھی منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قادسیہ کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ ؓ کا، خالد بن ولید ؓ کا یرموک میں اور ایلہ کی جنگ میں عتبہ بن غزوان ؓ کا خطبہ طبری نے نقل کیا ہے۔

خلافت راشدہ کے اخیر میں صحابہ کے مابین مشاجرات کا دور شروع ہوجاتا ہے جس میں اموی وعثمانی، علوی وخارجی خطبا اپنا زور خطابت دکھاتے ہیں۔ خوارج کا مشہور خطیب قطری بن فجاۃ ہے۔ حضرت امام علی رضی اللہ عنہ عربی زبان کے ایک اہم اور عظیم الشان خطیب ہیں، ان کی خطابت میں قرآنی اسلوب، منہج نبوی سے تاثر اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ان کے خطبوں کا بڑا حصہ نہج البلاغہ میں جمع کیا گیا ہے، تاہم تاریخ ادب عربی کے محققین مثلاً ڈاکٹر شوقی ضیف اس کتاب کے بیشتر مشتملات کو غیر مستند اور گڑھا ہوا قرار دیتے ہیں۔

دواموی گورنر زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف عربی زبان کے قدآور خطیب اسی دور میں ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ جہادی مہمات اور سیاسی اختلافات، تفسیر قرآن کے حلقوں اور سیاسی فضا سے الگ وعظ وارشاد کی مجلسیں بھی سرگرم ہوئی ہیں اور ان میں سحبان وائل، سماک بن حرب اور حسن بصری جیسے زہاد اپنی فصاحت و بلاغت اور مذہبی خطابت کے ذریعہ لوگوں میں دینی شوق اور جذبہ پیدا کردیتے تھے۔ یوں ان مختلف اسباب کے تحت عصر اسلامی میں خطابت کا فن عروج کو پہنچتا ہے۔

8.6 فرہنگ

پنہائیاں	:	گہرائیاں۔
مسجع	:	سجع سے آراستہ جملہ جس میں ہم آواز الفاظ لانے کا التزام کیا جاتا ہے۔
مقفی	:	قافیہ والا کلام: قافیہ نثر و نظم میں استعمال کی جانے والی ایک صنعت جس میں سُر یکساں ہوں۔
مفاخر	:	مفخرہ کی جمع: فخر بیان کرنا۔
اسواق عرب	:	زمانہ جاہلیت میں عرب کے وہ مشہور بازار جن میں شعروادب کی مجلسیں بھی جمتی تھیں۔
مشاجرات	:	جھگڑا، نزاع، خاص طور پر صحابہؓ کے درمیان ہوئی لڑائیوں اور سیاسی اختلافات کو کہا جاتا ہے۔
منحول	:	گھڑا ہوا، جعلی۔
افصح العرب	:	عرب کا سب سے فصیح آدمی۔
آورد	:	تکلف اور بناوٹ سے کوئی بات کہنا۔
توحش کن	:	ایسے الفاظ جن سے سننے والے کو وحشت ہو۔
زیروبم	:	اتار چڑھاؤ۔
مؤلفۃ القلوب	:	جن کے دلوں کو کچھ دے دلا کر رام کیا جاتا ہے۔زکوۃ کی ایک مد۔
کالعدم	:	ختم کردینا، لغو کردینا۔
قتل عمد	:	جان بوجھ کر قتل کر ڈالنا۔
قتل شبہ عمد	:	جان بوجھ کر تو قتل نہ کرنا مگر ایسے طریقہ سے مارنا جس سے آدمی کی جان جاسکتی ہو۔
نسئ	:	لوند، سال کے مہینوں کو آگے پیچھے کردینا جیسا کہ جاہلی زمانہ کے عربوں میں رواج تھا۔
اشراف	:	اشرف کی جمع، قبیلہ وقوم کے بڑے لوگ، معززین۔
تقویت	:	قوت پہنچانا۔
اخطب العرب	:	عرب کا سب سے بڑا خطیب۔
طلاقت لسانی	:	زبان کی روانی۔

زہدوورع	:	تقوی اور پرہیزگاری۔
مولاۃ	:	مولی کی مؤنث جس کوآزاد کردیا گیا ہو۔
اضمحلال	:	کمزوری۔
مشاہیر	:	مشہور کی جمع ،مشہور و معروف لوگ۔
بانگ دہل	:	اعلان کے ساتھ، کھلے عام۔
عشرہ مبشرہ	:	وہ دس صحابی جن کو جنت کی بشارت دنیا میں مل گئی تھی۔
سابقون اولون	:	سب سے آگے رہنے والے،سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے۔
منزہ	:	پاک وصاف۔

8.7 نمونہ کے امتحانی سوالات

ا۔ عصر اسلامی کی خطابت عہد جاہلی کی خطابت سے کس معنی میں ممتاز ہے؟

۲۔ عہد اسلامی میں خطابت کے معانی ومضامین میں کیا اضافہ ہوا؟ مختصر نوٹ لکھیں

۳۔ عہد اسلامی کے ممتاز خطبا کون کون ہیں، نام لکھیں اور بتائیں کہ کسی کی خطابت پر کون سا عنصر غالب تھا؟

۴۔ الخطبة البتراء کس خطیب کا ہے اور اس کو بتراء کیوں کہتے ہیں؟

۵۔ أری رؤسا قدأینعت وحان خطافها کس خطیب نے کہا تھا،کس سے کہا تھا اور کہاں کہا تھا؟ پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

٦۔ حضرت علیؓ کے خطبات کے مجموعہ کا کیا نام ہے اور اس پر اہل علم میں کیا اختلاف ہے؟

8.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

ا۔	تاریخ الأدب العربي المجلد الثانی، العصر الاسلامی	ڈاکٹر شوقی ضیف
۲۔	تاریخ الأدب العربي، اردو ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی	ڈاکٹر احمد حسن الزیات
۳۔	تاریخ الأدب العربي	ڈاکٹر عمر فروخ
۴۔	فجر الإسلام	ڈاکٹر احمد امین
۵۔	اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور مادہ حدیث	

اکائی 9 عصر اموی کے سیاسی و دینی حالات

اکائی کے اجزا

9.1 مقصد

9.2 تمہید

9.3 عصر اموی کے سیاسی حالات ایک تعارف

9.3.1 اموی خلافت کا پہلا مرحلہ: سفیانی خلفا کا دور

9.3.1.1 حضرت معاویہ کا دور خلافت

9.3.1.2 یزید بن معاویہ کا عہد خلافت

9.3.2 اموی خلافت کا دوسرا مرحلہ

9.3.2.1 مروان بن حکم کا دور خلافت (۶۴ھ تا ۶۵ھ)

9.3.2.2 عبدالملک بن مروان کا عہد خلافت (۶۵ھ تا ۸۶ھ)

9.3.2.3 ولید بن عبدالملک کا عہد خلافت (۸۶ھ تا ۹۶ھ)

9.3.2.4 سلمان بن عبدالملک کا عہد خلافت (۹۶ھ تا ۹۹ھ)

9.3.2.5 صالح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد خلافت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ)

9.3.2.6 ہشام بن عبدالملک کا عہد خلافت (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ)

9.3.3 سیاسی افراتفری اور اموی خلافت کا زوال

9.4 عصر اموی کے دینی حالات ایک تعارف

9.4.1 شیعوں کا ظہور

9.4.1.1 السبیئہ

9.4.1.2 الغرابیہ

9.4.1.3 زہدیہ

9.4.1.4 الامامیہ الاثنا عشریہ

9.4.1.5 الامامیہ الاسماعیلیہ

9.4.2 خوارج

9.4.3 معتزلہ

9.5 اکتسابی نتائج

9.6 فرہنگ

9.7 نمونے کے امتحانی سوالات

9.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

9.1 مقصد

اس اکائی کے ذریعہ آپ کو بنوامیہ کے عہد خلافت کے سیاسی اور دینی حالات کا اندازہ ہوگا اور یہ واضح ہوگا کہ کس طرح یہ پورا عہد سیاسی اتھل پتھل اور رسہ کشی کا شکار رہا اور کس طرح مختلف مذہبی جماعتیں اس عہد میں رونما ہوئیں اس اکائی کے ذریعہ واضح ہوجائے گا کہ بنو امیہ کے کن خلفا نے اموی خلافت کو سیاسی استحکام بخشا اور کن خلفا نے اسے نقصان پہنچایا اور کس خلیفہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور اسلامی ریاست میں کب کتنی توسیع واقع ہوئی۔

9.2 تمہید

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ان کی نرم سیاسی پالیسی کی وجہ سے فتنہ پرور عناصر کو شرانگیزی اور فتنہ پروری کا پورا موقع ملا جس کی وجہ سے آپؓ کی خلافت کے آخری ایام میں حالات اس قدر بے قابو ہوگئے کہ خود حضرت عثمانؓ بھی اس کا شکار ہوگئے اور شہید کر دیے گئے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد عالم اسلام کی سیاسی بساط دو خیموں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک طرف حضرت معاویہ تھے جن کا قبضہ شام پر تھا جو حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو بلا تاخیر کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور ان کی جماعت تھی جو ابھی اس مطالبہ کو نافذ کرنے کے لیے مہلت مانگ رہے تھے۔ دونوں خیموں میں اختلافات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ حضرت معاویہ نے حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی ضد پر قائم رہے اور دونوں خیموں میں جنگ کی صورتحال بن گئی۔ ان دونوں کے علاوہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی جماعت بھی تھی جن کا دبدبہ حجاز کے علاقے میں قائم تھا۔ حضرت علی کی وفات کے بعد حالات اور بھی زیادہ مضطرب ہوگئے کہ ایک طرف حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو دوسری طرف خوارج کی فتنہ انگیزیاں اپنے شباب پر پہنچ گئیں۔ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر جب ۴۱ھ میں بیعت لی گئی تب ان کے معاندین اور حریفوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک طرف شیعہ تھے تو دوسری طرف خوارج تھے۔ حجاز میں عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے حامی تھے تو وہیں جزیرۂ عرب کے مختلف علاقوں میں باغی جماعتیں بار بار بنوامیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہی تھیں۔ ان حالات میں اموی خلافت کا دور شروع ہوا، حالانکہ حضرت معاویہ اور ان کے جانشین یزید اور اس کے بعد عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید نے اموی خلافت کو اپنی حکمت عملی اور مستحکم سیاسی پالیسی کے ذریعہ تقویت بخشی لیکن فتنوں اور مخالفتوں کا بازار مستقل گرم رہا۔

اگر اس عہد کے دینی حالات کی بات کریں تو مختلف جماعتیں، جو دراصل سیاسی جماعتیں تھیں مگر ان کے خاص مذہبی عقائد بھی تھے، سامنے آئیں اور سب نے اپنے عقائد و افکار کی نشر و اشاعت اور ترویج کے لیے ہر طرح کے وسائل استعمال کیے۔ ان جماعتوں میں شیعہ، خوارج اور معتزلہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان میں سے ہر جماعت کے اپنے مخصوص افکار و عقائد تھے جن کا ذکر اس موضوع کے تحت آئے گا۔ اور ان میں سے ہر جماعت متعدد فرقوں میں منقسم تھی۔ ان جماعتوں اور ان کے فرقوں میں ہمیشہ رسہ کشی جاری رہتی تھی جن کے پیچھے اکثر سیاسی اسباب و محرکات کارفرما ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام بھی قابل ذکر ہے جن کا دور خلافت اپنے مذہبی رجحان اور دینی ماحول کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ عصر اموی کے یہ سبھی سیاسی اور دینی پہلو اس موضوع کے تحت آگے آنے والے صفحات

میں زیر بحث رہیں گے۔

9.3 عصر اموی کے سیاسی حالات ایک تعارف

اموی خلافت کا قیام ۱۷/رمضان ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت اور خلافت راشدہ کے خاتمہ کے ساتھ ہوا لیکن مؤرخین اس کی باقاعدہ شروعات اس وقت سے مانتے ہیں جب حضرت حسن بن علی نے ۲۵/ربیع الاول ۴۱ھ میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے حق میں اپنے حق خلافت سے دست برداری کا اعلان کیا۔ تقریباً اکیانوے سال تک یہ خلافت قائم رہی۔ اس کا اصل اختتام "معرکۃ الزاب" (Battle of the Zab) کی اس فیصلہ کن جنگ پر ہوا جو ۱۱/جمادی الاولیٰ ۱۳۲ھ میں واقع ہوئی۔ اکیانوے سال کے عرصے میں اموی خلافت پر جن چودہ خلفا نے حکومت کی ان کا تعلق بنو امیہ کے دو خاندانوں سے تھا یا یوں کہہ لیجیے کہ دو شاخوں سے تھا، ایک سفیانی شاخ اور دوسری مروانی شاخ۔

(۱) بنو امیہ کے سفیانی خلفا: اس شاخ سے تین خلیفہ تخت نشین ہوئے اور اس کی خلافت ۴۱ھ سے ۶۴ھ تک یعنی تقریباً ۲۴ سال تک قائم رہی۔

۱۔ معاویہ بن ابی سفیان	۴۱ھ - ۶۰ھ
۲۔ یزید بن معاویہ	۶۰ھ - ۶۴ھ
۳۔ معاویہ بن یزید (معاویۃ الثانی)	۶۴ھ

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ معاویہ بن یزید بن معاویہ یا معاویۃ الثانی کو خلیفۃ المسلمین بنایا گیا لیکن فرزندگان امت اسلامیہ کے درمیان یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی خلافت پر اتفاق نہیں تھا، لہٰذا حضرت عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تھی۔ دوسری بات یہ کہ معاویہ الثانی کی خلافت محض چند مہینوں پر مشتمل تھی جس کے بعد انہوں نے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا جس کے بعد ایک طرف حجاز وغیرہ میں حضرت زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تو دوسری طرف شام میں مروان بن الحکم کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

(۲) بنو امیہ کے مروانی خلفا: اس شاخ سے گیارہ خلفا نے زمام خلافت سنبھالی اور ۶۴ھ سے ۱۳۲ھ تک قائم رہی۔

۱۔ مروان بن الحکم	۶۴ھ - ۶۵ھ
۲۔ عبدالملک بن مروان	۶۵ھ - ۸۶ھ
۳۔ الولید بن عبدالملک	۸۶ھ - ۹۶ھ
۴۔ سلیمان بن عبدالملک	۹۶ھ - ۹۹ھ
۵۔ عمر بن عبدالعزیز بن مروان	۹۹ھ - ۱۰۱ھ
۶۔ یزید بن عبدالملک	۱۰۱ھ - ۱۰۵ھ
۷۔ ہشام بن عبدالملک	۱۰۵ھ - ۱۲۵ھ

۸۔ الولید بن یزید بن عبدالملک — سنہ ۱۲۵ - ۱۲۶ھ

۹۔ یزید بن الولید بن عبدالملک — سنہ ۱۲۶ - ۱۲۶ھ

۱۰۔ ابراہیم بن الولید بن عبدالملک — سنہ ۱۲۶ - ۱۲۷ھ

۱۱۔ مروان بن محمد بن مروان — سنہ ۱۲۷ - ۱۳۲ھ

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ سنہ ۶۴ سے سنہ ۷۳ تک کے عرصہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کو حجاز، یمن، عراق اور خراسان کے لوگوں نے خلیفۃ المسلمین تسلیم کیا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی معاویہ الثانی اور مروان بن حکم کو اگرچہ بنوامیہ اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے لیکن اس دور کے زیادہ تر فرزندان اسلام ان دونوں کی خلافت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یزید کی وفات کے بعد بنو یہ امیہ کا وجود خطرے میں پڑ چکا تھا، خلافت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں سے تقریباً نکل چکی تھی، اس وقت مروان بن حکم کی حکیمانہ مداخلت کے ذریعہ بنوامیہ کو دوبارہ سیاسی استحکام حاصل ہوا۔ امویوں اور زبیریوں کے علاوہ شیعہ اور خوارج جیسی سیاسی جماعتیں بھی موجود تھیں جن کا اس پورے عہد کی سیاسی رسہ کشی اور اتھل پتھل پر پورا اثر تھا بلکہ اس میں ان کا پورا ہاتھ تھا، مندرجہ ذیل فصول کے تحت ان کا ذکر بھی ضمنی طور پر آئے گا۔

9.3.1 اموی خلافت کا پہلا مرحلہ: سفیانی خلفا کا دور

9.3.1.1 حضرت معاویہ کا عہد خلافت

اموی خلافت کا باقاعدہ آغاز حضرت معاویہ کی تاج پوشی سے تب ہوا جب ۴۱ ھ میں ان کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کی گئی اور انھیں خلیفۃ المسلمین قرار دے دیا گیا، حالانکہ بہت سی مخالف سیاسی جماعتیں ایسی تھیں جنہوں نے انہیں بحیثیت خلیفۃ المسلمین ماننے سے انکار کر دیا تھا ان میں شیعہ، خوارج اور عبداللہ بن زبیر کے متبعین سرفہرست تھے۔

حضرت معاویہ کی پیدائش ہجرت سے اٹھارہ سال قبل ہوئی تھی، آپ اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ غزوہ احد اور غزوہ خندق وغیرہ میں مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اترے تھے۔ حضرت معاویہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن انہوں نے اپنے اسلام کو اپنے والد اور دیگر مشرکین مکہ سے مخفی رکھا یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد جب اللہ کے رسول مکہ تشریف لے گئے تب قریش کے دوسرے کئی سرداروں کی طرح حضرت معاویہ نے بھی اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ اللہ کے رسول کے ساتھ غزوۂ طائف اور غزوۂ حنین میں شرکت کی۔ بعد میں وہ مدینہ منتقل ہو گئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

حضرت معاویہ کی جنگی قیادت کا باقاعدہ آغاز خلافت راشدہ کے دور میں تب ہوا جب حضرت ابوبکر نے انھیں ایک فوج کا قائد بنا کر شام میں موجود فوج کی کمک کے طور پر بھیجا، جہاں آپ نے جنگ یرموک میں شرکت کی اور اپنے جوہر دکھائے۔ حضرت عمر کے دور میں قیساریہ کی جس جنگ میں رومیوں کے خلاف مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی وہ بھی حضرت معاویہ کی ہی قیادت میں لڑی گئی تھی۔ سنہ ۱۸ھ میں عمواس نامی طاعون کی وبا پھیلنے سے شام میں موجود کئی قائدین لقمۂ اجل بن گئے جس کے بعد حضرت عمر نے رفتہ رفتہ بلاد شام کے سبھی علاقے حضرت

معاویہ کے ماتحت کردیے۔ حضرت عثمان نے بھی خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد حضرت معاویہ کو شام کے والی کے طور پر قائم رکھا۔ حضرت علی نے جب خلافت کی کمان سنبھالی تو انہوں نے بہت سے والیوں کو ان کے منصب سے برطرف کر دیا۔ حضرت معاویہ شام کو رومیوں کے قبضے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے منصب پر جمے رہے اور بیعت کرنے میں ٹال مٹول کرتے رہے یہاں تک کہ خلیفہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگی صورت حال پیدا ہوگئی۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت حسن بن علی کے ہاتھ پر بیعت کی گئی لیکن انہوں نے دست بردار ہونا پسند کیا جس کے بعد ۴۱ھ میں حضرت معاویہ کے ہاتھ پر خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے مسلمانوں نے بیعت کی۔

حضرت معاویہ کی خلافت مسلمانوں کے لیے کئی ناحیوں سے ایک اچھی خلافت ثابت ہوئی، وہ اس طرح کہ ایک طرف کئی سالوں سے جاری آپسی خانہ جنگی کافی حد تک کم ہوگئی اور ریاست کا اندرونی سیاسی ماحول کافی حد تک پرامن اور پرسکون ہوگیا، جس کا سیدھا فائدہ یہ ہوا کہ فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور دشمن طاقتوں کو قابو میں کرنے میں کافی مدد ملی چنانچہ رومیوں پر مسلم فوجوں نے ایسا شکنجہ کسا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔

حضرت معاویہ نے امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنے کی سنجیدہ کوشش کی اور مخالفین کے خیموں کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اپنے حریفوں کے ساتھ بھی محبت سے پیش آئے چنانچہ حضرت حسن بن علی کے مطالبات کو پورا کیا، حضرت عبداللہ بن عباس کو امان دی اور قیس بن سعد جنھوں نے حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا ان کو نہ صرف معاف فرمایا بلکہ انہیں امان بھی دی، بالآخر ان سب نے حضرت معاویہ کی اطاعت وفرماں برداری کو قبول کیا، اسی طرح زیاد بن ابیہ بھی حضرت علی کے مقربین میں سے تھے جو ان کی طرف سے خراسان کے والی تھے۔ جب حضرت علی کی شہادت واقع ہوئی تو زیاد نے خراسان میں خود کو نظر بند کرنا پسند کیا، لیکن حضرت معاویہ نے ان کو بھی محبت کا پیغام بھیجا اور بالآخر انہوں نے حضرت معاویہ کی درخواست کو قبول کیا اور حاضر ہوئے اور حضرت معاویہ نے انہیں پھر سے والی بنا کر انعام واکرام سے نوازا۔ یہ تھی حضرت معاویہ کی سیاسی پالیسی جس کے تحت وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، دشمنانِ اسلام سے مقابلہ کرنا اور انہیں شکست دینا ان کا اصل مطمح نظر تھا، اس لیے انہوں نے آپسی مصلحت پسندی کو ترجیح دی اور اس کے لیے جو بھی کر سکتے تھے وہ کیا۔

اس دور میں موجود تقریباً سبھی جلیل القدر صحابہ کرام جیسے عبادہ بن صامت، ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو، شداد بن اوس وغیرہ حضرت امیر معاویہ کے ساتھ تھے اور ان کے قدم سے قدم ملا کر راہِ جہاد میں شریک ہوئے اور اپنی برکتوں سے دشمنوں کے بے شمار قلعے فتح کیے۔

بعض صحابہ ضرور ایسے تھے جو حضرت معاویہ کی ان سیاسی پالیسیوں سے اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی تعداد برائے نام تھی، البتہ خوارج کی ایک بڑی تعداد تھی جو اپنے موقف کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتے تھے اور موقع دیکھتے ہی بلوہ اور فساد پھیلانے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے ضرور خلیفہ کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی لیکن مجموعی طور پر خلیفہ کے حامیوں کے مقابلہ میں ان خوارج کی تعداد کم تھی اور سیاسی طور پر غیر مؤثر بھی۔ ان کے اصل مراکز کوفہ اور بصرہ کے شہر تھے، یہی وجہ ہے کہ خلیفہ یعنی حضرت معاویہ کی طرف سے ان دونوں شہروں پر متعین کردہ

والی نہایت سخت گیر ہوا کرتے تھے یا یوں کہیے کہ وہ اس قسم کے متمرد لوگوں کو قابو میں کرنے کے لیے سختی سے پیش آنے پر مجبور تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت معاویہ کے دور میں ان کے خلاف جو سیاسی مورچہ قائم ہوا تھا اس کا اصل مرکز عراق کا علاقہ تھا تو شاید یہ بات غلط نہیں ہوگی۔

حضرت معاویہ کی کچھ سیاسی پالیسیاں مورخین کی تنقید کا نشانہ ضرور بنیں اور خاص طور سے جب انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تو اس کے خلاف کئی صحابہ نے بھی آواز اٹھائی۔ بہر حال امیر معاویہ سے بحیثیت ایک انسان جو بھی سیاسی وغیر سیاسی چوک یا خطا ہوئی اس سے قطع نظر ان کا عہد خلافت ایک مثالی عہد خلافت تھا جس میں ایک طرف اتحاد امت کی سعی وکوشش کی بہترین مثال بھی ملتی ہے تو وہیں فتوحات کی پیش قدمی اور مسلمانوں کی مجموعی خوشحالی بھی قابل ستائش اور نا قابل فراموش ہے۔

حضرت معاویہ کی خلافت کے دوران عالم اسلام بنیادی طور پر چھ ولایتوں یا حصوں میں تقسیم تھا:

(۱) شام: جس کے والی وہ خود تھے۔ یہ علاقہ شروع سے ہی خلیفہ کی حمایت میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔

(۲) کوفہ: یہ مخالفین کا مرکز تھا بطور خاص خوارج کا گڑھ تھا، یمامہ کا علاقہ اس کے ماتحت تھا۔

(۳) بصرہ: مشرق میں ہونے والی فتوحات پر یہیں سے نظر رکھی جاتی تھی، بلاد فارس، خراسان اور سجستان وغیرہ بصرہ کے ماتحت تھے، بعد میں عمان اور بحرین کو بھی اس کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔

(۴) خراسان: اکثر یہ بصرہ کے ماتحت رہا، اس کے امیر کا تعین بصرہ کے والی خود کیا کرتے تھے۔

(۵) مدینہ: یہاں پر صحابۂ کرام کی بڑی تعداد مقیم تھی۔

(۶) مصر: حضرت عمر کے زمانے میں مصر حضرت عمرو بن العاص کے ماتحت تھا، حضرت معاویہ کے عہد میں دوبارہ سے مصر کی ولایت ان کے سپرد کی گئی۔

حضرت معاویہ کے دور خلافت میں فتوحات کے سلسلے میں جو وسعت ہوئی وہ یقینا اس عہد کی ایک اہم خوبی ہے۔ مغرب ومشرق دونوں ہی طرف فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، مسلم فوجوں نے سلطنت روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سمندری طاقت میں اپنی جگہ بنائی۔

حضرت معاویہ نے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کرنے کی طرف خاص توجہ دی، شمال کی طرف اناضول میں طوروس کے پہاڑوں میں رومیوں سے مقابلے کے لیے حضرت معاویہ نے گرمی اور جاڑے کی الگ الگ فوجیں تیار کیں جو باری باری وہاں جا کر لڑا کرتی تھیں، حضرت معاویہ نے رومیوں کے مرکز قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے لیے کئی بار فوج بھیجی اگر چہ مسلم فوج کو اس میں فتح نصیب نہ ہوسکی۔

9.3.1.2 یزید بن معاویہ کا عہد خلافت

حضرت معاویہ نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا جن کی وفات کے بعد امت کے سواد اعظم نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، البتہ حجاز میں کچھ لوگوں نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا جن میں حسین بن علی، عبدالرحمن بن ابوبکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

یزید کی پیدائش ۲۳ھ میں حضرت عثمان کے دور خلافت میں ہوئی تھی، بچپن کھیل کود اور ناز ونعم میں گزرا، ۲۴ سال کی عمر میں حضرت معاویہ نے یزید کو فتح قسطنطنیہ کی مہم پر روانہ کیا۔ مذکورہ حضرات کو چھوڑ کر مفتوحہ اسلامی علاقوں کے تقریباً سبھی امرا وعوام نے یزید کی خلافت کو

تسلیم کرلیا تھا۔ یزید کی متواتر سعی وکوشش کے بعد عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس بھی بیعت لینے پر تیار ہو گئے لیکن عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین اس پر راضی نہ ہوئے اور ان دونوں نے مکہ میں پناہ لے لی۔

سیاسی اعتبار سے یزید کا عہد خلافت بہت افراتفری اور اتھل پتھل کا دور رہا، جب حضرت حسین نے مکہ میں سکونت اختیار کی تب اہل کوفہ نے ان سے مراسلت کی اور ان کے نام خطوط بھیج کر انھیں کوفہ آنے کی دعوت دی اور انھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا، حضرت حسین نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا تا کہ وہ وہاں جا کر معاملہ کی حقیقت کا پتہ لگا سکیں، جب مسلم بن عقیل وہاں پہنچے تو کوفہ کے بارہ ہزار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور کوفہ کے عامل نعمان بن بشیر کو برطرف کر دیا اور کوفہ کو بصرہ کے عامل عبیداللہ بن زیاد کے تحت کر دیا گیا۔ مسلم بن عقیل نے حضرت حسین کو کوفہ کے لیے روانہ ہونے کا مشورہ دیا، لیکن کچھ دنوں بعد ہی اہل کوفہ نے مسلم بن عقیل کا ساتھ چھوڑ دیا اور بالآخر انھیں قتل کر دیا گیا۔ حضرت حسین کے کئی خیر خواہوں نے انھیں اپنا ارادہ بدلنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اپنے عزم پر قائم رہے اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ان کے کچھ متبعین بھی تھے جن کی تعداد تقریباً ۸۰ رتھی۔ جب حضرت حسین اپنے اس مختصر سے قافلہ کے ساتھ کربلا نامی مقام پر پہنچے تو کوفہ کے والی عبیداللہ بن زیاد نے ایک لشکر روانہ کیا اور حضرت حسین کا محاصرہ کرلیا، تب حضرت حسین نے کچھ شرطوں کے ساتھ ان سے امان مانگی، لیکن لشکر کے قائد نے ان کی سبھی شرطوں کو ٹھکرا دیا اور ان پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ جانبین میں سخت مقابلہ ہوا۔ بالآخر حضرت حسین نے جام شہادت نوش کیا اور ان کے اہل خانہ اور ان کے متبعین نے بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی جانوں کو ان کے اوپر قربان کر دیا۔ یہ واقعہ کربلا کے نام سے مشہور ہوا اور ۱۰ رمحرم ۶۱ ھ میں پیش آیا۔ اس دل سوز واقعہ سے پوری امت اسلامیہ غم والم سے کراہ اٹھی اور بطور خاص حجاز میں یزید کے خلاف غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس واقعہ کے بعد اہل مدینہ نے یزید کی بیعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ان پر شکنجہ کسنے کے لیے یزید نے ایک لشکر بھیجا جس نے مدینہ میں خوب قتل و غارت گری مچائی، پھر ان لوگوں نے مکہ کا رخ کیا اور تقریباً دو مہینے تک اس کا محاصرہ کیے رہے اور خانۂ کعبہ وغیرہ کو بھی کافی نقصان پہنچایا۔ اہل مکہ نے عبداللہ بن زبیر کی قیادت میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس درمیان یزید کی وفات ہوگئی اور اس کی فوج نے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔

9.3.2 اموی خلافت کا دوسرا مرحلہ: مروانی خلفا کا دور

9.3.2.1 مروان بن حکم کا دور خلافت (۶۴ھ تا ۶۵ھ)

۶۴ھ میں یزید کی وفات کے بعد خلافت کو لے کر ایک طرح کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ خلیفہ بنا، مگر وہ ایک متقی اور دیندار انسان تھا اور بنو ہاشم کے تئیں ہمدردی رکھتا تھا، اس لیے اس کی خلافت چالیس دن سے زیادہ نہ چل سکی۔ اس نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ بھی مقرر نہیں کیا، کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اب خلافت کے مسئلہ پر پوری امت دو خیموں میں بٹ گئی، ایک طرف عبداللہ بن زبیر تھے جنھیں اہل حجاز کی حمایت حاصل تھی چنانچہ یزید کی وفات کے بعد سب سے پہلے اہل حجاز نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی پھر عراق، ایران، مصر اور یمن کے مسلمانوں نے بھی ان کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلیا اور ان کے ہاتھ پر ۶۴ ھ میں بیعت کر لی۔ دوسری طرف اہل شام تھے جنھوں نے مروان بن الحکم کو اپنا خلیفہ تسلیم کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مروان کی خلافت صرف ایک سال ہی قائم رہی لیکن اسی دوران مروان نے شام کے ساتھ ساتھ مصر کو اموی خلافت کے زیر نگین کرلیا اور ڈگمگاتی ہوئی اموی خلافت کو بچا لیا۔ مروان نے اپنی وفات سے

پہلے اپنے بیٹے عبدالملک اور عبدالعزیز کو یکے بعد دیگرے خلیفہ بننے کی بیعت لوگوں سے لے لی۔ ۶۵ھ میں دمشق میں اس کی وفات ہوئی۔

9.3.2.2 عبدالملک بن مروان کا عہد خلافت (۶۵ھ تا ۸۶ھ)

عبدالملک بن مروان کی پیدائش ۲۶ھ میں مدینہ میں ہوئی تھی اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عبدالملک نے سب سے پہلے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے فتنوں کو فرو کرنے کی طرف توجہ دی اور حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ عبدالملک نے اس سخت کام کو اپنی حکمت عملی سے بخوبی انجام دیا۔ اسی وجہ سے ان کو اموی خلافت کے مؤسس ثانی کے لقب سے نوازا گیا تھا۔

بلاد شام اور مصر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد عبدالملک کے سامنے ایک طرف وہ علاقے تھے جو عبداللہ بن زبیر کے ماتحت تھے تو دوسری طرف شمالی افریقہ کی بربر قوم اور عراق میں خوارج اور شیعوں کے گروہ تھے جنھیں قابو میں کرنا تھا، وہیں مختار ثقفی جیسے کچھ باغی بھی تھے جو جنگی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔ مختار اور عبداللہ بن زبیر کی فوجوں میں زبردست مقابلہ ہوا جس میں مختار قتل کیا گیا۔ عبدالملک نے ایک لشکر جرار کوفہ روانہ کیا جس نے عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب بن زبیر اور باغیوں کی جماعت کو شکست دے کر کوفہ اور عراق کے دیگر علاقوں کو اموی خلافت کے زیر نگیں کر دیا، ساتھ ہی عبدالملک نے خوارج کو بھی زبردست ٹکر دے کر انہیں بھی زیر کر دیا۔

اب عبدالملک کے سامنے سب سے بڑے حریف کی شکل میں عبداللہ بن زبیر تھے جن کی خلافت حجاز میں اب بھی قائم تھی۔ ان کو زیر کرنے کے لیے عبدالملک نے اپنے کمانڈر حجاج بن یوسف کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا جس نے مکہ پر چڑھائی کر دی اور منجنیقوں سے حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا اور کعبہ شریف بھی اس میں محفوظ نہ رہ سکا۔ عبداللہ بن زبیر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، بالآخر ۷۳ھ میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔ عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے ساتھ ہی عبدالملک بن مروان کو سبھی بلاد اسلامیہ کا واحد خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔

عبدالملک نے حجاج کو انعام کے طور پر پورے عراق کا والی مقرر کر دیا جس کے بعد حجاج نے عراق میں جو بھی فتنے اور بغاوتیں تھیں انھیں فرو کر کے اموی خلافت کی بنیادوں کو اور مضبوط کر دیا۔ ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ حجاج بن یوسف کے ہی ایک کمانڈر عبدالرحمن بن اشعث نے بغاوت کر دی اور کوفہ و بصرہ پر قبضہ کر لیا، لیکن عبدالملک کی بھیجی ہوئی فوجی کمک کے ذریعہ حجاج نے ابن اشعث کو شکست دے کر دوبارہ عراق پر اپنا قبضہ بحال کیا اور ابن الأشعث قتل کر دیا گیا۔ بربر قوم کو بھی قابو میں کرنے میں کچھ وقت لگا اور سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا لیکن پہلی صدی ہجری کی آٹھویں اور نویں دہائی میں ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا اور علاقے میں امن و امان قائم ہو گیا۔

عبدالملک بن مروان کا عہد اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ اسی عہد میں اموی خلافت کو سیاسی استحکام نصیب ہوا اور اس کی بنیادیں اور مضبوط و پختہ ہو گئیں۔ یہ عہد کئی انتظامی اصلاحات کی وجہ سے بھی ممتاز ہے بطور خاص سرکاری کام کاج کے لیے عربی کو لازمی قرار دینا اور نئے سکوں کو چلوانا اور بیت المقدس میں قبۃ الصخرۃ کی تعمیر کرنا وغیرہ۔ عبدالملک نے ۸۶ھ میں اپنی وفات سے قبل بالترتیب اپنے بیٹے ولید اور سلیمان کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔

9.3.2.3 الولید بن عبدالملک کا عہد خلافت (۸۶ھ تا ۹۶ھ)

ولید نے اپنے والد کی وفات کے بعد ۸۶ھ میں خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ولید کا عہد خلافت اسلامی فتوحات اور امن و امان کا دور

کہلاتا ہے۔عبدالملک نے اپنے عہد میں چھوٹے بڑے تقریباً سبھی فتنوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔اس لیے ولید کو داخلی مسائل کا زیادہ سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس نے فتوحات پر پوری توجہ دی۔ ولید کے عہد خلافت میں بلاد اسلامیہ کی وسعتوں میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اس کی سرحدیں سندھ اور چین کی سرحدوں سے لے کر مغربی افریقہ اور جنوبی یورپ تک پھیل گئیں۔

ولید کے عہد میں مشرق کی جانب سندھ اور ترکستان کے وسیع وعریض علاقے فتح کیے گئے، کہ ایک طرف عراق کے والی حجاج بن یوسف کے قائد اور خراسان کے والی قتیبہ بن مسلم کی قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ترکستان، خوارزم اور سمرقند جیسے علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا، تو دوسری طرف حجاج کے ہی ایک دوسرے قائد محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی اور ۸۹ھ میں دیبل (حالیہ کراچی) کو فتح کرلیا اور کچھ ہی دنوں بعد سندھ کے راجہ داہر کو شکست دے کر وہاں بھی اسلامی پرچم نصب کر دیا ان فتوحات کے بعد سندھ اور ترکستان کے ان سبھی مفتوحہ علاقوں میں زیادہ تر لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

فتح اندلس:

ایک طرف جہاں قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم مشرق میں یکے بعد دیگرے مختلف علاقے فتح کرتے چلے جا رہے تھے، وہیں دوسری طرف مغرب کی جانب اموی لشکر کے قائد موسیٰ بن نصیر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے تھے۔موسی بن نصیر نے طارق بن زیاد کو جو طنجہ کے امیر تھے، بربر مسلمانوں پر مشتمل ایک لشکر کا قائد بنا کر فتح اندلس کے لیے روانہ کر دیا۔ طارق بن زیاد نے ۹۲ھ میں سبتہ نامی مقام سے سمندر کو پار کر کے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ طارق نے ان کشتیوں کو جلوا دیا تھا جن پر سوار ہو کر اس کی فوج نے سمندر پار کیا تھا تاکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ بھی نہ سکیں۔اندلس پہنچ کر جس پہاڑ پر اس کی فوج نے اپنا پڑاو ڈالا تھا وہ جبل طارق (Gibraltar) کے نام سے مشہور ہوا۔

اس موقع پر طارق بن زیاد نے اپنا وہ مشہور فصیح وبلیغ اور پر جوش خطبہ دیا تھا جو تاریخ اور ادب کی کتابوں میں مذکور ہے۔طارق بن زیاد کے بہادر سپہ سالاروں اور فوجیوں نے اسپین کے عیسائی بادشاہ لذریق (رودریک) کو زبردست ٹکر دی، سات دن تک گھمسان جنگ جاری رہی، آخرکار آٹھویں دن مسلمانوں نے یہ جنگ جیت لی۔رودریک میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور غرقاب ہو کر مر گیا، تاریخ میں یہ معرکہ ''معرکۂ شریش'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پھر طارق بن زیاد نے اسپین کے دارالسلطنت طلیطلہ کو فتح کیا اور پھر قرطبہ اور اشبیلیہ نامی شہروں کو فتح کرلیا۔اس طرح پانچ مہینوں سے بھی کم عرصے میں اندلس کی سرزمین پر مسلمانوں نے اپنی فتح کا پرچم نصب کر دیا۔

9.3.2.4 سلیمان بن عبدالملک کا عہد خلافت (۹۶ھ تا ۹۹ھ)

ولید بن عبدالملک کی وفات کے بعد ان کے بھائی سلیمان مسند خلافت پر ۹۶ھ میں بیٹھے۔سلیمان کے عہد خلافت کی شروعات ہی جس طرح کی سیاسی پالیسی کے ساتھ ہوئی وہ خلافت کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والی تھی، سلیمان نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی سب سے پہلے ان قائدین اور والیوں کو برطرف کر دیا جنھوں نے ولید کے عہد میں مشرق ومغرب میں وسیع وعریض علاقے فتح کیے تھے۔

سلیمان نے نہ صرف انہیں اپنے عہدوں سے برطرف کیا بلکہ انہیں سزائیں تک دیں۔ ان میں بطور خاص محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم،

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد قابل ذکر ہیں۔

سلیمان کے عہد کے اہم کارناموں میں فتح قسطنطنیہ کی وہ کوشش تھی جو کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہوتے صرف اس لیے رہ گئی کہ سلیمان جو خود مسلم لشکر کی مدد کے لیے زبردست کمک لے کر قسطنطنیہ کی طرف نکلا تھا، راستے میں سخت بیماری کا شکار ہو گیا اور مسلم لشکر کو جس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اسے ختم کر کے واپس آنا پڑا۔ سلیمان نے اپنے چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور ۹۹ھ میں وفات پائی۔

9.3.2.5 صالح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد خلافت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ)

عمر بن عبدالعزیز ایک متقی اور صالح انسان تھے، شریعت کا وسیع علم رکھتے تھے اور اپنے اعلیٰ اخلاق کے لیے لوگوں میں جانے جاتے تھے۔ مدینہ کے علما وفقہا سے انہوں نے شریعت کا علم حاصل کیا تھا، ادب اور دیگر علوم میں بھی اچھی دسترس حاصل تھی۔ سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے انہیں کو بنو امیہ کا سب سے بہترین خلیفہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ نہایت سادہ مزاج اور بہت انصاف پسند انسان تھے، جو والی رعایا پر ظلم کرتے تھے اور بدعنوانی کا شکار تھے وہ انہیں برطرف کر دیا کرتے تھے۔ امت مسلمہ میں اتحاد کی فضا قائم کرنے کی غرض سے وہ شیعوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے اور انصاف کا معاملہ کرنے کا حکم دیا۔ بنو امیہ کے پچھلے خلفا نے جو غیر ضروری ٹیکس لگا رکھے تھے ان کو ختم کیا، جن لوگوں کی زمینوں پر قبضے کر لیے گئے تھے انہیں ان کی زمینیں واپس لوٹائی گئیں، والیوں کو یہ حکم دیا گیا کہ کوئی سخت سزا خلیفہ سے مشورہ کیے بغیر نافذ نہ کی جائے۔ اس طرح سے اس عہد میں ظلم وستم کا خاتمہ ہوا اور امن وامان کو دور دورہ ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلافت کے داخلی امور کی طرف زیادہ توجہ دی اور ان کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی جس کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ اس عہد میں کچھ خاص آگے نہ بڑھ سکا۔ ۱۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

9.3.2.5 ہشام بن عبدالملک کا عہد خلافت (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک کی وصیت کے مطابق یزید بن عبدالملک خلافت پر بیٹھے۔ وہ ایک کمزور اور عیاش قسم کے انسان تھے، سیاسی اعتبار سے ناتجربہ کار اور ناعاقبت اندیش تھے، چنانچہ عمر بن عبدالعزیز اور دیگر سابق خلفا نے جس طرح سے خلافت کو سیاسی سطح پر مضبوط کیا تھا یزید بن عبدالملک کے دور میں اسے اتنا ہی نقصان لاحق ہوا۔ ان کا دور خلافت تقریباً چار سال تک قائم رہا۔ ان کے بعد ان کا بھائی ہشام بن عبدالملک خلیفہ بنایا گیا، ہشام نے اپنے بھائی اور سابق خلیفہ یزید کی نااہلی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی بھرپائی کرنے کی کوشش کی جو کچھ حد تک کامیاب بھی ثابت ہوئی۔ فتوحات کا سلسلہ بھی پھر سے شروع ہوا اور کئی رومی شہر فتح کیے گئے۔ وہیں دوسری طرف ترکوں نے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو اسد بن عبداللہ قسری کی قیادت میں ترکوں کو زیر کیا گیا اور سمرقند و بخاریٰ کو دوبارہ فتح کیا گیا، شمالی افریقہ میں بھی بربر قبائل نے علم بغاوت بلند کیا لیکن مسلم لشکر کی بہادری اور جانبازی کی وجہ سے اس بغاوت کو فرو کر دیا گیا اور قیروان اور طنجہ شہر پھر سے فتح کر لیے گئے۔ یہ فتوحات ہشام کی سیاسی حکمت عملی کا ہی نتیجہ تھیں۔

9.3.3 سیاسی افراتفری اور اموی خلافت کا زوال

ہشام بن عبدالملک کے بعد بہت تیزی کے ساتھ اموی خلافت روبہ زوال ہو گئی، سیاسی انتشار اور افراتفری ہر طرف عام ہو گئی۔ ہشام

بن عبدالملک کے بعد تقریباً سات سالوں میں چار خلیفہ مسند خلافت پر بیٹھے جو سب نا اہل اور غیر ذمہ دار ثابت ہوئے۔ ہشام کے بعد ان کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ بنا جو ایک نہایت لا پرواہ اور نا اہل قسم کے خلیفہ ثابت ہوئے۔ ایک سال تین ماہ خلافت کے عہدے پر قائم رہنے کے بعد اپنے ہی چچا زاد بھائی یزید بن ولید کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔ یزید بن ولید ایک نیک طینت انسان تھے لیکن صرف چھ ماہ بعد طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل بن گئے۔ ان کے بعد ان کا بھائی ابراہیم بن ولید خلیفہ بنے لیکن مروان بن محمد جو آذر بائیجان اور ارمینیا کا والی تھا اس نے ابراہیم کے خلاف بغاوت کر دی اور ابراہیم کو شکست دے کر مرکز خلافت پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم بھاگنے پر مجبور ہوئے اور بالآخر اپنی شکست تسلیم کر کے مروان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مروان نے ۱۲۷ھ میں خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ مروان کا پورا عہد مختلف بغاوتوں اور فتنوں کو فرو کرنے میں ہی نکل گیا۔ خود بنوامیہ کے کئی امراان کے خلاف اعلان بغاوت کر چکے تھے، ابھی مروان ان فتنوں سے نبٹنے کی کوشش میں ہی لگے ہوئے تھے اور پوری خلافت سیاسی انتشار اور افراتفری سے دوچار تھی کہ اسی دوران ابومسلم خراسانی کی قیادت میں عباسی خلافت کے قیام کی کوششیں تیز ہوگئیں۔ اموی خلافت کے خاتمے اور عباسی خلافت کے قیام کا بگل اب بج چکا تھا۔ مروان نے فوراً عباسیوں کے سردار ابراہیم کو گرفتار کر لیا، ابراہیم نے گرفتاری سے قبل اپنے بھائی ابوالعباس السفاح کو قیادت کی ذمہ داری سونپی۔ ابومسلم خراسانی اور اموی افواج کے درمیان مقابلہ جاری رہا جس میں خراسانی کو کامیابی ہاتھ لگی، آہستہ آہستہ کوفہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ خلیفہ مروان نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ عباسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عراق کا رخ کیا اور موصل سے تقریباً ۱۲۵ کلومیٹر کی دوری پر نہر زاب کے کنارے دونوں لشکروں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں اموی فوج کو شکست اور عباسیوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح اموی خلافت کا خاتمہ ہوا اور عباسی خلافت کے نام سے ایک نئی خلافت وجود میں آئی۔

9.4 عصر اموی کے دینی حالات ایک تعارف

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ مقرر ہوئے تب امت کو جو بڑے مسائل درپیش تھے ان میں ایک بڑا مسئلہ ارتداد کا تھا، یعنی بہت سے مسلمانوں نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر کو ان کے خلاف سخت کاروائی بھی کرنی پڑی تب کہیں جا کر یہ مسئلہ قابو میں آیا۔ عہد صدیقی کا دوسرا بڑا مسئلہ منافقین کی جماعت تھی جن میں عبداللہ بن سبا جیسے یہودی بھی شامل تھے۔ منافقین آپ ﷺ کی زندگی میں بھی ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچتے رہے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے انتشار اور بدامنی پیدا کرنے اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کو راہ راست سے بھٹکانے کے لیے اور بھی نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ ان لوگوں نے ہمیشہ دین کا سہارا لے کر ماحول کو خراب کرنے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ حضرت عثمان کی شہادت ہو یا حضرت علیؓ کی شہادت ہو یا واقعۂ کربلا ہو ان سب کے پیچھے انہیں منافقوں اور یہودیوں کا ہاتھ تھا۔

جب اموی خلافت قائم ہوئی اس وقت مسلمانوں کے درمیان دو مذہبی جماعتیں وجود میں آ چکی تھیں ایک شیعہ اور دوسری خوارج۔ حالانکہ ان کے قیام کا اصل سبب سیاسی تھا اور سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت ہی یہ جماعتیں وجود میں آئی تھیں لیکن ان دونوں کے اپنے اپنے مذہبی عقائد وافکار تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنی پالیسیاں اور اپنے منصوبے تیار کرتے تھے، یا یوں کہہ لیجیے کہ مذہب کی آڑ میں ہی یہ جماعتیں اپنے

سیاسی وغیر سیاسی مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھیں(بعد میں ہر جماعت سے بہت سے فرقے پیدا ہوگئے جن میں سے ہر ایک کے اپنے مخصوص عقائد وافکار تھے، کچھ تو تا دیر باقی رہے، جب کہ کچھ جلد ہی روبہ زوال ہوگئے)ان دو جماعتوں کے علاوہ اموی دور میں ایک اور جماعت مذہبی رنگ میں سامنے آئی اور وہ تھی معتزلہ کی جماعت ۔ان سبھی جماعتوں اور اس عہد سے جڑے کچھ دیگر مذہبی پہلوؤں پر اس موضوع کے تحت گفتگو کی جائے گی۔

9.4.1 شیعوں کا ظہور

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد جو مذہبی مکا تب فکر نمودار ہوئے ان میں سب سے قدیم شیعہ مکتب فکر ہے۔حضرت عثمان کی عہد خلافت میں ہی اس جماعت کا ظہور ہوگیا تھا، پھر حضرت علی کے عہد خلافت میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا اور ہزاروں لاکھوں فرزندگان اسلام اس جماعت سے منسلک ہوگئے ۔اس جماعت کے عقائد کی اصل بنیاد حضرت علی سے بے پناہ محبت اور لگاؤ تھا لیکن شروع سے ہی اس محبت وعقیدت پر غلو کا اس قدر غلبہ رہا کہ بہت سے شیعہ فرقے سبھی حدوں کو تجاوز کرتے ہوئے حضرت علی کو الوہیت تک کا درجہ دے بیٹھے۔

ان کے عقائد کی اصل بنیاد یہ تھی کہ امامت اور خلافت اسلام کا ایک اہم رکن ہے اس لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ نبی نے اپنا خلیفہ مقرر نہ کیا ہو چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی کو ہی اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا تھا، اس کے علاوہ شیعہ حضرت علی کو تمام دیگر صحابہ سے افضل مانتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس مکتب فکر کی شروعات حضرت علی کے تیئں حد سے زیادہ عقیدت واحترام سے ہوئی، حالانکہ حضرت علی نے خود اس طرح کے رجحانات کی کبھی تشجیع نہیں کی ۔ان ؓ کی وفات کے بعد ان کے متبعین نے ان کی اعلائے شان میں غلو سے کام لینا شروع کر دیا اور کچھ فرقے حد سے تجاوز بھی کرنے لگے ۔اس جماعت کی مقبولیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت معاویہ نے اپنے عہد میں ایک نیا طریقہ یہ شروع کیا کہ ہر خطبہ کے بعد حضرت علیؓ کو لعن طعن کیا جائے اس سے شیعوں کے جذبات مجروح ہوئے، کئی صحابہ نے حضرت معاویہ کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا لیکن وہ نہ مانے۔ یہ سلسلہ بعد کے خلفا کے عہد میں بھی جاری رہا یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس پر روک لگائی۔اس کے علاوہ بنوامیہ کے عہد میں حضرت حسین کی شہادت ہوئی اس سے بھی شیعوں کے تیئں لوگوں کی ہمدردی میں اضافہ ہوا۔ بنوامیہ کی ان زیادتیوں کی وجہ سے ان کے تیئں صحابہ اور دیگر بہت سے لوگوں میں ایک طرح کا غصہ پیدا ہوگیا اور شیعوں کے قدم آہستہ آہستہ مضبوط ہوتے چلے گئے۔ان کا اصل مرکز دراصل عراق تھا، ایک تو اس لیے کہ حضرت علی نے آخری ایام میں وہیں سکونت اختیار کی اور اس کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا چنانچہ اہل عراق نے حضرت علی کے فضل وکرم کو بہت قریب سے دیکھا، اس کے بعد اہل عراق نے کبھی بھی اخلاص کے ساتھ بنوامیہ کی تائید وحمایت نہیں کی جس کے پاداش میں انھیں بنوامیہ کے غیظ وغضب کا شکار بھی ہونا پڑا،کبھی عبیداللہ بن زیاد،کبھی زیاد بن ابیہ اور کبھی حجاج بن یوسف جیسے سخت گیر قسم کے قائدین ان پر مسلط کیے گئے، شاید اسی کا ردعمل تھا کہ عراق بنوامیہ کے آخری ایام میں شیعیت کے سب سے اہم مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔اموی دور میں جو سب سے اہم دینی تبدیلی واقع ہوئی وہ دراصل تشیع کا ظہور اور اس کا ارتقا تھا۔ اس عہد میں شیعیت میں کئی فرقے وجود میں آئے جن میں سے ہر فرقے کے اپنے عقائد تھے، ان میں کچھ اہم فرقوں کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے:

9.4.1.1 السبائیہ

یہ عبداللہ بن سبا کے متبعین کی جماعت ہے جو ایک یہودی تھا اور قبول اسلام کا دعوی کرتا تھا۔اس نے حضرت عثمان اور ان کی خلافت کے خلاف اس نے ایک مہم چھیڑ رکھی تھی، اس نے حضرت علی کو پہلے اللہ کے رسول کا وصی قرار دیا اور پھر انہیں کو خدا تک کا درجہ دے بیٹھا، حضرت علی کی وفات کو بھی وہ ان کی وفات تسلیم نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا ماننا تھا کہ انہیں آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا ہے جیسے حضرت عیسیٰ کو اٹھا لیا گیا تھا۔ان میں سے بعض کا یہ بھی ماننا ہے کہ اللہ کی ذات حضرت علیؓ اور باقی ائمہ کی ذات میں حلول کر گئی تھی (نعوذ باللہ من ذلک)۔

9.4.1.2 الغرابیہ

یہ بھی شیعوں کا ایک غالی فرقہ ہے جو عصر اموی میں ظاہر ہوا۔اس کے مطابق حضرت علیؓ ہی دراصل نبوت کے حقدار تھے اور جبرئیلؑ نے غلطی سے اللہ کے رسول ﷺ پر وحی نازل کر دی، کہ حضرت علیؓ آپ ﷺ سے بہت مشابہت رکھتے تھے ایسے ہی جیسے ایک کوا دوسرے کوے سے مشابہت رکھتا ہے۔کوے کو عربی میں غراب کہتے ہیں، اسی وجہ سے اس جماعت کا نام الغرابیہ پڑا۔اس قسم کے شیعی فرقے غالی فرقے کہلاتے ہیں۔ان کے علاوہ کچھ شیعی فرقے ایسے ہیں جو معتدل فرقے کہلاتے ہیں اور ان کے عقائد میں بہت زیادہ انحراف یا شدت نہیں پائی جاتی ان میں سے کچھ کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

9.4.1.3 زیدیہ

یہ اپنے عقائد کے اعتبار سے ایک اعتدال پسند شیعہ فرقہ ہے۔ان کے یہاں ائمہ کا درجہ نبی سے بڑھ کر یا نبی کے مساوی نہیں ہے بلکہ نبی کے بعد ہے۔انھوں نے غالی فرقوں کی طرح صحابہ کرام پر کفر کے فتوے نہیں لگائے۔اس فرقے کے امام زید بن علی زین العابدین تھے جو ایک متقی اور صالح انسان تھے، وہ ایک ذی علم انسان تھے۔اپنے دور کے علما سے انہوں نے استفادہ بھی کیا تھا۔امام زید بن علی نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کو بھی تسلیم کیا ہے۔

9.4.1.4 ال إمامیہ الاثنا عشریہ

ان کے مطابق ائمہ کی تعیین شریعت میں باقاعدہ طور پر کر دی گئی ہے، حضرت علی سے لے کر محمد بن حسن عسکری تک کل بارہ امام ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہی اس جماعت کو الامامیہ الاثنا عشریہ کہا جاتا ہے۔ان کے مطابق شرعی معاملات میں امام کی بات ہی حرف آخر ہوتی ہے۔

9.4.1.5 ال إمامیہ الاسماعیلیہ

یہ فرقہ دراصل شیعوں کی امامیہ جماعت کی ہی دوسری شاخ ہے۔شیعوں کی یہ جماعت ان کے ایک امام اسماعیل بن جعفر صادق کی طرف منسوب ہے۔اثنا عشریہ کے مطابق امام جعفر صادق کے بعد امامت ان کے بیٹے موسی کاظم کے حصے میں آئی جب کہ اسماعیلیہ کا ماننا ہے کہ امام جعفر صادق کے بعد امامت ان کے دوسرے صاحبزادے اسماعیل کے حصے میں آئی، ان کے مطابق امام جعفر نے از خود اپنی وفات سے قبل اس کی وصیت کر دی تھی، بعد کے ادوار میں شیعوں کے یہاں اور بھی دوسرے فرقے وجود میں آئے، جیسے الحاکمیہ اور النصیریہ وغیرہ۔

9.4.2 خوارج

خوارج کی جماعت نے چونکہ حضرت علیؓ کے حکم سے خروج کیا تھا یعنی اسے ماننے سے انکار کیا تھا اسی لیے انھیں خوارج کا نام دیا گیا۔ انھیں الحَر وریہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جو حَروراء نامی مقام کی طرف منسوب ہے جس کی طرف انہوں نے رخ کیا تھا، ان کو شراۃ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے وہ اس لیے کہ یہ لوگ آیت کریمہ ''وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ'' کے مطابق اپنے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نفوس کو اللہ کی راہ میں بیچ دیا ہے یا قربان کردیا ہے، اس لیے وہ شراۃ ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دین حق پر پوری ثبات قدمی سے قائم واحد دینی جماعت مانتے ہیں۔

یہ دراصل ایک سیاسی جماعت تھی لیکن اس کے بہت سے عقائد وافکار ایسے تھے جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی۔ فرقۂ خوارج کا ظہور بھی دراصل فرقۂ شیعہ کی طرح حضرت علی کے عہد خلافت میں ہوا۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان صفین کی جنگ میں زبردست مقابلہ ہوا اور حضرت معاویہ کی فوج شکست کے قریب تھی تبھی ان کے سپاہیوں نے مصحف اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیے اور یہ مطالبہ کرنے لگے کہ فیصلہ اب اس قرآن کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ حضرت علی چاہتے تھے کہ جنگ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ فتح وشکست کا آخری فیصلہ نہ ہوجائے۔ اسی بیچ ان کے حامیوں میں سے ایک جماعت نے ان کی مخالفت کی اور ان پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ اس مطالبہ کو قبول کرلیں اور حضرت علی کو نا چاہتے ہوئے بھی اس فیصلہ کو منظور کرنا پڑا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ایک ایک حَکَم دونوں طرف سے طے کیا جائے۔ خارجیوں کی اس جماعت نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو حکم بنانے کا مطالبہ کیا جب کہ حضرت علی عبداللہ بن عباس کو حکم بنانا چاہتے تھے، خوارج اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انہوں نے حضرت علی کی قیادت سے بغاوت کردی اور الٹا ان کے خلاف کھڑے ہوگئے اور ان سے یہ مطالبہ کرنے لگے کہ وہ تحکیم والے مسئلہ پر توبہ کریں کیوں کہ وہ فیصلہ کفر کے موافق تھا۔

یہ فرقہ ایک نہایت متشدد اور جذباتی قسم کا فرقہ تھا، اپنے مذہب اور موقف کے دفاع میں بہت سخت رویہ رکھتا تھا، شرعی معاملات و مسائل کو قرآن وحدیث کے ظاہری معنی ومفہوم کے اعتبار سے طے کرتا تھا، ''لا حکم إلا لله'' ان کا شعار تھا۔ ایک طرف تو انہوں نے حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں کو نشانہ بنایا تو دوسری طرف حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اور ان اموی خلفا سے بھی برأت کا اظہار کیا جنھیں وہ ظالم وجابر قرار دیتے تھے۔ ان کی جرأت وبے باکی کا یہ عالم تھا کہ وہ حضرت علی کو دوران خطبہ ٹوک دیتے تھے، بلکہ دوران نماز بھی ان کو ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے، حضرت علی اور حضرت عثمان کے متبعین کو مشرک اور کافر تک کہہ دیتے تھے۔ حضرت علی نے اپنے دور خلافت میں ان کی لگام کسنے کی کوشش کی تھی لیکن ان میں سے جو بچ گئے تھے انہوں نے اپنے عقائد وافکار کو لوگوں میں پھیلا کر اپنے مذہب کو مضبوطی دینے کی کوشش کی۔

خوارج کے حوالے سے ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ان میں سے اکثر کا تعلق عرب کے بدوؤں سے تھا جو ظہور اسلام کے وقت نہایت خستہ حال تھے اور علوم وفنون سے بالکل نا آشنا تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر موجود جاہلی عادات وصفات پوری طرح سے ختم نہ ہو سکی تھیں اور اس کا اثر ان کے افکار وعقائد میں بھی نظر آتا تھا مثلاً وہ اپنے ارادے کے بہت پکے ہوا کرتے تھے۔ اپنے عقائد وافکار کے تئیں بہت مخلص اور راسخ العقیدہ ہوتے تھے، اسی طرح بہت جری وبے باک اور نہایت بہادر ہوا کرتے تھے اور ان کے مزاج میں خشونت اور سختی تھی۔ ان کے عقائد وافکار میں سے کچھ کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) خلیفہ کا تعین ایک آزادانہ اور غیر جانب دارانہ انتخاب کے ذریعہ ہی ہونا چاہیے اور مسلمانوں کی اکثریت مل کر طے کرے کہ کس کو خلیفہ بننا چاہیے، نہ تو وہ اس بات کے قائل تھے کہ خلافت صرف قریش یا اہل بیت کا حق ہے اور نہ ہی اس بات کے کہ یہ صرف عربوں کا حق ہے عجمیوں کا نہیں۔

(۲) خوارج کے بنیادی عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ گناہوں کا مرتکب بھی کافر ہوگا۔ اپنے اس عقیدہ کو قرآنی آیات کی غلط تفسیر کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، مثلاً قرآنی آیت ہے کہ ''وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَیْہِ سَبِیلاً وَمَن کَفَرَ فَإِنَ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ۔''

(ترجمہ: لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے)

کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تارک حج کو کافر قرار دیا ہے، اس لیے مرتکبین گناہ کبیرہ بھی کافروں میں شمار کیے جائیں گے۔ اسی طرح ایک دوسری آیت قرآنی پیش کرتے ہیں ''وَمَن لَّمْ یَحْکُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰہُ فَأُوْلَـئِکَ ھُمُ الْکَافِرُونَ۔''

(ترجمہ: جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں) کہتے ہیں کہ گناہوں کا مرتکب اللہ کے حکم کے خلاف اپنی ذات کے لیے فیصلہ کرتا ہے لہٰذا وہ کافر قرار دیا گیا ہے۔

خوارج کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ نہایت فصیح وبلیغ ہوا کرتے تھے، خطابت میں بے انتہا ماہر ہوا کرتے تھے، تاریخ وادب کی کتابوں میں ان کی فصاحت و بلاغت کے نمونے بکثرت موجود ہیں، فصاحت و بلاغت کے علاوہ علوم شرعیہ پر بھی انہیں بہت دسترس حاصل تھی، قرآن وحدیث کا گہرا علم رکھتے تھے، فقہی مسائل پر بھی ان کی مضبوط پکڑ تھی، بحث ومباحثہ میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، بہت قوی الحجہ ہوا کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ بحث ومباحثہ کے دوران اگر اپنا پہلو کمزور لگتا تھا تو حدیثیں گڑھ کر انھیں اللہ کے رسول کی طرف منسوب بھی کر دیتے تھے، قرآن وحدیث کے ظاہری حکم کو مانتے تھے، قرآنی آیات اور احادیث رسول کے اصل معنی ومفہوم، اس کے سیاق و سباق اور اس کے اغراض ومقاصد کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ ہر مسئلہ میں ظاہر پر ہی حکم لگاتے تھے۔

خوارج کے کئی فرقے اموی دور میں ظاہر ہوئے۔ کچھ کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) الأزارقہ: یہ نافع بن ازرق کے متبعین تھے۔ خوارج کی اکثریت کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ عبداللہ بن زبیر اور بنوامیہ کا مقابلہ خوارج کی اسی جماعت سے سب سے پہلے ہوا تھا۔ نافع نے تقریباً نو سال تک اپنے ان حریفوں سے جنگ لڑی۔ ان کے بنیادی عقائد میں نمایاں یہ ہیں کہ یہ اپنے مخالفین کو غیر مسلم مانتے تھے بلکہ ان کے مطابق ان کا دائمی ٹھکانہ جہنم ہے اور ان سے قتال جائز ہے، یہ لوگ رجم کی سزا کو نہیں مانتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ زانی اور زانیہ کو صرف کوڑوں سے مارا جانا چاہیے، کیوں کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے اور ان کے نزدیک یہ حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے، ان کے مطابق انبیائے کرام کبائر وصغائر گناہوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

(۲) النجدات: یہ نجدہ بن عویمر کے متبعین ہیں۔ ان کے عقائد بھی ازارقہ سے ملتے جلتے ہیں، البتہ انہوں نے تقیہ کا نیا عقیدہ پیش کیا وہ یہ کہ ایک خارجی مصلحتاً اپنے عقیدے کو پردۂ خفا میں رکھے جب تک کہ اس کو ظاہر کرنے کا مناسب وقت نہ آجائے۔

(۳)صفریہ: یہ زیاد بن اصفر کے متبعین تھے۔ان کے اور ازارقہ کے عقائد میں معمولی سا فرق ہے۔

(۴)عجاردہ: یہ عبدالکریم بن عجرد کے متبعین تھے۔قضا وقدر کے مسائل میں ان کے کچھ خاص عقائد ہیں۔

(۵)الاباضیہ: یہ عبداللہ بن اباض کے متبعین تھے۔ یہ خوارج دوسرے فرقوں کے بمقابل اپنے عقائد میں زیادہ معتدل تھے، ان کے یہاں غلو اور تشدد نسبتاً کم پایا جاتا تھا، اسی لیے جہاں دوسرے خارجی فرقے آہستہ آہستہ رو بہ زوال ہو گئے، یہ فرقہ باقی رہا اور کئی بڑے علما اس جماعت میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے مسلم مخالفین کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں مانتے تھے اور ان کے قتل کو جائز نہیں ٹھہراتے تھے اور ان کی شہادت اور ان کے ساتھ مناکحت کو درست مانتے تھے۔

9.4.3 معتزلہ

معتزلہ کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں مؤرخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ اس جماعت کا سردار واصل بن عطا (وفات ۱۳۱ھ) تھا جو اس دور کے مشہور اہل منطق میں شمار کیا جاتا تھا اور حضرت حسن بصری کی مجلس میں ان کا درس سننے کے لیے بیٹھا کرتا تھا۔حضرت حسن بصری کی مجلس میں ایک بار گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں اختلاف واقع ہو گیا، اس مجلس میں موجود خوارج کے علما کی رائے تھی کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر قرار دیا جائے گا جب کہ علما کی ایک دوسری جماعت نے کہا کہ نہیں وہ مومن ہی قرار دیا جائے البتہ وہ اس گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے فاسق ہو جائے گا۔اس مجلس میں واصل بن عطا بھی موجود تھا اور اس نے ان دونوں جماعتوں سے مختلف اپنی یہ رائے پیش کی کہ مرتکب کبائر نہ تو کافر قرار دیا جائے گا اور نہ ہی مومن بلکہ وہ ان دونوں مرتبوں کے بیچ میں ایک تیسرے مرتبہ میں شمار کیا جائے گا۔اس کی اس مختلف رائے کی وجہ سے حضرت حسن بصری نے اسے اپنی مجلس سے باہر نکال دیا، چنانچہ واصل بن عطا نے اپنی الگ علمی مجلس قائم کر لی اور لوگوں کو اپنے عقائد و افکار بتانے لگا چونکہ عربی میں اعتزال کے معنی علیحدگی اختیار کرنے کے آتے ہیں اور واصل نے بھی حضرت حسن بصری سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اس لیے وہ اور اس کے متبعین معتزلہ کہلائے۔ واصل بن عطا کی پیدائش مدینہ میں ہوئی تھی اور نشو و نما بصرہ میں ہوئی تھی، اس کا شمار اس دور کے اہل علم میں ہوتا تھا، اس نے کئی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں "المنزلة بين المنزلتين"، "معانی القرآن" اور "طبقات اهل العلم" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معتزلہ دراصل وہ مذہبی جماعت ہے جس نے عقل کو اصول و ادلہ پر ترجیح دی، بطور خاص عصر عباسی میں اس جماعت کا کافی اثر دیکھنے کو ملتا ہے، بعض مؤرخین کے مطابق معتزلہ کی شروعات واصل بن عطا سے پہلے ہو چکی تھی، بلکہ بعض معتزلہ تو صحابہ و تابعین میں سے بھی بعض کو معتزلی العقیدہ قرار دیتے ہیں، معتزلہ کے بھی کئی فرقہ سامنے آئے۔

واصل بن عطا کے متبعین کو واصلیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ واصل کے علاوہ جو مشہور علما و ادبا اس جماعت سے منسلک رہے ان میں محمد بن ھذیل علاف، ابراہیم بن سیار نظام، عمرو بن بحر جاحظ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معتزلہ کے مطابق عقل کا درجہ قرآن وحدیث کے بعد نہیں آتا بلکہ اس سے پہلے آتا ہے، ان کا ماننا ہے کہ عقل کے ذریعہ ہی قرآن وحدیث کے اسرار و رموز کو سمجھنا ممکن ہے۔

اپنے اس عقیدے کی بنیاد پر انہوں نے بہت سی متواتر احادیث کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، عقائد کے باب میں ان کے کچھ خاص افکار وخیالات تھے جن میں سے بہت سے اہل سنت والجماعۃ کے عقائد سے متضاد تھے، مثال کے طور پر یہ کہ وہ اللہ کی ذات کے لیے صفات کا انکار کرتے ہیں، قرآن کو مخلوق مانتے ہیں، قیامت کے روز اللہ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس پوری بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پورا دور سیاسی افراتفری کا دور تھا۔ پہلے اموی خلیفہ حضرت معاویہ کی سیاسی پالیسی اموی خلافت کو مستحکم کرنے میں بہت اہم اور کارگر ثابت ہوئی، ان کے یہاں ہمیں اعتدال بھی نظر آتا ہے اور اتحاد و اتفاق اور امن و امان قائم کرنے کی سعی و کوشش بھی صاف دکھائی دیتی ہے، وہیں فتوحات کا سلسلہ بھی ان کے عہد میں کافی آگے بڑھا لیکن ان کے جانشین یزید کے یہاں ہمیں شدت اور سختی نظر آتی ہے، حضرت حسین تک کو بخشا نہیں جاتا ہے، لوگوں میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے خلافت بنو امیہ کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، اگر مروان بن حکم نے اپنی حکمت عملی سے حالات کو قابو میں نہ کیا ہوتا تو شاید یہ خلافت تبھی ختم ہو چکی ہوتی۔ عبدالملک بن مروان اور الولید بن عبدالملک کا عہد خلافت نسبتاً بہتر ثابت ہوا، فتنوں کو فرو کیا گیا اور رعایا کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دی گئی، خلافت کے آخری ایام میں جو خلیفہ آئے وہ نہایت نااہل اور غیر ذمہ دار ثابت ہوئے جس کی وجہ سے خلافت بہت کمزور ہوگئی اور بالآخر ۱۳۲ھ میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس دوران عبداللہ بن زبیر، شیعہ اور خوارج کے بھی اس عہد کے سیاسی منظرنامے پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے، لیکن بنو امیہ کی فوجی اور سیاسی طاقت کے سامنے یہ سیاسی جماعتیں ٹک نہ سکیں اور بالآخر یکے بعد دیگرے امویوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئیں۔

اگر اس عہد کے دینی حالات کی بات کریں تو جیسا کہ ہم نے اس اکائی کے تحت پڑھا کہ کئی مذہبی جماعتیں اس عہد میں رونما ہوئیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے عقائد و افکار کی ترویج و اشاعت کی۔ ان جماعتوں میں اختلافات کا عکس ہمیں اس دور کی خطابت اور خطوط نویسی میں بھی صاف نظر آتا ہے، اس عہد کی شاعری میں بھی ان اختلافات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ عہد اموی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور وہ بہترین دور تھا جو اپنے دینی رجحان کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

9.6 فرہنگ

السبئیۃ: عبداللہ بن سبأ کی طرف منسوب شیعوں کا ایک فرقہ۔

الغرابیۃ: شیعوں کا ایک غالی فرقہ جو عصر اموی میں رونما ہوا۔

الزیدیۃ: شیعوں کا ایک معتدل فرقہ جس کی نسبت امام زید بن علی زین العابدین کی طرف ہے

الأزارقۃ: خوارج کا ایک فرقہ جو نافع بن ازرق کے متبعین پر مشتمل تھا۔

المعتزلۃ: عصر اموی میں ظاہر ہونے والی ایک دینی جماعت جس کے اپنے مخصوص عقائد تھے، اس کی بنیاد واصل بن عطا

نے ڈالی تھی۔

المنزلۃ بین المنزلین: مرتکب کبائر کے سلسلے میں معتزلہ کا ایک خاص عقیدہ

9.7 نمونے کے امتحانی سوالات

(۱) اموی خلافت کا قیام کس طرح عمل میں آیا اس پر روشنی ڈالیے۔

(۲) بنوامیہ کی اپنے مخالفین کے تئیں کیا سیاسی پالیسی رہی اس کا جائزہ لیجیے۔

(۳) اموی دور کی مختلف سیاسی جماعتوں جیسے عبداللہ بن زبیر کی جماعت، شیعہ اور خوارج وغیرہ کی سیاسی سرگرمیوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

(۴) عصر اموی میں جن اہم دینی جماعتوں کا ظہور ہوا ان کا مختصر تعارف کرایے۔

(۵) عصر اموی کے دینی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالیے۔

9.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔ تاریخ الأدب العربی-العصر الإسلامي — شوقی ضیف

۲۔ التاریخ الإسلامي — محمود شاکر

۳۔ الملل والنحل — ابو الفتح محمد الشهرستاني

۴۔ تاریخ الدولة الأمویة — محمد سهیل طقوس

۵۔ في التاریخ الإسلامي — شوقی ابو خلیل

۶۔ تاریخ عربی ادب — ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

(https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3)

اکائی 10 عصر اموی میں عربی خطابت کا ارتقا، اس کی اہم خصوصیات اور اہم شخصیات

اکائی کے اجزا

10.1 مقصد

10.2 تمہید

10.3 اموی دور میں عربی خطابت کا ارتقا

10.3.1 سیاسی خطابت

10.3.1.1 خطبا خوارج

10.3.1.2 شیعہ خطبا

10.3.1.3 عبداللہ بن زبیر اور ان کی جماعت کے خطبا

10.3.1.4 خطبائے بنوامیہ

10.3.2 درباری تقریریں اور مختلف مناسبات کی خطابت

10.3.3 واعظانہ خطابت اور قصہ گو خطبا

10.4 اموی دور کے چند مشہور خطبا

10.4.1 زیاد بن ابیہ

10.4.2 طارق بن زیاد

10.4.3 حجاج بن یوسف

10.4.4 حسن بصری

10.5 اکتسابی نتائج

10.6 نمونے کے امتحانی سوالات

10.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

10.1 مقصد

عصر اموی چونکہ سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پر آشوب اور پرفتن دور تھا اور عربوں میں سیاسی رسہ کشی اپنی شباب پر تھی اس لیے اس عہد میں خطابت کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے کا بہت موقع ملا۔ اس اکائی کا اصل مقصد اموی دور میں خطابت کی اہمیت، اس کے ارتقا اور اس کی اہم شخصیات کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔

10.2 تمہید

عرب قوم کو زبان و بیان پر قدرت کے اعتبار سے شروع سے ہی ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ ظہور اسلام کے ساتھ ہی عربی خطابت ایک نئے انداز میں سامنے آئی اور ایک نئی سمت میں اس نے اپنا سفر شروع کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنھم نے دین حق کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کے لیے خطابت کا سہارا لیا بلکہ یہ اس دعوتی مشن کا سب سے اہم اور مؤثر وسیلہ ثابت ہوا۔ ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ تیرہ سال تک خطابت کے ذریعہ قریش اور دیگر عرب قبائل کو اسلام کی طرف بلاتے رہے۔ اللہ کے رسول ﷺ عربوں کے مشہور بازاروں اور میلوں میں جا کر لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کرتے اور انہیں راہِ حق کی طرف بلاتے، ان کی زندگی کا اصل مقصد اور خالق کائنات سے متعلق حقائق قرآنی آیات کی روشنی میں ان کے سامنے پیش کرتے۔ اس مہم میں خطابت ہی کا رول سب سے اہم ثابت ہوا۔ مدینہ ہجرت کے بعد خطابت کی اہمیت وضرورت میں مزید اضافہ ہوا۔ مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی، عملی طور پر ایک مسلم معاشرہ کا قیام عمل میں آیا، گوناگوں معاملات وواقعات سامنے آئے، ان سب کا حل رسول ﷺ اور ان کے اصحاب قرآنی تعلیمات کی روشنی میں نکالتے تھے اور خطابت کے ذریعہ لوگوں تک اپنی بات پہنچایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جمعہ، عیدین، حج وغیرہ کے موقع پر اس کی جو اہمیت وافادیت تھی وہ اپنی جگہ قائم تھی۔

عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں عربی خطابت کا ایک خاص انداز تھا، اس کی کچھ خوبیاں تھیں جن کے بارے میں آپ اسلامی دور کے تحت پڑھ چکے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے موقع پر اور آپ کی وفات کے بعد خطابت کا دائرہ اور وسیع ہوا اور قائدین وخلفا نے اپنے لشکر کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے پرجوش اور مؤثر خطبے دیے، خواہ وہ جنگ قادسیہ کے موقع پر مغیرہ بن شعبہ کا خطبہ ہو، یا جنگ یرموک کے موقع پر خالد بن ولید کا خطبہ ہو یا ابلہ کی فتح کے دن عتبہ بن غزوان کا خطبہ ہو۔ اس عہد کی خطابت بنیادی طور پر دو محوروں پر قائم تھی ایک دعوت دین اور دوسری جہاد کی ترغیب۔ اس دور کے آخری ایام میں خاص طور سے جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ کے موقع پر عربی خطابت میں ایک نیا رنگ یہ پیدا ہوا کہ مختلف سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے اوپر خطبوں کے ذریعہ حملہ کرنے لگیں، حضرت علی خود ایک ماہر خطیب تھے اور ان کی حامیوں میں خطیبوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، جب خوارج کی جماعت منظر عام پر آئی تو اس کے اور حضرت علی کے حامیوں کے درمیان جو بحث ومباحثہ شروع ہوا اس کی بنیاد بھی خطابت پر ہی تھی۔ اس دور کی خطابت میں جاہلی دور کی خطابت میں موجود سجع ہمیں بہت کم نظر آتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اسے ناپسند کرتے تھے۔ عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں جن عوامل ومحرکات کی بنیاد پر عربی خطابت کا فروغ شروع ہوا تھا عہد اموی کے آتے آتے ان عوامل ومحرکات میں اور بھی زیادہ شدت پیدا ہوگئی، جس کے نتیجہ میں

خطابت کو ترقی کرنے کے لیے زیادہ سازگار ماحول میسر ہوا۔

10.3 اموی دور میں عربی خطابت کا ارتقا

بنوامیہ کی خلافت جس ماحول میں قائم ہوئی وہ نہایت پر آشوب اور پرفتن ماحول تھا، کئی سیاسی جماعتیں آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں، ایک طرف تو بنوامیہ کے خلاف کئی جماعتیں میدان کارزار میں اتری ہوئی تھیں تو دوسری طرف مختلف سیاسی جماعتوں کی آپس میں خوب ٹھنی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ماحول کافی گرم تھا اور ایسے ماحول میں خطابت جیسے فن کا فروغ پانا ایک فطری بات تھی۔

ایک طرف بنوامیہ کے حامیوں میں زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف جیسے خطیب تھے جو خلافت پر بنوامیہ کے حق کو ثابت کرنے میں جٹے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کی قیادت کے لیے خلیفہ منتخب کیا ہے، تو دوسری طرف ان کے مقابلہ میں خوارج کے خطبا تھے اور خلافت کو تمام مسلمانوں کا حق بتاتے تھے اور یہ مانتے تھے کہ خلیفہ کا انتخاب زہد وتقویٰ کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ حسب ونسب کی بنیاد پر۔ وہیں تیسری طرف حضرت علی کے متبعین تھے جو بعد میں شیعہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خلافت دراصل ان کا حق شرعی ہے، وہیں حضرت زبیر اور ان کے متبعین بھی تھے جو خلافت کو قریش اور حجاز میں واپس لانے کے قائل تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میدان جنگ میں اترے ہوئے تھے۔ اس پورے جنگ وجدال میں تیر وتفنگ کے بعد ہر فریق اور ہر جماعت کا سب سے بڑا ہتھیار خطابت ہی تھا، اس کے ذریعہ وہ اپنے مخالفین کے اوپر حملے کر کے ان کے پرخچے اڑایا کرتے تھے اور اپنے مؤیدین کو سر بہ کفن دشمن سے ٹکرانے کے لیے للکارا کرتے تھے۔ یہ اموی دور میں خطابت کا سیاسی رنگ تھا جس نے اس دور میں سب سے زیادہ ترقی کی، اس کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی تھے جن پر اس دور میں خوب خطابت ہوئی، جن میں سے کچھ کا ہم یہاں جائزہ لیں گے۔

مشرق ومغرب میں جو اسلامی لشکر یکے بعد دیگرے معرکے سر کر رہے تھے اس میں ان کے قائدین کا بہت ہی اہم رول تھا اور جب بھی کسی معرکے کی تیاری شروع ہوتی تھی تو قائدین اپنے جنگجوؤں کے سامنے آ کر تقریریں کرتے اور ان کے اندر دل وجان سے لڑنے کا جوش و ولولہ پیدا کرتے۔ ان کی یہ تقریریں ان جنگوں کی فتوحات میں بہت مؤثر ثابت ہوتی تھیں۔

مختلف عرب قبائل کے مابین دور جاہلی میں جو تعصب تھا اور جو منافرت پائی جاتی تھی وہ عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں کافی حد تک کم ہو گئی تھی، لیکن اموی دور آتے آتے وہ قبائلی رنجشیں پھر سے جاگ اٹھیں اور قبائلی تعصب کی آگ پھر سے دلوں میں بھڑک اٹھی۔ اس میں بھی مخالفین نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے خطابت کا سہارا لیا، ایک طرف قیس اور تغلب ومختلف یمنی قبائل آمنے سامنے آ گئے تھے تو دوسری طرف بصرہ میں تمیم اور ازد کے درمیان ٹھن گئی، کچھ یہی حال خراسان وغیرہ میں موجود عرب قبائل کا تھا، ہر قبیلے کے خطیب دوسرے قبیلہ کے لوگوں پر اپنی تقریروں کے ذریعہ وار کرتے اور انھیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتے۔

وفود کی آمد کا جو سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں شروع ہو چکا تھا، مختلف قبائل اور علاقوں کے وفد آپ ﷺ کی خدمت میں آیا کرتے تھے اور ان کے خطبا آپ ﷺ سے دین اسلام کی بابت پوچھتے تھے یا اپنا جو بھی مدعا ہوتا تھا اسے سامنے رکھتے تھے۔ خلافت راشدہ کے دور میں یہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ فتوحات کی کثرت کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔ عصر اموی میں بھی ان وفود کی تعداد میں خاطر

خواہ اضافہ ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اب اسلامی ریاست کی حدیں بے انتہا وسیع ہو چکی تھیں اور اسی حساب سے مسائل کی بھی کثرت ہو گئی تھی، وہیں دوسری طرف خود خلفا اور امرا نے اس بات کو پسند کیا کہ لوگ ان سے ملیں اور بالمشافہہ اپنا مدعا ان کے سامنے پیش کریں۔ یہ وفد خلفا اور والیوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے سامنے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ وفود نئے خلیفہ کی تاج پوشی کے وقت اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے بھی آتے تھے اور اس کے سامنے اپنی پریشانیوں اور اپنے مسائل کو رکھ کر ان کا حل تلاش کرنے بھی۔ بعض دفعہ وفود تعزیت یا مبارک باد پیش کرنے کے لیے بھی خلفا اور امرا کے دربار پہنچتے تھے اور ہر وفد کے خطیبوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ پوری فصاحت و بلاغت اور پورے شد و مد کے ساتھ حاکم وقت کے سامنے اپنی بات کو پیش کرے اور اس کی تائید وحمایت سے ہمکنار ہو اس طرح کے سینکڑوں خطبے تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

خطابت کا جو دینی مقام ومرتبہ عصر رسول اور دور خلافت راشدہ میں تھا وہ یقینا اپنی جگہ قائم رہا بلکہ اس میں بھی بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی تھی، کیوں کہ جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور نئے نئے علاقے اسلامی ریاست میں شامل ہوتے رہے اسی حساب سے مساجد اور عیدگاہوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے مسجد قبا کے نام سے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور چالیس پچاس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد سندھ سے لے کر شمالی افریقہ کے آخری کنارے تک ہزاروں مسجدوں اور عیدگاہوں کا قیام عمل میں آچکا تھا جن میں باقاعدہ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس طرح عالم اسلام کے ہر کونے میں خطبا حضرات جمعہ اور عیدین کے موقع پر خطبے دیتے اور عوام الناس تک اسلام کی صحیح تعلیمات پہنچاتے۔ ویسے تو یہ خطبے خالص مذہبی نوعیت کے ہوا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ان میں خلفا اور امرا کے نام بھی داخل ہو جاتے تھے۔ جمعہ وعیدین کے خطبوں کے علاوہ مذہبی خطبوں کی ایک اور قسم تھی جو اس وقت کثرت سے رائج ہوئی اور وہ تھی وعظ ونصیحت اور دینی حلقوں میں دی جانے والی تقریروں کی قسم جس کے ذریعہ ائمہ اور واعظین لوگوں کے سامنے دینی تعلیمات کو پیش کرتے اور صحیح راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے۔ اس نوعیت کے خطبوں میں حسن بصری وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ادب اور تاریخ کے مصادر ومراجع میں اس دور کی خطابت کے نمونے ہمیں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ تاریخ طبری وغیرہ اس قسم کے مراجع کی بہترین مثال ہے۔

10.3.1 سیاسی خطابت

10.3.1.1 خطبائے خوارج

اس دور کی سیاسی خطابت میں خوارج کو دوسری سیاسی جماعتوں پر سبقت حاصل تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے عقائد وافکار کو لے کر سب سے زیادہ پرجوش اور جذباتی تھے اور کھل کر برملا اپنے مخالفین پر ہر طرح سے حملہ کرتے تھے، خطابت میں بھی انہوں نے اپنے مخالفین پر شدید حملے کیے اور انھیں خوب آڑے ہاتھوں لیا، حالانکہ ان کے زیادہ تر خطبے ہم تک نہ پہنچ سکے کیوں کہ ایک تو انہوں نے خود انہیں سپرد قلم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی وہیں ان کے مخالفین نے بھی ان کے خطبوں کو اکثر نظر انداز کیا لیکن جو خطبے بھی تاریخ و ادب کے حوالے سے ہم تک پہنچے ہیں ان میں بہت جوش وولولہ نظر آتا ہے۔ جاحظ کی البیان والتبیین میں ان کے بہت سے خطبے موجود ہیں۔ خوارج کے اس وقت

وجود میں آئے چاروں فرقوں، ازارقہ، نجدات، صفریہ اور اباضیہ میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے خطیب تھے جو ایک دوسرے کو ٹکر دیتے تھے۔ ازارقہ کے مشہور خطیبوں میں ان کا لیڈر نافع بن ازرق، زبیر بن علی اور قطری بن الفجاءۃ خاص طور سے قابل ذکر ہیں یہ اپنی تقریروں میں اپنے متبعین کو راہ حق میں جان کی بازی لگانے کی ترغیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کی تقریروں کا اسلوب مسجع و مقفی ہوا کرتا تھا۔

خوارج میں فرقہ ازارقہ اپنے عقائد و نظریات اور خیالات میں بڑا سخت اور کٹر تھا۔ یہ لوگ اللہ کے راستے میں جان دینے کے لیے اس طرح بے تاب رہتے تھے جس طرح پروانہ شمع پر نثار ہونے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اس دنیا کی زندگی ہیچ ہے، اصل زندگی جنت کی زندگی ہے اور اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ ان گمراہ لوگوں اور فرقوں سے جنگ کر کے راہ حق میں شہادت حاصل کی جائے، چنانچہ ان کے لیڈر زبیر بن علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ: "إن البلاءَ للمؤمنين تمحيصٌ و أجرٌ، وهو على الكافرين عقوبةٌ وخزيٌ، وثِقُوا بأنكم المستخلفونَ في الأرض"

(ترجمہ: مومن جب آزمائش اور مصیبت میں پڑتا ہے تو اس کے گناہ گھٹتے ہیں اور ثواب بڑھتا ہے اور کافر جب آزمائش اور مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی ذلت وخواری اور سزا بڑھتی ہے، یقین رکھو کہ تم ہی زمین پر خدا کے خلیفہ ہو اور انجام کار کامیابی متقیوں ہی کو نصیب ہوگی)

یہ لوگ دنیا اور متاع دنیا کو فریب، دھوکہ اور خواہشات نفسانی کا مرکز سمجھتے تھے، ان کے بقول دنیا سراسر ناکامی اور نقصان کا موجب ہے اور اس کے مقابلہ میں آخرت اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی حاصل زندگی ہے۔ زبیر بن علی کے بعد ان کے مشہور مقرر اور لیڈر قطری بن الفجاءۃ نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا: "أما بعد، فإني أحذركم الدنيا، فإنها حلوةٌ خَضِرَةٌ، حُفَّتْ بالشهوات، مع أن امرءاً لم يكن منها في حَبَرَة، إلا اعقبته بعدها عبرة۔۔۔۔ لا خيرَ في شيئٍ من زادها إلا التقوىٰ"

(ترجمہ: اے لوگو! میں تم کو دنیا سے خبردار کیے دیتا ہوں، اس لیے کہ یہ بڑی میٹھی اور ہری بھری ہے، مگر خواہشات نفسانی سے بھری ہوئی ہے، آدمی کو یہاں جب کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے تو اس کے بعد فوراً ہی کوئی نہ کوئی تکلیف دہ بات ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اس لیے یہاں کی کسی چیز میں سوائے تقویٰ کے کوئی بھلائی یا خیر نہیں)

خوارج کے دوسرے فرقے صفریہ کے یہاں ہمیں عمران بن حِطان اور صالح بن مسرح جیسے خطیب ملتے ہیں۔ ان حضرات نے بنو امیہ اور اپنے دیگر مخالفین پر جم کر حملے کیے اور انہیں گمراہ قرار دے کر ان کے خلاف جہاد پر اپنے متبعین کو خوب بھڑکایا۔ ان کے دیگر مشہور خطیبوں میں طرماح بن حکیم، شبیل بن عزرہ ضبعی اور ضحاک بن قیس وغیرہ اہم مانے جاتے ہیں۔ اباضیہ فرقے کے بھی کئی اہم خطیبوں کے نام تاریخ و ادب کے مراجع میں ہمیں ملتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ان کے ایک لیڈر عبداللہ بن یحییٰ کندی کو حاصل ہوئی جس نے ۱۲۹ھ میں بنو امیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور یمن و حضرموت وغیرہ کے علاقوں پر اپنا قبضہ جمایا۔ اپنے قائد ابوحمزہ کی قیادت میں اس فرقے نے حجاز تک اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، یہاں تک کہ اموی خلیفہ مروان بن محمد نے اسے شکست دے کر اس کی نکیل کسی۔

10.3.1.2 شیعہ خطبا

شیعہ فرقے کے خطیبوں کے نشانے پر بھی بنو امیہ اور ان کے خلفا تھے۔ ان کے مطابق بنو امیہ نے خلافت پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور

اس پر حضرت علیؓ اوران کی جماعت کا ہی حق تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ از خود خلافت کے لیے حضرت علیؓ کو نامزد کیا تھا اور بنو امیہ نے ان کوان کے اس حق سے محروم کر دیا۔ اس فرقے کے خطیبوں کا سارا زور اپنے ان دعوؤں کو ثابت کرنے پر تھا، بطور خاص حضرت حسین ؓ کی شہادت کے بعدان لوگوں نے بنوامیہ کے خلاف اپنا محاذ پوری طرح کھول دیا تھا اور خطابت کے ذریعہ ان پر شدید حملے کیے۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعداس جماعت کے ایک رہنما سلیمان بن صرد نے منبر پر کھڑے ہو کر پر جوش خطبے دیے اور بنوامیہ کو منھ توڑ جواب دینے کے لیے لوگوں کو بھڑکا یا۔ اس جماعت کا ایک اور خطیب عبید اللہ بن عبداللہ مری تھا جس نے جوشیلے خطبوں کے ذریعہ شیعوں کو بنوامیہ کے خلاف برانگیختہ کیا۔ شیعوں کا ہی ایک بہت بڑا قائد مختار ثقفی بھی تھا، جس کی بنوامیہ اور مصعب بن زبیر کے خلاف معرکہ آرائیاں تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ بھی ایک زبردست خطیب تھا اور اس کے خطبے بھی تاریخ کے مراجع میں موجود ہیں۔ ان خطیبوں کے علاوہ شیعہ فرقہ کے اور بھی ماہر اور شعلہ بیان خطیب تھے جنہوں نے اپنی خطابت کے خوب جلوے دکھائے، لیکن ان کے بہت سے خطبے ہم تک نہ پہنچ سکے۔

شیعوں کے دوسرے خیالات کے علاوہ جن میں ان کا اختلاف عام مسلمانوں سے ہے، مذکورہ بالا خیالات صرف ان کے سیاسی مقررین کے نہ تھے بلکہ ان کے اماموں کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا چنانچہ حضرت حسینؓ جب شیعوں کی دعوت پر مدینہ سے روانہ ہو کر کوفہ کے قریب پہنچ گئے اور لوگ ان کے اردگرد جمع ہونے لگے اور اسی درمیان عبیداللہ بن زیاد کی فوج کے ہراول دستے بھی پہنچنے لگے تو حضرت حسین نے اپنا رخ لوگوں کی طرف کر کے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ: ''أیها الناس، فإنکم إن تتقوا و تعرفوا الحق لأهله یکن أرضی لله، ونحن۔ اهلَ البیت۔ أولی بولایة هذاا لأمر علیکم من هؤلاء المدعین ما لیس لهم، والسائرین فیکم بالجور والعدوان''

(ترجمہ: اے لوگو! اگر تم خدا سے ڈرو اور حقداروں کے حق کو سمجھو تو اس سے خدا بہت خوش ہوگا، ہم اہل بیت ہی ان جھوٹے دعوے داروں کے مقابلہ میں تمہارے اوپر حکومت کرنے کے زیادہ حقدار ہیں کیوں کہ ان لوگوں کو تو یہ حق کسی طرح پہنچتا ہی نہیں، پھر یہ لوگ تم لوگوں سے ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتے ہیں)

جلد ہی امویوں نے خلافت کے سب سے بڑے اور معزز ومحترم دعوے دار یعنی حضرت حسینؓ کو قتل کروا کے اپنی حکومت اور سطوت کو اور مضبوط کرنا شروع کر دیا، لیکن تبھی خلیفہ یزید بن معاویہ جس کے زمانے میں کربلا کا واقعہ پیش آیا تھا مر گیا، اب شیعوں میں ذرا جان آئی اوران میں ایک جانباز سلیمان بن صرد کے نام سے پیدا ہوا، اس نے شیعوں کو ان کی غلطی یاد دلائی، ان کو حضرت حسینؓ کی مدد نہ کرنے پر عار اور شرم دلائی، چنانچہ شیعان کوفہ میں سے اکثریت اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی اور اس طرح اس نے شیعوں میں فرقہ توابین کی بنیاد ڈالی۔ اس نے سبط رسول کی مدد نہ کرنے اور اپنے گھروں میں چپ چاپ بیٹھے رہنے کے گناہ سے سب سے توبہ کروائی اور ان کے خون کا بدلہ لینے کا ان سے عہد لیا۔ اس موقع پر کئی شیعہ قائدین کے علاوہ ان کے لیڈر سلیمان بن صرد نے بھی ایک جوشیلی تقریر کی جس میں اس نے کہا: ''قُتِلَ فینا ولدینا ولُدُ نبینا وسلالته وعصارته وبُضعةٌ من لحمه ودمه، اتخذه الفاسقون غرضاً للنبل، ألا انُهضوا فقد سخط ربکم، ولا ترجعوا إلی الحلائل والأبناء حتی یرضی الله، والله ما أظنه راضیا دون أن تناجِزوا من قَتَلَه أو تَبیرُوا''

(ترجمہ: ہمارے درمیان ہمارے نبی کی اولاد اور ان کی ذریت کا نچوڑ اوران کے خون وگوشت کا ٹکڑا قتل کر دیا گیا، انھیں ان فاسقوں نے اپنے تیروں کا نشانہ بنالیا، اے لوگو! اٹھ کھڑے ہو کہ تمہارا رب تم سے خفا ہوگیا ہے اور اپنی بیویوں اور بچوں کے پاس اس وقت تک نہ جانا

جب تک کہ خدا تم سے خوش نہ ہو جائے اور خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ خدا اس وقت تک تم سے خوش نہیں ہو سکتا جب تک تم اس شخص سے ڈٹ کر مقابلہ اور لڑائی نہ کرو جس نے ان کو قتل کیا تھا یا تم خود ہی اس راہ میں ختم نہ ہو جاؤ)

شیعوں کا ہی ایک اور لیڈر مختار ثقفی بھی بڑا ہی فصیح و بلیغ اور شعلہ بیان مقرر تھا۔ اس کی جوشیلی تقریریں سن کر کوفہ والے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ مختار ایک بہت ہی سنکی اور بہروپیا قسم کا انسان تھا، وہ یہ تصور دینے کے لیے کہ اس پر وحی یا اللہ کا حکم نازل ہوتا ہے اپنی تقریروں میں جاہلی دور کے کاہنوں جیسا رنگ پیدا کرتا تھا اور اپنی تقریروں میں مسجع ومقفی عبارتیں بکثرت استعمال کرتا تھا اور قرآنی اسلوب کی طرح اپنے جملوں کو اکثر قسم سے شروع کرتا تھا، جن میں نامانوس اور شاذ و نادر الفاظ کی بھرمار ہوا کرتی تھی، چنانچہ اس نے ایک موقع پر اپنی ایک تقریر میں کہا:

"أما ورب البحار، والنخيل والأشجار، والمَهامة والقِفار، والملائكة الأبرار، والمصطفَين الأخيار، لأقتلنَ كل جبار، بكل لدن خطار، ومهند بتار، في جموع من الأنصار، ليسو بميل أغمار، ولا بعزل أشرار، حتى إذا أقمتُ عَمود الدين ورأبت شعب صدع المسلمين وشفيت غليل صدور المؤمنين، وأدركت بثأر النبيين، لم يكبر عَلَيَّ زوالُ الدنيا، ولم أحفل بالموت إذا أتى"

(یعنی: قسم ہے سمندروں کے مالک کی، کھجوروں اور درختوں کے مالک کی، صحراؤں اور بیابانوں کے مالک کی اور پاکیزہ فرشتوں کے مالک کی کہ میں ہر جابر و ظالم شخص کو پیوست ہو جانے والے نیزوں سے اور تیز دھار والی ہندوستانی تلواروں سے اس کے ایسے مددگاروں کے بیچ قتل کروں گا جو نہ تو بزدل ہیں اور نہ ہی ناتجربہ کار ہیں اور نہ ہی لفنگے ہیں اور نہ ہی نہتے ہیں، یہاں تک کہ جب میں دین کے ستون کو کھڑا کر لوں گا اور مسلمانوں کے اختلاف کو دور کر لوں گا اور مومنوں کے دل کی پیاس بجھا دوں گا اور نبیوں کے خون کا بدلہ لے لوں گا، تب میرے لیے اس دنیا کو چھوڑنا کوئی بڑی بات نہ ہوگی اور اس کے بعد جب موت آئے گی تب میں اس کی کوئی پرواہ نہ کروں گا)

مذکورہ بالا مقررین اور شیعوں کے دیگر مقررین اپنی نجی مجالس کی گفتگو سے لے کر بڑے بڑے جلسوں کی تقریروں میں بنوامیہ کی برائی اور آل بیت کی مظلومیت کی داستانیں سنا کر لوگوں کو امویوں کے خلاف اکساتے تھے اور خون کا بدلہ لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق آل رسول ہی نبوت کے حقیقی وارث، مقدس پیغام کے حامل اور مہدی منتظر تھے۔

10.3.1.3 عبداللہ بن زبیر اور ان کی جماعت

خوارج اور شیعوں کے علاوہ بھی کچھ سیاسی جماعتیں اس وقت میدان میں تھیں جن میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی جماعت خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ عبداللہ بن زبیر بذات خود ایک شعلہ بیان خطیب تھے اور ان کی خطابت کا انداز بے انتہا مؤثر اور سحر انگیز تھا۔ انہوں نے بھی اپنے خطبوں میں بنوامیہ، خوارج اور شیعوں پر شدید حملے کیے۔

یہ اپنی تقریروں میں بنوامیہ کی برائی کرتے اور حضرت حسین کے قتل کے واقعہ کو ان کی دھوکہ دھڑی اور خون ناحق بہانے اور ظلم وستم ڈھانے کے مماثل بتا کر سامعین کی ہمدردی بٹورنے اور ان کو امویوں کے خلاف بغاوت کرنے پر ابھارنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

ایسے ہی جب ان کے بھائی مصعب بن زبیر کی شہادت کی خبر ان تک پہنچی تب بھی انہوں نے ایک بہترین خطبہ دیا اور بھائی کی شہادت پر رنج وغم کا اظہار بھی کیا اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کا عزم بھی ظاہر کیا۔

ان کی یہ تقریر ایک معرکۃ الآرا اور نہایت مؤثر تقریر تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے بھائی مصعب بن زبیر کی شہادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”اگر وہ قتل ہو گیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس گھرانے کا تو دستور یہی رہا ہے، چنانچہ اس سے قبل اس کے باپ، اس کے چچا اور اس کے چچازاد بھائی کو بھی ایسے ہی قتل کیا گیا تھا۔ مصعب کے والد زبیر جنگ جمل کے بعد شہید ہوئے تھے، ان کے چچا عبدالرحمن جنگ یرموک میں شہید ہوئے تھے اور ان کے بیٹے عبداللہ یوم الدار میں کام آئے تھے۔

مصعب بن زبیر خود ایک اچھے خطیب تھے اور ان کے بھی کچھ خطبے ادب کے مراجع میں محفوظ ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور میں خلافت بنوامیہ کے خلاف اور بھی بہت سی بغاوتوں نے سر اٹھایا تھا جنھیں بنوامیہ کے لشکر جرار نے ایک ایک کر کے کچل دیا تھا۔ ان باغی جماعتوں میں بھی بہت سے اچھے خطیب موجود تھے۔ جیسے مدینہ پر جب یزید بن معاویہ نے چڑھائی کی تب عبداللہ بن حنظلہ نے اپنی جماعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور ہار کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے ہی عمرو بن سعید بن العاص نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں شام پر حملہ کیا اور بالآخر شکست سے دوچار ہوئے۔ عمرو بن العاص کو خطابت میں بے انتہا مہارت حاصل تھی اسی لیے انہیں ان کی فصاحت و بلاغت پر قدرت کی وجہ سے اشدق کا لقب دیا گیا تھا۔ عراق میں حجاج بن یوسف کے خلاف عبدالرحمن بن محمد بن اشعث نے محاذ بنایا اور مقابلہ کیا۔ یہ بھی اپنے دور کے ایک بہترین خطیب تھے۔ اسی طرح دوسری صدی ہجری کے شروع میں یزید بن مہلب نے یزید بن عبدالملک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انہیں بھی اس دور کے ماہر خطیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

10.3.1.4 خطبائے بنوامیہ

ان سب سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں بنوامیہ کی جماعت نظر آتی ہے جو صاحب اقتدار تھی اور یقینا اس دور کی سب سے بڑی اور مضبوط سیاسی جماعت بھی تھی۔ اس لیے اس جماعت میں ماہر خطیبوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک شعلہ بیان خطیب ان کے درمیان موجود تھے، خود ان کے خلفا اور قائدین بھی خطابت میں بلند مقام رکھتے تھے۔ خلافت کے بانی حضرت معاویہ بذات خود ایک بہترین خطیب تھے اور ان کے علاوہ عبدالملک بن مروان اور عمر بن عبدالعزیز بھی بہترین خطیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ امیر معاویہ اور عبدالملک مروان کے خطبے تو زیادہ تر سیاسی نوعیت کے ہیں لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خطبوں میں وعظ و نصیحت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

جہاں تک بنوامیہ کے قائدین اور والیوں کی بات ہے تو خطابت کے میدان میں ان کو دوسری جماعت کے قائدین پر خاصی سبقت حاصل رہی۔ ایک سے بڑھ کر ایک ماہر خطیب بنوامیہ کی صفوں میں موجود تھے جن کی تقریروں کو آج بھی فصاحت و بلاغت اور فن خطابت پر قدرت کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مصر میں بنوامیہ کے والی عتبہ بن ابوسفیان اور عراق میں زیاد بن ابیہ، حجاج بن یوسف اور خالد قسری جیسے خطیبوں نے خطابت کے بہترین نمونے پیش کر کے تاریخ ادب کے صفحات پر اپنے نام ہمیشہ کے لیے ثبت کروا لیے ہیں۔ بنوامیہ کے قائدین میں سرفہرست حجاج بن یوسف کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر حجاج کو اس دور کا سب سے بہترین خطیب کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ حجاج کو جب خلیفہ عبدالملک کی طرف سے عراق کا والی متعین کیا گیا تو اس وقت عراق فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، ہر طرف خون ریزی اور بغاوت نظر آ رہی تھی۔ آشوب زدہ ماحول سے نپٹنے کے لیے خلیفہ نے حجاج بن یوسف جیسے مضبوط کمانڈر کا انتخاب کیا جو نہ صرف یہ کہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں

کے لیے جانے جاتے تھے بلکہ اپنی خطیبانہ مہارت کے لیے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ لہٰذا جب انہیں عراق کا والی مقرر کر کے بھیجا گیا تو انہوں نے اہل عراق کو مخاطب کر کے جو خطبہ دیا وہ عربی ادب کی تاریخ کے بہترین اور عمدہ خطبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقریر میں ایسی گھن گرج تھی کہ سننے والوں کے دل دہل کر رہ گئے تھے گویا وہ حجاج بن یوسف کے الفاظ نہ ہوں بلکہ تیغ وتفنگ کے وار ہوں۔ یہ تقریر فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔

بنو امیہ کے دور کا دوسرا سب سے بڑا خطیب زیاد بن ابیہ تھا جن کو امیر معاویہ نے عراق اور خراسان کا والی مقرر کیا تھا۔ خطابت میں زیاد کو حجاج کا ہم پلہ مانا جاتا ہے۔ زیاد ایک ماہر سیاستداں تھے۔ انہوں نے اس وقت عراق میں موجود خراب حالات کو قابو میں کرنے کے لیے سختی سے کام لیا۔ ان کے کئی معاصرین نے ان کی خطابت کی تعریف لکھی ہے۔ حجاج کی ہی طرح زیاد کی بھی زیادہ تر تقریریں سیاسی نوعیت کی تھیں۔ ان کا سب سے مشہور خطبہ وہ خطبہ ہے جو انہوں نے بصرہ میں دیا تھا اور اس کو اللہ کی حمد وثنا کے بغیر ہی شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے اس خطبے کو البتراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زیاد کا یہ خطبہ اس عہد کی خطابت کے بہترین نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ خطبہ اس قدر مؤثر تھا کہ اس کے بعد بصرہ میں امن وامان کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ اس میں ان کا انداز بہت دھمکی آمیز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو سن کر بصرہ کے لوگوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ اس خطبہ کو پڑھ کر اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زیاد کے وعظ ونصیحت پر مبنی کچھ خطبے بھی ادب کے مختلف مراجع میں موجود ہیں۔

10.3.2 درباری تقریریں اور مختلف مناسبات کی خطابت

قدیم زمانے سے ہی عربوں میں اس کا خوب رواج تھا کہ وہ اپنے سرداروں اور بادشاہوں کے درباروں میں حاضر ہو کر بہترین انداز میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اس میں مخاطب کی تعریف بھی شامل ہوتی تھی اور اپنے قبائل کی بڑائی بھی۔ اسی طرح وہ لوگ مختلف قسم کے اختلافات اور منازعات کی صورت میں صلح کرانے کے لیے بھی تقریروں کا سہارا لیتے تھے۔ اسی طرح بازاروں میں، میلوں میں اور شادی بیاہ کے موقع پر بھی تقریریں کیا کرتے تھے۔ حبشہ میں نجاشی کے دربار میں اور شام میں قیصر کے دربار میں کی ہوئی ان کی تقریریں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ وفود کی آمد کا سلسلہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا خاص طور سے فتح مکہ کے بعد اس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ خلافت راشدہ کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ عہد اموی کے آتے ہی اس میں بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی۔ یہ وہ درباری تقریریں ہوا کرتی تھیں جنھیں مختلف قبائل کی نمائندگی کے لیے آنے والے وفود کے سربراہ خلیفہ کے سامنے اپنے مسائل بیان کرنے یا اپنی مشکلات کو بتانے یا کسی حاکم یا گورنر یا والی کی شکایت کرنے یا خلیفہ سے مدد مانگنے یا اپنی قوم یا قبیلہ کی تعریف وتوصیف کرنے یا دوسروں کے مقابلے میں فخر ومباہات کرنے یا خلیفہ کو کسی خوشی کے موقع پر مبارکباد دینے یا کسی غم کے موقع پر اظہار ہمدردی یا تعزیت کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔

یہ تقریریں زبان وبیان کے اعتبار سے فن خطابت کا بہترین نمونہ ہوا کرتی تھیں اور اس زمانے میں ان کی بڑی گرم بازاری تھی جس کی وجہ سے خطابت کے ایسے ماہرین اس دور میں سامنے آئے جنھوں نے عربی ادب کی تاریخ میں اپنے نام زریں حروف سے لکھوائے۔

اموی خلفا نے اپنے دروازوں کو ان وفود کے لیے پوری طرح کھول دیا تھا اور ان کو خوب انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ خود حضرت

معاویہ نے اس میں بہت دلچسپی دکھائی اور ان کے دور سے ہی اس کے نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ زیادہ تر وفود خلیفہ کے تئیں اپنی اور اپنے اہل قبیلہ کی اطاعت گزاری وفرماں برداری کا پیغام دینے کے لیے آتے تھے۔ خلیفہ بھی ان کی خوب خاطر مدارات کرتے اور انھیں خوب نوازتے تھے۔ عرب قوم اور خاص طور سے شیوخِ قبائل اور بادیہ میں رہنے والے بھوکے اور تنگ حال بدوؤں کو اپنی طرف مائل کا یہ بہترین طریقہ تھا، چنانچہ حضرت معاویہ کے بعد آنے والے تمام اموی حکمرانوں نے اس طریقے کو اختیار کیا۔ وفود کی خطابت کے حوالے سے خاص طور سے سحبان وائل کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ وائل قبیلہ کی نمائندگی کرتے ہوئے خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوئے تھے۔ اپنے وقت کے بہت ماہر خطیب تھے۔ اور شوہاء نامی اپنے خطبہ کے لیے جانے جاتے ہیں۔

اس ضمن میں احنف بن قیس کا نام جو قبیلہ تمیم کے نمائندہ کے طور پر حاضر ہوئے تھے اور صحار بن عیاش عبدی کا نام جو بنوعبدالقیس کے نمائندہ تھے قابل ذکر ہے۔

صحار بن عیاش عبدی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار حضرت معاویہ نے اس سے کہا کہ ”ماهی البلاغه التی فیکم“یعنی یہ کون سی بلاغت ہے جو تم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ (اپنے اس جملہ سے حضرت معاویہ اس کی قوم بنوعبدالقیس کی خطابت میں شہرت اور مہارت کی طرف اشارہ کررہے تھے)۔ تو اس نے جواب میں کہا”شیٔ تجیش به صدورنا، فتقذفه علی ألسنتا“۔ یعنی یہ ایسی چیز ہے جس کا ابال ہمارے سینوں میں اٹھتا ہے تو ہمارے سینے اسے ہماری زبانوں کی طرف پھینک دیتے ہیں“۔

بنوعبدالقیس کے دیگر مشہور مقررین میں بنوصوحان ،مصقلہ بن رقیہ، رقیہ بن مصقلہ اور کرب بن مصقلہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا ذکر جاحظ نے اپنی کتاب البیان و التبیین میں کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ان لوگوں کے پاس ایک خطبہ ہوا کرتا تھا جسے العجوز (یعنی بوڑھا یا بزرگ) کہا جاتا تھا اور جب بھی وہ لوگ خطبہ دیتے تو اس العجوز خطبے کو پورا یا اس کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری سمجھتے تھے۔

جاحظ نے ایک اور شخص عبدالعزیز بن زرارہ الکلابی کا ذکر بھی کیا ہے کہ وہ بھی فن خطابت میں اس زمانے میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ جاحظ نے لکھا ہے کہ عبدالعزیز نے ایک بار حضرت معاویہ سے مخاطب ہوکر چار پانچ جملوں میں اپنی ضرورت اس بلیغانہ انداز میں بیان کی کہ حضرت معاویہ اس کی زبان دانی پر عش عش کرا ٹھے۔

ہر خطیب کی یہی سعی وکوشش ہوتی تھی کہ کس طرح اپنی فصاحت وبلاغت اور حسن اسلوب کے ذریعہ خلیفہ یا والی کا دل جیت لیا جائے اور اسے اپنی بات سے مطمئن کردیا جائے۔ ان کا انداز بیان اس قدر خوبصورت اور دلپذیر ہوتا تھا کہ دمشق کے درباروں میں جب یہ خطیب تقریر کیا کرتے تھے تو ان کو سننے کے لیے شہر کے نوجوان جوق در جوق وہاں پہنچ جاتے تھے تا کہ ان کی خوش اسلوبی اور فصاحت و بلاغت سے محظوظ ہوسکیں۔

حجاج جیسا جابر اور سخت دل والی بھی ان مقرروں کی زبان دانی اور حاضر جوابی کے سامنے جھک جاتا تھا حالانکہ وہ خود اپنے زمانے کا سب سے مؤثر اور شعلہ بیان خطیب تھا۔ان مقررین میں آپس میں تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے۔اس قسم کا ایک مقابلہ حضرت معاویہ کے دربار میں پیش آیا جب یزید کی خلافت کے لیے بیعت کی گئی،اس قسم کا دوسرا مقابلہ اس وقت ہوا جب عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹے الولید

کے لیے بیعت لینے کا اعلان کیا۔

ان خطیبوں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ خلیفہ کو اپنی خوش اسلوبی اور فصاحت وبلاغت کے ذریعہ متأثر کیا جائے اور اس کے سامنے اپنی اطاعت وفرماں برداری کا اظہار کیا جائے۔ اسی ضمن میں تعزیت اور مبارکبادی کے خطبوں کو بھی شامل کرلیا جاسکتا ہے جو اس طرح کے مواقع پر دیے جاتے تھے اور تاریخ ادب کی کتابوں میں ان کے نمونے محفوظ ہیں۔

اس صنف کی خطابت کی شروعات عبداللہ بن ہمام سلولی کوفی کے ذریعہ ہوئی جو یزید کی بیعت کے وقت یزید کے دربار میں حاضر ہوا اور لوگوں کے جم غفیر کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ ایک طرف حضرت معاویہ کے انتقال کی وجہ سے رنج وغم کا ماحول تھا تو دوسری طرف یزید کی بیعت کی خوشی۔ ہر خطیب اس موقع پر زبان کھولنے سے گھبرا رہا تھا کہ اگر وہ خوشی کا اظہار کرے تو اتنے بڑے غمناک حادثے کو کیسے نظر انداز کرے اور اگر مبارکباد پیش کرے تو تہنیت کے لیے کیا اسلوب اختیار کرے۔ چنانچہ اس موقع پر عبداللہ بن ہمام نے ہمت دکھائی اور آگے بڑھ کر اپنی تقریر پیش کی، اس کی وہ تقریر ایک طرف اس کی فصاحت وبلاغت پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی ذہانت وفطانت کا ثبوت دیتی ہے۔ اس نے ان دونوں جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا: ''**یا امیر المؤمنین! آجرک اللہ علی الرزیۃ، وبارک لک فی العطیۃ، وأعانک علی الرعیۃ، فلقد رُزِئتَ عظیماً، واُعطِیتَ جسیماً، فاشکر اللہ علی ما اُعطِیتَ، واصبرْ لہ علی ما رُزِئتَ، فقد فقدتَ خلیفۃَ اللہ، ومُنِحتَ خلافۃَ اللہ، ففارقتَ جلیلا ووُہِبتَ جزیلا**''۔

(یعنی اے امیر المؤمنین! خدا آپ کو اس مصیبت پر اجر دے اور جو عطیہ (یعنی خلافت) دیا گیا ہے اس میں برکت عطا کرے اور رعیت کے سلسلے میں آپ کی مدد کرے ایک طرف آپ پر ایک بڑی مصیبت آن پڑی ہے تو دوسری طرف آپ کو ایک عظیم الشان چیز بھی عطا کی گئی ہے۔ اس لیے جو چیز آپ کو عطا کی گئی ہے اس پر خدا کا شکر ادا کیجیے اور جو مصیبت آپ پر پڑی ہے اس پر صبر کیجیے کیوں کہ آپ نے اگر ایک طرف اللہ کے خلیفہ کو کھویا تو دوسری طرف اللہ کی خلافت کو پایا اور یوں آپ نے ایک طرف ایک عظیم الشان ہستی کا ساتھ چھوڑا تو دوسری طرف ایک بہت بڑی چیز آپ کو مرحمت کردی گئی)

اموی خلافت میں وفود کی کثرت اور خطیبوں کے جلوے ہمیں سب سے زیادہ عبدالملک بن مروان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں، اسی طرح واعظوں کی کثرت ہمیں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور میں زیادہ نظر آتی ہے۔

دراصل ان وفود اور درباری خطبوں میں کچھ خطیب ایسے بھی تھے جو خلیفہ کے سامنے واعظانہ خطبے دیا کرتے تھے۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے دربار میں کئی واعظ خطبا حاضر ہوئے اور واعظانہ تقریریں کیں، اس سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام سب سے اہم ہے کیوں کہ اس قسم کے خطیبوں کا ذکر سب سے زیادہ انھیں کے عہد میں ملتا ہے، خالد بن صفوان، عبداللہ بن اہتم، محمد بن کعب قرظی جیسے خطیبوں کا نام اس حوالے سے ہمیں ملتا ہے۔

اس کے علاوہ خلیفہ کے والیوں اور قائدین کے درباروں میں بھی وفود کی آمد اور خطیبوں کی جلوہ گری کا سلسلہ اموی دور میں جاری رہا چاہے وہ زیاد بن ابیہ ہوں یا حجاج بن یوسف ہوں جو خود بھی عظیم خطیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے درباروں سے بھی بہت سے ماہر

خطیب وابستہ تھے۔

زیاد بن ابیہ کے دربار میں عمران بن حطان حاضر ہوئے اور انھوں نے والی کے سامنے ایک بہترین خطبہ پیش کیا۔ اسی طرح حجاج کے دربار میں حاضر ہونے والے خطیبوں کی ایک بڑی تعداد کا ذکر ملتا ہے جن میں جامع محاربی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

10.3.3 واعظانہ خطابت اور قصہ گو خطبا

جس طرح سیاسی خطابت کا اس عہد میں بہت زور رہا اسی طرح قصہ گوئی اور وعظ ونصیحت پر مبنی خطابت کا بھی اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں ان خطبوں کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ واعظین اپنے خطبوں میں قصوں کو شامل کر لیتے تھے تو وہیں قصہ گو حضرات پر وعظ ونصیحت کا رنگ غالب آجاتا تھا۔ بصرہ میں اس نوعیت کی خطابت کی شروعات اسود بن سریع کے ذریعہ ہوئی جبکہ کوفہ کے اولین قصہ گو خطبا میں زید بن صوحان کا شمار ہوتا ہے۔ مدینہ میں اس کی شروعات عبید بن عمیر اور مسلم بن جندب جبکہ مصر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ذریعہ ہوئی۔ وہب بن منبہ اور سعید بن جبیر وغیرہ بھی اس دور کے اہم قصہ گو خطبا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

بصرہ کے دیگر قصہ گو خطبا میں جن کا ذکر جاحظ نے کیا ہے قاضی بصرہ ایاس بن معاویہ اور خالد بن صفوان وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اس دور کے واعظین میں سب سے زیادہ شہرت حسن بصری کو ملی۔ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے بعد واصل بن عطا، عبداللہ بن شداد اور فضل بن عیسیٰ رقاشی وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔

واصل بن عطا اپنے دور کے عظیم خطیبوں میں سے ایک مانے جاتے ہیں۔ اس دور میں علم کلام کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اس لیے واصل اور علم کلام کے دوسرے ماہرین نے اس دور کی خطابت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اس دور کے خلفا میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بہت سے دینی خطبے کتابوں میں محفوظ ہیں جن کا مرکزی خیال اللہ کی اطاعت، اس کی نافرمانی سے اجتناب، قیامت کے دن کا حساب وکتاب اور جزا وسزا جیسے موضوعات ہوا کرتے تھے۔ خطبوں میں اس واعظانہ رنگ کا اس دور میں اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ جو بھی خطبہ دینے کھڑا ہوتا اس کے خطبہ میں کچھ نہ کچھ واعظانہ باتیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ مشہور اموی کمانڈر اور والی حجاج بن یوسف کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب وہ مسجد میں منبر پر چڑھتا تھا تو کہتا تھا کہ: ''اے لوگو! خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنا، یہ اس کے عذاب کو برداشت کرنے کے مقابلے میں بہت آسان ہے''۔ حجاج کے علاوہ کچھ دوسرے سخت دل اور سخت گیر حکام اور والی تھے جو اس طرح کی واعظانہ باتیں خطبوں کے دوران کیا کرتے تھے۔

واعظانہ مقررین کا یہ طبقہ اس عہد میں ہر اسلامی شہر میں پایا جاتا تھا۔ اموی خلفا وحکام نے کئی جید واعظین اپنے یہاں ملازم کے طور پر بھی رکھے ہوئے تھا اور قصے دن میں دو مرتبہ سنائے جاتے تھے، ایک مرتبہ فجر کی نماز کے بعد اور دوسری مرتبہ مغرب کے نماز کے بعد۔ اس طبقہ واعظین کا کام مسلمانوں کو وعظ ونصیحت کرنا اور انھیں اچھے کاموں کی ترغیب وتلقین کرنا تھا۔ جاحظ کی البیان والتبیین میں اس قسم کی واعظانہ تقریریں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

ان واعظین میں ابراہیم تیمی کوفی اور سعید بن جبیر کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر کا یہ معمول تھا کہ وہ روز فجر اور عصر کی

نماز کے بعد وعظ کیا کرتے تھے۔ جاحظ نے دیگر واعظین میں یزید بن ابان رقاشی کا ذکر بھی بطور خاص کیا ہے اور ان کے ایک خطبے کا یہ جز بھی نقل کیا ہے کہ:

”لیتنا لم نُخلَق، ولیتنا اذ خُلقنا لم نعص، ولیتنا إذ عَصینا لم نمت، ولیتنا إذمتنا لم نُبعث، ولیتنا إذ بُعثنا لم نُحاسَب، ولیتنا إذ حُوسبنا لم نُعذب، ولیتنا إذ عُذبنا لم نُخلد“۔

(یعنی اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر پیدا ہو گئے تو کاش ہم خدا کی نافرمانی نہ کرتے اور اگر نافرمانی کرتے تو کاش ہم نہ مرتے اور اگر مرجاتے تو کاش دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے اور اگر زندہ کر دیے جاتے تو اے کاش ہم سے حساب کتاب نہ ہوتا اور اگر حساب کتاب ہوتا تو کاش ہمیں عذاب نہ دیا جاتا اور اگر عذاب دیا جاتا تو اے کاش اسی عذاب میں ہمیشہ نہ رہنا پڑتا)

اس دور کے مشہور ترین واعظین خطبا میں جماعت معتزلہ کا سردار واصل بن عطا بھی تھا۔ وہ بے انتہا فصیح وبلیغ اور بہت ذی علم انسان تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک بار وہ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس وقت عبداللہ بن عمر عراق کے امیر (۱۲۶ھ۔ ۱۲۹ھ) تھے۔ واصل کے ہمراہ اس وقت خالد بن صفوان، شبیب بن شیبہ اور فضل بن عیسیٰ رقاشی بھی تھے۔ عبداللہ بن عمر کے دربار میں چاروں خطیبوں میں زوردار مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں واصل اپنے تینوں ساتھیوں پر غالب آ گیا۔ اس کا وہ خطبہ اس عہد کے بہترین خطبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اس کا کچھ حصہ ذکر کیا جاتا ہے:

”الحمدالله القديم بلا غاية، والباقي بلا نهاية، الذى علا فى دُنُوه، ودنا فى عُلُوه، فلا يحويه زمانٌ ولا يحيط به مكانٌ، ولايؤوده حفظُ ما خَلَق، ولم يخلقه على مثال سَبَق، بل انشأه ابتداعا، وعدله اصطناعاً، فأحسن كل شيء خَلْقَه، وتمم مشيئته، وأوضح حكمته، فدل على ألوهيته، فسبحانه لا مُعَقِبَ لحكمه ولا دافع لقضائه، تواضع كل شى ء لعظمته، وذل كل شى ء لسلطانه، ووسع كلُ شى ء فضلَه، لايَعزُبُ عنه مثقالُ حبة وهو السميع العليم، وأشهد أن لا إله الله وحده الها تقدست أسماؤه وعظمت آلاؤه، وعلاعن صفات كل مخلوق، وتنزه عن شبيه كل مصنوع، فلاتبلغه الأوهام، ولا تحيط به العقول والافهام، يُعصَى فيحلم، ويُدعَى فيسمع، ويقبل التوبة من عباده، ويعفو عن السيئات، ويعلم ماتفعلون“۔

(یعنی اس خدا کے لیے ہر قسم کی حمد وثنا ہے جو غیر معلوم مدت سے قدیم ہے اور جو نہ ختم ہونے والی مدت تک باقی رہے گا، جو باوجود قریب ہونے کے دور اور جو دور ہونے کے قریب ہے۔ نہ کوئی زمانہ اسے اپنے اندر سمو سکتا ہے اور نہ کوئی مکان اس کا احاطہ کر سکتا ہے، جو چیز اس نے پیدا کر دی ہے اس کی حفاظت میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے اور نہ اس نے کسی سابق چیز کی مثال پر اسے پیدا کیا ہے۔ (یعنی ہر مخلوق بالکل نئی اور اچھوتی ہے کوئی کسی سے پوری طرح مشابہ نہیں ہے) بلکہ ہر چیز کو اس نے خود ہی ایجاد کر کے بنایا ہے اور پھر اسے پوری مہارت اور چابکدستی سے ہر طرح مکمل بنایا اور پھر اپنی مخلوق کو پوری طرح سنوارا اور نکھارا اور اس طرح اپنی مرضی پوری کی اور اس کے ذریعہ اپنی حکمت کو پوری طرح بیان کیا اور یوں اپنی خدائی کی دلیل دی۔ بڑی پاک وصاف ہے اس کی ذات اور اس کے حکم کو نہ کوئی ٹال سکتا ہے اور اس کے فیصلے کو نہ کوئی روک سکتا ہے۔ ہر چیز اس کی عظمت وبڑائی کے آگے سرنگوں اور اس کی فرماں روائی وسلطانی کے آگے ذلیل وحقیر ہے۔ اس کا فضل وکرام ہر چیز کو حاوی ہے اور رائی کے برابر بھی اس سے کوئی چیز تجاوز نہیں کر سکتی۔ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ

نہیں ہے کوئی چیز پوجنے کے لائق سوائے یکتا اللہ کے جس کے تمام بڑے نام بڑے مقدس اور پاک ہیں اور جس کی نعمتیں اور مہربانیاں بہت بڑی ہیں جو ہر مخلوق میں موجود صفات سے بلند اور ہر بنائی ہوئی چیز کی مشابہت اور مماثلت سے مبرا ہے۔ اس کی ہیئت کو سوچنے، سمجھنے پر کوئی طاقت قادر نہیں ہوسکتی اور نہ عقل وفہم اس کا احاطہ کرسکتی ہے، اس کی نافرمانی کی جاتی ہے تو وہ عفوودرگزر سے کام لیتا ہے اور اس کو پکارا جاتا ہے تو وہ بندوں کی پکار کو سنتا ہے اور ان کی توبہ کو قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اسے وہ جانتا ہے۔)

واصل کی یہ تقریر جہاں ایک طرح قرآن وحدیث کی بہت سی تعلیمات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کی بنیاد پر وعظ ونصیحت کی باتیں پیش کرتی ہے تو وہیں یہ متکلمین اور معتزلہ کے عقائد وانداز بیان کا بھی ایک نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

اپنے اسی خطبے میں واصل آگے چل کر تقویٰ اور عمل صالح کی ترغیب دیتا ہے۔ اور دنیا اور اس کی لذتوں میں غرق ہونے سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ وہ آگے کہتا ہے:

"اوصیکم عبادَ اللہ مع نفسی بتقوی اللہ و العمل بطاعته و المجانبة لمعصیته، و احضکم علی ما یُدنیکم منه، ویُزلفکم لدیه، فإن تقوی اللہ أفضل زاد و أحسن عاقبة فی معاد، و لا تُلهینَّکم الحیاةُ الدنیا بزینتها و خدعها و فواتن لذاتها، و شهوات آمالها، فإنها متاع قلیل و مدة إلی حین، و کل شئ فیها یزول، فکم عانیتم من أعاجیبها و کم نَصَبَتْ لکم من حبائلها، و أهلکتْ من جَنَحَ إلیها و اعتمد علیها، أذاقتهم حلواً و مزجتْ لهم سُماً"

(یعنی اے اللہ کے بندوں! میں تمہیں اور خود اپنے آپ کو تقویٰ اور اللہ کی اطاعت گزاری اور اس کی معصیت سے اجتناب کرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور میں تمہیں ان کاموں کو کرنے کی ترغیب دیتا ہوں جو تمہیں اللہ سے قریب کردیں اور تمہیں اس کا مقرب بنادیں، کیوں کہ تقویٰ اور اللہ کی اطاعت ہی آخرت کے لیے بہترین توشہ ہے۔ اور اسی کا انجام آخرت میں سب سے اچھا ہوگا جو اس کو حاصل کرے گا، یہ دنیا تمہیں اپنی زینت وچمک دمک، پرفریب اور فتنہ پرور لذتوں اور شہوتوں کے ذریعہ ہرگز دھوکہ نہ دینے پائے کیوں کہ یہ ایک بہت ہی معمولی چیز ہے اس کی مدت بہت ہی مختصر ہے اور اس کی ہر شی بہت جلد فنا ہونے والی ہے، تم کس قدر اس کے دام فریب میں آچکے ہو اور جس نے اس کے اوپر بھروسہ کیا اس نے اسے تباہ وبرباد کردیا، اس نے اسے سبز باغ دکھائے اور پھر اسے بادسموم کے ذریعہ ہلاک کردیا کیوں کہ اس کی ہر میٹھی اور لذیذ چیز در حقیقت زہر آلود ہوتی ہے)

جاحظ نے واصل کی فصاحت وبلاغت اور فن خطابت میں اس کی مہارت کو خوب سراہا ہے اور کہا ہے کہ وہ زبان وبیان اور فصاحت وبلاغت کا ایک معجزہ تھا۔

اس دور میں بڑے بڑے خطیبوں کے درمیان خطابت کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے جیسا کہ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے دربار میں مقابلہ ہوا جس میں واصل بن عطا، خالد بن صفوان، شبیب بن شیبہ اور فضل بن عیسیٰ رقاشی کے درمیان خطابت کا مقابلہ ہوا جس میں واصل بن عطا نے بازی ماری۔

وعظ ونصیحت اور قصہ گوئی کی خطابت کے حوالے سے ایک بات اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ سیاسی خطبا اور وفود کے خطبا کے برعکس اس صنف کے خطبا بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے اور ان کے ارد گرد ان کے سامعین کا حلقہ سجا ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں حسن بصری کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔حسن بصری نے اپنی زندگی وعظ ونصیحت کے لیے وقف کردی تھی۔اس زمانے کے عظیم واعظین میں ان کو گردانا جاتا ہے۔نمونے کے طور پر انہیں پیش کیا جاتا تھا۔تمام مؤرخین اور اہل قلم نے ان کی فصاحت وبلاغت کی تعریف کی ہے۔ جاحظ کی البیان والتبیین، ابن قتیبہ کی عیون الأخبار اور ابن عبد ربہ کی العقد الفرید وغیرہ میں ان کی واعظانہ تقریریں مذکور ہیں جو اس فن میں ان کے عظیم مقام ومرتبہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں ان کی تعریف کی ہے۔ان کی تقریروں کا دارومدار اکثر قرآنی آیات اور احادیث رسول پر ہوا کرتا تھا۔وہ دنیا سے خود کو محفوظ رکھنے اور آخرت کی تیاری کرنے کی تلقین کرتے تھے اور تقویٰ وعمل صالح کی ترغیب دیتے تھے۔

اس دور کی خطابت کی خاص بات یہ بھی تھی کہ اس عہد میں اور اس کے بعد انشا پردازی کا جو مسجع ومقفی اسلوب رائج ہوا اس پر اس عہد کی خطابت کے اسلوب کا کافی اثر تھا۔گویا اس اسلوب کی شروعات انھیں تقریروں اور خطبوں سے ہوئی تھی۔

اس دور کی خطابت کو عصر رسول اور خلافت راشدہ کی خطابت کا ارتقا کہا جاسکتا ہے۔البتہ اس دور میں خطابت کے اسلوب میں کچھ تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں۔مثال کے طور پر اس دور سے قبل خطبے اکثر مختصر ہوا کرتے تھے،لیکن اس دور کے زیادہ تر خطبے ہمیں نسبتاً طویل اور مفصل نظر آتے ہیں۔اس تبدیلی کے پیچھے کئی اسباب کارفرما تھے۔مثلاً یہ کہ خطبوں کا اصل مقصد خلیفہ کے حکم یا پیغام کو رعایا تک پہنچانا تھا اور اس دور میں چونکہ فتوحات کثرت سے ہوئیں اور اسلامی ریاست میں توسیع ہوتی رہی اور رعایا کی تعداد اور ان کے مسائل ومعاملات میں بھی کثرت واقع ہوئی اس لیے تقاضا یہی تھا کہ اسی کے مطابق تفصیل سے اپنی بات کو عوام کے سامنے رکھا جائے۔اسی طرح اس عہد میں جس طرح بغاوتوں اور جنگوں کا سلسلہ جاری رہا، قائدین اور والیوں کو اپنے متبعین کو جنگ پر ابھارنے اور اپنا حکم منوانے کے لیے وعدہ ووعید کے مختلف طریقے استعمال کرنا پڑتے تھے جس کی وجہ سے بات مختصر ہونے کے بجائے اکثر طویل ہوجاتی تھی۔اس کے علاوہ یہ سبب بھی کارفرما تھا کہ پچھلے ادوار کے خطیبوں کے مخاطب اکثر خالص عرب ہوا کرتے تے جو مختصر اور جامع لب ولہجے کو بھی بآسانی سمجھ لیا کرتے تھے جبکہ اس دور میں غیر عربوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد خطیبوں کے سامنے ہوا کرتی تھی جن کو نہایت مختصر اور جامع انداز میں ہر بات سمجھانا آسان نہیں تھا، اس لیے بسط وشرح کا سہارا لیا گیا۔

اس دور کی خطابت میں وعید اور ترہیب کا عنصر بھی بالکل نمایاں نظر آتا ہے، بطور خاص اس دور کے سیاسی خطبات میں ہمیں یہ عناصر غالب نظر آتے ہیں جیسا کہ ہم حجاج بن یوسف اور زیاد بن ابیہ وغیرہ کے خطبوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس دور کی خطابت میں ہمیں اس دور کے حالات کی بہترین تصویر نظر آتی ہے خواہ وہ سیاسی اتھل پتھل ہو، یا مذہبی بحث ومباحثے ہوں یا علم کلام کے مناظرے ہوں یا وعظ ونصیحت کے حلقے ہوں، لوگوں کے آپسی اختلافات ہوں، یا قبائلی منافرتیں ہوں، یا معاشرتی محفلیں اور ملاقاتیں ہوں یا لوگوں کے آپسی تعلقات ہوں۔غرض یہ کہ اس وقت کی خطابت اس دور کے سماج اور معاشرے کی بہترین تصویر پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

10.4 اموی دور کے چند مشہور خطبا

10.4.1 زیاد بن أبیہ

زیاد کی پیدائش عام الہجرۃ یعنی ہجرت کے سال یا اس سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔حضرت عمرؓ کے عہد میں مشرق کی جانب ہونے والی فتوحات میں زیاد بھی شریک تھا۔بچپن سے ہی بے انتہا ذہین اور فصیح وبلیغ تھا۔حضرت علیؓ نے اسے اپنے دور خلافت میں بلاد فارس کا والی بنا کر بھیجا تھا۔حضرت معاویہؓ نے جب خلافت کا عہدہ سنبھالا تو زیاد کو اپنی جماعت میں شامل کرلیا۔حضرت معاویہؓ نے زیاد کی کارکردگی دیکھی تھی اس لیے وہ اس کے بڑے قدردان تھے۔حضرت معاویہؓ نے اسے ۴۵ھ میں بصرہ،خراسان اور سجستان کا والی مقرر کردیا۔بعد میں کوفہ بھی اس کے ماتحت کردیا۔اس طرح پورا عراق اس کے ماتحت ہوگیا۔

زیاد ایک بہترین خطیب تھا، اپنی بات کو مؤثر انداز میں ادا کرنے کے لیے بہترین الفاظ اور انداز کا انتخاب کیسے کرنا ہے یہ اس کو بہت اچھی طرح آتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ فن خطابت میں اس کی بے پناہ مہارت کے اس معاصرین بھی قائل تھے۔اس کے بارے میں شعبی کا کہنا ہے کہ میں جب بھی منبر پر کسی ایسے آدمی کو بولتے ہوئے سنتا جو بہت اچھا بولتا ہوتو میری خواہش یہی ہوتی تھی کہ وہ خاموش ہوجائے تاکہ اس کے منھ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے سوائے زیاد کے، کیوں کہ وہ جب بھی بولتا ہے بہت اچھا بولتا ہے۔زیاد کی تقریریں بھی حجاج بن یوسف کی طرح دو اہم موضوعات کے اردگرد گھومتی تھیں۔ایک سیاست اور دوسرا وعظ ونصیحت۔اس کے خطبوں کے کچھ اجزا ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کا ایک طویل سیاسی خطبہ بھی تاریخ وادب کی کتابوں میں موجود ہے جو اس دور کے بہترین خطبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔زیاد کا یہ خطبہ البتراء کہلاتا ہے اسے البتراء اس لیے کہا جاتا ہے کہ زیاد نے اپنے اس خطبہ کو بغیر حمد وثنا کے شروع کیا تھا اور بتراء کے معنی عربی میں ناقص یا ادھورے کے آتے ہیں۔اس خطبے کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے:

”أما بعد فإن الجهالة الجَهلاء والضلالة العَمياء، والغى المُوفى بأهله على النار ما فيه سفهاؤكم ويشتمل عليه علماؤكم من الأمور العظام، ينبت فيها الصغير ولا يتحاشى عنها الكبير كأنكم لم تقرؤا كتاب الله ولم تسمعوا ما أعد الله من الثواب الكريم لأهل طاعته والعذاب الأليم لأهل معصيته فى الزمن السرمدى الذى لا يزول، أتكونون كمن صرفتْ عينيه الدنيا، وسدتْ مسامعَه الشهواتُ واختار الفانيةَ على الباقية“۔

(یعنی بدترین جہالت اور تاریک گمرہی اور دوزخ کے عذاب کو واجب کردینے والی کج روی جس میں تمہارے احمق اور بے وقوف لوگ مبتلا ہیں اور جس میں تمہارے عقلمند لوگ بھی برابر کے شریک ہیں وہ یقینا ایک بہت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔اسی صورت حال میں تمہارے بچے پلتے ہیں اور اسی میں تم بڑے ہوکر جیتے ہوتو ایسا لگتا ہے گویا تم نے اللہ کی کتاب پڑھی ہی نہیں۔اللہ نے اپنے فرمانبردار بندوں کے لیے ثواب تیار کیا ہے اور اپنے نافرمان بندوں کے لیے وہ سخت عذاب تیار کیا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، ایسا لگتا ہے اس کے بارے میں تم نے کچھ سنا ہی نہیں۔کیا تم ان لوگوں کی طرح ہوگئے ہو جن کی آنکھوں میں دنیا بس گئی ہو اور شہوتوں نے جن کے کان بند کردیے ہوں، جنھوں نے باقی رہنے والی آخرت کو بھلا کر اس فنا ہونے والی دنیا کو گلے لگا لیا ہو)

10.4.2 طارق بن زیاد

طارق بن زیادہ اموی دور میں مصر کے والی موسیٰ بن نصیر کا ایک غلام تھا۔خود موسیٰ بن نصیر بھی عبدالعزیز بن مروان کا آزاد کردہ غلام تھا۔طارق بن زیادہ کے خاندان اور ذاتی حالات کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتی اور جو معلومات ملتی بھی ہے

اس میں بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔مثلا ان کے نام تک کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کا نام طارق بن زیاد تھا یا طارق بن عمرو تھا۔اسی طرح اس بات کو لے کر بھی اختلاف ہے کہ وہ بربر نسل سے تھے یا بلاد فارس کے موالی قوم سے ان کا تعلق تھا یا کسی اور قبیلے سے البتہ اس بات پر زیادہ تر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام تھے اور موسیٰ نے انھیں طنجہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔اندلس کی فتح میں طارق بن زیاد کا بہت ہی اہم رول تھا۔موسیٰ بن نصیر نے سب سے پہلے جو فوج فتح اندلس کے لیے روانہ کی تھی اس کا سربراہ طارق بن زیاد ہی کو بنایا تھا۔اس بابت ایک قصہ بہت مشہور ہے کہ جب طارق نے اپنے سات سو سپاہیوں کے ساتھ چار کشتیوں پر سوار ہوکر سمندر کو پار کرلیا اور الجزیرۃ الخضراء کے سامنے صخرۃ الاسد نامی پہاڑی پر اپنی کشتیوں کو لنگر انداز کردیا، تب اسپین کے حاکم لذریق کی فوجی طاقت کو دیکھ کر طارق کو یہ اندازہ ہوگیا کہ مقابلہ بے انتہا مشکل ہے اور اس کو جیتنے کے لیے ان کے سپاہیوں کو جان کی بازی لگانی ہوگی، ورنہ سب کے سب لقمۂ اجل بن کر رہیں گے۔اسی لیے طارق نے ان سبھی کشتیوں کو جلانے کا حکم دے دیا جن پر سوار ہوکر ان لوگوں نے سمندر پار کیا تھا تاکہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اب ان کے پاس میدان چھوڑ کر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچا ہے اور اب انھیں سر بہ کفن میدان جنگ میں کودنا پڑے گا۔اس موقع پر اپنے سپاہیوں کے حوصلوں کو بڑھانے کے لیے طارق بن زیاد نے ایک جوشیلہ خطبہ دیا تھا جو نہ صرف بحیثیت ایک کمانڈر کے خطبہ کے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے بلکہ فصاحت و بلاغت کا وہ بہترین نمونہ ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔یہاں اس خطبے کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔

”یا ایھا الناس این المفر، البحر من ورائکم والعدو أمامکم ولیس لکم واللہ إلا الصدق والصبر، واعلموا أنکم فی ھذہ الجزیرۃ أضیع من الأیتام فی مأدبۃ اللآم، وقد استقبلکم عدوکم بجیشہ وأسلحتہ، وأقواتہٗ موفورۃٌ، وأنتم لا وزر لکم إلا سیوفکم ولا أقوات إلا ما تستخلصونہ من أیدی عدوکم، وإن امتدت بکم الأیام علی افتقارکم ولم تنجزوا لکم امرا ذھبتْ ریحُکم، وتعوضت القلوب من رعبھا منکم الجراءۃَ علیکم، فادفعوا عن انفسکم خزلان ھذہ العاقبۃ من أمرکم بمناجزۃ ھذا الطاغیۃ“۔

(یعنی اے لوگو! اب بھاگنے کا راستہ کہاں ہے؟ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے سامنے ہے اور خدا کی قسم اب تمہارے لیے سوائے سچائی و صبر کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تم اس جزیرہ میں ان یتیم بچوں سے زیادہ لاچار اور کم مایہ ہو جو کمینوں کے چنگل میں پھنس گئے ہوں۔تمہارے دشمن نے تمہارا استقبال اپنی فوج سے کیا ہے۔اس کے پاس طاقت، سامان خورد و نوش اور اسلحہ کی فراوانی ہے جبکہ تمہارا تمہاری تلواروں کے سوا نہ کوئی سہارا ہے نہ ہی کوئی مددگار اور نہ ہی کوئی خورد و نوش کا سامان سوائے اس کے جو تم خود سے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین کر حاصل کرلو اور اگر بہت دنوں تک تمہاری محتاجگی اور کسمپرسی قائم رہی اور تم کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکے تو یاد رکھو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔اور یہاں کے لوگوں کے دلوں میں تم سے خوف کے بجائے تم پر دست درازی کرنے کے خیالات پیدا ہونے لگیں گے۔اس لیے اس سرکش حاکم سے ڈٹ کر مقابلہ کرکے اس ذلت آمیز نتیجہ سے اپنے آپ کو محفوظ کرلو۔)

10.4.3 حجاج بن یوسف

ابو محمد حجاج بن یوسف کی پیدائش طائف میں ۲۱ھ ہوئی تھی۔حجاج ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو معاشی اعتبار سے

قدرے تنگ دست تھا۔شروع میں وہ ایک رنگ ریز کے یہاں کام کرتا تھا لیکن بے انتہا دلیر اور چرب زبان تھا۔حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد اموی خلیفہ یزید نے ایک لشکر مدینہ میں اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے روانہ کیا اور اس میں حجاج کو بھی شامل کرلیا گیا۔جب عبدالملک بن مروان خلیفہ ہوا تو اس نے حجاج کو مصعب بن زبیر سے جنگ کرنے اور عراق کو ان کے اثر سے آزاد کرانے کے لیے ایک فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا۔حجاج نے مصعب بن زبیر کو قتل کر کے عراق کو ان کے حامیوں سے آزاد کرالیا اور اسے عبدالملک بن مروان کے زیر نگیں کردیا۔اس کامیابی اور اس کے بعد کئی دوسری جنگی کامیابیوں کے بعد خلیفہ نے حجاج کا مقام بلند کردیا اور اس کی خوب قدر کی۔ ۷۲ھ میں عبدالملک نے ایک لشکر جرار حجاج کی سر براہی میں عبداللہ بن زبیرؓ سے مقابلے کے لیے مکہ کی طرف روانہ کیا۔حجاج نے مکہ پر حملہ کیا اور عبداللہ بن زبیر کو قتل کروا کر مکہ میں سولی پر لٹکوا دیا۔اس موقع پر حجاج نے اہل مکہ کے سامنے ایک خطبہ دیا تھا جو اس طرح تھا:

”یا أهل الحجاز، كيف رأيتموني، الم أكشف ظلمة الجور وطخية الباطل بنور الحق، والله لقد وَطِئَكم الحجاجُ وطأةَ مشفق وعطفة رحم ووصل قرابة، فاياكم أن تزلوا عن سنن أقمناكم عليه، فأقطع عنكم ما وصَله لكم بالصارم البتار وأقيم من أَوَدكم مايقيم المثقفُ من أودالقناة بالنار، ثم نزل وهو يقول

أخو العرب إن عَضَّتْ به الحربُ عَضَّها

وإن شَمَّرتْ عن ساقها الحربُ شمرا

یعنی اے حجاز کے لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا؟ کیا میں نے ظلم کی تاریکی اور باطل کے اندھیرے سے پردہ ہٹا کر نور حق سے دنیا کو منور نہیں کردیا؟ خدا کی قسم تمہاری سرزمین پر حجاج نے ایک مشفق،قریبی،ایک عزیز اور رشتہ دار کی طرح قدم رکھا ہے اس لیے خبردار اس راستہ سے ہرگز نہ ہٹنا جس کو ہم نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے، ورنہ جو کچھ میں نے تم کو دیا ہے اسے دھاردار تلوار سے کاٹ کے رکھ دوں گا اور تمہاری کج روی کو آگ کے ذریعہ ایسے ہی سیدھا کردوں گا جیسے نیزے کی کجی کو نیزہ درست کرنے والا آگ سے دور کرتا ہے۔پھر وہ منبر سے اترا اور یہ شعر پڑھا: میں ایک ایسا جنگجو سپاہی ہوں کہ اگر جنگ اسے کاٹے گی تو وہ بھی اسے کاٹے بغیر نہ چھوڑے گا اور جنگ شروع ہوجائے تو وہ بھی اس کے لیے تیار رہے گا۔

حجاج کو جب عراق کا والی بنا کر بھیجا گیا تب اس نے اہل عراق کے سامنے بھی ایسی ہی جوشیلی اور زبردست تقریریں کیں کہ اہل عراق کے دل دہل گئے اور روح کانپ اٹھی۔حجاج کے یہ خطبے تاریخ وادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور ادب کے شہہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عراق پہنچ کر حجاج نے جو تقریر اہل عراق کے سامنے کی تھی اس کی ایک جھلکی یہاں پیش کی جاتی ہے۔

”والله يا أهل العراق إن امير المؤمنين عبدَ الملك نَثَل كنانتَهُ بين يديه، فعَجَمَ عيدانَها عوداً عوداً، فوجدني أَمرَّها عوداً وأشدها مسكاً، فوجهني إليكم ورماكم به، يا أهل العراق، يا أهل النفاق والشقاق ومساوئ الأخلاق، إنكم طالما أوضعتم في الفتنة، واضطجعتم في مناخ الضلال، وسننتم سنن الغي، وأيم الله لألحونكم لحو العود، ولأقرعنكم قرع المروة، ولأعصبنكم عصب السلمة، ولأضربنكم ضرب غرائب الإبل“۔

(یعنی اے عراق کے لوگو! اللہ کی قسم امیر المؤمنین عبدالملک نے اپنے ترکش کے سارے تیر نکال کر ہر ایک کو دانت سے چبا کر دیکھا اور ان میں سے مجھ کو ہی سب سے زیادہ کڑوا، سخت اور مشکل سے ٹوٹنے والا پایا، اس لیے تم کو مجھ سے ہی مارا، اے عراق کے لوگو! تم نفاق اور اختلاف کی جڑ ہو اور تم بدترین اخلاق کے حامل ہو، تم فتنہ وفساد کی طرف تیزی سے بڑھتے ہو اور ضلالت وگمراہی کے بستروں پر سوتے ہو، خدا کی قسم میں تم لوگوں کی ایسے ہی کھال کھینچوں گا جیسے کسی لکڑی کی چھال اتاری جاتی ہے اور میں تمہاری ڈنڈوں سے ایسے ہی پٹائی کروں گا جس طرح مسلمہ نامی درخت کو اس کے پتے جھاڑنے کے لیے پیٹا جاتا ہے اور میں تمہیں ایسے ہی ماروں گا جیسے لوگ انجانے اونٹوں کو اپنے کنوؤں سے بھگانے کے لیے مارتے ہیں)

10.4.4 حسن بصری

حسن بصری کی پیدائش مدینہ میں ۲۱ھ میں ہوئی۔ ان کی والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ ان کا رجحان بچپن سے ہی دینداری اور تحصیل علم کی طرف تھا۔ اس دور میں جاری سیاسی سرگرمیوں میں انہوں نے کبھی بھی دلچسپی نہیں لی۔ گویا انہوں نے خود کو دین پر عمل کرنے اور اس کی خدمت کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا، وہ اپنا زیادہ تر وقت قرآن وحدیث کے مطالعہ میں ہی گزارا کرتے تھے۔ ان سے بہت سی احادیث بھی مروی ہیں۔ جب مشرق کی جانب فوجی مہم زوروں پر تھی تب وہ بھی اس میں شریک ہوئے اور خراسان کے بعض والیوں کے یہاں کچھ دفتری کام پر مامور ہوئے اور تقریباً دس سال تک اس کام سے منسلک رہے۔ اس کے بعد ۱۱۰ھ میں اپنی وفات تک بصرہ میں ہی گوشہ نشین رہے اور دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کا شمار ان کے عہد کے اہم واعظین میں ہوتا ہے۔ فصاحت وبلاغت میں بھی ان کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔

ویسے تو بنوامیہ کے دیگر خلفا کے یہاں بھی ان کا مقام ومرتبہ بہت بلند تھا لیکن بطور خاص حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں انہیں بہت ہی خاص مقام حاصل ہوا کیوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز خود ایک متقی وصالح خلیفہ تھے اور وہ ایسے لوگوں کو بہت پسند کیا کرتے تھے۔ **البیان والتبیین**، **العقد الفرید** اور **عیون الأخبار** جیسے ادب کے اہم اور مستند مراجع میں حسن بصری کے خطبوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو آپ کی واعظانہ اور خطیبانہ صلاحیت کا پختہ ثبوت پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے خطبوں میں اکثر تقویٰ اور عمل صالح اور آخرت کی تیاری کرنے پر ابھارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک خطبہ میں آپ فرماتے ہیں:

"یاابن آدم بع دنیاک بآخرتک تربحهما جمیعاً، ولا تبع آخرتک بدنیاک فتخسرهما جمیعاً، یا ابن آدم إذا رأیت الناس فی الخیر فنافسهم فیه، وإذا رأیتهم فی الشر فلا تغبطهم به، الثواء هاهنا قلیل والبقاء هناک طویل۔"

(یعنی اے ابن آدم اپنی دنیا کو آخرت کے بدلے بیچ دے تو تجھے دونوں چیزیں مل جائیں گی۔ اور اپنی آخرت کو دنیا کے بدلے مت بیچ ورنہ دونوں ہاتھ سے جائیں گی۔ جب لوگوں کو خیر کے کام کرتے دیکھو تو اس میں ان کا مقابلہ کرو اور جب انھیں کوئی برائی کرتے دیکھو تو ان پر رشک نہ کرو، اس دنیا میں بہت کم رہنا ہے مگر آخرت میں بہت رہنا ہے)

بسا اوقات آپ اپنے خطبے میں قرآن کی کسی آیت کی دل نشین انداز میں تشریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے قرآن کی آیت "إِنَّا

عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً" کو کچھ اس طرح اپنے وعظ میں سمجھایا کہ:

"إن قوما غَدَوا في المطارف العتاق والعمائم الرقاق يطلبون الإمارات ويضيعون الأمانات، يتعرضون للبلاء وهم منه في عافية، حتى إذا أخافوا من فوقهم من أهل العفة وظلموا من تحتهم من أهل الذمة، اهزلوا دينهم وأسمنوا براذينهم، ووسعوا دورهم وضيقوا قبورهم"۔

(یعنی بے شک وہ لوگ جو ریشم کے بہترین لباس زیب تن کیے ہوئے اور سروں پر بہت ہی باریک کپڑوں کے عمامے باندھے ہوئے حکومت و بادشاہت کو طلب کرتے ہیں اور امانتوں کو ضائع کردیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو ان مصیبتوں اور پریشانیوں کے حوالے کردیتے ہیں جن سے وہ محفوظ تھے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے اپنے سے بلندتر پاک دامن اور نیک لوگوں کو ڈرانا شروع کردیا اور اپنے ماتحت ذمیوں پر ظلم ڈھانا شروع کردیا تو انہوں نے اپنے دین کو کمزور اور اپنی سواریوں کو موٹا کرنا شروع کردیا (یعنی دین کو بھلا کر مال و دولت لوٹنے میں لگ گئے) اور اپنے گھروں کو کشادہ کرلیا اور اپنی قبروں کو تنگ کرنا شروع کردیا۔)

10.5 اکتسابی نتائج

عربوں کو شروع سے ہی خطابت میں بے پایاں مہارت حاصل تھی، عہد جاہلیت اور عصر رسول وخلافت راشدہ میں عربوں نے خطابت میں جو جوہر دکھائے اس کے نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن عصر اموی کو عربی خطابت کا سنہری دور کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا، کیوں کہ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا کہ جس انداز سے خلافت راشدہ کے آخری ایام میں اور اس کے بعد جو سیاسی اتھل پتھل اور افراتفری برپا ہوئی اور مختلف سیاسی وغیر سیاسی جماعتیں جس طرح سے آپس میں نبرد آزما ہوئیں اس طرح کے ماحول میں خطابت جیسے فن کو فروغ حاصل ہونا ایک فطری بات تھی اور ایسا ہی ہوا کہ ہر جماعت کے اپنے خطیب ہوا کرتے تھے جو اپنی جماعت کے موقف اور عقائد کو پیش کرتے تھے اور ان کا دفاع کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے الزامات اور حملوں کا جواب دیتے تھے، امویوں کے اپنے خطیب تھے جن میں زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف کے نام نمایاں ہیں، جب کہ شیعوں اور خوارج کے اپنے خطیب تھے جن میں سلیمان بن صرف، مختار ثقفی، نافع بن ازرق، واصل بن عطاء، قطری بن فجاءۃ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، عبداللہ بن زبیر خود ایک اچھے خطیب تھے، ان کے علاوہ سحبان وائل، احنف بن قیس اور حسن بصری جیسے خطیب بھی فن خطابت میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ غرض یہ کہ یہ دور فن خطابت کے ارتقا کے لیے بہت ہی سازگار دور ثابت ہوا ہے لہٰذا اگر اسے عربی خطابت کا سنہرا دور کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔

10.6 نمونے کے امتحانی سوالات

(۱) عصر اموی میں فن خطابت کے ارتقا کے اہم اسباب کیا تھے، ان پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

(۲) عصری اموی میں سیاسی خطابت کی اہمیت اور ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

(۳) درباری خطابت سے کیا مراد ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

(۴) اموی دور میں واعظانہ خطابت اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

(۵) اموی دور کے ان اہم خطبا میں سے کسی دو کے اوپر ایک مختصر نوٹ لکھیے

(۱) حجاج بن یوسف (۲) زیاد بن ابیہ (۳) طارق بن زیاد (۴) حسن بصری

10.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔	تاریخ الأدب العربي، العصر الإسلامي	شوقي ضيف
۲۔	تاریخ الأدب العربي	عمر فروخ
۳۔	أدب العرب	زبید احمد
۴۔	الجامع في تاریخ الأدب العربی	حنا الفاخوري
۵۔	تاریخ الأدب العربي	أحمد حسن الزيات
۶۔	تاریخ عربی ادب	ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی

(https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3)

اکائی 11 خطوط نویسی اور وصیتیں

اکائی کے اجزا

11.1 مقصد

11.2 تمہید

11.3 عصر اموی میں خطوط نویسی

11.3.1 سیاسی خطوط نویسی

11.3.1.1 خوارج کی خطوط نگاری

11.3.1.2 شیعوں کی خطوط نگاری

11.3.1.3 بنو امیہ کی خطوط نگاری

11.3.2 واعظانہ خطوط نویسی

11.3.3 ذاتی خطوط

11.3.4 دیوان الرسائل

11.4 عصر اموی میں توصیات یا ادب الوصایا

11.4.1 عصر جاہلی میں ادب الوصایا

11.4.2 عصر رسول اور خلافت راشدہ میں ادب الوصایا

11.4.3 عصر اموی میں ادب الوصایا

11.5 اکتسابی نتائج

11.6 نمونے کے امتحانی سوالات

11.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

11.1 مقصد

اس اکائی کا اصل مقصد اموی دور میں خط وکتابت اور أدب الوصایا توصیات کا جو سلسلہ قائم ہوا اس کا ایک مختصر تعارف پیش کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ اس دور کے خطوط اور وصیتیں ادبی اہمیت کی حامل ہیں اور ان سے اس دور کے حالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

11.2 تمہید

خطوط نویسی اور أدب الوصایا کو قدیم ادب کا ایک اہم حصہ مانا جاتا ہے اور یہ بات جگہ بالکل صحیح ہے۔ ان دونوں نثری فنون کے ذریعہ ہمیں متعلقہ عہد کے احوال وکوائف اور حالات زندگی کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ عصر اموی کے جو خطوط اور وصیتیں ہم تک پہنچی ہیں وہ ایک طرف جہاں اپنی ادبی اور فنی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتی ہیں اور اہم سرمایہ مانی جاتی ہیں تو وہیں وہ خطوط اور وصیتیں اس عہد کے سیاسی، سماجی، دینی حالات اور لوگوں کے ذاتی حالات کے بہت سے پہلوؤں کو ہمارے سامنے اجاگر کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس عہد کے بہت سے خطوط اور بہت سی وصیتیں ہم تک نہ پہنچ سکیں لیکن جو کچھ بھی ہم تک پہنچ سکی ہیں وہ یقیناً اہم ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو خطوط اس عہد کے ہم تک پہنچے ہیں ان میں سیاسی خطوط بھی ہیں مثلاً بنو امیہ کے خلفا اور والیوں کے لکھے ہوئے خطوط یا خوارج، شیعہ اور عبداللہ بن زبیر کے جماعت کے ذریعہ لکھے ہوئے خطوط، وہیں ان میں واعظانہ اور ناصحانہ خطوط بھی شامل ہیں۔ اسی طرح اس دور کے بہت سے ذاتی خطوط بھی ہم تک پہنچے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اموی خلفا نے ایک شعبہ بھی سرکاری خط وکتابت کے لیے خاص کر رکھا تھا جس میں سرکاری خطوط کو لکھنے اور انہیں ارسال کرنے کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ شعبہ دیوان الرسائل کہلاتا تھا۔ اس عہد کی خطوط نویسی سے متعلق ان سبھی پہلوؤں کا اس اکائی کے تحت تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

جہاں تک بات اس دور کے أدب الوصایا یا وصیتوں کی ہے تو ان پر بھی عموماً ادبی رنگ غالب ہوتا تھا اور وہ سیاسی وغیر سیاسی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔ اس موضوع کے تحت اس اکائی میں سب سے پہلے أدب الوصایا کا مختصر پس منظر پیش کیا گیا ہے اور عہد جاہلی وعہد اسلامی میں اس کی اہمیت پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ عصر اموی میں وصیتوں کی جو مختلف شکلیں موجود تھیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور کچھ مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے اس دور کے نثری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

11.3 عصر اموی میں خطوط نویسی

خط وکتابت اور مراسلت کو اس دور کے نثری سرمایہ کا ایک اہم حصہ مانا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اگرچہ عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی جاری تھا اور اس دور کے خطوط کے نمونے تاریخ وادب کے مصادر میں موجود ہیں۔ اموی دور میں چونکہ اسلامی ریاست بہت وسیع و عریض ہو چکی تھی اس لیے خلیفہ اور والیوں کو اپنے ماتحت علاقوں میں موجود اپنے قائدین اور نمائندوں سے رابطے کے لیے خط وکتابت کا ہی سہارا لینا پڑتا تھا، اس کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ویسے تو اس دور کے جو خطوط مختلف مراجع کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کچھ مراجع قابل اعتماد یا مستند نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان میں مذکور متعدد خطوط کو ہم پورے یقین کے ساتھ نہیں لے سکتے، البتہ کچھ مستند مراجع جیسے جاحظ کی

البیان والتبیین، امام طبری کی تاریخ الطبري اور مبرد کی الکامل وغیرہ ایسے مراجع ہیں جن میں کثیر تعداد میں اس دور کے خطوط موجود ہیں جن کی روشنی میں اس دور میں فن خطوط نویسی کے ارتقا کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان مراجع میں امام طبری کی تاریخ کو خاص طور سے اہم مرجع مانا جاتا ہے۔

اس دور کے جو خطوط ہم تک پہنچے ہیں ان میں اگرچہ خوارج، شیعہ، عبداللہ بن زبیر، بنوامیہ اور واعظین جیسی جماعتوں کے خطوط موجود ہیں، لیکن سب سے زیادہ خطوط جو ان مراجع میں موجود ہیں وہ خوارج کی طرف منسوب ہیں۔

فرقۂ خوارج کے اندر جو آپسی اختلافات تھے ان سے ہم سب بخوبی واقف ہیں، یہ فرقہ بنیادی طور پر چار فرقوں یعنی ازارقہ، نجدیہ، صفریہ اور اباضیہ میں منقسم تھا اور آپس میں فکری اور سیاسی اختلافات اپنے عروج پر تھے، ان فرقوں کے رہنماؤں اور قائدین کے درمیان مختلف مسائل کو لے کر خوب خط وکتابت ہوتی تھی، مثال کے طور پر ازارقہ کے قائدین نافع بن ازرق اور قطری بن الفجاءہ کی جو خط وکتابت حجاج بن یوسف سے ہوئی اس کو اس عہد کی خط وکتابت کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ان خطوط میں ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے تھے۔

اگر ہم اس دور میں شیعوں کے خطوط کی بات کریں تو جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ ان کی تعداد بے شمار ہے، البتہ زیادہ تر غیر مستند کتابوں کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، جماعت شیعہ کے جو خطوط ہم تک اس دور کے پہنچے ہیں ان میں وہ خطوط خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کو ان کے قائدین نے اپنے متبعین کے نام روانہ کیا، جیسے سلیمان بن صرد اور مختار الثقفی وغیرہ، اس کے علاوہ ان کے وہ خطوط بھی موجود ہیں جو انہوں نے دوسری جماعتوں اور فرقوں کے قائدین اور رہنماؤں کے نام لکھے تھے۔ ایسے ہی تاریخ کی کتابوں میں عبداللہ بن الزبیر اور ان کے والیوں کے کئی خطوط موجود ہیں، ان میں عبداللہ بن زبیر کا وہ خط بھی ہے جو انہوں نے شیعہ رہنما مختار الثقفی کے نام لکھا تھا، رہی بات بنوامیہ کی تو چونکہ وہ صاحب اقتدار تھے اس لیے انتظامی امور کی ادائیگی کے لیے خط وکتابت ان کی ایک بنیادی ضرورت تھی، چنانچہ خلفا اپنے والیوں کو خطوط بھیجا کرتے تھے اور والی ان کے خطوط کا جواب لکھتے تھے، اسی طرح قائدین جب بھی کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تو فوراً خط لکھ کر اپنے والی اور خلیفہ کی جانب روانہ کرتے تھے، بہت سے معاہدے بھی خطوط کے ذریعہ روانہ کیے جاتے تھے۔

اس ضمن میں خاص طور سے اولین دور میں جن خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں زیاد بن ابیہ اور امیر معاویہ کے درمیان ہونے والی خط وکتابت، یزید بن معاویہ اور حجاز میں موجود ان کے والیوں کے درمیان ہونے والی مراسلت اور یزید اور عراق میں ان کے والی عبیداللہ بن زیادہ کے درمیان ہونے والی خط وکتابت قابل ذکر ہے۔ عبدالملک بن مروان کا عہد اس حوالہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اسی کے عہد میں سب سے زیادہ خط وکتابت ہوئی اور اس میں بھی خاص طور سے خلیفہ اور اس کے والی حجاج بن یوسف کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی وہ اس دور کی خط وکتابت کا اہم سرمایہ مانا جاتا ہے۔ خود حجاج بھی اپنے قائدین اور ماتحتوں سے کثرت سے خط وکتابت کیا کرتا تھا۔ اسی طرح حجاج اور اس کے مخالفین اور باغیوں کے درمیان بھی خوب خط وکتابت ہوتی تھی جس کے نمونے تاریخ وادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ حجاج کا جس طرح خطابت میں اپنا ایک منفرد انداز تھا اسی طرح خط وکتابت میں بھی اس کا ایک خاص انداز تھا۔

اس کے علاوہ وعظ ونصیحت پر مبنی کچھ خطوط بھی اس عہد کے ہم تک پہنچے ہیں۔ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں ذکر کیا جاتا

ہے کہ وہ واعظین کو خط لکھ کر ان سے یہ گزارش کرتے تھے کہ وہ انھیں اپنی طرف سے نصیحت لکھ کر بھیجیں چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کے امام حسن بصری کو لکھا کہ وہ ان کو مفید شوروں اور نصیحتوں سے نوازیں چنانچہ حسن بصری نے ان کو ایک خط اس بابت لکھا جو اس دور کی خط و کتابت کے اہم نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس خط میں امام صاحب نے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق، بعث بعد الموت اور تقویٰ جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

جاحظ نے حسن بصری کی فصاحت و بلاغت کی خاص طور سے بہت تعریف کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے بعد کے دور میں بھی ان کے اسلوب کو لوگ اپناتے رہے۔

سیاسی اور دینی خط و کتابت کے علاوہ شخصی خط و کتابت کو بھی اس دور میں رواج حاصل ہوا، چونکہ اب اسلامی ریاست بہت وسیع و عریض ہو چکی تھی اس لیے خط و کتابت کے ذریعہ ہی ایک دوسرے تک اپنا پیغام پہنچانا اور خیر خبر لینا ممکن تھا، لہٰذا شخصی خط و کتابت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوا لیکن اس نوعیت کے زیادہ تر خطوط ہم تک اس طرح نہیں پہنچ سکے جس طرح دوسری اقسام کے خطوط ہم تک پہنچے ہیں۔ اس قسم کے جو خطوط بھی ہم تک پہنچے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی خطوط میں بھی زبان و بیان کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا ان میں بھی عبارتیں مسجع اور مقفی ہوا کرتی تھیں۔

11.3.1 سیاسی خطوط نویسی

11.3.1.1 خوارج کی خطوط نگاری

ازارقہ کی جماعت نے اپنے رہنما نافع بن ازرق کی سربراہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ ہر وہ بات جو انھیں غلط معلوم ہوگی اس کے خلاف انہیں تلوار نکال لینا ہے، چاہے اس کے لیے مسلمانوں کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے اور معصوم بچوں تک کو قتل کرنا پڑے جب کہ خوارج کی ہی دیگر جماعتوں نے ان کے اس موقف کی سختی سے مخالفت کی۔ اس طرح کے موضوعات کو لے کر ان فرقوں میں آپس میں خط و کتابت کی ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ اس نوعیت کے دو خطوط مبرد نے اپنی کتاب الکامل میں ذکر کیے ہیں جن کا تبادلہ نجدات فرقہ کے سربراہ نجدہ بن عامر حنفی اور ازارقہ فرقہ کے سربراہ نافع بن ازرق کے درمیان ہوا تھا۔ اس خط میں نجدہ نافع پر حملہ کرتا ہے اور پھر نافع اس کا جواب دیتا ہے۔ دونوں ہی خط فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار کے حامل اور نہایت دلچسپ ہیں۔

ایسے ہی جب ازارقہ کی جماعت نے اپنے ایک دوسرے رہنما قطری بن الفجاءۃ کی سربراہی میں جب اس وقت کے گورنر عراق حجاج بن یوسف کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا تو اس موقع پر بھی دونوں رہنماؤں اور سپہ سالاروں میں خط و کتابت کا سلسلہ پورے شد و مد کے ساتھ جاری رہا، چنانچہ حجاج نے قطری کو دھمکی آمیز خط لکھ کر اس کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی تو وہیں قطری نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے حجاج کے خط کا سخت لب و لہجے میں جواب دیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان دونوں خطوط کی کچھ عبارتیں نقل کی جائیں تاکہ اس دور کی سیاسی خط و کتابت کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجائے اور ہمیں اس کے اسلوب اور انداز و بیان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ حجاج بن یوسف نے قطری کے نام جو خط لکھا وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"سلام علیک۔ أما بعد! فإنک مَرَقْتَ من الدین مُروقَ السهم من الرَّمِيَة، وقد علمتَ حیث تَجرْثَمتَ، ذلک انک

عاص لله ولو لاة أمره، غير انک اعرابی جِلفٌ أمّي تستطعم الكسرةَ وتستشفی بالتمرة، والأمور عليک حسرةٌ، خرجتَ لتنال شبعة، فلحق بک طَغامٌ صلوا بم صليت به من العيش فهم يهزون الرماح ويستنشو ؤن الرياح على خوف و جهد من امورهم، وماأصبحوا ينتظرون اعظم مما جهلوا معرفته، ثم أهلكهم الله بنزحتين۔ والسلام"

(ترجمہ:تم پر سلامتی ہو،تم دین سے ایسے ہی نکل گئے ہو جیسے کوئی تیر اپنے شکار کو چیرتے ہوئے نکل جاتا ہے اورتم نے کیا غلطی کی ہے یہ تم بخوبی جانتے ہو،تم نے اللہ اور اس کے اولیا کی نافرمانی کی ہے، اس کے علاوہ تم سخت مزاج بدو ہو اور ان پڑھ ہو اور دوسروں کے نوالوں پر جیتے ہو اور صرف کھجور کھا کر اپنا علاج کرتے ہو اور تمہارا ہر معاملہ تمہارے لیے افسوس اور حسرت و ندامت کا سبب بنتا ہے،تم اپنی بھوک مٹانے نکلے تھے اور غنڈے موالی تمہارے ساتھ ہو لیے اور وہ بھی تمہاری ہی طرح جینے لگے، ہوا میں نیزے لہراتے ہیں جب کہ پیٹ بالکل خالی ہوتا ہے، دل میں خوف ہوتا ہے اور تھکن سے چور ہوتے ہیں اور انھیں یہ بھی نہیں پتہ کہ جو چیز آنے والی ہے وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس کی وہ توقع کر رہے ہیں، آخرکار اللہ نے انھیں دو شکستوں سے دوچار کیا)

حجاج کے اس خط کے جواب میں قطری نے جو خط لکھ کر روانہ کیا اس کے چند ابتدائی جملے آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں:

"سلام على الهداة من الولاة الذين يَرعون حريمَ الله ويَرهبون نقمه، فالحمد لله على ما أظهر من دينه، وأظلع به أهلَ السفال وهَدى به من الضلال ونصر به عند استخفافک بحقه، كتبتَ إليّ تذكر أني اعرابی جِلفٌ أميٌّ أستطعم الكسرة وأستشفی بالتمرة، ولَعمری يا ابن ام الحجاج إنک لمُتَيَّهٌ في جبلتک مُطَلْخِمٌ في طريقتک، واه في وثيقتک، لا تعرف الله ولا تجزع من خطيئتک، يئستَ واستيأستَ من ربک فالشيطان قرينک"

(ترجمہ: سلامتی ہو ان والیوں پر جو دوسروں کو راہ دکھاتے ہیں اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور اس کے عقاب سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، اس دین حق کے لیے جسے اللہ نے ظاہر کر دیا اور گھٹیا اور ذلیل قسم کے لوگوں کو خوار کر دیا جس کے ذریعہ اس نے گمراہی سے نجات دی اور اس کے ذریعہ سے اس وقت لوگوں کی مدد کی جب تم نے اس کے حقوق کو پامال کیا۔تم نے مجھے خط لکھ کر یہ کہا کہ میں سخت مزاج بدو ہوں اور ان پڑھ ہوں، دوسروں کے ٹکڑوں اور نوالوں پر جیتا ہوں اور صرف کھجور سے علاج کرتا ہوں،تو سن لے اے اپنی ماں کی اولاد میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تو تو فطری طور پر ایک گمراہ انسان ہے، تیرے ہر کام میں ٹیڑھ اور کجی پائی جاتی ہے،تو بالکل بھی بھروسے کے لائق نہیں ہے، نہ ہی تو اللہ کو ٹھیک سے جانتا ہے اور نہ ہی تو اپنی غلطی پر کبھی شرمندہ ہوتا ہے،تو خود سے بھی مایوس ہو چکا ہے اور اپنے رب سے بھی مایوس ہو چکا ہے اور شیطان ہی تیرا اصل دوست ہے)

ان دونوں خطوط میں ایک طرف تو ہمیں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار نظر آتا ہے، سجع وقافیہ اور طباق و جناس کی تزئین کاری کا غلبہ نظر آتا ہے، بھاری بھرکم اور مؤثر الفاظ کی کثرت نظر آتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان میں ہمیں بے انتہا بے باک اور جری لب ولہجہ نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کوئی خط یا کوئی مجموعہ الفاظ نہیں بلکہ تیروں اور تلواروں کی بوچھار ہو جو دشمن کے دل و دماغ کو تار تار کر کے رکھ دے اور اس کے نفس کو چھلنی کر دے۔ یہ انداز تھا اس دور کی سیاسی خطوط نگاری کا۔ ان خطوط میں ایک بات جو مشترک نظر آتی ہے وہ ہے السلام علیکم سے ان کی شروعات۔ یہ اس دور کے اسلوب کی ایک خوبی تھی کہ خطوط کو اکثر سلام یا بسم اللہ سے شروع کیا جاتا تھا۔

11.3.1.2 شیعوں کی خطوط نگاری

شیعہ فرقہ کے خطوط کی ایک کثیر تعداد تاریخ وادب کے مختلف مراجع میں محفوظ ہے جس سے اس دور کی خطوط نگاری کے انداز اور بطور خاص اس پر چڑھے مذہبی رنگ کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔شیعوں کے درمیان خط وکتابت نے اس وقت زور پکڑ لیا جب اہل کوفہ نے حضرت حسین کو کوفہ کی طرف کوچ کرنے پر آمادہ کیا تا کہ وہ بنوامیہ کے خلاف جنگ میں باقاعدہ شریک ہوسکیں اور ان کو خلافت سے برطرف کر کے خلافت اس کے اصل حقداروں کو دی جا سکے۔اس کے بعد حالات بہت تیزی سے بدلے یہاں تک کہ حضرت حسین کی شہادت کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا، اس کے بعد توابین کی تحریک چلی جس میں اس کے رہنما سلیمان بن صرد نے حسرت وندامت کا لبادہ اوڑھ کر قاتلین حسین سے انتقام کا اعلان کیا، سلیمان اور اس کے ساتھیوں کے درمیان بھی خط وکتابت کا سلسلہ جاری ہوا جس کے نمونے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اس کے بعد عبداللہ بن زبیر کے عہد میں مختار ثقفی نے علم بغاوت بلند کیا اور کوفہ پر قبضہ کر لیا، مختار اور اس کی جماعت کے دوسرے سپہ سالاروں اور قائدین کے درمیان جن خطوط کا تبادلہ ہوا وہ بھی تاریخ وادب کے مراجع میں محفوظ ہیں، انھیں میں سے ایک خط وہ ہے جو مختار نے بنوتمیم کے قائد احنف بن قیس کے نام لکھا تھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، من المختار بن ابی عبید الی الأحنف بن قیس، و من قِبَلَهٗ، فسلم أنتم، أما بعد فویلُ ام ربیعة من مضر، فإن الأحنف مُورِدُ قومه سَقر، حیث لا یستطیع لهم الصدر، وإنی لا أملک ما خُطَّ فی القدر، وقد بلغنی انکم تسمونني كذابا، وإن كُذِّبْتُ فقد كذبتْ رسلٌ من قبلی، ولست بخیر من كثیر منهم"

(ترجمہ: بسم اللہ الرحمن الرحیم، مختار بن ابی عبید کی طرف سے احنف بن قیس اور اس کی جماعت کے نام، تم پر سلامتی ہو، امابعد! مضر سے تعلق رکھنے والے مضر قبیلہ پر مجھے حیرت ہوئی ہے، احنف اپنی قوم کو جہنم رسید کرنا چاہتا ہے، جہاں پہنچ کر وہ ان کا دفاع بھی نہیں کرسکتا، تقدیر میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ میری ملکیت میں نہیں ہے، مجھے پتہ چلا ہے کہ تم لوگ مجھے جھوٹا کہتے ہو، اگر میں نے جھوٹ بولا ہے تو مجھ سے پہلے بہت سے نبیوں نے بھی جھوٹ بولا ہے اور میں بہرحال ان سے بہتر نہیں ہوں)

اسی طرح سے امام طبری نے حضرت زبیر بن عوام اور عراق میں موجود ان کے والیوں کے درمیان ہونے والی خط وکتابت کے کئی نمونے پیش کیے ہیں۔

11.3.1.3 بنوامیہ کی خطوط نگاری

جہاں تک خود بنوامیہ کے خلفا، امرا اور حکام اور والیوں کی بات ہے تو ان کے مابین خط وکتابت دیگر سیاسی جماعتوں کے بمقابل کہیں زیادہ تھی، اسی طرح بنوامیہ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے درمیان بھی خط وکتابت بہت زور وشور کے ساتھ جاری رہی۔خطوط کے ذریعہ خلیفہ عہد نامے لکھ کر مختلف علاقوں میں موجود اپنے والیوں کے نام روانہ کیا کرتے تھے بلکہ خلفا اور ان کے والیوں کے درمیان ہر چھوٹے بڑے معاملہ پر خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ قائم رہتا تھا، جیسے قائدین جب بھی کوئی نیا مشن سر کرتے یا کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تو فوراً خط لکھ کر خلیفہ کو یہ خوش خبری سناتے یا جب بھی خلافت اسلامیہ کے کسی گوشے میں کوئی بغاوت سر اٹھاتی تو اس علاقے میں موجود خلیفہ کے والی فوراً خلیفہ کو اس سے باخبر کرتے

اور مدد مانگتے مثال کے طور پر جب حجر بن عدی اور اس کے شیعہ ساتھیوں نے علم بغاوت بلند کیا تو زیاد بن ابیہ نے فوراً حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دی اور خلیفہ نے اس کا جواب دیا، ایسے ہی یزید بن معاویہ اور حجاز میں متعین اس کے والیوں کے درمیان عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی کے خلاف جنگی مہم کے سلسلے میں خط وکتابت ہوئی۔ اسی طرح جب حضرت حسین کوفہ پہنچے اور بعد میں جو واقعات پیش آئے اس سلسلے میں خلیفہ یزید بن معاویہ اور عبیداللہ بن زیاد کے درمیان خوب خط وکتابت ہوئی۔ یہ سارے خطوط تاریخ طبری اور دیگر مراجع میں موجود ہیں۔

اس دور میں سیاسی خط وکتابت کا جو سلسلہ پہلے اموی خلیفہ معاویہ کے ذریعہ شروع ہوا وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور میں اپنے شباب پر پہنچ گیا، بطور خاص عبدالملک اور اس کے گورنر حجاج بن یوسف کے درمیان بکثرت خط وکتابت ہوئی۔ حجاج بن یوسف جہاں ایک طرف ایک بہترین شعلہ بیان خطیب تھا تو وہیں خطوط نویسی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھا۔ عراق اور خراسان میں جو بغاوتیں ظاہر ہوئیں انہیں کچلنے کی ذمہ داری حجاج کو ہی سونپی گئی تھی چنانچہ میدان جنگ کی ہر خبر حجاج خلیفہ کو خط کے ذریعہ بھیجا کرتا تھا، ساتھ ہی ساتھ خود اپنے قائدین اور سپہ سالاروں کے ساتھ اس کی خط وکتابت بہت کثرت سے ہوا کرتی تھی۔ حجاج کا مزاج اور لب ولہجہ اس قدر سخت تھا کہ وہ بنوامیہ کی سر برآوردہ شخصیات تک کو بھی نہیں بخشتا تھا چنانچہ ایک بار اس نے ولی عہد سلیمان بن عبدالملک کو جس سے اس کی کچھ ان بن ہوگئی تھی، یہ خط لکھ کر بھیجا: ”

إنما أنت نقطة من مِداد، فإن رأيتَ فِيَّ ما رأى ابوک واخوک کنتُ لک کما کنتُ لهما وإلا فأنا الحجاج وأنت النقطة، فإن شئتُ محوتک وإن شئتُ اثبتک“

(ترجمہ: تمہاری حیثیت روشنائی کے ایک نقطہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اگر میرے بارے میں تمہاری رائے وہی رہی جو تمہارے باپ اور بھائی کی تھی تو میں میری رائے بھی تمہارے تئیں ایسے ہی رہے گی جیسی ان کے لیے تھی، ورنہ یاد رکھنا کہ میں حجاج ہوں اور تم روشنائی کا ایک نقطہ، اگر میں چاہوں تو تمہیں مٹا دوں اور اگر چاہوں تو تمہیں باقی رکھوں)

یقیناً حجاج کا یہ انداز اور یہ سخت لب ولہجہ اس کی تقریروں کی یاد دلا دیتا ہے جن میں وہ کسی شیر کی طرح دھاڑتا اور گرجتا ہوا نظر آتا ہے۔ حجاج کے یہ خطوط اس دور کی خطوط نویسی کے بہترین نمونے شمار کیے جاتے ہیں، فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے حجاج کے خطوط کو بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔

11.3.2 واعظانہ خطوط نویسی

پہلی صدی ہجری کے آخر میں سیاسی خطوط کے ساتھ ساتھ واعظانہ اور ناصحانہ خطوط کا بھی چلن ہونے لگا، اس سلسلے میں متقی و پرہیزگار خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ خلفائے بنوامیہ میں انہیں کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ خود بھی اپنے ماتحتوں کو وعظ ونصیحت کرتے تھے اور اس بات کو بہت پسند بھی کرتے تھے کہ اہل علم اور اہل تقویٰ ان کو وعظ ونصیحت کرتے رہیں۔ ان کے برعکس دیگر اموی خلفا اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی ان کی طرف انگلی اٹھائے یا انہیں وعظ ونصیحت کرے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کے ایک متقی و پرہیزگار واعظ اور ناصح امام حسن بصری کا نام تاریخ کی کتابوں میں بڑے ہی ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی ان کے ورع وتقویٰ سے اس قدر متاثر تھے کہ ان سے وعظ ونصیحت کرنے کی درخواست کرتے تھے، چنانچہ حسن بصری نے ان کے خط کا جواب لکھا جو بہت سی قیمتی نصیحتوں پر مشتمل ہے، اس خط میں امام حسن بصری نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک حاکم کے اوپر رعایا کے

کیا حقوق ہوتے ہیں اور اس کے اوپر اس کے دین کے کیا حقوق ہوتے ہیں، یہاں اس طویل خط کی ایک جھلک پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

”اعلم یا امیر المؤمنین ان اللہ جعل الإمام العادل قِوام کل مائلة وقصدَ کل جائر، وصِلاح کل فاسد وقوة کل ضعیف ونصفة کل مظلوم ومفزع کل ملهوف، والإمام العادل یا امیر المؤمنین کالراعی الشفیق علی إبله الرفیق بها الذی یرتاد لها أطیبَ المراعی ویزودها عن مراتع الهلکة، ویحمیها من السباع، ویکفیها من أذی الحَر والقُرِ، والإمام العادل یا أمیر المؤمنین کالأب الحانی علی ولده، یسعی لهم صغارا ویعلمهم کبارا، یکتسب لهم فی حیاته ویدّخر لهم بعد مماته، والإمام العادل یا أمیر المؤمنین کالأم الشفیقة البَرّة بولدها، حملته کرها ووضعته کرها، ورَبّته طفلا، وتسهر بسهره وتسکن بسکونه ترضعه تارة وتفطمه أخری وتفرح بعافیته وتَغْتَمُّ بشکایته“

(ترجمہ: اے امیر المؤمنین! آپ جان لیجیے کہ اللہ نے عادل امام اور خلیفہ کو کج روی کو سیدھا کرنے کے لیے، ظالم کو صحیح راہ دکھانے کے لیے، بدکار کی اصلاح کے لیے، مجبور کو تقویت بخشنے کے لیے، مظلوم کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے اور لاچار کو پناہ دینے کے لیے مقرر کیا ہے۔ اے امیر المؤمنین! عادل امام ایک ایسے چرواہے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے اونٹوں کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آتا ہے اور ان کے لیے بہترین چراہ گاہ تلاش کرتا ہے اور انھیں ہر طرح کی ہلاکت سے محفوظ رکھتا ہے، خونخوار جانوروں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، ہر قسم کی تکلیف اور پریشانی سے انھیں بچا کر رکھتا ہے۔ اے امیر المؤمنین! عادل امام ایک ایسے باپ کی طرح ہوتا ہے جو اپنے بچوں سے محبت سے پیش آتا ہے، بچپن میں ان کے لیے ہر مشقت اٹھاتا ہے اور جب بڑے ہوجاتے ہیں تو انھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، اپنی زندگی میں ان کے لیے کماتا ہے اور اتنا مال ان کے لیے جمع کرتا ہے کہ اس کے بعد ان کے کام آسکے۔ اے امیر المؤمنین! عادل امام ایک ایسی ماں کی طرح ہوتا ہے جو اپنے بچوں سے ہمیشہ شفقت و محبت سے پیش آتی ہے، اس کی خاطر حمل کی صعوبتوں کو برداشت کرتی ہے اور ایسے ہی اسے جنم دینے کی تکلیف اٹھاتی ہے اور بچپن میں اس کا پورا خیال رکھتی ہے، جب بچہ جاگتا ہے تو وہ بھی جاگتی ہے اور جب بچہ سکون سے رہتا ہے تو وہ بھی سکون سے رہتی ہے، کبھی اسے دودھ پلاتی ہے تو کبھی اس کا دودھ چھڑاتی ہے، اس کی صحت و عافیت پر خوش ہوتی ہے اور جب اسے کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو وہ بھی غمزدہ اور پریشان ہوجاتی ہے)

اس طرح حسن بصری اپنے اس خط میں خوف خدا اور تقویٰ و پرہیز گاری کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس خط میں ان کا اسلوب، ان کی خطابت کے اسلوب سے کافی مشابہ نظر آتا ہے۔ ان کے خطبوں کی طرح ان کے اس خط میں بھی سجع و قافیہ کا پورا اہتمام نظر آتا ہے اور جناس وطباق جیسی بلاغت کی خوبیاں بکثرت استعمال ہوئی ہیں۔ ان کے اس خط کے اسلوب میں اور حجاج اور زیاد وغیرہ کے خطوط میں اسلوب کا بنیادی فرق یہ نظر آتا ہے کہ ان دونوں کے اسلوب میں الفاظ بے انتہا ثقیل، وزنی اور نادر قسم کے استعمال ہوئے ہیں جب کہ حسن بصری کے اسلوب میں سہل اور آسان قسم کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ حسن بصری کا مقصد اصلاحِ قوم تھا جب کہ حجاج اور زیاد کے خطوط کا اصل مقصد اپنا رعب اور اپنی ہیبت اپنے مخالفین کے دلوں میں پیدا کرنا تھا۔

11.3.3 ذاتی خطوط

اس دور میں خطوط نویسی کی مذکورہ بالا دونوں قسموں کے علاوہ ایک قسم اور تھی جس کے بہت سے نمونے ہم تک پہنچے ہیں اور وہ تھی ذاتی

خطوط کی قسم، چونکہ اب خلافت اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا اور مسلمان دور دراز کے علاقوں تک پھیل گئے تھے، اس لیے سماجی و معاشی ضروریات کے تحت ذاتی خط وکتابت کا بھی اسی دور میں کافی چلن ہوا، بہت سے ایسے حالات و واقعات لوگوں کی زندگی میں پیش آتے تھے کہ وہ اپنے اہل وعیال یا احباب وغیرہ کو خطوط کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجا کرتے تھے مثلاً کسی قریبی شخص کی موت پر تعزیت کرنا ہو یا کسی کی عہدہ نشینی پر مبارک باد پیش کرنا ہو، یا کسی رشتہ دار یا دوست کے لیے کوئی سفارش کرنا ہو، یا کسی سے کوئی گلہ شکوہ ہو اور اس کا اظہار کرنا ہو، اس طرح کے مواقع پر لوگ ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے تھے اور اپنے احساسات وجذبات یا اپنی ضرورت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ خطوط شخصی نوعیت کے ہوتے تھے اس لیے ان کی حفاظت بھی شخصی سطح پر ہوتی تھی نہ کہ سرکاری سطح پر اس لیے اس نوعیت کے بیش تر خطوط ضائع ہو گئے اور بہت ہی قلیل تعداد میں باقی بچ سکے ہیں۔ اس نوعیت کے جو خطوط محفوظ رہے ان میں سے ایک خط وہ ہے جو عقال بن شبہ نے خالد قسری کے نام بھیجا تھا جس میں کسی قریبی شخص کو کسی منصب پر فائز کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کی کچھ سطریں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

"وقد وجهت إليک فلانا وهو من دنية قرابتي، وذوي الهيئة من أسرتي، عرف معروفک وأحببت أن تلبسه نعمتک"

(ترجمہ: میں نے تمہارے پاس فلاں شخص کو بھیجا ہے، جو میرے بہت ہی خاص قریبی لوگوں میں سے ہے اور میرے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، وہ تمہاری نیک نامی سے خوب واقف ہے، میری خواہش ہے تم اسے کسی نعمت سے نواز دو)

اس خط میں عبارتیں مسجع ومقفی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی خطوط میں بھی اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

11.3.4 دیوان الرسائل

اسلامی تاریخ میں مختلف قسم کے دواوین یعنی سرکاری شعبوں کی بنیاد خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے رکھی تھی۔ یہ نظام ایران کے قدیم بادشاہوں کے یہاں پہلے سے موجود تھا، مال فئی اور مالِ غنیمت اور زکوٰۃ وخیرات کا حساب کتاب رکھنے کی غرض سے حضرت عمرؓ نے دو دیوان قائم کیے تھے ایک دیوان الخراج کے نام سے اور دوسرا دیوان الجند کے نام سے۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے اس میں توسیع کی اور دیوان الرسائل اور دیوان الخاتم کے نام سے دو نئے دیوان قائم کیے۔ دیوان الرسائل میں سرکاری خطوط تیار کیے جاتے تھے جب کہ دیوان الخاتم میں ان کو سیل کیا جاتا تھا۔ کچھ دواوین میں کاغذی کاروائی علاقائی زبانوں میں ہوا کرتی تھی جیسے دیوان الخراج کا کام شام اور مصر میں رومی اور قبطی زبان میں اور عراق وغیرہ میں فارسی میں ہوا کرتا تھا حتی کہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے سبھی سرکاری کام کاج کے لیے عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا۔ ان علاقوں میں عجمیوں نے بھی عربی زبان میں مہارت حاصل کی اور ان دواوین میں عربوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتے رہے۔ مذکورہ بالا سبھی دواوین میں معاملات کو عربی زبان میں تحریر کر کے کاغذی کاروائی ہوا کرتی تھی لیکن ادبی نقطۂ نظر سے دیوان الرسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اسی دیوان یا شعبہ میں خلفا اور امرا کے پیغام اور فرمان تحریر کیے جاتے تھے اور ان میں کام کرنے کے لیے فصاحت وبلاغت کو ہی اصل معیار سمجھا جاتا تھا۔ اس سے منسلک انشا پرداز اچھے قلم کار اور ادبا ہوا کرتے تھے۔ دیوان الرسائل کی وجہ سے انشا پردازوں کی ایک خاص جماعت وجود میں آئی جو اس فن میں اپنے جوہر دکھاتی رہی، خلیفہ کے علاوہ مختلف علاقوں کے امرا اور حکام بھی اپنے یہاں ایسے انشا پردازوں کو متعین کیا کرتے تھے۔

امیر معاویہ کے عہد کے انشا پردازوں میں عمرو بن سعید بن عاص کا نام لیا جاتا ہے جو اپنی فصاحت وبلاغت کی وجہ سے الأشدق کے

نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے۔اسی دور کے ایک اور انشا پرداز عبیداللہ بن اوس غسانی تھے جو امیر معاویہ اور یزید کے دور میں دیوان الرسائل کے سرپرست تھے۔شروع میں دواوین کے خطوط اور تحریروں میں ایجاز واختصار کا غلبہ ہوتا تھا، بعد میں اس میں شرح وبسط پیدا ہونے لگا،عبدالملک بن مروان کے عہد کے مشہور انشا پردازوں میں سلیمان بن سعد خشنی کا نام لیا جاتا ہے۔شام وعراق کے دواوین کو رومی سے عربی زبان میں منتقل کرنے کا سہرا بھی انہیں کو جاتا ہے،عراق کے دواوین میں بھی اچھے انشا پرداز موجود تھے جن میں عبدالرحمن بن اشعث کے دیوان سے منسلک ابن القریہ کا نام مختلف مصادر میں موجود ہے۔ابن اشعث نے ان سے ایک خط لکھوایا تھا اور اسے مسجع ومقفی عبارت میں لکھنے کی درخواست کی تھی۔ابن القریہ نے ان کا یہ حکم بخوبی پورا کیا تھا۔

حجاج بن یوسف کے دواوین میں بھی کئی اچھے قلم کار موجود تھے۔انہیں میں سے ایک صالح بن عبدالرحمن بھی تھے،جن کے ذمہ عراق کے دواوین کو فارسی سے عربی منتقل کرنا تھا۔عراق کے زیادہ تر انشا پرداز صالح کے ہی شاگرد تھے۔

یہ قلم کار اور انشا پرداز اکثر بڑے حجم کے کاغذ کو اپنی تحریروں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک کا دور (۱۰۵ھ۔۱۲۴ھ) آتے آتے دواوین کی انشا پردازی نے ایک خاص فنی انداز اختیار کر لیا تھا اور باقاعدہ ایک جماعت انشا پردازوں اور قلم کاروں کی تیار ہو چکی تھی۔اسی دور کے اہم قلم کاروں میں سالم مولی ہشام کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

سالم کے دو شاگرد اس فن کے حوالے سے خاص طور سے قابل ذکر اور بہت مشہور ہوئے ہیں۔ایک ان کے صاحبزادے عبداللہ اور دوسرے ان کے ایک رشتہ دار عبدالحمید الکاتب۔ان میں عبدالحمید الکاتب کو فن انشا پردازی میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔

سالم خود ایک اچھے قلم کار تھے، وہ یونانی زبان میں بھی ماہر تھے اور بعض یونانی کتابوں کو انہوں نے عربی میں منتقل بھی کیا تھا۔جہاں تک عبدالحمید الکاتب کی بات ہے تو وہ فارسی الاٴصل تھے جبکہ بعض مؤرخین کے مطابق ان کا تعلق عراق کے علاوہ انبار سے تھا۔اموی خلیفہ مروان بن حکم کے عہد میں عبدالحمید کو دیوان الرسائل کا رئیس یا سرپرست بنا دیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں بہترین تحریری نمونے ان کے نوک قلم سے وجود میں آئے۔

عبدالحمید اس عہد کے سب سے بڑے انشا پرداز کے طور پر جانے جاتے ہیں، بلکہ انہیں فن انشا پردازی کا امام مانا جاتا ہے۔جاحظ نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور قلم کاروں کو نصیحت بھی کی ہے کہ وہ ان کے طرز نگارش کو اپنائیں۔ان کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ (خطوط نویسی کا فن عبدالحمید سے شروع ہوا اور ابن العمید پر ختم ہوا) بعد کے ادوار میں بھی عبدالحمید الکاتب کو ایک مثالی انشا پرداز کے طور پر دیکھا گیا اور لوگوں نے ان کے اسلوب کو اختیار کیا۔کہا جاتا ہے کہ اپنی تحریروں کو تحمید وتمجید سے شروع کرنے کا طریقہ بھی عبدالحمید نے ہی ایجاد کیا تھا۔عبدالحمید کے خطوط اور دیگر تحریروں کو خاص ادبی مقام حاصل ہے،ان کے بہترین خطوط میں سے وہ عام خط بھی ہے جو انہوں نے اپنے زمانے کے قلم کاروں کے نام لکھا تھا جس میں انہوں نے فن انشا پردازی کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور جن آداب سے انہیں مزین ہونا چاہیے ان کو ذکر کیا ہے۔انہوں نے اس خط میں مختلف علوم وفنون سے آگہی اور واقفیت کو انشا پردازی کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے بہت سے خطوط ہیں جو ادبی اہمیت کے حامل ہیں اور انہیں بہت شہرت نصیب ہوئی۔ان کے کچھ خطوط سیاسی نوعیت کے بھی ہیں مثال کے طور پر ان کا وہ طویل خط جو انہوں نے مروان کی طرف سے اس کے بیٹے عبداللہ کے نام لکھا تھا۔یہ ایک نہایت طویل خط تھا،اس خط کا اصل محور

بھی جنگ اور قیادت سے متعلق آداب واخلاق ہیں۔ یہ خط ایک پورے سیاسی دستور کی مانند ہے جس میں عبدالحمید قدیم فارسی ادب کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں، البتہ اس میں اسلامی تعلیمات کا اثر بھی صاف نظر آتا ہے اور یہ سب عبدالحمید نے اپنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔عبدالحمید کے مشہور خطوط میں سے ایک خط وہ ہے جس میں انہوں نے شکار کا قصہ نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس دور سے قبل جو سرکاری رسائل دیوان الرسائل سے صادر ہوتے تھے ان میں خلیفہ یا امیر یا والی انشا پردازوں کو اپنا خط یا پیغام املا کروا دیتے تھے، لیکن اس دور میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ یہ کاتبین از خود خلیفہ کی طرف سے اس کا خط یا پیغام لکھ لیا کرتے تھے، پھر خلیفہ کے پاس لے جاتے اور اسے پڑھ کر سناتے اور جو بھی تبدیلی وغیرہ کرنا ہوتی وہ کی جاتی تھی۔

11.4 عصر اموی میں توصیات یا أدب الوصایا

أدب الوصایا کا شمار قدیم عربی نثر کے اہم ادبی فنون میں کیا جاتا ہے۔ اس فن کے ذریعہ اس دور کے عربی معاشرہ کی عقلی ،فکری و ادبی معیار کی جھلکیاں ہم تک پہنچی ہیں، اسی طرح اس فن کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں ان کے ذریعہ اس دور کے سیاسی ،سماجی اور دینی حالات کو سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔

جاہلی دور میں بھی أدب الوصایا کا وجود تھا اور مختلف مواقع پر وصیتوں کے ذریعہ اپنی بات رکھنے کا پتہ ملتا ہے، تاہم اس دور کی وصیتوں کی بہت ہی قلیل تعداد ہم تک پہنچ سکی ہے اور اس دور کے دیگر نثری فنون کی مانند اس دور کی زیادہ تر وصیتیں بھی غیر مدون ہونے کی وجہ سے تاریخ کی دھند میں کہیں غائب ہوگئی ہیں۔ جاہلی دور کے ادبی فنون میں شاعری کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ چونکہ اپنے اوزان کی وجہ سے سھل الحفظ ہوتی ہے، لہذا اس کی ایک بڑی مقدار شروع دور سے ہی محفوظ رہی اور رفتہ رفتہ صفحۂ قرطاس پر اپنی جگہ بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہوگئی، جب کہ أدب الوصایا اور اس دور کے دوسرے نثری فنون اس امتیازی خوبی سے محروم رہے اور دھیرے دھیرے ناپید ہو گئے۔

عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی وصیت کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔اس دور کے چند ایک نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ اس دور میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی وجہ سے وصیتوں کا اپنا ایک الگ رنگ تھا۔ اس کے بعد اموی دور آتا ہے جس میں أدب الوصایا کی اپنی خوبیاں اور خصوصیات تھیں، أدب الوصایا سے متعلق ان سب پہلوؤں کا ذکر اس موضوع کے تحت کیا جائے گا۔سب سے پہلے جاہلی دور اور ابتدائی اسلامی دور جسے صدر الاسلام کہا جاتا ہے یعنی عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں أدب الوصایا کی نشو ونما پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی ، اس کے بعد عصر اموی میں أدب الوصایا کا ارتقا کیسے ہوا اس پر تفصیل سے گفتگو ہوگی اور اس عہد کی وصیتوں کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

تاریخ ادب کا شاید ہی کوئی ایسا دور رہا ہو جس میں أدب الوصایا کی جھلکیاں ہمیں نہ ملتی ہوں ، کہیں باپ اپنے بچوں کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتا ہے، تو کہیں سردار اپنے ماتحتوں کو اور کہیں حاکم اپنے محکوم کو اور کہیں بڑے اپنے چھوٹوں کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں تو یہ وصیتیں سیاسی نوعیت کی ہوتی ہیں اور کہیں سماجی اور دینی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ہر وصیت میں ہمیں سچے احساسات وجذبات نظر آتے ہیں۔ ان وصیتوں کی بنیاد صدق واخلاص پر ہوتی ہے اور اس کا منبع ومصدر خیر خواہی اور ہمدردی ہوتا ہے۔ادب الوصایا کی یہ ایک اہم خوبی ہے اور یہ خوبی

ہمیں ہر دور کی وصیتوں میں صاف نظر آتی ہے اور بطور خاص جاہلی دور کی وصیتوں میں ہمیں یہ خوبی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

11.4.1 عصر جاہلی میں ادب الوصایا

جاہلی دور میں عمومی طور پر پڑھنے لکھنے کا رواج بہت کم تھا، اگرچہ وہ اپنے عمدہ قصائد کو لکھ لیا کرتے تھے اور اس ضمن میں بعض نثری عبارتوں کی تدوین کے بھی ثبوت ملتے ہیں لیکن ان کے علمی وادبی سرمائے کا دار و مدار ان کے قوت حافظہ پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کچھ ایسا حیرت انگیز قوت حافظہ عطا کیا تھا کہ انہوں نے لکھنے پڑھنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور چونکہ نثر کے مقابلہ میں اشعار کو حفظ کرنا نسبۃً سہل اور آسان ہوتا ہے اس لیے اس دور کے زیادہ تر قصائد اور شعری کلام انہیں ازبر یاد تھے اور نسل در نسل وہ اسے اپنی قوت حافظہ کے ذریعہ محفوظ کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ مزید برآں نثر کے برخلاف شاعر کے پاس اپنا راوی بھی ہوا کرتا تھا جو اس شاعر کے اشعار کو یاد کرنے اور انہیں روایت کرنے پر مامور ہوتا تھا۔ انہیں اسباب کی بنا پر جب تدوین و تالیف کا دور آیا یعنی دوسری صدی ہجری کا دور تو فوراً اشعار کی تدوین عمل میں آگئی اور اس دور کا زیادہ تر شعری سرمایہ قلم و قرطاس کے سپرد کر دیا گیا جب کہ نثر کا زیادہ تر حصہ اس وقت تک آفت نسیان کی نذر ہو چکا تھا۔

جاہلی دور کے نثری وشعری فنون کا جو مستند سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ ظہور اسلام سے تقریباً دو سو سال قبل تک کا ہے، حالانکہ اس سے پہلے کے بھی بہت سے کتبات اور نقوش وغیرہ مختلف مقامات پر برآمد ہوئے ہیں لیکن ان سے اس دور کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق کوئی خاص معلومات فراہم نہیں ہو پاتی۔ أدب الوصایا کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ مختلف کتابوں میں ظہور اسلام سے ہزاروں سال قبل کے عرب بادشاہوں وغیرہ کی وصیتیں نقل کی گئی ہیں، مثال کے طور پر یحییٰ بن الوشا کی کتاب "وصایا ملوک العرب في الجاهلية" میں ان قدیم عرب بادشاہوں اور شخصیتوں کی وصیتیں بھی نقل کی گئی ہیں جن کی طرف نسبت کا کوئی پختہ ثبوت دستیاب نہیں ہے۔ اس کتاب میں جہاں حضرت ہود علیہ السلام کی وصیت بیان کی گئی ہے تو وہیں عربوں کے قدیم اجداد میں قحطان، یعرب، عبدشمس، سبأ، حمیر، کہلان، ایمن، زہیر، القوت وغیرہ کی وصیتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے حالانکہ ان کی نسبت کے بارے میں کوئی پختہ ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان میں سے زیادہ تر وصیتیں من گھڑت ہیں۔ انہیں میں سے ایک وصیت سیف بن ذی یزن کی ہے جس میں اس نے رسول اکرم کے جد امجد عبدالمطلب کو اللہ کے رسول کے بارے میں بشارت دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ آپ ﷺ کے ماں اور باپ کا انتقال ہو جائے گا اور آپ ﷺ کی کفالت آپ ﷺ کے دادا اور چچا کریں گے۔

ایک اور کتاب اس ضمن میں قابل ذکر ہے جو الوصایا الخالدة کے نام سے موسوم ہے جسے عبدالبدیع صقر نے تصنیف کیا ہے۔ اس میں بھی جاہلی واسلامی دور کی وصیتوں کو جمع کیا گیا ہے۔

ابوحاتم سجستانی نے بھی اپنی کتاب "کتاب المعمرين وكتاب الوصايا" میں اس عہد کی وصیتوں کو ذکر کیا ہے، یہ کتاب "المعمرون والوصايا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

عصر جاہلی کی طرف منسوب ادبی اہمیت کی وصیتوں میں سے ایک وصیت وہ ہے جسے شہاب الدین محمد بن احمد الابشیہی نے اپنی کتاب المستطرف میں ذکر کیا ہے جس میں امامہ بنت حارث نے اپنی بیٹی کو سہاگ رات سے پہلے کی جانے والی وصیت کو نقل کیا ہے۔ اس وصیت کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی وصیتوں کا اسلوب مسجع ومقفی ہوا کرتا تھا اور طباق و جناس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس وصیت میں امامہ نے اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے تئیں جو رویہ اختیار کرنا چاہیے اس کی تلقین کی ہے اور گیارہ باتیں اس کو بتائی ہیں۔ یہ وصیت ایک نہایت جامع

وصیت ہے جس سے فکری اور عقلی پختگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور خوش اسلوبی وخوش کلامی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یقینا یہ اس دور کی ایک بہترین وصیت شمار کیے جانے کی مستحق ہے۔

اس دور کی طرف منسوب مشہور وصیتوں میں ایک وصیت حیرۃ کے حاکم نعمان بن منذر کی وصیت ہے جو انہوں نے عرب رہنماؤں کی ایک جماعت کو کسریٰ کے دربار کی طرف روانہ کرنے سے قبل کی تھی۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ اور عمرو بن معدیکرب جیسے قادر الکلام اور شعلہ بیان عرب خطبا اس جماعت کے حصہ تھے۔ نعمان نے روانگی سے قبل ان کو وصیت کی تھی جو **العقد الفرید** جیسے تاریخ اور ادب کے اہم مراجع میں محفوظ ہے۔

نعمان کی یہ وصیت دراصل سیاسی نوعیت کی تھی۔ اپنی اس وصیت میں نعمان نے اپنے نمائندوں کو یہ بتایا تھا کہ انھیں کسریٰ کے سامنے کس طرح حاضر ہونا ہے اور کس طرح اپنی بات پیش کرنا ہے۔ نعمان کی یہ وصیت بھی اس سے قبل مذکور امامہ کی وصیت کی طرح مختصر اور فصیح وبلیغ ہے، البتہ اس میں وہ سجع وقوافی نظر نہیں آتے جو امامہ کی وصیت میں ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں، شاید اس لیے کہ نعمان کی وصیت سیاسی نوعیت کی وصیت تھی جب کہ امامہ کی وصیت ایک شخصی وصیت تھی جس کو امامہ نے اپنے علمی وادبی ذوق کے ذریعہ نہایت ادبی وفنی پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا تھا۔ بہر حال اس عہد کے أدب الوصایا کی جو مثالیں بھی ہم تک پہنچتی ہیں وہ نہایت عمدہ اور اعلیٰ ادبی معیار کی ہیں، جن کے مطالعہ سے اس دور کے سماجی، سیاسی اور ادبی رجحانات ومیلانات اور معیار کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

11.4.2 عصر رسول اور خلافت راشدہ میں أدب الوصایا

تاریخ وادب کی کتابوں میں عصر رسول اور خلافت راشدہ کو صدر الاسلام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں عربی ادب میں سب سے بنیادی تبدیلی جو واقع ہوئی وہ قرآن کریم کے نزول اور احادیث رسول کے اضافہ کی شکل میں تھی۔ قرآن کریم کلام اللہ ہے اور احادیث رسول جوامع الکلم۔ ان دونوں کے عربی زبان وادب پر بہت ہی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ دیگر نثری فنون کی طرح أدب الوصایا بھی ان دونوں سے کافی متاثر ہوا چنانچہ ان دونوں مراجع میں موجود ادب الوصایا کے وجود پر مختصراً گفتگو کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں شروع سے آخر تک جگہ جگہ وصیتوں کی شکل میں پند ونصائح پیش کیے گئے ہیں، بار بار "**أمر بالمعروف اور نهي عن المنكر**" کی تلقین کی گئی ہے، اعمال حسنہ کو اپنانے کی بات کہی گئی ہے اور اعمال سیئہ سے روکا گیا ہے، والدین کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق وغیرہ کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے گویا قرآن کریم میں اس طرح کی وصیتیں جابجا وارد ہوئی ہیں۔ کچھ قرآنی وصیتیں تو ایسی ہیں جنھیں خود رب کائنات نے بلا واسطہ انسان کے سامنے پیش کیا ہے یعنی رب کائنات خود اپنی زبانی انسان کو وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے جیسے سورۃ النساء کی یہ آیت کریمہ "**وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلاَ تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالجَنبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللّٰهَ لاَيُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً**".

(ترجمہ: اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں احسان کا معاملہ رکھو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے)

اس آیت میں ایک بہترین سماج اور معاشرہ کی تعمیر کے لیے جس طرح حقوق کی پاسداری ضروری ہے اس کو اس وصیت کی شکل میں رب کائنات نے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قرآن کریم میں وارد وصیتوں کی دوسری شکل وہ ہے جن میں کوئی نبی یا کوئی متقی انسان اپنے کسی ماتحت کو وصیت کرتا ہے اور اس کی بہترین مثال وہ وصیت ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھی اور جس کو سورۃ لقمان کی ان آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے''وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ۔وَإِن جَاهَدَاكَ عَلى أَن تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (سورۂ لقمان ۱۳۔۱۵)

(ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، بیشک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے، (پھر اس کو دودھ پلاتی ہے) اور آخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے، تو ہم نے اس کو اس کے والدین کے بارے میں یہ تاکید کی کہ میرا بھی شکر کرتے رہنا اور اپنے والدین کا بھی کہ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع کرے اس کے راستے پر چلنا، پھر تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، تو جو کام بھی تم کرتے رہے میں سب سے تم کو آگاہ کروں گا)

جہاں تک احادیث رسول کا تعلق ہے تو ان میں بھی اس طرح کی وصیتیں اور نصیحتیں رسول اکرم اور صحابہ کرام کی زبانی کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔ مختلف احادیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک ہادی و رہنما اور ایک سردار کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں یعنی صحابہ کرام کو مختلف مواقع پر وصیتیں کیں جن کے ذریعہ آپ ﷺ نے انھیں جینے کا طریقہ بھی سکھایا اور بلند اخلاق سے آشنا بھی کرایا۔ مثال کے طور پر بخاری شریک کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ وصیت کی: "ایاکم والظنّ فان الظن أکذب الحدیث، ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا"

(ترجمہ: بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹ پر مبنی بات ہوتی ہے، ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو، مال کی قیمت بڑھا کر ایک دوسرے کو دھوکہ مت دو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ کرو، ایک دوسرے کے خلاف چالیں نہ چلو، آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو)

اس وصیت میں آپ ﷺ نے ایک نیک اور صالح معاشرہ کی بنیادی شرائط بیان کی ہیں کہ جن کے بغیر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر ناممکن ہے۔ ایسے ہی ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس کو اس طرح سے وصیت کی "یا غلام انی اعلمک کلمات، احفظِ اللہ یحفظْک ، احفظ اللہ تجده تُجاهَک، إذا سألتَ فاسأل الله، وإذا استعنت فاستعن بالله، واعلم أن الأمة لو اجتمعت علی أن ینفعوک لم ینفعوک إلا بشيئ قد کتبه اللہ لک، ولو اجتمعوا علی ان یضروک بشیئ، لم یضروک إلا بشیئ قد کتبه اللہ علیک، رُفِعَتِ الأقلام وجَفّت الصحف" (صحیح الترمذی)

(ترجمہ: اے لڑکے میں تمھیں کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں، اللہ کے حقوق واحکام کی حفاظت کرو، وہ تمھاری حفاظت کرے گا اور تم اسے اپنی مدد کے لیے حاضر پاؤ گے، جب بھی کچھ مانگنا ہو تو صرف اللہ سے مانگنا، جب بھی مدد طلب کرنا ہو تو صرف اللہ سے کرنا اور جان لو کہ اگر پوری امت تمھیں فائدہ پہنچانے پر متفق ہو جائے تو تمھیں صرف اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھ دیا ہے، ایسے ہی اگر پوری امت تمھیں نقصان پہنچانے پر متفق ہو جائے تو صرف اتنا ہی نقصان پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں (یعنی ہر شخص کی تقدیر لکھی جا چکی ہے)۔

اسی طرح خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام سے بھی وصیتیں نقل کی گئی ہیں، کہیں تو ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کو اپنی موت سے پہلے وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اسے خوفِ خدا اور اعمال صالحہ پر عمل کرنے کی تاکید کرتا ہے جیسے کہ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت جو انہوں نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمرؓ کو خلیفہ متعین کرنے کے بعد کی تھی۔ اس میں انہوں نے انھیں دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کے کچھ بنیادی اصول بتائے اور کہا کہ اس کی بنیاد تقویٰ ہے، تو کہیں کوئی خلیفہ اپنے سپہ سالاروں اور کمانڈروں کو میدان جنگ کی طرف روانہ کرنے سے پہلے وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے جیسے حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر اپنے ایک لشکر کو صبر و تحمل اور حسن اخلاق کی تلقین کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے حوالے سے بھی بہت سی روایات تاریخ طبری وغیرہ میں وارد ہوئی ہیں جن میں وہ اپنے والیوں، گورنروں اور سپہ سالاروں کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کہ حضرت علیؓ کی طرف کثیر تعداد میں وصیتیں منسوب ہیں جن میں وہ لوگوں کو تقویٰ و پرہیز گاری اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری پر ابھارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس عہد کی طرف منسوب بعض وصیتوں کے آغاز میں ہمیں بسم اللہ ملتی ہے جب کہ بعض میں نہیں۔ ظن غالب یہی ہے کہ ہر وصیت بسم اللہ ہی سے شروع کی جاتی ہوگی، ممکن ہے کہ راویوں نے روایت کرتے وقت ہر جگہ اس کو ذکر نہ کیا ہو۔ جہاں تک اس دور کی وصیتوں کے اسلوب و بیان کی بات ہے تو وہ زیادہ تر سجع و قوافی کی قید و بند سے آزاد ہوا کرتا تھا، البتہ خلفائے راشدین اور صحابہ کی کچھ وصیتوں میں ہمیں بسا اوقات سجع و قافیہ اور طباق و جناس جیسی اسلوبی خصوصیات بھی نظر آ جاتی ہیں۔

اس دور کی وصیتوں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر وصیتیں بالمشافہہ کی جاتی تھیں اور انھیں رواۃ نے محفوظ کر کے بعد میں تحریر کیا جب کہ بعض وصیتیں ایسی بھی تھیں جو خط و کتابت کے ذریعہ کی جاتی تھیں جیسے حضرت علیؓ کی وصیت عبداللہ بن عباسؓ کے لیے جو ایک خط کے ذریعہ بھیجی گئی تھی۔

11.4.3 عصر اموی میں أدب الوصایا

عصر اموی آتے ہی أدب الوصایا میں خاطر خواہ ترقی واقع ہوئی اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ دراصل یہ دور سیاسی اتھل پتھل اور افراتفری کا دور تھا اور بنو امیہ کا سیاسی نظام ایک موروثی نظام تھا جس کی وجہ سے ان کے حریفوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے اس دور میں ہمیں مختلف انواع واقسام کی وصیتوں کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ خلفا اپنے وارثین کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو قائدین اور والی اپنے ماتحتوں کو اطاعت و فرماں برداری کی وصیت کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو علما اور اہل تقویٰ حضرات، حکام اور خلفا کو عدل و انصاف وغیرہ کی وصیت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ باپ اپنی اولاد کو یا ولی اللہ اپنے ماتحتوں کو وصیت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، غرض یہ کہ

اس دور میں وصیت اپنی مختلف اشکال میں کثرت سے نظر آتی ہے۔

اگر ہم سیاسی نوعیت کی وصیتوں کی بات کریں تو اس دور کی اولین وصیتوں میں سے وہ وصیت ہے جو بنو امیہ کے پہلے خلیفہ اور بانئ خلافت حضرت معاویہ بن ابوسفیان نے اپنے بیٹے زیاد کو اس وقت کی جب انہوں نے اسے عراق کا حاکم بنا کر بھیجا، چنانچہ انہوں نے فرمایا: "یا زیاد، لِیکنْ حبُک و بغضک قصدا، فإن العَثْرَة فیھما کامنة، واجعل للنزوع والرجوع بقیةً من قلبک، واحذر صولةَ الانھماک فإنھا تؤدي إلی الھلاک"

(یعنی اے زیاد تمہاری محبت اور تمہاری نفرت قصداً و ارادةً ہونا چاہیے، کیوں کہ ان دونوں میں ہی انسان کے لڑکھڑانے اور ٹھوکر کھانے کا خطرہ چھپا ہوتا ہے، جب کسی سے قطع تعلق کرنا ہو یا کسی کی طرف مائل ہونا ہو تو اپنے دل میں تھوڑی سی گنجائش رکھنا اور کسی بھی امر میں حد سے زیادہ انہماک سے بچنا، کیوں کہ یہ ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے)۔

ایسے ہی یزید بن معاویہ نے اپنے فوجی کمانڈر عبیداللہ بن زیاد کو وصیت کی تھی۔ خلفا اکثر اپنے وارثین کو وصیت کیا کرتے تھے جو زیادہ تر سیاسی نوعیت کی ہوا کرتی تھی۔ وہ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی رعایا کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے اور ان کا دل کیسے جیتنا ہے۔ اس عہد کی اہم ترین سیاسی وصیتوں میں سے وہ وصیت ہے جو اموی خلیفہ مروان بن حکم نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اس وقت کی تھی جب اسے مصر کا حاکم متعین کیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک بہترین وصیت تھی۔ مروان نے اپنی اس وصیت میں کہا تھا کہ "أرسل حکیما ولا تؤصِہِ، أی بُني، أنظر الی عمالک فإن کان لھم عندک حق غُدْوَةً فلا تؤخرہ إلی عشیة، وإن کان لھم عشیة فلا تؤخرہ إلی غدوة، وإیاک أن یظھر لرعیتک منک کذب، فانھم إن ظھر لھم منک کذب لم یصدقوک في الحق، واستشر جلساءک واھل العلم، وإن کان بک غضب علی أحد من رعیتک فلا تؤاخذہ بہ عند سورة الغضب، واحبس عنہ عقوبتک حتی یسکن غضبک، ثم انظر الی اھل الحسب والدین والمروءة فلیکونوا أصحابک وجلساءک"

(ترجمہ: اے میرے بیٹے! اپنے عمال کا خیال رکھنا، اگر تمہارے اوپر ان کا کوئی حق صبح کے وقت ہو تو اسے شام تک مت ٹالنا اور اگر ان کا کوئی حق تمہارے پاس شام کے وقت ہو تو اسے صبح تک مت ٹالنا اور تمہاری طرف سے کوئی کذب بیانی تمہاری رعایا کے سامنے نہ آنے پائے، کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو وہ حق بات پر بھی تمہاری تصدیق نہیں کریں گے اور ساتھیوں سے اور اہل علم سے مشورہ ضرور کر لیا کرنا اور اگر کبھی کسی شخص پر غصہ آ جائے تو غصہ کی حالت میں اس کا مؤاخذہ نہ کرنا اور جب تک غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے تب تک اس کو کوئی سزا بھی مت دینا، پھر یہ کوشش کرنا کہ صاحب حسب، دیندار اور بامروت لوگوں کو ہی اپنا ساتھی اور ہم مشرب بنانا)

اس طرح خلیفہ اس وصیت میں اپنے بیٹے کو ان اہم باتوں سے آگاہ کرتا ہے اور قیمتی نصیحتوں سے نوازتا ہے تاکہ وہ ایک کامیاب خلیفہ بن سکے اور لوگ اس سے محبت کرتے رہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے یہ وصیت نہایت سہل اور سادہ انداز میں کہی گئی ہے، نہ تو اس میں کوئی سجع و قافیہ ہے اور نہ ہی کوئی پیچیدگی ہے، یہ وصیت فصاحت و بلاغت کے بلند معیار پر بالکل کھری ثابت ہوتی ہے اور ساتھ ہی بے انتہا ذو معنیٰ اور قابل عمل بھی ہے۔ اس طرح کی وصیتوں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ اموی خلفا اپنے وارثین کے لیے خلافت کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لیے کس قدر کوشاں اور فکر مند رہا کرتے

تھے۔ مذکورہ بالا وصیتیں ان کی اس فکر مندی کو صاف ظاہر کرتی ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت قائم ہوئی تب أدب الوصایا کا بطور خاص بہت ارتقا ہوا، حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے ورع وتقویٰ کے لیے جانے جاتے ہیں وہ ایک متقی اور پرہیزگار خلیفہ تھے اور اپنی طرح اپنی رعایا کو بھی ایسے ہی صراط مستقیم پر اور جادۂ حق پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے، اسی لیے وہ خود بھی اپنے والیوں وغیرہ کو وصیتیں کرتے رہتے تھے، ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی وصیتوں اور خاص طور سے واعظین کی وصیتوں کے لیے انہوں نے اپنے دروازے وا کر رکھے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جو خطوط اپنے والیوں اور سپہ سالاروں کی طرف روانہ کیا کرتے تھے، ان میں بکثرت وصیتیں شامل ہوا کرتی تھیں جن میں وہ انھیں کتاب اللہ اور سنت رسول کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین کرتے تھے اور یہ سمجھاتے تھے کہ معاملہ عدل وانصاف پر مبنی ہو اور ظلم کا قطعاً کوئی سہارا نہ لے، خواہ معاملات مسلم رعایا کے ساتھ ہوں یا غیر مسلم رعایا کے ساتھ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سوانح پر جو اہم کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ان کی وصیتیں اور وصیت کے خطوط شامل اور موجود ہیں، مثال کے طور پر ابومحمد عبداللہ بن حکم نے اپنی تصنیف "**سیرۃ عمر بن عبدالعزیز**" میں سات صفحات پر مشتمل حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ خط بھی ذکر کیا ہے جو انہوں نے مختلف علاقوں کے حاکموں اور والیوں کے نام روانہ کیا تھا جس میں بہت سی قیمتی وصیتیں موجود تھیں۔ ان وصایا میں انہوں نے انھیں خوف خدا اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی خاص تلقین کی تھی۔ اس خط میں ان کی یہ وصیت بھی موجود ہے، "**اجتنبوا الاشغالَ عند حضور الصلوات، فمن أضاعها فهو لما سواها من شرائع الإسلام أشد تضييعا**"

(ترجمہ: نماز کے وقت اپنی تمام دوسری مصروفیات کو چھوڑ دو، کیوں کہ جس نے نماز کو ضائع کیا وہ شریعت کے دوسرے احکام کو ضائع کرنے میں اور بھی آگے نظر آئے گا)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ جس طرح خلفا اپنے وارثین اور والیوں کو وصیت کیا کرتے تھے اسی طرح ان کے والی، عوام الناس اور علما ان خلفا کو وصیت کیا کرتے تھے، یہ چیز ہمیں خاص طور سے عمر بن عبدالعزیز کے دور میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، اس کا ایک سبب خود حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ذاتی مزاج اور رجحان تھا جس کے تحت وہ دوسروں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح کو بھی پسند فرماتے تھے، بعض اموی خلفا اس امر کو ناپسند کیا کرتے تھے کہ کوئی ان کے معاملات میں دخل دے اور انھیں وصیت یا نصیحت کرے، لیکن عمر بن عبدالعزیز کا معاملہ اس کے برعکس تھا، وہ اس طرح کی وصیتوں کو پسند کرتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے زمانے کے مشہور متقی عالم اور واعظ حسن بصری سے یہ درخواست کی کہ وہ انھیں اچھی باتوں کی وصیت کریں چنانچہ حسن بصری نے ایک طویل خط کے ذریعہ انہیں اپنی وصیت لکھ کر بھیجی۔ اس وصیت میں بہت سی مفید اور قابل عمل نصیحتیں شامل ہیں۔ چنانچہ حسن بصری اس میں فرماتے ہیں "**ولا يَغُرَّنّک الذين يتنعمون بما فيه بؤسک ويأكلون الطيبات في دنياهم بإذهاب طيباتک في آخرتک، ولا تنظرْ الى قدرتک اليوم ولكن انظر الى قدرتک غدا وأنت مأسور في حبائل الموت وموقوف بين يدى الله في مجمع من الملائكة والنبيين والمرسلين وقد عنت الوجوه للحي القيوم**"

(ترجمہ: آپ ان لوگوں سے ہرگز دھوکا مت کھانا جو آپ کی آزمائش اور پریشانی پر خوش ہوتے ہیں اور آپ کو آخرت کی نیکیوں سے محروم کر کے خود دنیا کی نعمتوں کے مزے اڑاتے ہیں، آج جو طاقت وقوت آپ کے پاس ہے اس کو مت دیکھیے، بلکہ اس طاقت کے بارے میں غور کیجیے جو کل آپ کے پاس اس وقت ہوگی جب موت کے شکنجے میں کسے ہوئے ہوں گے اور جب آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں

گے، جب آپ کے اردگرد فرشتے اور انبیا کھڑے ہوں گے اور ہر ہستی بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگی، اس وقت آپ کی طاقت کیا ہوگی اس کے بارے میں سوچیے !)

اسی نوعیت کی وصایا میں وہ وصیت بھی شامل ہے جو ایک شخص نے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو کی تھی ۔ اس وصیت میں اس نے خلیفہ کو اپنی رعایا کے ساتھ صدق وصفا سے پیش آنے کی نصیحت کی اور یہ بتایا کہ بلندی پر چڑھنا اگر آسان لگے تو یہ دیکھ لینا کہ اس سے اترنے کا راستہ بہت مشکل تو نہیں ساتھ ہی ساتھ اس کے ذریعے یہ بھی سمجھایا کہ بسا اوقات اچانک مصائب نازل ہوجاتے ہیں اس لیے ہمیشہ چوکنا اور محتاط ہو کر ہر کام کریں۔

ان وصایا کے علاوہ اس دور میں بہت سی ایسی وصیتیں بھی ملتی ہیں جن میں باپ اپنی اولاد کو وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اموی دور کی ایک سرکردہ شخصیت عمر بن ہبیرہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جن کی دو وصیتیں تاریخ وادب کے مراجع میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک تو وہ وصیت ہے جو انہوں نے ایک قائد کو کی تھی اور دوسری وہ جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔

ابن ہبیرہ کی یہ خواہش تھی کہ جو شہرت اور مقام ومرتبہ خلافت بنی امیہ میں انھیں حاصل تھا وہی ان کے بیٹے کو بھی حاصل ہوجائے۔ وہ اس بات کو لے کر بہت فکر مند اور سنجیدہ تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی تا کہ وہ اس پر عمل کر کے بلند مقام حاصل کر سکے، چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی کہ **"لا تکن اولَ مشیر، وإیاک والرأیَ الفطیر، ولا تسترنَّ علی مستبدٍ ولا علی وَغْدٍ ولا علی متلون ولا علی لَجُوج، وخِفِ اللہ فی موافقۃ ھوی المستشیر، فإن التماس موافقتہ لؤم، وسوءالاستماع منہ خیانۃ"**

(ترجمہ: سب سے پہلے مشورہ دینے والوں میں نہ ہونا اور جلد بازی میں لیے ہوئے فیصلے سے بچنا، کسی بھی ظالم، غنڈے موالی، متلون مزاج اور جھگڑالو قسم کے انسان کو مشورہ مت دینا اور طالب مشورہ کی خواہش اور رائے کی موافقت میں اللہ سے ضرور ڈرنا، کیوں کہ ایسے طالب مشورہ کی تائید کرنے میں ملامت ہے اور اس کی غلط بات سننا خیانت ہے)

اموی دور کے آخری ایام میں عربی نثر کے اسلوب میں نمایاں تبدیلی واقع ہونے لگی تھی، نثری تحریروں میں سجع وقافیہ کا چلن شروع ہو گیا تھا، چنانچہ یہ تبدیلی ہمیں اس دور کے أدب الوصایا میں بھی صاف نظر آتی ہے چنانچہ عصر اموی کے آخری دور کے ایک ادیب علقمہ بن لبید عطاردی کی اپنے بیٹے کو کی گئی وصیت پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہاں مسجع ومقفی عبارتیں بھی صاف نظر آتی ہیں جو اس عہد کے شروعاتی دور میں ہمیں خال خال ہی دکھائی دیتی ہیں۔ سجع وقافیہ کے علاوہ طباق اور جناس جیسی بلاغت کی بعض خوبیاں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مروجہ نثری رجحانات کا اثر أدب الوصایا پر بھی خوب پڑا، جس کے نتیجہ میں اسلوب کی یہ بنیادی تبدیلی واقع ہوئی۔

عصر اموی کے آخری زمانے میں دوسرے نثری فنون کے ساتھ ساتھ فن رسائل کے ارتقا کو بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے۔ اس فن کے ارتقا میں اس دور کے اہم قلم کار عبدالحمید الکاتب کا نام سب سے نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ عبدالحمید الکاتب کے لکھے ہوئے خطوط میں بھی ہمیں جا بجا وصیتیں نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر انہوں نے ۱۲۹ھ میں جو خط اموی خلیفہ مروان بن محمد کی طرف سے عبداللہ بن مروان کو لکھا تھا اور جو تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل تھا اس میں بہت سی سیاسی، سماجی اور دینی نوعیت کی وصیتیں موجود ہیں جو بے پایاں ادبی اہمیت کی حامل ہیں، ان میں سجع وقافیہ کا بھی غلبہ نظر آتا ہے۔

اموی دور کے ابتدائی دور اور آخری دور کی وصیتوں کے درمیان ایک اہم فرق اسلوب کا فرق ہے۔ ابتدائی دور کی وصیتوں کا اسلوب سہل اور آسان ہے اور اس میں سجع وقافیہ کا غلبہ اس قدر نہیں ہے جتنا ہمیں اموی دور کے آخری زمانہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس دور کی وصیتوں میں اسلامی تعلیمات کا بھی خاصہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے، البتہ قرآن وحدیث کے نصوص کا استعمال شاذ ونادر ہی ہوا کرتا تھا۔ عبدالحمید الکاتب کے دور میں چونکہ فن رسائل کو فروغ حاصل ہوا اور یہ رسائل اکثر طویل ہوا کرتے تھے اس لیے ان کے ضمن میں وارد ہونے والی وصیتوں میں طوالت اور تفصیلی انداز صاف نظر آتا ہے۔

11.5 اکتسابی نتائج

اس دور کے خطوط کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ خطوط سیاسی نوعیت کے ہوں، یا دینی نوعیت کے ہوں یا ذاتی نوعیت کے ہوں ان سب میں ہمیں ادبی اسلوب اور فنی حسن و جمال نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جو بھی خط لکھتا تھا وہ اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ وہ بہترین سے بہترین الفاظ میں اور نہایت جامع انداز میں اپنی بات اپنے مخاطب تک پہنچائے تاکہ اس کی بات اتنی ہی مؤثر ثابت ہو۔ خطوط نویسی کی مذکورہ ہر صنف کا اپنا ایک منفرد اسلوب تھا جس کو حسب ضرورت اختیار کیا جاتا تھا، مثلاً جو خطوط فوجی سربراہوں یا والیوں کو بھیجے جاتے تھے ان کا انداز اور لب ولہجہ مجاہدانہ اور سخت ہوتا تھا جب کہ جو خطوط پند ونصائح پر مبنی ہوتے تھے ان کا انداز اور لب ولہجہ واعظانہ اور ناصحانہ ہوتا تھا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ ذاتی خط وکتابت میں بھی لغوی حسن وجمال کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاہم ذاتی خطوط کی اکثریت ہم تک نہ پہنچ سکی۔ اسی طرح وصیتوں میں بھی موقع اور مناسبت کے اعتبار سے الگ الگ اسلوب اور انداز بیان ملتا ہے۔ وصیتوں کا سلسلہ جاہلی دور سے شروع ہوا، پھر قرآن وحدیث میں بھی اس کو خاص جگہ ملی بعد ازیں عصر اموی میں اس کو خاص مقام ومرتبہ حاصل ہوا اور سیاسی، واعظانہ اور ذاتی وصیتوں کی کئی مثالیں بھی ہمارے سامنے آئیں۔

11.6 نمونے کے امتحانی سوالات

(۱) خطوط نویسی کی اہمیت وافادیت تحریر کیجیے۔

(۲) خطوط نویسی کے عروج وارتقا پر روشنی ڈالیے۔

(۳) ادب الوصایا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

(۴) اموی دور میں سیاسی خطوط پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

(۵) واعظانہ خطوط اور دیوان الرسائل کے درمیان فرق واضح کیجیے۔

(۶) عصر اموی ادب الوصایا پر فن نثر کی تاثیر کو بیان کیجیے۔

11.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔ تاريخ الأدب العربي العصر الإسلامي — شوقي ضيف

۲۔ أدب الوصايا — أحمد أمين مصطفى

۳۔	تاریخ الأدب العربی	عمر فروخ
۴۔	تاریخ الأدب العربی	أحمد حسن الزیات
۵۔	أدب العرب	زبید أحمد
۶۔	تاریخ عربی ادب	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

(https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3)

اکائی 12 عصر اموی کی شاعری اور اس عہد کے مشہور شعرا

اکائی کے اجزا

12.1 مقصد
12.2 تمہید
12.3 عصر اموی کی عربی شاعری
12.4 عصر اموی کے شعری مراکز
12.4.1 عراق
12.4.2 شام
12.4.3 حجاز
12.5 شعر اموی کے اغراض
12.5.1 مدح سرائی
12.5.2 ہجو گوئی
14.5.3 فخر
12.5.4 سیاسی شاعری
12.5.5 غزل
12.5.6 غزل صریح/عمری/اباحی
12.5.7 غزل عفیف/عذری
12.6 نقائض
12.6.1 نقائض کی ابتدا
12.6.2 نقائض کی قدر و قیمت
12.6.2.1 سیاسی حیثیت

12.6.2.2 سماجی حیثیت

12.6.2.3 لغوی اور ادبی حیثیت

12.7 شعر اموی کی خصوصیات

12.8 اموی دور کے مشہور شعرا

12.8.1 عمر بن ابی ربیعہ :

12.8.1.1 پیدائش و حالات زندگی

12.8.1.2 شاعری کی ابتدا

12.8.1.3 عورتوں کا شاعر

12.8.1.4 عمر بن ابی ربیعہ کے اشعار کی فنی تقسیم

12.8.1.5 شاعری کی خصوصیات

12.8.2 اخطل

12.8.2.1 پیدائش اور حالات زندگی

12.8.2.2 شاعری کی ابتدا

12.8.2.3 اخطل کی شاعری

12.8.2.4 اخطل کی امتیازی خصوصیات

12.8.3 فرزدق

12.8.3.1 پیدائش اور حالات زندگی

12.8.3.2 شاعری کی ابتدا

12.8.3.3 فرزدق کا شعری اسلوب

12.8.3.4 شاعری کے ادوار

12.8.3.5 شاعری کی خصوصیات

12.8.3.6 نقائض

12.8.3.7 شہرہ آفاق قصیدہ میمیہ

12.8.4 جریر

12.8.4.1 پیدائش اور حالات زندگی

12.8.4.2 نقائض کی ابتدا

12.8.4.3 شاعری کے موضوعات

12.8.4.4 امرا کی مدح سرائی

12.8.4.5 جریر کے اشعار کی امتیازی خصوصیات

12.9 اکتسابی نتائج

12.10 نمونے کے امتحانی سوالات

12.11 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

12.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ عصر اموی کی عربی شاعری اور اس کے اغراض ومقاصد اور خصوصیات سے اچھی طرح باخبر ہوجائیں گے۔ نیز اموی دور کے اہم شعرا عمر بن ابی ربیعہ، اخطل ،فرزدق اور جریر کی زندگیوں سے واقف ہوجائیں گے۔ نیز ان شعرا کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے شعری اسالیب اور مخصوص طرز ادا سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہوجائے گی۔ علاوہ ازیں یہ اکائی طلبہ کو اس دور کے شعری موضوعات ،شعری مراکز اور شعری ترجیحات کے ساتھ ساتھ اغراض ومقاصد کے محرکات اور اسباب سے بھی باخبر کرے گی۔

12.2 تمہید

عربی زبان وادب میں عصر اموی کی شاعری نہایت اہمیت کی حامل ہے۔عربی شاعری جس کے آثار اسلام کے ڈیڑھ سو سال قبل سے ملتے ہیں، اپنے ابتدائی دور سے ہی اپنے مخصوص اسلوب اور منفرد طرز بیان سے ممتاز رہی ہے۔عربی شاعری کے تاریخی سفر میں جب اس کا پڑاؤ بنوامیہ کے دور میں ہوا تو اس میں کافی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ نئے نئے شعری مراکز وجود میں آنے لگے۔ان مراکز کی خاص بات یہ تھی کہ مرکز کا انداز اور اسلوب دوسرے مرکز سے بالکل جداگانہ اور منفرد رہا ہے۔ نیز شاعری کے اغراض اور مقاصد میں کافی تبدیلیاں آنے لگیں ۔عربی زبان کے شعرا جو شعر کو اپنے جذبات اور محسوسات کے اظہار کا اہم وسیلہ سمجھتے تھے اب وہ بعض شعرا کے نزدیک ذریعہ معاش میں تبدیل ہوگیا۔علاوہ ازیں امرا کی سرپرستی میں عربی شاعری نے قبائلی اختلافات کے ساتھ ساتھ دینی اور سیاسی اختلافات کو بھی پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے نئے موضوعات اور مقاصد وجود میں آنے لگے۔اسی لیے عصر اموی کو عربی شاعری کی نشوونما کے حوالہ سے بہت اہم دور سمجھا جاتا ہے۔

اموی دور عربی زبان وادب اور شعروشاعری کی نشوونما کا اہم دور مانا جاتا ہے۔اس دور میں عربی شاعری کی کچھ نئی اصناف معرض وجود میں آئیں اور دیگر شعری اصناف نے بھی ترقی کرتے ہوئے اپنے گہرے اثرات عربی زبان اور عربی شاعری پر چھوڑے ہیں۔عصر اموی میں قادر الکلام بلند پایہ شعرا کی کثیر تعداد موجود تھی جنھوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرکے عربی شاعری پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ان تمام شعرا میں چند ایسے شعرا بھی ہیں جو خوشنما الفاظ ،آسان معانی ، پختہ اسلوب، بلند خیال اور وسعت فکر ودیگر خصوصیات شعری کی بنا اس دور کے تمام شعرا میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں جن میں عمر بن ابی ربیعہ، اخطل ، جریر اور فرزدق سرفہرست ہیں۔

12.3 عصر اموی کی عربی شاعری

عصر اموی کی شاعری ابتدائی زمانہ میں خالص اسلامی اور عربی زندگی کی آئینہ دار تھی۔ بعد ازاں زمانہ کے تغیرات اور تقلبات کے نتیجہ میں ہونے والے حوادث کی وجہ سے اس پر سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اغراض اور مفادات کا غلبہ ہونے لگا جس کی وجہ سے اس عصر کی عربی شاعری پر جاہلانہ میلانات، بدویانہ ماحول ،شاہی انعام واکرام اور اموی سرفرازیوں کے آثار نمایاں پائے جاتے ہیں۔ نیز اس کے مقاصد اور موضوعات پر سیاسی جھگڑوں اور مذہبی وابستگیوں کو بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس کے باوجود اس عصر کی شاعری کی بنیاد مثلا اوزان اور قافیہ میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اسلام نے اول یوم سے شعر گوئی میں لہو ولعب ،لغویات ومنکرات اور زلل وضلال کے ساتھ ساتھ قبائلی تعصب اور آپسی شکر رنجی وریشہ دوانیوں سے منع کیا ہے اسی لیے اس عصر کے شعرا پر قرآنی الفاظ ومعانی ،اسلوب واحکام کا اثر جابجا نظر آتا ہے۔مخضرمین شعرا جن کی تربیت اور نشوونما عصر جاہلی کے پرآشوب عصر میں ہوئی ان کے افکار اور جذبات بھی اسلامی تعلیمات کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور ان کے قصیدے عصر جاہلی کی لغویات اور عصبیات سے محفوظ ہو گئے اور اسلامی افکار ونظریات ہی ان کے شعر وادب کا مرکز اور محور ہو گیا۔اس کے بعد عصر اموی میں نئے شعرا پیدا ہوئے جن کی نشوونما اسلامی ماحول اور اسلامی ادب کے دائرہ میں ہوئی تھی ۔انھوں نے عصر جاہلی کے مآخذ اور مراجع سے بھی خوب خوب استفادہ کیا جس کا اثر ان کے مزاج اور شاعری میں بھی واضح طور پر نظر آنے لگا جس کی وجہ سے اس عصر کے بیشتر شعرا عصر جاہلیت کے افکار اور موضوعات کو اختیار کرنے لگے۔یہی وجہ تھی کہ اسلام نے جن امور ،لہو ولعب ،لغویات اور موضوعات سے منع کیا تھا اب وہی چیزیں دوبارہ اس عصر کے بعض شعرا میں سرایت کرنے لگی۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ غزل جو کہ عصر جاہلی میں صرف قصیدہ کے ابتدائی حصہ اور تمہید کے طور پر شامل ہوا کرتی تھی، نے عصر اموی میں جامع شکل اختیار کر لی اور مکمل غزلیہ قصائد میں کہے جانے لگے۔نیز لہو ولعب کو بھی خاطر خواہ انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔بات یہی ختم نہیں ہوئی بلکہ عصر اموی نے عصر جاہلیت کے قبائلی تعصّبات کو بھی ہوا دینا شروع کر دیا اور شعرا بھی قصیدوں میں اپنے اپنے قبیلوں کا فخریہ ذکر اور دوسرے قبیلوں کی ہجو کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔

عصر جاہلی میں شاعری کو قبیلہ کے دفاع اور اس کی عظمت ومنزلت کے اظہار کا اہم ذریعہ شمار کیا جاتا تھا۔اسلام کے بعد شعر کا استعمال دینی مقاصد کے لیے ہونے لگا لیکن عصر اموی میں شعر کا استعمال محامد اور مآثر کو عام کرنے ،سیاسی جماعتوں کی تائید کرنے اور قبائلی عادات واطوار کی حفاظت کے لیے ہونے لگا۔علاوہ ازیں لہو ولعب اور غنا کو پروان چڑھانے میں بھی اس عصر کی شاعری نے اہم رول ادا کیا ہے۔نیز امرا اور حکمرانوں کی مدح سرائی میں بھی شعرا ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے۔

12.4 عصر اموی کے شعری مراکز

عصر اموی کے وہ مراکز جہاں عربی شاعری کا گلستاں آباد ہوا حسب ذیل ہیں:

12.4.1 عراق

عراقی شاعری باہمی منافرت،آپسی مقابلہ اور مضطرب انقلابی زندگی کی تصویر ہے۔عراق میں فخر وہجو کی کثرت،قبائلی تعصب،قومی جماعت بندی اور سیاسی وابستگی نئی نئی شکل وصورت میں وقتاً فوقتاً میں نمودار ہوئیں۔عراقی شاعری پر اخلاقیات اور اسلامی تعلیمات سے زیادہ جاہلانہ میلانات ،بدویانہ ماحول ،قبائلی تعصب،دینی کشمکش،سیاسی بے چینی،آپسی ہجو گوئی،باہمی مقابلہ او رمباحثہ مختلف رجحانات اور پراگندہ خیالات کا غلبہ رہا ہے۔

عصر اموی میں عراق ایک اہم او رمرکزی حیثیت رکھتا تھا جہاں عربی شاعری کو پروان چڑھنے کا موقع میسر ہوا۔عراقی شاعری کے موضوعات اور اسلوب عصر جاہلیت کے موضوعات اور اسلوب سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔شعرا کے بیشتر قصیدے فخریہ کلام اور ہجو گوئی پر مشتمل ہوتے تھے۔فرزدق اپنے قبیلہ پر فخر کرتا اور دوسرے قبائل کی ہجو کرتا تھا،اسی طرح جریر نے بھی دوسرے قبائل کی ہجو اور تنقیص میں کوئی

کسر باقی نہیں رکھی۔

عراق کی سرزمین عہد اموی میں سیاسی اورگروہی چپقلش کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی خاص طور سے شیعی تحریک، جس نے اموی حکومت کے دانت کھٹے کردیے تھے اسی سرزمین پر فروغ حاصل ہوا تھا،خوارج کی جماعت نے بھی عراق ہی کوسرگرمی کا ٹھکانہ بنایا تھااور دوسری تحریکیں بھی اسی سرزمین میں پروان چڑھیں تھیں۔عراق میں عربی شاعری کو پروان چڑھانے میں بصرہ کے بازار''مربد'' کا نہایت ہی اہم کردار رہا ہے اور اس بازار کی قدرومنزلت عصر اموی میں بالکل اسی طرح تھی جس طرح عصر جاہلیت میں عکاظ بازار کی تھی۔مربد دراصل ایک بازار تھا جہاں اونٹوں کی خرید وفروخت اور تجارت ہوتی تھی۔عرب اس بازار میں جمع ہوکر خرید وفروخت بھی کرتے تھے اور اپنے اشعار کے ذریعہ اپنے حسب ونسب پر فخر بھی کرتے تھے۔علاوہ ازیں بہادری اور شجاعت کے واقعات او رداد ودہش کے قصہ سنانا بھی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔مربد کے بازار میں ہرشاعر کا ایک حلقہ ہوا کرتا تھا جہاں اس کے قبیلہ اور مذہبی ہم آہنگ لوگ جمع ہوکر اس کی تائید اور مدد کیا کرتے تھے۔مربد کے وہ اہم شعرا جن کا مخصوص حلقہ ہوا کرتا تھا ان میں جریر،فرزدق،اخطل،عجاج اور کعب بن جعیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نقائض اور اراجیز کا شمار عراقی شاعری اور مربد کے اہم شعری مآثر میں ہوتا ہے۔

عراقی شاعری کی دوسری قسم خوارج کی شاعری تھی جو بالکلیہ طور پر جاہلی شعر،جاہلی عصبیت اور جاہلی عادات واطوار سے پاک تھی اور اس کا مرکز ومحور صرف اسلامی تعلیمات او راحکامات تھے۔خوارج کے شعرا دوسرے شعرا کی طرح مدح سرائی اور ہجو گوئی کے بجائے اسلامی موضوعات اور تعلیمات کو اختیار کرتے تھے۔خوارج کے شعرا میں قطری بن فجاءۃ اور عمران بن حطان زیادہ مشہور ہیں۔غزلیہ شاعری کی نشوونما جس بہترین انداز میں حجاز کی سرزمین میں ہوئی،اس انداز میں سرزمین عراق میں نہ ہوسکی۔

12.4.2 شام

عصر اموی میں شام کا شمار ادبی اور شعری سرگرمیوں کے اہم مراکز میں ہوتا تھا۔چونکہ شام کا علاقہ بنوامیہ کے زیرنگیں رہا اسی لیے وہ وفاداروں اور حاشیہ برداروں کا مرکز رہا جس کی وجہ سے وہ آپسی چپقلشوں اور سیاسی ہنگاموں سے محفوظ رہا۔یہاں کی شاعری میں نہ حجاز کی طرح لہوولعب اور نہ ہی عراق کی طرح مختلف سیاسی اور مذہبی اختلافات کے موضوعات پائے جاتے ہیں بلکہ شامی شعر کی سب سے اہم خصوصیت مدح سرائی تھی،اور یہ بات فطری بھی تھی کیونکہ دمشق بنوامیہ کا پایہ تخت تھا اور شعرا مدحیہ کلام پیش کرنے کے لیے دوردراز کے سفر کی مشقتوں کو برداشت کرکے آتے تھے جس کے صلہ میں امرا بھی داد ودہش وانعامات سے انھیں مالا مال کرتے تھے۔امرا اور حکمرانوں کے درباروں میں جو شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں وہ شعروادب کے لحاظ سے بہت اہم ہوا کرتی تھیں کہ امرا خود شعروادب کے اداشناس اور بیان وبلاغت کے رمزشناس ہوتے تھے۔ان کی تعلیم اور تربیت میں خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ عربی زبان وشعر پر جوان کا قومی اثاثہ تھا،انھیں قدرت حاصل ہو اسی لیے عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کی تعلیم کے لیے امرا اپنی اولادوں کو قبائل میں بھیجتے تھے۔عبدالملک بن مروان نے اپنی اولاد کے اتالیق سے کہا کہ ان کو شعر کی تعلیم دیجیے تاکہ وہ اہل کمال بن سکیں۔

بنوامیہ کے امرا چونکہ اہل زبان تھے اسی لیے مدحیہ قصائد پر ان کے حسن اور خوبی کے پیش نظر شعرا کو داد ودہش سے نوازتے تھے اور سیاسی

اغراض اور مقاصد کے لیے ان کا استعمال کرتے تھے تا کہ یہ شعرا ان کی جود وسخا اور حسن معاملت کو عوام الناس میں عام کر کے حکومت کے تئیں عوام کے افکار اور جذبات کو مائل کریں۔ اسی لیے شام کے امرا کے محلات جہاں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھے وہیں ادبی اور شعری سرگرمیوں کے بھی اہم مرکز کے طور پر جانے جاتے تھے۔ عدی بن رقاع، یزید بن عبدالملک اور ولید بن یزید کا شمار شام کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔

12.4.3 حجاز

اہل حجاز جو طبعی طور پر خوش مزاج، نزاکت احساس، عیش وآرام، کھیل کود اور دیگر تفریحی مشاغل سے مانوس تھے۔ اموی حکمرانوں نے سیاسی مصلحتوں کے تحت انھیں عیش وآرام کے وسائل مہیا کر کے عیش کوشی کا خوگر بنا دیا تھا، لہو ولعب کے صحرا میں اہل حجاز اس قدر سرگرداں تھے کہ حجاز اس زمانہ کے مشہور گانے والوں کا مرکز بنا ہوا تھا جن میں ابن سریج، غریض، معبد، حنین، ابن محرز، جمیلہ، نشیط، وغیرہ شامل ہیں۔

حجاز عصر اموی کے شعری مراکز میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کا حامل تھا۔ حجاز بیک وقت دو متناقض ومتضاد مظاہر کا اہم مرکز تھا۔ ایک طرف وہ مذہبی اور دینی اعتبار سے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کی وجہ سے لوگ دور دراز کے علاقوں سے رخت سفر باندھ کر قرآن کریم، حدیث شریف اور فقہ اسلامی کی دولت سے مالا مال ہونے کے لیے وہاں آتے تھے تو دوسری طرف وہ لہو ولعب اور لغویات کا بھی ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ حجاز کے ادب اور شاعری میں عورتوں کے ساتھ کھیل کود اور ان کے محاسن کا ذکر ہی ان کی خصوصیت تھی اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہوتا تھا جس کا اہم سبب یہ تھا کہ شام بنو امیہ کا پایہ تخت تھا اور عراق مخالفین کا اہم مرکز، اس طرح یہ دونوں مقامات سکون اور فراغ کے بجائے سیاست کے اہم مراکز تھے جبکہ حجاز ایک پرسکون اور سیاسی چپقلشوں سے دور ایک سازگار جگہ تھی جہاں عربی شاعری اور بطور خاص غزل نے ترقی کے بے شمار منازل طے کیے تھے۔ حجاز کی سرزمین میں شعر وشاعری کو اس وقت زیادہ عروج اور فروغ حاصل ہوا جب اس معاشرہ میں مال ودولت کی فراوانی نے وہاں کے لوگوں کی زندگی بدل دی خاص طور سے عہد اموی میں جب حکومت کا دارالسلطنت حجاز سے باہر شام میں قائم ہوا تو لوگ تبرکا مقدس سرزمین سمجھ کر مال ودولت حجاز بھیجنے لگے۔ دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اموی حکمرانوں نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اہل حجاز کو خلافت اور حکومت سے غافل رکھنے اور حکومت کے معاملات سے دور رکھنے کی غرض سے ان میں مال ودولت اور ہر طرح کی عیش کوشی کے سامان مہیا کردیئے اور زندگی کے ہر ایک شعبہ میں عیش وتنعم داخل ہوگیا۔ اونچے محلات اور خوبصورت باغات میں لہو ولعب کی مجلسیں قائم ہونے لگیں اور نغمہ وسرور کی محفلیں جمنے لگیں، غیر ممالک سے جو خواتین کنیز کی صورت میں آئیں تھیں وہ بھی بے پردہ ان میں شریک ہونے لگیں، الفت ومحبت نے اظہار جذبات پر مجبور کر دیا اور حسن وعشق کے اس ماحول نے شاعری کو پاکیزہ اور خوبصورت غزل سے ایسا مالا مال کر دیا کہ عربی شاعری کا وہ حصہ طرہ امتیاز بن گیا۔

حجاز کے اہم شعرا میں عمر بن ابی ربیعہ، جمیل بن معمر، کثیر بن عبدالرحمن، احوص اور نصیب کے علاوہ دوسرے شعرا بھی شامل ہیں۔

12.5 شعر اموی کے اغراض

عصر اموی میں شعرا نے کثیر اغراض ومقاصد کے لیے طبع آزمائی کی اور عمدہ کلام پیش کیا ہے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

12.5.1 مدح سرائی

اگرچہ اموی دور سے قبل اسلامی شاعری میں خالص مدح سرائی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن عصر اموی میں حضرت امیر معاویہ نے مشروط اجازت دی تھی لیکن رفتہ رفتہ شعرا دنیاوی مفاد اور اغراض کے حصول کے لیے امرا کی مدح سرائی مبالغہ آرائی کے ساتھ کرنے لگے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مدح میں کثیر عزۃ کے اشعار:

وليت فلم تشتم عليا ولم تخف	وليا ولم تقبل اشارة مجرم
وصدقت بالفعل المقال مع الذي	أتيت فأمسى راضيا كل مسلم
فما بين شرق الارض والغرب كلها	مناد ينادى من فصيح وأعجم
يقول اميرالمؤمنين ظلمتنى	بآخذ لدينار ولا أخذ درهم
ولو يستطيع المسلمون لقسموا	لک الشطر من اعمارهم غير ندم

12.5.2 ہجو گوئی

عصر اموی میں شاعری کی اس صنف نے بھی بہت ترقی کی اور اسے سیاسی، ذاتی، قبائلی اور دینی اغراض کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

اخطل کے ہجویہ اشعار جریر کے قبیلہ کلیب کے بارے میں:

ما زال فينا رباط الخيل معلمة	وفي كليب رباط الذل والعار
النازلين بدار الذل ان نزلوا	وتستبيح كليب حرمة الجار
والظاعنين على اهواء نسوتهم	وما لهم من قديم غير اعيار
بمعرض او معيد اَو بنى الخطفى	ترجو جرير مساماتى واخطاري
قوم اذا استنبح الاضياف كلبهم	قالوا لامهم بولى على النار

12.5.3 فخر

اس عصر کے شعرا زمانہ جاہلیت کے کارناموں کو فخریہ اشعار میں ذکر کرنے لگے۔ نیز عصر جاہلیت کی عصبیت کو دوبارہ زندہ کر کے اس کے ذریعہ داد و دہش اور کرم نوازیوں کے واقعات بھی سنانے لگے۔ اس عصر میں اگرچہ فخر و مباہات میں مبالغہ آرائی اور ناپسندیدہ امور پر عمل کیا جانے لگا لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ بھی رہا کہ اس کے ذریعہ اس عصر کی تاریخ اشعار کی شکل میں محفوظ ہوگئی۔

جریر کے فخریہ اشعار

ان الذي حرم المكارم تغلبا	جعل الخلافة والنبوة فينا
مضر ابى وابوالملوک فهل لكم	يا خرز تغلب من اب كابينا
هذا ابن عمى في دمشق خليفة	لو شئت ساقكم الى قطينا

12.5.3 سیاسی شاعری

سیاسی شاعری عربی شاعری کی ایک ایسی اہم صنف ہے جسے عصر اموی میں امرا بنو امیہ کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کا موقعہ ملا۔ بنو امیہ نے اپنے خلاف چلنے والی تیز وتند آندھیوں کا مقابلہ جہاں مال وزر، جاہ منصب سے کیا وہیں دوسری طرف شعرا کو داد ودہش اور انعام واکرام کے ذریعہ استعمال کیا جس کے نتیجہ میں عربی زبان میں شعر سیاسی کا وجود ہوا۔ اس عصر میں بنو امیہ کے علاوہ دوسری جماعتوں کے موافق شعرا بھی کثرت سے پائے جانے لگے مثلا بنو ہاشم ، زبیریہ، خوارج وغیرہ۔ جریر، فرزدق اور اخطل بنو امیہ کے لیے شعر گوئی کرتے تھے۔ کمیت بن زید بنو ہاشم کی مدح سرائی کرتا تھا۔ عبداللہ بن قیس ابتدا میں زبیریہ کے لیے بعد ازاں بنو امیہ کی تایید میں شعر کہتا تھا۔ جبکہ قطری بن فجاءۃ ، عمران بن حطان اور طرماح بن حکیم کا شمار خوارج کے شعرا میں ہوتا تھا۔

بنو ہاشم کی مدح میں کمیت بن زید کے اشعار

طربت وما الى البيض اطرب   ولا لعبا مني ،وذو الشيب يلعب

ولم تلهني دارولا رسم منزل   ولم يتطربني بنان مخضب

ولكن الى أهل الفضائل والتقى   وخير بنى حواء، والخير يطلب

الى النفر البيض الذين بحبهم   الى الله فيما نالني أتقرب

بني هاشم رهط النبي فاني   بهم ولهم ارضى مرارا وأغضب

خفضت لهم مني جناحي مودة   الى كنف عطفاه أهل ومرحب

بأي كتاب ام بأي سنة   ترى حبهم على عارا وتحسب

فمالي الا آل أحمد شيعة   ومالي الا مذهب الحق مذهب

يعيبونني من غيهم وضلالهم   على حبكم بل يسخرون وأعجب

فطائفة قد كفرتني بحبكم   وطائفة قالوا:مسيء ومذنب

عبداللہ بن قیس کے اشعار کا نمونہ جو مصعب بن زبیر کے مدح میں کہے گئے ہیں:

حبذا العيش حين قومي جميع   لم تفرق امورها الأهواء

قبل ان تطمع القبائل في ملك   قريش وتشمت الاعداء

ايها المشتهى فناء قريش   بيدالله عمرها والبقاء

ان تودع من البلاد قريش   لايكن بعدهالحي بقاء

انما مصعب شهاب من الله   تجلت عن وجهه الظلماء

ملكه ملك قوة ليس فيه جبروت ولا به كبرياء
كيف نومي على الفراش ولما تشمل الشام غارة شعواء
تذهل الشيخ عن بنيه وتبدى عن براها العقيلة العذراء

12.5.4 غزل

اموی دور سے قبل عربی قصائد میں غزلیہ اشعار کو بطور تمہید ذکر کیا جاتا تھا لیکن عصر اموی میں غزل ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کرگئی اور غزل میں مکمل قصیدے پیش کیے جانے لگے اور اس کی دو اہم قسمیں وجود میں آئیں۔

12.5.5 غزل صریح/عمری/اباحی

غزل صریح، غزل کی وہ صنف ہے جس میں شاعر دل لگی، دل بستگی کے مناظر اور محبت ونسوانی حسن کے مشاعر کو بغیر شرم وحیا کے پیش کرتا تھا اور یہ صنف حجاز کے اہل ثروت انصار اور مہاجرین کے درمیان پروان چڑھی تھی۔اس صنف کے مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ قریشی تھے جو علانیہ طور پر جھوٹے قصوں میں تشبیب کیا کرتے تھے۔عمر بن ابی ربیعہ نے غزل میں زبان وبیان، وصف ومنظر کشی، مکالمہ ومعاملہ بندی اور حدیث دیدہ ودل کا ایسا اچھوتا، دلنشین اور سحر آگیں انداز ایجاد کیا تھا جو معاشرہ کے تمام افراد کے زبان پر یکساں طور پر جاری تھا اور جسے سن کر ہر کوئی مدہوش اور سرشار ہوجاتا تھا۔اور جب اس سحر آمیز کلام کو فرزدق جیسے قادر الکلام اور جادو بیاں شاعر نے سنا تو بے ساختہ بول پڑا ''خدا کی قسم یہی وہ باتیں تھیں جنھیں درحقیقت شعرا کہنا چاہتے تھے،لیکن بھٹک کر دیار حبیب پر رونے لگے'' اور تقریبا یہی بات اس کے معاصر اور حریف شاعر جریر نے بھی کہی تھی۔نیز راگ ورنگ اور نغمہ وآہنگ نے غزل صریح کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے اس کی بازگشت دوسرے شہروں میں بھی سنائی دینے لگی۔

حجاز چونکہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا اسی لیے وہاں مال ودولت کی فراوانی تھی،مزید برآں وہاں ملک شام، مصر، روم اور فارس کے غلاموں اور باندیوں کی خاصی تعداد بھی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے حجاز میں نئی تہذیب اور لہو ولعب کا عنصر زیادہ پایا جاتا تھا جس نے غزل اباحی کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔غزل کی اس قسم کا نمائندہ شاعر عمر بن ابی ربیعہ تھا۔غزل کی اس قسم کو اس کی نسبت سے غزل عمری سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

12.5.6 غزل عفیف/عذری

غزل کی یہ صنف حجاز کے مشہور قبیلہ بنو عذرہ میں پروان چڑھی تھی جو ایک قحطانی قبیلہ ہے۔یہ قبیلہ صفائی محبت، پاک دامنی اور اخلاق فاضلہ میں پورے نجد وحجاز میں مشہور تھا جہاں کے باشندے بدوی خصوصیات پر نازاں اور اپنے رسم ورواج کو سینے سے لگائے ہوتے تھے۔بعد ازاں قبیلہ بنو عامر نے بھی اس صنف کی شاعری میں حصہ لیا ہے۔اس صنف کے شعرا فحش نگاری اور کذب سے احتراز کرتے تھے اور غیر حقیقی محبت کو پیش کرنے سے احتراز کرتے تھے اور عاشق شعرا اپنی محبتوں کا اظہار قصائد اور اشعار کے ذریعہ عورتوں کے محاسن کو ذکر کیے بغیر پاک وصاف انداز میں کیا کرتے تھے۔

ان کے الفاظ ثقل وگرانی کے باوجود بڑے سبک اور حسین اور معانی ومطالب سیدھے سادھے اور ابتذال وفحشیات سے پاک وصاف ہوتے تھے، نیز کلام میں ایسا مؤثر اسلوب اختیار کیا جاتا کہ پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔علاوہ ازیں نغمگی اور موسیقی نے بھی ان کے کلام کو چار چاند لگادیے۔غزل عذری میں جمیل بن معمر اور بثینہ ، کثیر بن عبدالرحمن اور عزہ ،قیس بن ملوح اور لیلی ،توبۃ بن حمیر اور لیلی اخیلیۃ،قیس بن ذریح اور لبنی کی حقیقی محبت کے واقعات بہت مشہور ہیں۔

بنوعذرہ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اسے عذری غزل سے موسوم کیا جاتا ہے۔غزل عذری کے ارتقا میں معاشرتی عوامل کا بھی نہایت اہم رول رہا ہے کیونکہ عرب کا وہ ایسا معاشرہ تھا جو اپنی غیرت کے لیے شہرت رکھتا تھا۔اگر کوئی شاعر کسی دوشیزہ کو شعر میں ذکر کرتا تو اس کے اہل خاندان اس سے شادی ہرگز نہیں کرتے تھے اور اس زمانہ میں حاسدین، ملامت کرنے والوں اور چغل خوروں کی کثرت سے اکثر شعرا کے حصہ میں محرومی آتی تھی جس کی وجہ سے ان کی محبت میں اور شدت پیدا ہوجاتی تھی۔قبیلہ بنوعذرہ چونکہ شہری زندگی سے دور اور اس کے اثرات سے محفوظ رہا اس لیے وہاں کے شعرا میں عفت اور پاک دامنی کا عنصر زیادہ غالب رہا۔علاوہ ازیں قبیلہ بنوعذرہ عصر اموی میں تمام سیاسی اور عسکری سرگرمیوں سے بھی کافی دور رہا جس کی وجہ سے اس قبیلہ میں غزل گوئی کا رجحان بڑھتا چلا گیا اور اس فراغت نے غزل کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔نیز عشاق کی آپسی قرابت داری کو بھی غزل عفیف کی ترقی کا اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے۔

غزل عذری میں شاعر فحش اور یاوہ گوئی کے بجائے عفت اور پاک دامنی کا پہلو زیادہ اجاگر کرتا تھا جو کہ محرومی ،شدت جذبات اور دینی جذبات کا صلہ تھا۔شعر کی اس صنف میں محبوبہ کی نسوانی خوبصورتی کے بجائے عاشق کی ذات اور اس کے جذبات زیادہ غالب رہتے تھے۔اس صنف کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ شعرا حقیقی واقعات اور تجربوں کو ہی ذکر کرتے تھے اور جھوٹ اور غیر حقیقی واقعات سے اجتناب کرتے تھے۔علاوہ ازیں اس صنف کے شعرا محبت میں کثرت کے بجائے وحدت میں یقین رکھتے تھے اسی لیے ان کی زندگیوں اور قصیدوں میں عام طور پر صرف ایک ہی محبوبہ کا ذکر ملتا ہے اسی لیے ان کی محبتوں میں دوام اور استقرار بھی پایا جاتا ہے۔اس صنف کے شعرا کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے جذبات اور محبتوں کے اظہار کے لیے فطری آسان اور سہل زبان استعمال کرتے تھے۔

جمیل بن معمر کے غزلیہ اشعار کا نمونہ:

لا ليت ريعان الشباب جديد　　ودهرا تولى يا بثين يعود

ويا ليت شعري هل أبيتن ليلة　　بوادى القرى اني اذن لسعيد

وهل أُلقين فردا بثينة مرة　　تجود لنا من ودها ونجود

فقد تلتقى الحاجات من بعد يأ سة　　وقد تطلب الحاجات وهي بعيد

علقت الهوى منها وليدا فلم يزل　　الى اليوم ينمى حبها ويزيد

وأُفنيت عمري في انتظارنوالها　　وأُبليت فيها الدهر وهو جديد

فما ذكرا لاحباب الا ذكرتها　　ولا البخل الا قلت سوف تجود

اذا قلت ما بي يا بثينة قاتلي　　من الحب قالت : ثابت ويزيد

وان قلت ردى بعض عقلي أعش به — مع الناس قالت: ذاك منك بعيد
فما أنا مردود بما جئت طالبا — ولا حبها فيما يبيد يبيد

12.6 نقائض

عصر اموی میں وجود میں آنے والی ایک نئی شعری صنف کو "نقیضة" کہتے ہیں اور اس کی جمع "نقائض" ہے۔اس صنف میں شاعر جب کسی خاص بحر اور قافیہ میں قصیدہ پیش کرتا ہے تو مدمقابل کا شاعر اس قصیدہ کا جواب اسی بحر اور قافیہ میں اس طرح دیتا ہے کہ مخالف شاعر کے معانی و مطالب کو الٹ کر اسی کے خلاف استعمال کرتا ہے۔اسی لیے اس صنف میں شعرا جھوٹ، تہمت تراشی، افترا پردازی، فحاشی و دیگر غیر اخلاقی امور سے بھی اجتناب نہیں کرتے تھے۔نقائض کے اہم شعرا جریر، فرزدق اور اخطل ہیں۔

12.6.1 نقائض کی ابتدا

نقائض درحقیقت زمانہ جاہلی سے چلی آرہی ہجوگوئی کی ہی ایک زیادہ واضح تصویر اور معانی و مطالب کے اعتبار سے ایک اور متنوع شکل ہے۔نقائض کی ابتدا عصر اموی میں ہوئی، اس زمانہ میں ہجو کی اس شکل میں بڑی گندگی اور ابتذال پیدا ہوگیا۔خلفا و امرا و حکام اس کو روکنے کی بجائے ایسے شاعروں کی پیٹھ ٹھونکتے تھے اور انعام و اکرام اور داد و دہش سے نواز کر اپنے درباری حلقہ میں شامل کر لیتے تھے اور اپنی حکومت اور اپنے خاندان اور اس کے کارہائے نمایاں کا ذکر ان شاعروں کے ذریعہ کراتے تھے اور اس طرح خلافت کے دعووں کو حق بجانب اور اپنی حیثیت کو مضبوط کرتے تھے۔

عصر اموی میں نقائض کی ابتدائی صورت جریر اور غسان سلیطی کے درمیان ہوئی شعری جھڑپ ہے جس میں جریر کو اپنے مخالف شاعر پر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔غسان سلیطی کی مدد کے لیے فرزدق کے قبیلہ کا ایک شاعر بعیث سامنے آتا ہے اور جریر کی ہجو کرتا ہے، جس کے جواب میں جریر بعیث اور اس کے قبیلہ کی عورتوں کی ہجو کرتا ہے۔معاملہ طول پکڑتا ہے اور بنومجاشع کی عورتیں فرزدق کے پاس آکر مدد طلب کرتی ہیں، اس طرح فرزدق اس باہمی منافرت کا حصہ بن جاتا ہے اور ادب میں ایک نئی صنف نقائض اور باہمی ہجوگوئی کا ایک زوردار مقابلہ کا آغاز ہوتا ہے۔اخطل نے فرزدق کو جریر پر ترجیح دی اور اس کو برتر و افضل بتایا جس کی وجہ سے جریر نے اخطل کی بھی ہجو کی۔جریر اور فرزدق کے معاملہ میں لوگوں کے دو جماعتیں بن گئیں، ایک جماعت اور گروہ جریر کی تائید کرتا اور دوسری جماعت فرزدق کی حمایت کرتی تھی۔ان دونوں شاعروں کے معاملہ میں لوگوں کی دلچسپی اور اہتمام نیز ان کی شاعری کے متعلق فیصلہ کرنے میں اختلاف پر اس سے زیادہ کوئی چیز بھی دلالت نہیں کرسکتی کہ دو بالمقابل لشکر تھوڑی دیر کے لیے لڑنا بند کر کے اس بات کی خواہش کرنے لگیں کہ خارجی ادیبوں میں سے ایک ان دو مہلب کے آدمیوں میں فیصلہ کردے جو جریر اور فرزدق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ابن سلام نے کے لکھا ہے کہ مہلب کے لشکر کے دو آدمی جریر اور فرزدق کے بارے میں جھگڑنے لگے حالانکہ فرزدق خوارج کے بالمقابل تھا۔جب وہ اس کے پاس گئے تو اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کہا کہ میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، البتہ تمہیں ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو ان دونوں کی ناراضگی کو بآسانی برداشت کرلے گا یعنی

''عبید بن ہلال'' جو اس دن قطری بن فجاءۃ کے لشکر میں تھا۔ چنانچہ وہ دونوں اس کے لشکر کے پاس پہنچ کر اسے آواز دی۔ وہ اس خیال سے کہ کوئی اس مقابلہ کے لیے بلا رہا ہے نیزہ گھسیٹتے ہوئے نکلا، جب قریب پہنچا تو دونوں نے دریافت کیا:''فرزدق زیادہ بڑا شاعر ہے یا جریر''؟اس نے کہا:''تم پر اور ان دونوں پر خدا کی لعنت ہو''۔ ان دونوں نے کہا:''ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے سوال کا جواب دے دیں پھر ہم ادھر چلے ائیں گے جدھر آپ چاہتے ہیں''۔اس نے کہا بڑا شاعر وہ ہے جو کہتا ہے:

ولا حبها فیما یبید یبید وطوی القیا د مع الطراد بطونها

طی التجار بحضر موت برودا۔انہوں نے کہا یہ تو جریر کا شعر ہے،اس نے کہا:''بس تو وہی ان دونوں میں بڑا شاعر ہے''۔اغانی میں یہ واقعہ رج ہے کہ ایک شخص نے چار ہزار درہم اور ایک گھوڑا اس شخص کو پیش کر دیا جس نے جریر پر فرزدق کو ترجیح دی تھی۔

نقائض کی علمی،ادبی،سیاسی اور سماجی حیثیتوں پر ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔

12.6.1 نقائض کی قدر و قیمت

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نقیضہ گوئی کوئی بالکل نئی چیز نہ تھی، بلکہ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا وجود تھا۔لیکن اموی دور میں سیاسی و مذ ی حالات اور ہر طرح کی گروہ بندیوں نے اس میں قبائلی حمیت اور خاندانی و عربی تعصب کو بھی داخل کر دیا، چنانچہ ان کے اثرات پوری طرح یضہ گوئی میں نمایاں رہے۔اس صورتحال سے جہاں ان گروہوں اور جماعتوں نے سیاسی فائدے حاصل کیے وہاں عربی ادب کو بھی بہت فائدہ نچا اور اس طرح اس نقیضہ گوئی نے جس نے اس زمانے میں گھناؤنی شکل اختیار کر لی تھی مختلف حیثیتوں سے بالواسطہ طریقے پر زبان وادب کو بھی بہت فائدہ پہنچایا اور اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی۔

12.6.2 سیاسی حیثیت

نقیضہ کی قدر و قیمت سیاسی حیثیت سے یوں بڑھ گئی کہ نقیضہ گو شعرا امویوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان خلافت کے استحقاق اور عدم استحقاق پر چھڑی جنگ کا نقشہ کھینچ کر ملت اسلامیہ کے دل و دماغ کو موافقت یا مخالفت کے لیے تیار کرتے تھے،اور اگرچہ آخر میں امویوں کو فتح ہوئی اور ان کے مخالف افراد اور جماعتیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی گئیں یا ان کی قدر و قیمت کمزور ہوتی گئی،مگر اس احساس شکست نے قبائلی تعصب کی شکل اختیار کر لی، جو باوجود اسلام کے منع کرنے کے ابھر کر نئے سرے سے سامنے آ گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قبیلہ قیس کے افراد ،جنھوں نے خلافت کی جنگ میں عبداللہ بن زبیر کا ساتھ دیا تھا،یمنیوں کی جنھوں نے بنو امیہ کا ساتھ دیا تھا محض قبائلی تعصب کی بنا پر ہر معاملہ میں مخالفت کرتے تھے۔اور یہی وطیرہ شعرا کا بھی تھا مگر ایک بات ضرور تھی وہ یہ کہ اکثر شعرا قبائلی تعصب رکھنے کے باوجود، عام عربوں کی عظمت اور عربی قومیت کی اہمیت اور اسلامی فتوحات کی روز افزوں وسعت اور خاص طور سے مشرقی علاقوں جیسے ایران، ہندوستان اور چین کی فتوحات کا ذکر اور ان پر فخر کرنے میں بھی اپنا پورا زور قلم صرف کر دیتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر شعرا عقیدہ کے اعتبار سے نہ اموی تھے نہ علوی اور نہ زبیری، وہ تو اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر پیسہ کمانا اور اپنی حیثیت بنانا چاہتے تھے،اس لیے موقع ملتے ہی چولے بدلتے رہتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کل تک جو شعرا زبیریوں کے ساتھ تھے ان کے ہارنے کے بعد امویوں کے دھڑے میں شامل ہو گئے،اور اس میں بڑے

سے بڑا شاعر شریک تھا، چنانچہ فرزدق جیسا عظیم شاعر جو شروع میں علوی تھا آخر میں امویوں کا قصیدہ خواں ہوگیا۔اسی طرح جو بہت غالی عیسائی تھا محض مالی منفعت کی خاطر اموی خلفا کی جو بہرحال اس کے عقیدہ کے خلاف مسلمان تھے،دل کھول کر تعریف کرتا تھا اور اس تعریف میں اصطلاحات اور تعبیرات سب اسلامی استعمال کرتا تھا،دو ایک شعرا البتہ ایسے تھے جنھوں نے اپنی ریت نہیں بدلی،ان میں قابل ذکر کمیت ہے جو آل بیت کا بہت بڑا مداح اور غالی شیعہ تھا۔اس نے ان کی شان میں بہت ہی خوبصورت مدحیہ قصیدے کہے جو عربی ادب میں ''ھاشمیات الکمیت'' کے نام سے مشہور ہیں۔مگر روایت ہے کہ آخر میں حالات نے اس کو بھی مجبور کرکے بنوامیہ کا مدح خواں بنادیا،البتہ عمر بن ابی ربیعہ وہ تنہا شاعر ہے جس نے نہ کسی کی مدح کی اور نہ نقیضہ گوئی میں شریک ہوا۔

12.6.3 سماجی حیثیت

اگر ہم اموی دور کی شاعری پر گہری نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس پر بدوی زندگی اور اس کے معتقدات اور رسم ورواج کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔اس عہد کی شاعری میں حسب ونسب پر فخر کے علاوہ عربوں کی زمانہ جاہلی کی جنگوں کا ذکر اور ثار یعنی خون کا بدلہ خون جیسی ریت کا ذکر بالکل جاہلی انداز میں ملے گا،نقیضہ گوشعرا مدنی یا شہری زندگی کو قومی نظر سے بری اور اپنی شان سے گری ہوئی زندگی سمجھتے تھے۔اخطل نے عیسائی ہونے کے باوجود انصاریوں کی ہجو کی تو ان کے پیشہ کھیتی باڑی پر انھیں عار دلایا۔جریر آخر عمر تک بنومجاشع کی ہجو کرتا رہا کہ وہ پیشہ کے لحاظ سے لوہار تھے۔یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ لوہاری،بڑھئی گیری،کھیتی کسانی اور دوسرے تمام پیشے عرب بدویوں کی نگاہ میں حقیر پیشے تھے،جو غلام کرتے تھے آزاد عرب نہیں۔

اس زمانے میں بھی صدر اسلام کی طرح اسلامی الفاظ اور اسلامی آرا و افکار کو شعرائے نقائض نے استعمال کیا،چنانچہ نہ صرف جریر،فرزدق اور دوسرے مسلمان شعرا کے نقائض میں نماز،روزہ اور حج کا ذکر اور قرآن شریف کی آیات یا ان کی طرف کھلے اشارے ملتے ہیں بلکہ اخطل جیسے عیسائی شاعر کے کلام میں بھی کم از کم اسلامی افکار وآرا صاف اور کھلے الفاظ میں ملتے ہیں،جیسے:

نفسي الفداء امير المؤمنين اذا	ابدى النواجذ يوم عارم ذكره
الخائض الغمر ،والميمون طائره	خليفة الله ،يستسقى به المطر

یعنی امیر المؤمنین پر گھمسان کی جنگ کے موقعہ پر قربان ہوجاؤں،جو اتنے بہادر ہیں کہ بے مہابا معرکہ میں گھس پڑتے ہیں،جو بڑی تقدیر والے ہیں،اور اللہ کے ایسے خلیفہ ہیں کہ بارش ان سے سیراب ہوتی ہے۔

ان اشعار میں امیر المؤمنین،خلیفۃ اللہ جیسے الفاظ اور ترکیبیں بالکل اسلامی فکر اور اعتقاد پر مبنی ہیں۔

12.6.3 لغوی اور ادبی حیثیت

اسلوب بیان اور الفاظ کی سج دھج کے نقطۂ نظر سے اگر نقیضہ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان شعرا نے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس میں موقع محل کے اعتبار سے ایسے خوب صورت،موزوں اور منتخب الفاظ استعمال کیے ہیں جن کے ذریعہ معانی ومطالب کھل کر واضح شکل میں سامنے آجاتے ہیں اور کسی قسم کی لفظی یا معنوی تعقید یا ابہام نہیں رہ جاتا اور خاص وعام نہ صرف اس سے لطف لیتا ہے بلکہ اس انداز بیان کی

داد دیتا ہے اور اس طرح انھوں نے زبان کی صفائی اور پاکیزگی اور اثر اندازی کو پوری طرح نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کو جلا بخشی۔

اس زمانے میں جب کہ اعاجم (غیر عرب لوگ) کی وجہ سے عربی زبان وبیان میں عجمی الفاظ اور غیر عربی تعبیرات آنے لگیں تھیں، شعرائے نقائض اور خاص طور سے فرزدق نے اس کا اہتمام باقی رکھا کہ خالص عربی الفاظ اور خالص عربی تعبیرات استعمال کرے اور قدیم اسلوب اور مروج ومقبول طرز ادا کو محفوظ رکھے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر فرزدق نہ ہوتا تو ایک تہائی اور بعض کے قول کے مطابق دو تہائی زبان ختم ہو جاتی۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان شعرانے الفاظ کے معانی ومطالب کا ان کی موزوں جگہ پر استعمال کر کے اور ان کی شان وشوکت کو محفوظ رکھ کر عربی زبان کو بگڑنے سے بچا لیا۔

جیسا کہ اوپر کہیں اشارہ کیا گیا ہے کہ نقائض کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ کہ اس نے شعر وادب میں ایک نئی صنف سخن کا اضافہ کیا تھا جو اس عہد تک عربی شاعری میں اتنی وضاحت اور مؤثر طریقے سے ابھر کر سامنے نہیں آئی تھی اور وہ ہے ''سیاسی شاعری''۔

نابغہ الذبیانی کے کلام میں ملوک حیرہ وغسان کے سلسلہ میں کچھ سیاسی رنگ کی شاعری ملتی ہے مگر اس زمانے میں شعرائے نقائض نے اس رنگ کو اتنا نکھارا اور عوام وخواص نے اس کو اتنا پسند کیا کہ آگے چل کر اس نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی جس میں بہت سے نامی گرامی شعرا ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے زبان وبیان کو ترقی دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا اور اس میں قدیم رنگ کو برقرار رکھتے ہوئے جدید آرا وافکار اور خیالات وجذبات کو نئے حالات میں نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے اس طرح پیش کیا کہ خالص عربی زبان و بیان کی بالادستی اور اس کا وقار اور اس کی جاذبیت واثر اندازی بدستور قائم رہی۔ یہ صنف شاعری جس کو ہم نے ''سیاسی شاعری'' کا نام دیا ہے، بڑی شاندار اور جاندار ہے اس میں بہت سے نامور شعرا پیدا ہوئے ہیں جن میں اخطل، فرزدق اور جریر ممتاز قرار دیے جاتے ہیں۔

نقائض کے تین سب سے اہم اور باکمال اور قادر الکلام شعرا ہیں: جریر، فرزدق اور اخطل۔ لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف تھا کہ ان میں سے کون کس سے بڑا شاعر ہے، چنانچہ ہر ایک اپنے پسندیدہ شاعر کو بڑھاتا تھا اس لیے اعتدال پسند نقادوں نے رائے دی ہے کہ ''اگر بہترین غزل، حسین تشبیب، خوبصورت الفاظ، سبک اسلوب اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے نقطۂ نظر سے تینوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو جریر کو سب پر فوقیت حاصل ہوگی'' اور اگر بہترین فخر، بھاری بھرکم الفاظ، دقیق اسلوب بیان، پر شکوہ اور گمبھیر اشعار اور گہرے معانی ومطالب کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو فرزدق ان میں سب سے بڑا شاعر نظر آئے گا''۔ اور ''جس کو فصاحت و بلاغت اور ہجو ومدح میں کمال کے ساتھ، شراب وکباب اور یاران مے کدہ کا وصف زیادہ پسندیدہ ہو اسے اخطل کے کلام میں زیادہ لطف آئے گا''۔

علاوہ ازیں اگر تینوں شعرا کے اسالیب بیان کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو بقول شوقی ضیف ہمیں نظر آئے گا کہ اخطل کی ساری توجہ الفاظ کی سج دھج اور ان کی ترتیب وتنقیح پر مرکوز رہتی ہے اور اس طرح وہ زمانہ جاہلیت کے شاعر زہیر بن ابی سلمی کے مکتب فکر کا آدمی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برخلاف فرزدق الفاظ کے بناؤ سنگھار پر زیادہ زور نہیں دیتا، بلکہ اکثر غیر روایتی انداز کے ساتھ گراوٹ اور ابتذال پر اتر آتا ہے جو نتیجہ ہے اس کی طبیعت کی سختی، خشکی، اکڑپن اور رعونت وبد دماغی کا۔ مگر اس کے ساتھ شعر کی پرکھ، اچھے برے کی پہچان میں اس کی بالغ

نظری کا جواب نہیں، یہاں تک کہ بعض وقت وہ کسی پسندیدہ شعر کا ایسا چربہ کھینچتا تھا کہ نقل کو اصل سے بڑھا دیتا تھا۔ان باتوں کے علاوہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں اس کا مقابلہ اس کے معاصرین میں سے کوئی نہیں کرسکتا وہ یہ کہ وہ پرشکوہ اور بھاری بھرکم اور موٹے الفاظ کے تانے بانے سے ایسا مہیب ہیولی تیار کرتا ہے کہ خودبخود گردنیں اس کے آگے جھک جاتی ہیں۔اب رہا جریر کا انداز بیان تو ہلکے پھلکے سبک اور رسیلے الفاظ کے ذریعہ ساز وآہنگ کا ایسا مرقع تیار کرنے میں اس کا جواب نہیں جس کی موسیقیت اور نغمگی دیر تک کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے،اوراثر اندازی کا یہ عالم ہے کہ جرعہائے صبح کی طرح نس نس میں سرایت کرتی جاتی ہے جو اعلی ذوق اور صاف ستھرے مذاق کی غمازیرا کرتا ہے اور یہ دین ہے قرآن کریم اوراس کے معجم نما اسلوب بیان اوراس سے تاثر پذیری کا، کہ جریر طبعا بڑا نیک، بھلا مانس،خوش خصال اور نرم خو ہونے کے ساتھ بڑا دیندار آدمی بھی تھا۔اس لیے اس کے یہاں سختی، کرختگی اور خشونت نہیں ملتی۔اشعار پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک سبک سیر صاف وشفاف بل کھاتی لہراتی ندی لہروں کے ساز پرایک لاہوتی نغمہ گاتی رواں دواں ہے،جس کی سیمیں صدائے بازگشت دل وجان کے لیے فردوس گوش اورنظر وفکر کے لیے جنت نگاہ ہے۔

نقائض کے چنداشعار بطورنمونہ:

فرزدق کہتا ہے:

ان الذي سمک السماء بنی لنا   بیتا دعائمه أعز واطول
بیتا بناه لنا الملیک وما بنی   حکم السماء فانه لا ینقل
بیتا زرارة محتب بفناء ه   ومجاشع وأبو الفوارس نهشل
الاکثرون اذا یعد حصاهم   والاکرمون اذا یعد الأول
لایحتبی بفناء بیتک مثلهم   أبدا اذا عد الفعال الأفضل
حلل الملوک لباسنا فی ارضنا   والسابغات لدی الوغی نتسربل

فرزدق کے قصیدہ کے جواب میں جریر کا قصیدہ:

أعددت للشعراء سما نافعا   فسقیت آخرهم بکأس الاول
لما وضعت علی الفرزدق میسمی   وضغاالبعیث جدعت أنف الاخطل
أخزی الذي سمک السماء مجاشعا   وبنی بناء ک في الحضیض الاسفل
اني انصببت من السماء علیکم   حتی اختطفتک یا فرزدق من عل
احلامنا تزن الجبال رزانة   ویفوق جاهلنا فعال الجهل
ولقد بنیت أخس بیت یبتنی   فهدمت بیتکم بمثلي یذبل
بیتا یحمم قینکم بفناء ه   دنسا مقاعده خبیث المدخل

12.7 شعر اموی کی خصوصیات

عصر اموی کے اشعار کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس دور کے شعر قرآنی الفاظ سے معمور اور اسلامی معانی سے لبریز نظر آتے ہیں اور اس کا اثر تمام شعرا میں اور خاص طور پر خوارج اور شیعہ کے شعرا میں پایا جاتا تھا۔

عصر اموی کے شعر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس دور کے اشعار اور قصیدوں کے الفاظ نہایت آسان اور رقیق ہوا کرتے تھے، سوائے رجز کے کیونکہ شعرا اس صنف میں بہت سخت الفاظ استعمال کرتے تھے۔

اغراض ومقاصد کے اعتبار سے اس دور کا اسلوب عصر جاہلی اور عصر اسلامی سے مختلف نہیں تھا، وہی عبارت کا انداز اور وہی الفاظ کی رقت اور نامانوسیت۔ اس عصر میں شاعر اپنے قصیدہ کی ابتدا نسیب، محبوب کے دیار کا ذکر اور اس کے کوچ کرنے کے واقعات سے کرتا تھا۔ اس کے بعد فخریہ کلام قصیدہ کا اہم جز ہوتا تھا جس کے بعد شاعر قصیدے کے بنیادی موضوع جیسے مدح، ہجو، تعزیت وغیرہ کی جانب ملتفت ہوا کرتا تھا۔

جمیل بثینۃ کے اشعار بطور نمونہ

لقد لامني فيها اخ ذو قرابة	حبيب اليه فى ملامته رشدي
وقال: افق!حتى متى هائم؟	ببثنة فيها قد تعيد وقد تبدي
فقلت له: فيها قضى الله ما ترى	علي! وهل فيما قضى الله من رد؟
فان یک رشدا حبها او غواية	فقد جئته ،ما كان مني على عمد
لقد لج ميثاق من الله بيننا	وليس لمن يوف لله من عهد
فلا وابيها الخير ما خنت عهدها	ولا لي علم بالذي فعلت بعدي
وما زادوها الواشون الا كرامة	علي، وما زالت مودتها عندي

12.8 اموی دور کے مشہور شعرا

12.8.1 عمر بن ربیعہ (۹۳-۲۳ھ/ ۷۱۲-۶۴۴ء)

12.8.1.1 پیدائش وحالات زندگی

ابوالخطاب عمر بن عبداللہ بن ابی ربیعہ قریشی مخزومی کی پیدائش مدینہ میں اسی رات کو ہوئی جس رات حضرت عمرؓ کا وصال ہوا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ کے نام پر اس کا نام اور ان کی کنیت پر اس کی کنیت رکھی گئی۔ لوگ اس کی پیدائش کے حوالہ سے کہا کرتے تھے ''کتنا بڑا حق اٹھ گیا، اور کون سا باطل اس کی جگہ آ گیا''۔

عمر بن ابی ربیعہ کا شمار دور اموی کے نامور اور بلند پایہ شعرا میں ہوتا ہے، وہ اپنے باپ عبداللہ کی محبتوں، کرم نوازیوں، ناز ونعمت، مال ودولت اور دنیاوی نعمتوں کے آغوش میں پرورش پا کر جوان ہوا۔ عمر کے والد عبداللہ جو اسلامی خلافت کے مختلف ادوار میں گورنر کے منصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ آسودہ حال سردار تھے جس کی وجہ سے عمر بن ابی ربیعہ کی زندگی میں مال وآسائش، آسودگی اور فارغ البالی کے آثار

نمایاں نظر آتے ہیں۔

12.8.1.2 شاعری کی ابتدا

عمر بن ابی ربیعہ کی طبیعت بچپن ہی سے شعر وشاعری اور لہولعب کی جانب مائل تھی۔ نیز معاشی آسودگی اور زندگی کے نشیب وفراز سے بے فکری نے بھی اس کی شاعری کو جلا بخشی۔ بچپن ہی سے شاعری کے آثار اس میں نمودار ہونے لگے تھے اور وہ یکسوئی کے سے شعر وشاعری میں مشغول ہو گیا جس کی وجہ سے چھوٹی عمر میں ہی شاعری کا ملکہ اس میں پختہ ہو گیا۔ شاعری کے مختلف موضوعات پر اس نے طبع آزمائی شروع کی اور مسلسل شاعری کی مشق کرتا رہا اور مشکلات شاعری کو آسان کرنے میں کوشاں رہا، حتی یہ کہ شاعری اس کے سامنے جھک کر اس کی تابع اور مطیع ہو گئی اور جب جریر نے اس کا رائیہ قصیدہ سنا، جس کا مطلع ہے:

امن آل نعم انت غاد فمبکر غداة غد،ام رائح فمجر

تو اس نے کہا: ''یہ قریشی تو تک بندی کرتے کرتے اب عمدہ شاعری کرنے لگا ہے''۔ عمر کی یہ غزل واقعی معانی ومطالب، اسلوب نگارش اور الفاظ کے سج دھج کے نقطۂ نظر سے بڑی حسین، موثر اور دل آویز ہے۔ اس نے نہ صرف عمر کو قادر الکلام اباحی غزل گو شاعری کی حیثیت سے شہرت دوام بخش دی بلکہ عربی ادب میں محاکاتی اور حقیقی غزل کی ایسی نئی صنف کو جنم دیا جس کے لیے شعرا مستقل طبع آزمائی کرتے رہے تھے لیکن بقول جریر ''محبوبہ کے کھنڈرات میں بھٹک کر رہ گئے''۔

اس غزل کی کامیابی کے بعد عمر کی زبان اور قلم دونوں چل نکلے۔ چنانچہ عمر اب بے روک ٹوک محبت کے نغمے غزل کی زبان میں گاتا اور صرف رمز واشارہ میں نہیں بلکہ اعلی اور شریف گھرانوں اور مکہ ومدینہ کے معزز اور باحیثیت لوگوں کی لڑکیوں کے نام لے کر علانیہ اظہار عشق کرتا۔ چنانچہ اس زمانہ کی کوئی دوشیزہ یا خوبصورت عورت ایسی نہیں تھی جسے اس نے تشبیب نہ کیا ہو حتی یہ کہ اس نے اشراف قوم کے مستورات کو بھی نہیں چھوڑا جن میں عبدالملک بن مروان کی لڑکی فاطمہ، الولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی بیوی لبابہ، عائشہ بنت طلحہ، ہند بنت الحارث المری، ثریا بنت علی بن عبداللہ بن الحارث، زینب بنت موسی الجمحی، زینب کی چچازاد بہن نعم، رملہ بنت عبداللہ بن خلف خزاعیہ، فاطمہ بنت محمد بن اشعث کندی لیلی بنت حارث بکریہ، شیخ النحو ابوالاسود دوٴلی کی اہلیہ بھی شامل ہیں۔

12.8.1.3 عورتوں کا شاعر

عمر بن ابی ربیعہ کو عورتوں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کے دیوان کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہے۔ صاحب اغانی نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن ابی ربیعہ سے دریافت کیا: ''ہماری مدح سے تمہیں کس چیز نے روکا ہے''؟ اس نے جواب دیا: ''میں آدمیوں کی مدح نہیں کرتا ہوں میں صرف عورتوں کی مدح کرتا ہوں''۔

شاعری میں عمر ابن ابی ربیعہ نے غیر مانوس وناآشنا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں عشقیہ مضامین افسانوی انداز میں پیش کرتا تھا جس میں وہ عورتوں کے اوصاف، باہمی گفتگو اور آپسی لہو ولعب کو خوشنما الفاظ اور پر اثر انداز میں پیش کرتا تھا۔ اس نے شاعری کو عورت، عورتوں کی باہمی ملاقات، عورتوں کے محاسن واوصاف، آپس کی چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کے جھوٹے اور سچے واقعات بیان کرنے میں محدود کر دیا

اور وہ ان مضامین کو نہایت خوش نما الفاظ عمدہ وصف، پختہ بندش اور انوکھے پیرایہ میں ادا کرتا ہے۔ اس کے اشعار الفاظ کے اعتبار سے بہت و آسان ہوتے تھے لیکن معانی کے اعتبار سے زیادہ مؤثر نہ ہونے کے باوجود دل پر اثر انداز ہوتے تھے اسی لیے نوجوان اور عوام الناس اس کی شاعری کے دل دادہ ہو گئے اور گانے والیوں اور مے نوشوں میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی۔عوام الناس میں اس کی شاعری خوب گائی اور سنائی جانے لگی حتی کہ غیرت مندوں اور زاہدوں نے اس کے خلاف شور مچا دیا۔ ابن جریج کا قول ہے کہ نوجوان لڑکیوں کے پردہ میں ابن ابی ربیعہ کی شاعری سے زیادہ مضرت رساں کوئی چیز داخل نہیں ہوئی۔اسی لیے خاندان کے بزرگ اس کے اشعار سے نوجوانوں اور خاص طور سے غیر شادی شدہ لڑکیوں کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ظبیہ نامی ایک باندی عمر کی بعض غزلیں بغل میں دبائے اپنی مالکن فاطمہ بنت عمر بن مصعب کے پاس جارہی تھی، فاطمہ کے دادا عبداللہ صحن میں بیٹھے تھے جب انھوں نے باندی کے بغل میں کاغذات دیکھے تو بولے کہ یہ کیا ہے؟ باندی نے جواب دیا یہ عمر کے اشعار ہیں۔تو وہ غصہ میں بولے کہ تیرا ستیاناس ہو تو عورتوں کے پاس عمر کے اشعار لے کر جارہی ہے۔ اس کے اشعار تو دل و دماغ کی پنہائیوں میں گھس جاتے ہیں، اور اگر اشعار جادو کا کام کر سکتے ہیں تو یہ صفت اس کے اشعار میں پوری طرح پائی جاتی ہے، تم ان کو لے کر واپس جاؤ، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

اس قصہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عمر کا کلام عورتوں اور مردوں میں کتنا مقبول اور مؤثر تھا اور یہ کہ لڑکیاں اس کو حاصل کرنے کے لیے کتنا اہتمام کرتی تھیں اور بڑے بوڑھے ان کو اس کے کلام سے بچانے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے۔

عمر بن ابی ربیعہ شاعری کو ذریعہ بنا کر اپنی شرارت میں اس حد تک سرکش ہو گیا تھا کہ وہ ایام حج میں عمدہ لباس اور زیب و زینت اختیار کر کے حج کرنے والی عورتوں کے پیچھے لگ جاتا، باعزت عورتوں اور شہزادیوں سے شاعری میں اظہار محبت کرنے لگتا، اور طواف واحرام میں مصروف خواتین کے اوصاف بیان کرتا یہاں تک کے اس کے خوف سے شریف خاندانوں کے عورتوں نے فریضہ حج ادا کرنے میں کمی کر دی تھی۔

اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے یمن وحبشہ کے درمیان واقع ایک جزیرہ ''دھلک'' میں جلاوطن کر دیا جہاں بنوامیہ مجرموں کو بھیج کر جلاوطنی کی سزا دیا کرتے تھے۔ پھر جب تک اس نے عشق بازی چھوڑنے کی پختہ قسم نہ کھائی اور خلوص دل سے توبہ نہ کی اسے وہاں سے واپس آنے کی اجازت نہیں ملی۔

12.8.1.4 عمر بن ربیعہ کے اشعار کی فنی تقسیم

عمر کے اشعار جو عمر کی محبت کا اہم مصدر ہیں، تین حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں:

عمر کے کلام کی ایک قسم تو ان فنی اشعار کی ہے جنھیں عمر نے اپنے کسی دوست کی یا دوست عورتوں میں سے کسی ایک کی فرمائش پر، یا اپنے معاصر شعرا یا ادبا میں سے کسی کے ذوق شعری کو پورا کرنے کے لیے کہے ہیں۔

دوسری قسم ان اشعار کی ہے جن میں جنسی اور حسی محبت کی چھاپ ہے جس میں عاشق جسمانی حسن کا دلدادہ دکھائی دیتا ہے، اور حسینوں سے صرف لطف اندوزی اور مطلب برآری اس کا مقصد ہوتا ہے۔

عمر کے کلام کی تیسری قسم وہ ہے جو عمر کی حقیقی اور سچی محبت کی آئینہ دار ہے چنانچہ ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت اس کے دل و دماغ، اس کی زبان، اس کی حس اور فکر ونظر سب پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ محبت، محبوباؤں کے اختلاف کے ساتھ مختلف رہتی ہے، چنانچہ اگر اس

نے ایک سے زیادہ عورتوں سے اظہار محبت کیا ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ محبت کو جانتا ہی نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ لڑکیوں کی محبت میں گرفتار ہوئے اور اس کی وجہ سے بڑی قلبی کش مکش میں مبتلا ہوئے۔

12.8.1.4 شاعری کی خصوصیات

عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں فصیح الفاظ ،آسان معانی بہترین اسلوب ،عمدہ پیراہن ودیگر فنی خصوصیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری میں بلندافکار اور وسعت خیالی نہیں پائی جاتی ہے کیونکہ اس کی شاعری عشقیہ کلام اور یا وہ گوئی پر زیادہ مشتمل ہوتی تھی۔اس کے باوجود اس کی شاعری دل کے اندر پہنچ کرانتہائی رقت طاری کر دیتی ہے کہ اس کی زبان بہت آسان ہے۔اس کے خوش نما لفظ ،عمدہ وصف، پختہ بندش اور مضامین کی زود فہمی میں اسے کمال حاصل تھا۔ جمال کی تعریف اور عورتوں کے وصف میں اس کی شاعری لوگوں کی طبیعتوں سے ہم آہنگ اور ان کی خواہشات کے مطابق ہے۔وہ اپنے نسب،شباب اور اپنی دولت وآسودگی کے باعث ایسی باتوں کے بیان کرنے میں کامیاب ہوگیا جنھیں کوئی دوسرا بیان کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔نیز عمر بن ابی ربیعہ میں فریفتگی ،دل کوموہ لینے ،انسانی نفسیات کو گرویدہ کرنے اور حاجت کی تکمیل کی خوبی موجود تھی، یہ باتیں کسی اور شاعر کے اشعار میں نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس قدر اللہ تعالی کی نافرمانی ابن ابی ربیعہ کی کے اشعار سے ہوئی ہے کسی اور کے اشعار سے نہیں ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں اس کے اشعار میں پایا جانے والا قصہ اور افسانوی اسلوب بھی اسے منفرد بناتا ہے جس میں وہ عورتوں کی گفتگو،اشارات،حرکات اور اوصاف کا ذکر کرتا ہے۔اس وصف میں وہ امرؤالقیس جیسے بلند پایہ شاعر سے بھی فوقیت لے گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں شعری روایات اور اصول سے زیادہ عورتوں کے ذکر کا اہتمام پایا جاتا ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ کو تمام غزل گو شعرا میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس نے عشق ومحبت،اس کے احوال وکیفیات اور دل ودماغ پر اس کے اثرات کا صحیح اور بے لاگ نقشہ کھینچا ہے۔عورتوں کے حسن وشباب،ان کے انداز واطوار،ان کی دلداری ودلنوازی اور رنگینی ورعنائی کا بہت حسین اور کیف آور تصویر کشی کی ہے۔ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ،خود بینی وخود ستائی اور عشوہ وناز وادا کے بہت رنگین اور جذبات انگیز قصے بیان کیے ہیں۔ہجر وفراق کی تپش اور سوز دروں کی حکایت خونچکاں بڑے دلدوز انداز میں بیان کی ہے۔دوسری طرف وصال کی جاں فزا،روح پرور اور رنگین اوقات کا بہت والہانہ انداز سے ذکر کیا ہے۔معاملہ بندی اور نسوانی مکالمہ نگاری میں اس نے وہ کمال فن دکھایا ہے جس کی مثال عربی شاعری میں مشکل سے ملتی ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں گہرے افکار اور بلند خیالات کی کمی پائی جاتی ہے اور اس میں کوئی جدت نظر نہیں آتی ہے۔جذبات کو اس نے شاعری میں جگہ تو دی ہے لیکن وہ بھی سطحی نظر آتے ہیں ان میں بھی کوئی گہرائی نظر نہیں آتی ہے۔ایک اور اہم چیز جو فنی اعتبار سے اس کی شعری منزلت کو متاثر کرتی ہے وہ ہے ''تکرار''۔ایک ہی فکر اور ایک انداز کا بار بار ذکر کرنا شاید اس وجہ سے بھی زیادہ رہا کہ عمر بن ابی ربیعہ کے شعر کا محور عام طور پر صرف عورت ہی ہوا کرتی تھی۔علاوہ ازیں اس کی اشعار میں کثرت سہولت کی بنا پر فتور بھی طاری ہوجاتا تھا اور بسا اوقات اس سے اشعار میں قواعد کی غلطیاں بھی سرزد ہوجاتی تھیں۔

اس کی شاعری میں رقت ،سہولت،لہو ولعب اور موسیقی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے جسے وہ حالات اور شخصیتوں کے پیش نظر مختلف اور متنوع

شعری بحروں میں پیش کرتا تھا مثلاً بحر خفیف، بحر منسرح، بحر رمل، بحر طویل وغیرہ جس کی وجہ سے گانے والوں اور نوجوانوں میں اس کا کلام زیادہ مقبول رہا ہے جن میں بطور خاص ابن سریج اور غریض شامل ہیں۔ اگر اس کی شاعری کو محبت کی زبان سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

عمر بن ابی ربیعہ کا شعری دیوان ہے جو ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے جو تمام کے تمام غزل ہی میں ہے سوائے چند اشعار کے جن کا موضوع فخر اور وصف ہے۔ اور یہ دیوان لیپسیک میں ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مصر میں ۱۸۹۳ء اور بیروت میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

12.8.2 اخطل (۹۰-۱۹ھ/ ۷۰۸-۶۴۰ء)

12.8.2.1 پیدائش اور حالات زندگی

ابو مالک غیاث بن غوث تغلبی اپنی قوم بنی تغلب میں بمقام ''حیرۃ'' میں حضرت عمرؓ کی خلافت میں عیسائی مذہب پر پیدا ہوا۔ اس کا لقب اخطل اور ذوالصلیب تھا۔ مؤخر الذکر لقب نصرانی مذہب اور صلیب کو لٹکانے کی وجہ سے پڑا تھا۔ بچپن ہی میں وہ ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگیا اور سوتیلی ماں کی سوء تربیت نے اسے اخلاقی برائیوں میں مبتلا کردیا اسی لیے وہ بڑا ہوکر منہ پھٹ، زبان دراز، بدنیت اور شرابی بن گیا۔

12.8.2.2 شاعری کی ابتدا

اخطل کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے بڑی رغبت تھی اور ابتدائی زمانہ ہی سے اس میں شاعری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، چنانچہ اس نے قبیلہ تغلب کے شاعر کعب بن جعیل سے ہجویہ شاعری میں مقابلہ کیا اور اسے شکست فاش سے دوچار کرکے گمنامیوں کی وادیوں میں دھکیل دیا جس کے باعث اس کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا۔ ایک مرتبہ عبدالرحمن بن حسان بن ثابت انصاری نے حضرت معاویہ کی صاحبزادی رملہ کی اپنے اشعار میں تشبیب کی جس سے ناراض ہوکر یزید بن معاویہ نے انصار کی ہجو گوئی کے لیے کعب بن جعیل کو بلایا تو کعب انصار کے انتقام سے ڈر گیا اور اس نے یزید کو اخطل کا نام بتایا اور کہا کہ اخطل کو اس باب میں زیادہ ملکہ حاصل ہے۔ اخطل نے انصار کے خلاف ہجو گوئی کی اور یہی سلسلہ اس کی بلند اقبالی اور شہرت کا ذریعہ بن گیا۔ انصار کے خلاف کہے جانے والے کچھ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

وإذا نسبت ابن الفريعة خلته	كالجحش بين حمارة و حمار
خلوا المكارم، لستم من أهلها	وخذوا مساحيكم ،بني النجار
ذهبت قريش بالمكارم كلها	واللؤم تحت عمائم الأنصار

ترجمہ: یعنی اگر تم الفریعۃ (حضرت حسان کی ماں) کے بیٹے کا حسب نسب معلوم کرنے کی کوشش کرو تو تمہیں وہ ایک گدھے اور ایک گدھی کے بیچ میں ایک گدھے کا بچہ دکھائی دے گا۔ اے بنو نجار بڑائی اور بھلائی کے کاموں کو چھوڑ دو، یہ سب تمہارے بس کی باتیں نہیں ہیں اور اپنے پاٹوں کو سنبھالو۔ بڑائی اور بھلائی کے تمام کاموں کو قریش لے گئے اور کمینگی انصاریوں کے عماموں کے نیچے رہ گئی۔

کہتے ہیں جب اس ہجویہ قصیدہ کی شہرت ہوئی تو نعمان بن بشیر انصاری، جو حضرت معاویہؓ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہو چکے تھے اور حضرت معاویہ نے گورنری اور دوسرے بڑے بڑے عہدوں سے بھی نوازا تھا، حضرت معاویہؓ کے پاس آئے اور اپنا عمامہ اتار کر کہا کہ معاویہ دیکھو اس پر کہیں کمینگی دکھائی دے رہی ہے؟ حضرت معاویہؓ اس عجیب سوال سے کچھ گھبرا سے گئے، اور بولے کہ ''آخر قصہ کیا ہے، کچھ تو کہو؟'' اس پر

نعمان نے کہا کہ اخطل نے ہماری ہجو میں اتنی بیہودہ بات کہی ہے کہ ہماری عزت ہمیشہ کے لیے جاتی رہی، اور پھر ان کو وہ اشعار سنائے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ ہاں یہ تو بہت بری بات ہے، بولو کیا چاہتے ہو؟ نعمان نے کہا ''اس کی زبان''، حضرت معاویہؓ بولے ''دے دی'' اور اخطل کی زبان کٹوانے کا وعدہ کیا۔ جب یہ خبر اخطل کو پہنچی تو اس کے ہوش جاتے رہے وہ بھاگا ہوا یزید کے پاس آیا، یزید، معاویہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے بھی اس کی جاں بخشی اور حفاظت کا ذمہ لے چکا ہوں، اب اس کی لاج آپ رکھ لیجیے اور معاف کر دیجیے۔ یہ سن کر حضرت معاویہؓ نرم پڑ گئے اور کچھ نہ کر سکے۔ اور اس واقعہ کے بعد اخطل، یزید کا ہم دم ودم ساز بن گیا اور اس کی ولی عہدی سے کر حکومت تک اس کی محفل راگ ورنگ کا ساتھی اور ندیم رہا اور ان کی شان میں قصیدے کہتا رہا۔ اس طرح بنوامیہ کے پاس اخطل کا مقام ومرتبہ بلند ہوتا گیا اور بنوامیہ اسے اپنی بخششوں سے نوازتے اور احسانات سے مالا مال کرتے تھے۔ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں بھی اس کی قدر ومنزلت میں بہت اضافہ ہوا۔ عبدالملک نے اسے ''بنوامیہ کا شاعر'' اور ''امیرالمؤمنین کا شاعر'' جیسے ذی قدر القابات سے نوازا۔ اس کی بے تکلفی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنی ریشمی عبا پہنے، گلے میں طلائی صلیب ڈالے، ڈاڑھی سے شراب ٹپکاتے ہوئے بلا اجازت۔ عبدالملک بن مروان کے دربار میں داخل ہو جاتا تھا۔

12.8.2.3 اخطل کی شاعری

اخطل اپنی شاعری میں کافی مراجعت اور تبدیلی کیا کرتا تھا، نیز اپنے اشعار کو ناقدین کے پاس پیش کر کے اس میں سے نامناسب اور ردی اشعار کو خارج کر دیتا تھا اسی لیے اس کے اشعار حشو اور عیوب سے خالی ہوتے تھے۔ فصیح الفاظ، قوی اسلوب اور عمدہ پیراہن اس کے اشعار کی خصوصیت ہے، اسی طرح وہ اپنی شاعری میں عمدہ مدح کرنے، شراب اور شکار کا وصف بیان کرنے، ہجو میں کم فحش آمیزی کرنے میں بھی ممتاز ہے، نیز اسے اپنے طویل قصائد میں بے ضرورت الفاظ کی بھرتی اور دیگر خامیوں کے نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت میں غور وفکر اور چھان بین کا مادہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بھی بہترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اخطل شعری میدان میں زہیر بن ابی سلمی، اعشی اور نابغہ ذبیانی سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے اور ان کے علاوہ کسی کو اپنے سے بلند وبرتر نہ سمجھتا تھا۔ اس کے اشعار میں ان کے اسلوب کی پیروی کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

12.8.2.4 اخطل کی امتیازی خصوصیات

اخطل نے اس زمانے میں مروج اصناف سخن میں سے تقریبا ہر ایک پر طبع آمائی کی ہے جیسے مدح، ہجو، فخر اور وصف۔ ان میں سے مدح، ہجو اور شراب وکباب کے وصف میں اس نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مرثیہ میں بھی اس کے دو چار شعر ملتے ہیں کہ اس کا طبعی رجحان اس طرف نہ تھا۔ یزید کے انتقال پر بھی اخطل مرثیہ کے چار شعر سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا جس نے اس کو گمنامی کے گڈھے سے نکال کر ترقی کے بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔

اخطل جاہلی شعرا کی ریت کے مطابق اور خاص طور سے زہیر بن ابی سلمی کی طرح اپنے قصیدوں کو نوک پلک سے درست کرنے کا عادی تھا۔ چنانچہ زہیر کی طرح نوے (۹۰) یا سو (۱۰۰) شعر کے ایک مدحیہ قصیدہ میں کتر بیونت اور اصلاح وترمیم کرتے کرتے کبھی صرف تیس شعر

رہنے دیتا اور باقی سب کاٹ دیتا تھا۔قصیدہ پرنظر ثانی کرنے میں وہ زہیر ہی کی طرح کبھی کبھی ایک قصیدہ میں پورا ایک سال لگا دیتا، چنانچہ جو قصیدے اس طرح نکھر کر سامنے آتے تھے وہ زبان وبیان اور اسلوب کے اعتبار سے نمونے ہوتے تھے۔اسی لیے ایک صاحب نظر ناقد نے کہا تھا کہ ''اگر اخطل کو جاہلی دور کا ایک دن بھی مل جاتا تو میں اس کو تمام جاہلی شعرا پر فوقیت دے دیتا''۔اس کی وجہ صرف جاہلی شعرا کی پیروی ہی نہیں بلکہ بقول ڈاکٹر طہ حسین ''قرآن کا فیض اور اس کا اثر بھی ہے'' کیوں کہ وہ اس کے ممدوحین کی زبان ہونے کے علاوہ عربی زبان کا اعلی نمونہ بھی تھا۔

اپنے دونوں ہم عصروں او رحریفوں فرزدق اور جریر کے مقابلہ میں اس کا کلام بہت کم ہے،اس کے صرف سات لمبے قصیدے ملتے ہیں،اس کے برخلاف اس کے حریفوں کا کلام کہیں زیادہ ہے،اسی لیے بعض نقاد اس کا مقابلہ اس کے دونوں حریفوں سے کلام کے مقدار میں نہیں کرتے ہیں کہ اس اعتبار سے اخطل کا درجہ بہت کم ہوجائے گا۔

ہشام بن عبدالملک کو اموی خلفا میں شعروشاعری کا بڑا پاکیزہ ذوق اور اس میں بڑی گہری ناقدانہ نظر تھی۔ایک دفعہ اس نے عہد اموی کے تینوں معاصر شعرا کے بارے میں خالد بن صفوان کی رائے پوچھی،تو اس نے اخطل کے بارے میں بڑی نپی تلی بات کہی:''أما أحسنهم نعتا، وأمدحهم بيتا، وأقلهم فوتا، الذي إذا هجا وضع، وإذا مدح رفع فالأخطل''۔یعنی ان سب میں وہ شاعر جو وصف میں اور مدح میں سب سے بہتر اور غلطی کرنے میں سب سے کمتر، جو اگر ہجو کرتا تو گرا کے رکھ دیتا تھا اور مدح کرتا تو آسمان پر پہنچا دیتا تھا،تو وہ اخطل ہے۔

فنی خصوصیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے اشعار میں خوش نما الفاظ،آسان معانی اور پختہ اسلوب کے ساتھ اخطل ایک حسی خیال کا شاعر تھا جس میں وہ جذبات اور عاطفہ کے بجائے عقل پر زیادہ اعتماد کرتا تھا اسی لیے اشعار میں طبیعت پر اعتماد کرنے کے بجائے ہر شعر پر بذات خود غور وفکر کرکے اس میں عمدہ تعبیر اور تصویر پیش کرتا تھا۔نیز اضافی اور لایعنی چیزوں سے بھی اپنے اشعار کو پاک وصاف کرتا تھا جس کی بنا عمدہ اسلوب اور عبارت اس کے کلام کا خاصہ بن گئے تھے جس میں عقل کی حکمرانی اور ذاتیت کا اثر نظر آتا ہے۔علاوہ ازیں تاریخی اعتبار سے بھی اخطل کے اشعار بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اخطل نے اشعار میں جاہلیت کے آثار کے ساتھ ساتھ جریر اور فرزدق کے قوموں کے احوال کو بھی بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔نیز اخطل کی شاعری میں عصر اموی کے حالات،سیاسی جماعتوں اور عصبیت کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

12.8.3 فرزدق (۱۱۰-۱۹ھ/ ۷۲۷-۶۴۰ء)

12.8.3.1 پیدائش اور حالات زندگی

ابوفراس ہمام بن غالب بن صعصعہ تمیمی دارمی حضرت عمرؓ کی خلافت میں مقام کاظمہ میں پیدا ہوا اور وہیں ابتدائی زندگی گذاری۔چونکہ اس کا چہرہ زیادہ خوبصورت نہیں تھا اسی لیے اس کا لقب ''فرزدق'' پڑ گیا۔فرزدق آغوش ادب میں پلا اور فصیح ماحول میں پروان چڑھا،اس کا باپ اسے اشعار پڑھانے اور شاعری سکھانے لگا حتی کہ پندرہ سال کی عمر میں جب اس کی طبیعت شعروشاعری کے لیے موزوں اور زباں رواں ہوگئی تو وہ اسے حضرت علی کی خدمت میں لے گئے،حضرت علی نے اس کے باپ سے کہا:''اسے قرآن پڑھاؤ کہ وہ اس کے لیے بہتر ہے''۔یہ بات

فرزدق کے ذہن میں بڑھاپے تک جمی رہی اور اس نے حفظ قرآن کا پختہ ارادہ کرلیا۔اس نے گھر آ کر اپنے آپ کو زنجیر سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک قرآن حفظ نہ کرلوں گا اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا، چنانچہ اس نے قرآن حفظ کر کے چھوڑا۔

12.8.3.2 شاعری کی ابتدا

فرزدق میں شاعری کے آثار بچپن ہی سے نمودار ہو گئے تھے چنانچہ کہتے ہیں کہ اس کا سب سے پہلا شعر وہ ہے جو اس نے ایک بھیڑیے کے بارے میں کہا تھا جو اس کے قبیلہ کے ایک مینڈھے کو لے بھاگا تھا۔کہتا ہے:

تلوم علی ان صبح الذئب ضانها　　　　فالوی بکبش وهوفی الرعی رائع

یعنی وہ اس بات پر ملامت کرتی ہے کہ بھیڑیا اس کے ریوڑ میں صبح سویرے گھس پڑا اور ایک مینڈھے کو لے بھاگا حالانکہ وہ چراہ گاہ میں چر رہا تھا۔

12.8.3.3 فرزدق کا شعری اسلوب

فرزدق جو بہت بہادر اور سخی تھا اسے اپنے آبا واجداد پر بڑا فخر اور اپنے خاندان پر بڑا ناز تھا۔اسے اپنے آبا واجداد کے بلند کارنامے سنانے کا بڑا شوق تھا حتی کے وہ خلفا کے سامنے بھی ان کو بیان کرنے سے باز نہ رہتا،یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں فخریہ عنصر غالب ہے ۔فرزدق کا فخریہ کلام پرشوکت الفاظ،شاندار اسالیب،غریب کلمات، نیز عربوں کے مشہور واقعات وانساب کے ذکر اور خانہ بدوشوں کے طرز ادا کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے ۔یہی وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے فرزدق کی شاعری کو راویوں نے پسند کیا اور نحویوں نے اس ترجیح دی ہے اور کہا ''اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو عربی زبان کا تہائی حصہ تلف ہو جاتا، نیز ناقدوں نے اسے دور اموی کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے ۔چونکہ فرزدق کا کلام بڑا مشکل اور ترکیبیں بڑی گنجلک اور معانی ومطالب دقیق اور گہرے ہوتے تھے اسی لیے اس کا کلام عوام کو کم اور علما وادبا او رماہرین نحو ولغت کو زیادہ پسند آتا تھا۔راویوں نے بیان کیا ہے کہ فرزدق نے اپنے کلام میں تقریبا ۴۰ ہزار مشکل اور شاذ ونادر الفاظ استعمال کیے ہیں ۔فرزدق کو بھی اپنی اس مشکل پسندی کا احساس تھا، چنانچہ وہ تمنا کیا کرتا تھا کہ:

ان تکون له رقة جریر لعهره　　　　ولجریر　صلابته　لطهره

یعنی کاش کہ میری بیہودہ گوئی کو جریر کے اسلوب کا سبک پن،اور جریر کی پاک گوئی کو میری صلابت میسر آ جاتی تو دونوں کا کلام ہر اعتبار سے شاہکار ہو جاتا کہ ایک کی کمی دوسری پوری کر دیتا۔فرزدق چٹان سے اپنا کلام تراشتا تھا اور جریر سمندر سے چلو بھر کر شعر کہتا تھا۔فرزدق کے اسی اسلوب کی وجہ سے زبان وادب کی پرانی قدروں اور امتیازی خصوصیات کو محفوظ رکھنے میں جو مدد ملی اس کے بارے میں یہ مقولہ عام طور سے علمی وادبی حلقوں میں مشہور تھا کہ ''لو لا شعر الفرزدق لذهب ثلث اللغة''،یعنی اگر فرزدق کا کلام نہ ہوتا تو تہائی زبان ختم ہو چکی ہوتی۔

تاریخی اعتبار سے بھی فرزدق کی شاعری نہایت اہمیت کی حامل ہے اور اس کے شعر کو تاریخی مصدر شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے عرب کے زمانہ اور قبائل کے محاسن اور مساوی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ۔اسی لیے بعض مؤرخین کہتے ہیں ''اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو عرب کی آدھی تاریخ ضائع ہو جاتی''۔

فرزدق نے عربی شاعری کے متعدد موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔فرزدق کی شاعری میں ہجوگوئی،مدح سرائی اور فخر کا زیادہ غلبہ رہا ہے لیکن فخریہ اشعار میں وہ تمام شعرا پر سبقت لے گیا ہے۔نیز تشبیب ،غزل اور سیاست میں بھی فرزدق نے طبع آزمائی کی ہے۔علاوہ ازیں فرزدق ہجوگوئی میں بڑا سخت ،وصف کرنے میں جدت طراز، مدح میں درمیانہ اور مرثیہ گوئی میں اچھا نہیں تھا۔فرزدق نے اشعار کے ذریعہ حجاج ،عبدالملک ،ان کے بیٹے ولید،سلیمان اور ہشام کے علاوہ دوسرے آل مروان اور دیگر حکمرانوں کی مدح سرائی کی ۔

12.8.3.4 شاعری کے ادوار

فرزدق کے کلام کے دو دور ہیں۔ایک کلام تو اس کی جوانی کا ہے اور دوسرا اس کے بڑھاپے کے زمانے کا۔ جوانی کا کلام جو دراصل اس کے کلام کی صحیح تصویر اور مثالی نمونہ ہے، بڑا پرشکوہ ،مبالغہ آمیز ثقیل اور بھاری بھرکم اور بعض اوقات شاذ الفاظ سے بھی بھرا ہوا ہے اور اسلوب بیان خاصا مشکل اور بعض مواقع پر گنجلک ہے۔فخر میں اور خاص طور سے اپنے آبا اجداد پر فخر کرنے میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتا ہے اور کبھی کبھار تو خلفا اور بادشاہوں کے سامنے بھی اپنے آبا و اجداد کی ایسی تعریف کرتا کہ ان کو بہت برا لگ جاتا تھا اور وہ بجائے انعام واکرام دینے کے ڈانٹ ڈپٹ اور دربار نکاسی کا انعام دیتے تھے۔

ایک دفعہ سلیمان بن عبدالملک نے فرزدق سے شعر سنانے کی فرمائش کی ،فرزدق نے ایک فخریہ قصیدہ پڑھا جس میں حسب عادت اپنے بات غالب کی تعریف کی اور کہا:

سروايركبون الريح وهي تلفهم　　　إلى شعب الأكوار ذات الحقائب

إذااستوضحوانارا يقولون ليتها　　　وقد خصرت ايديهم ،نار غالب

ترجمہ: سخت سردیوں کے زمانے میں جب لوگوں کی انگلیاں گلنے لگتی ہیں اور آگ کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں تو بھی ان کے منہ سے یہی نکلتا ہے کاش یہ آگ غالب (فرزدق کے والد) کی آگ ہوتی۔مطلب یہ ہے کہ جب مصیبتوں اور پریشانیوں اور قحط سالی وخشک سالی سے دنیا تنگ آجاتی ہے تو ہمارے خاندان کو ہی یاد کرتی ہے کیوں کہ ہم لوگ بڑے سخی داتا اور فیاض ہیں۔ یہ سن کر سلیمان کو غصہ بہت آیا لیکن بولا کچھ نہیں۔دربار میں ایک دوسرا مشہور شاعر نصیب بھی تھا،سلیمان نے اس سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ اس نے سلیمان کی شان میں ایک بہت شاندار قصیدہ پڑھا،جس میں کہتا ہے:

قفواخبرونى عن سليمان إننى　　　لمعروف من آل ودان طالب

فعاجوافاثنوا بالذى أنت اهله　　　ولو سكتواأثنت عليک الحقائب

ترجمہ: میں نے تمہارے پاس واپس جانے والے قافلوں سے روک کر تمہارے بارے میں پوچھا تو انھوں نے تمہاری حد درجہ تعریف کی۔اگر وہ چپ رہتے تو ان کے اونٹوں کے پیچھے لدے بھرے ہوئے بورے بول پڑتے۔مطلب یہ کہ تم نے ان کو اتنا انعام واکرام دیا کہ ان کے اونٹ ان انعامات اور بخششوں سے بوجھل ہو رہے تھے۔

قصیدہ سننے کے بعد سلیمان نے غلام سے کہا کہ نصیب کو انعام میں پانچ سو دینار دے دو،اور فرزدق کو اس کے باپ کی آگ میں جھونک دو،فرزدق یہ سن کر یہ شعر پڑھتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا:

خیر الشعرأشرفه رجالا وشر الشعرماقال العبید

ترجمہ: بہترین شعروہ ہے جوشریف (آزاد)لوگ کہےاور بدترین شعروہ جوغلام کہے۔

12.8.3.5 شاعری کی خصوصیات

معانی میں جدت اور ندرت فرزدق کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے کیونکہ وہ ایک ہی معنی کو بار بار ذکرنہیں کرتا تھا۔اس کے برخلاف جریر کے معانی میں تکرار پایا جاتا ہے۔ نیز خیال کی زرخیزی اور عمدگی کا عنصر بھی فرزدق کے اشعار میں بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔علاوہ ازیں اس کے اشعار میں الفاظ کی کثرت اور فخامت بھی حد درجہ پائی جاتی ہے۔مزید برآں پرشوکت اسلوب،مضبوط تراکیب،فصاحت الفاظ، پختہ معانی اس کے کلام کی نمایاں ترین خصوصیات میں شامل ہیں۔

شاعری کا نمونہ: ان اشعار میں اس نے بھیڑیے کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کا ذکر کیا ہےجس میں مذکورہ بالاشاعرانہ صفات پائی جاتی ہیں:

واطلس عسال وما کا ن صاحبا — دعوت لناری موهنا فاتانی

فلما دنا قلت: ادن دونک انني — وایاک فی زادی لمشترکان

فبت اسوی الزادبیني وبینه — علی ضوء نار مرة ودخان

فقلت له لما تکشر ضاحکا — وقائم سیفی من یدی بمکان

تعش فان واثقتنی لا تخوننی — نکن مثل من یا ذئب یصطحبان

وانت امرؤیا ذئب والغدر کنتما — اخیین کاناارضعا بلبان

عبدالملک کے بیٹے ہشام کے بارے میں بھی روایت ہے کہ وہ بھی بہت باذوق اور ناقدانہ نظر کا مالک تھا۔کہتے ہیں کہ اس نے ایک دن خالد بن صفوان سے اپنے زمانے کے مشہور شعرا جیسے جریر،فرزدق اور اخطل کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو اس نے بڑے بلیغ انداز میں سب کے اسلوب بیان اور امتیازی خصوصیات بیان کر کے ہر ایک کا صحیح مقام ومرتبہ متعین کیا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ خالد بن صفوان نے فخر میں فرزدق کو،وصف اور منظر نگاری میں اخطل کو،اوررموز شعر کی شناوری اور معانی ومطالب کے سبک پن میں جریر کوفوقیت دی ہے۔

12.8.3.6 نقائض

جریر اور فرزدق کے درمیان ہونے والی شعری معرکہ آرائی کی مدت پچاس سال سے بھی زیادہ ہے۔ اس شاعرانہ معرکہ آرائی میں فرزدق نے اپنے قوم وقبیلہ کی عظمت اور بلند اقبالی کا شاندار تذکرہ کیا ہے۔ نیز جریر کی ہجوگوئی کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔

نقائض فرزدق کا نمونہ:

إن الذی سمک السماء بنی لنا — بیتا دعائمه عز وأطول

بیتا بناہ لنا الملیک وما بنی — حکم السماء فإنه لا ینقل

بیتا زرارة محتب بفناء ہ — ومجاشع و بو الفوارس نهشل
الأکثرون اذا یعد حصاهم — والأکرمون إذا یعد الأول
لایحتبی بفناء بیتک مثلهم — بداإذا عدالفعال الأفضل
حلل الملوک لباسنا في أرضنا — والسابغات لدی الوغی نتسربل

فرزدق کے قصیدہ کے جواب میں جریر کا قصیدہ:

أعددت للشعراء سما نافعا — فسقیت آخرهم بکأس الأول
لما وضعت علی الفرزدق میسمی — وضغاالبعیث جدعت أنف الأخطل
أخزی الذی سمک السماء مجاشعا — وبنی بناء ک فی الحضیض الأسفل
إني انصببت من السماء علیکم — حتی اختطفتک یا فرزدق من عل
أحلامنا تزن الجبال رزانة — ویفوق جاهلنا فعال الجهل
ولقد بنیت أخس بیت یبتني — فهدمت بیتکم بمثلي یذبل
بیتا یحمم قینکم بفناء ہ — دنسا مقاعده خبیث المدخل

فرزدق بسا اوقات ہجو گوئی میں تمام انسانی اقدار اور اخلاقی ضابطوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا بلکہ پستی اور دنائت کی حد کر دیتا تھا۔ جریر نے اپنی بیوی کے مرنے پر جب اس کا مرثیہ کہا تو بجائے ہمدردی کے انتہائی بیہودہ انداز میں اس مرثیہ کا جواب دیتا ہے۔ جریر نے مرثیہ میں کہا:

لولا الحیاء لهاجنی استعبار — ولزرت قبرک، والحبیب یزار

ترجمہ: اگر شرم وحیا مانع نہ ہوتی تو شدت غم سے میری آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگتیں اور بے تحاشا تری قبر کی زیارت کے لیے دوڑ پڑتا کہ محبوب کی زیارت بہرحال کی جاتی ہے۔ اس کا جواب فرزدق نے انتہائی بھونڈے پن سے دیا ہے:

کانت منافقة الحیاة، وموتها — خزی علانیةعلیک وعار

ترجمہ: یعنی وہ تو زندگی بھر منافق رہی، اور اس کا مرجانا تیرے لیے اعلانیہ عار اور شرمندگی کا باعث ہے۔

ایک مرتبہ جریر اور فرزدق عبدالملک کے دربار میں جمع ہوئے، فرزدق نے کہا کہ میری بیوی نوار بنت مجاشع کو تین طلاقیں اگر میں ایسا شعر نہ کہہ سکوں جس کا یہ گدھی زادہ (جریر) کبھی نہ توڑ سکے اور نہ اس پر اضافہ کر سکے۔ عبدالملک نے کہا: اچھا سناؤ، فرزدق نے برجستہ کہا:

فإني أنا الموت الذي هو واقع — بنفسک ،فانظر کیف أنت مزاوله
وما أجد یا ابن الأتان بوائل — من الموت ،إن الموت لا شک نائله

ترجمہ: میں یقینا وہ موت ہوں جو ایک دن تم کو آئے گی، اب ذرا سوچو، تم اس سے کیسے بچ سکتے ہو؟ اور اے گدھی زادہ موت سے کوئی بچ کر جا نہیں سکتا کہ موت بلاشبہ اس کو دبوچ کر رہے گی۔

شعر سن کر جریر تھوڑی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ پھر بولا کہ میری بیوی ام حرزہ کو میری طرف سے تین طلاق اگر میں نے ان اشعار کو

توڑ نہ دیا اور ان پر اضافہ نہ کر دیا۔ عبدالملک نے لطف لیتے ہوئے کہا: اچھا سناؤ، آج تم میں سے کسی ایک کی بیوی پر طلاق پڑ کر رہے گی۔ چنانچہ جریر نے یہ شعر پڑھے:

أناالبدر يغشي نور عينيک فالتمس	بكفيک يا بن القين هل أنت نائله
أنا الدهر يفني الموت ،والدهر خالد	فجئني بمثل الدهر شيئا يطاوله

ترجمہ: میں چودھویں کا چاند ہوں جس کی روشنی تمہاری آنکھوں کی بینائی پر چھائی ہوئی ہے، اے لوہار زادے ذرا اپنی ہتھیلیوں سے مل کر دیکھو کیا تم اس روشنی کو چھو لو گے؟ میں زمانہ ہوں جو موت کو بھی فنا کر کے رکھ دیتا ہے اور زمانہ ہمیشہ رہے گا، تو میرے پاس کوئی ایسی چیز لا جو زمانہ کا مقابلہ کر سکے۔

یہ سن کر عبدالملک بولا: ''ابوفراس (فرزدق کی کنیت) خدا کی قسم جریر تم سے بڑھ گیا اور تمہاری طلاق پڑ گئی۔

12.8.3.7 شہرہ آفاق قصیدہ میمیہ

فرزدق اہل بیت سے بے انتہا محبت کرتا تھا اگر چہ دنیاوی مال واسباب کے لیے بنوامیہ کی بھی مدح کی ہے لیکن دل سے وہ اہل بیت کا احترام کرتا تھا اور ان کی عظمت کا اعتقاد رکھتا تھا جس کا اظہار عمر کے آخری حصہ میں ہشام بن عبدالملک کی ولی عہدی کے زمانہ میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے کعبہ کے پاس عوام الناس کو حضرت علی زین العابدین بن حسین بن علیؓ کی خدمت کرتے ہوئے، ان کے چہرہ کو بوسہ لیتے ہوئے اور دعا کی درخواست کرتے ہوئے دیکھ کر سوال کیا: یہ کون ہے؟ حالانکہ وہ انھیں جانتا تھا۔ ہشام کا یہ سوال فرزدق پر بہت گراں گذرا، اس نے جوابا درج ذیل شہرہ آفاق اشعار کہے، جس کے بعد ہشام نے اسے قید کروا دیا۔

هذا الذى تعرف البطحاء وطأته	والبيت يعرفه والحل والحرم
هذا ابن خير عباد الله كلهم	هذا التقي النقي الطاهر العلم
وليس قولک :من هذا ؟ بضائره	العرب تعرف من انكرت والعجم
هذا بن فاطمة إن كنت تجهله	بجده أنبياء الله قد ختموا

ترجمہ: یہ وہ ہستی ہے جن کے پاؤں کی چاپ تک کو بطحائے مکہ پہچانتی ہے اور جسے خانہ کعبہ اور حرم وحل سب پہچانتے ہیں۔ یہ اللہ کے تمام بندوں میں سب سے اچھے بندے کے بیٹے ہیں اور بذات خود بڑے متقی، پاک باطن، پاک باز اور ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی لیے تمہارے اس کہنے سے کہ ''یہ کون ہے'' ان کا کچھ نہیں بگڑتا، اس لیے کہ جس سے تم نے تجاہل برتا ہے انھیں تو عرب وعجم سبھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے ہو سن لو یہ سیدۃ النساء جگر گوشہ رسول فاطمہ بتول کی اولاد ہیں اور ان کے نانا خاتم الانبیا ہیں۔

12.8.4 جریر (۱۱۰-۲۸ھ/۷۲۸-۶۴۰ء)

12.8.4.1 پیدائش اور حالات زندگی

جریر بن عطیہ بن خطفی تمیمی حضرت عثمانؓ کی خلافت میں یمامہ میں پیدا ہوا۔ اس کی کنیت ابوحرزہ اور ابن المراغۃ تھیں۔ وہ دیہات میں

ایک تنگدست گھرانہ میں پل کر بڑا ہوا اس لیے جوان ہونے پر اس کی زبان فصیح، ضمیر صحیح اور طبیعت شعروشاعری کے سانچہ میں ڈھل گئی۔اس کے اہل قبیلہ بنوخطفی تنگدستی کے باوجود شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک شاعر غسان سلیطی اس کے قبیلہ کی ہجو کررہاہے۔جریر کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ سخت ترین الفاظ میں اس شاعر کی ہجو کرتا ہے جس کی وجہ سے جریر کی منزلت اپنی قوم میں بڑھ جاتی ہے۔جریر کا خاندان بڑا غریب تھا، ان کا پیشہ بھیڑ، بکریاں اور گدھے چرانا تھا چنانچہ جریر بھی چرواہے کا کام کرتا تھا۔جریر نے اپنی عمر کا اکثر حصہ بادیہ یمامہ میں ہی گذارا، مگر جب اس کے اور فرزدق کے درمیان ہجوگوئی، جھڑپوں اور مفاخرت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اپنے خاندان کے لوگوں کے اصرار پر بصرہ آیا اور دس سال تک جم کر یہاں فرزدق کے خلاف زبان وقلم کا معرکہ گرم کیے رہا۔

12.8.4.2 نقائض کی ابتدا

نقائض کی ابتدا جریر اور غسان سلیطی، جو جریر کا چچازاد بھائی ہوتا تھا، کے درمیان ہوئی شعری جھڑپ سے ہوتی ہے جس میں جریر غسان کی ہجو کرتا ہے۔اس کے بعد قبیلہ بنومجاشع کا شاعر بعیث غسان کی مدد کے لیے آتا ہے لیکن جریر ان دونوں کی ہجو کرکے ان پر غالب آجاتا ہے اور بنومجاشع کے عورتوں کی بھی سخت ترین ہجو کرتا ہے جس کی وجہ سے بنومجاشع کی عورتیں فرزدق سے مدد طلب کرتی ہیں اور پھر دونوں کے درمیان تاریخی ہجوگوئی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو پچاس سال سے زیادہ عرصہ پر مشتمل ہوتا ہے۔اس ہجوگوئی میں تقریبا اسی شعرا حصہ لیتے ہیں لیکن جریر سوائے اخطل اور فرزدق کے تمام پر غالب آتا ہے۔

جریر وفرزدق کے شعری نقائض کا نمونہ۔فرزدق کہتا ہے:

إن الذی سمک السماء بنی لنا   بیتا دعائمه أعز وأطول
بیتا بناه لنا الملیک وما بنی   حکم السماء فانه لا ینقل
بیتا زرارة محتب بفناء ه   ومجاشع وأبو الفوارس نهشل
الأكثرون إذا يعد حصاهم   والأكرمون إذا يعد الأول
لايحتبى بفناء بيتک مثلهم   أبداإذا عدالفعال الأفضل
حلل الملوک لباسنا في أرضنا   والسابغات لدى الوغى نتسربل

فرزدق کے جواب میں جریر کا قصیدہ:

أعددت للشعراء سما نافعا   فسقيت آخرهم بكاس الأول
لما وضعت على الفرزدق ميسمى   وضغاالبعيث جدعت أنف الأخطل
أخزى الذى سمک السماء مجاشعا   وبنى بناء ک في الحضيض الأسفل
إنى انصببت من السماء عليكم   حتى اختطفتک يا فرزدق من عل
أحلامنا تزن الجبال رزانة   ويفوق جاهلنا فعال الجهل
ولقد بنيت اخس بيت يبتنى   فهدمت بيتكم بمثلي يذبل

بیتا یحمم قینکم بفناء ہ دنسا مقاعدہ خبیث المدخل

نقائض کے تین سب سے اہم اور باکمال اور قادرالکلام شعرا ہیں: جریر، فرزدق اور اخطل۔لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف تھا کہ ان میں سے کون کس سے بڑا شاعر ہے، چنانچہ ہر ایک اپنے پسندیدہ شاعر کو بڑھاتا تھا اس لیے اعتدال پسند نقادوں نے رائے دی ہے کہ ''اگر بہترین غزل، حسین تشبیب، خوبصورت الفاظ، سبک اسلوب اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے نقطۂ نظر سے تینوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو جریر کو سب پر فوقیت حاصل ہوگی'' اور ''اگر بہترین فخر، بھاری بھرکم الفاظ، دقیق اسلوب بیان، پرشکوہ اور گمبھیر اشعار اور گہرے معانی ومطالب کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو فرزدق ان میں سب سے بڑا شاعر نظر آئے گا''۔ اور ''جس کو فصاحت و بلاغت اور ہجو و مدح میں کمال کے ساتھ، شراب وکباب اور یاران مے کدہ کا وصف زیادہ پسندیدہ ہو اسے اخطل کے کلام میں زیادہ لطف آئے گا''۔

12.8.4.3 شاعری کے موضوعات

جریر نے شعر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جس میں غزل، ہجوگوئی، فخر، مرثیہ، مدح سرائی اور سیاسی شاعری شامل ہے۔

ایک دفعہ عبدالملک بن مروان نے ایک پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔کھانے کے بعد اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کھانا کیسا رہا؟ تو ایک طرف سے آواز آئی کہ امیر المؤمنین جہاں تک کھانے کے مقدار کا تعلق ہے تو واقعی میں نے اتنا زیادہ اور اتنے انواع واقسام کے کھانے اب تک نہیں دیکھے، لیکن جہاں تک مزیدار ہونے کا تعلق ہے، تو یقین فرمایئے کہ میں نے اس سے کہیں زیادہ مزیدار کھانا کھایا ہے۔عبدالملک نے جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک بدو سامنے کھڑا ہے۔عبدالملک نے اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اچھا تو تم نے اس سے بھی زیادہ مزیدار کھانا کھایا ہے؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ ہو کس قبیلہ کے؟ بدوی نے جواب دیا کہ آپ کے ننیہالی قبیلہ بنی عذرہ کا۔اس پر عبدالملک نے کہا کہ اس قبیلہ کے لوگ تو شعروشاعری کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، تم کو بھی اس سے کچھ دلچسپی ہے؟ بدوی بولا: جی ہاں تھوڑا بہت ہے۔یہ سن کر عبدالملک نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ عربوں نے مدح میں سب سے اچھا شعر کون سا کہا ہے؟ بدوی بولا: جریر کا آپ کے بارے میں یہ شعر:

ألستم خير من ركب المطايا وأندى العالمين بطون راح

ترجمہ: کیا آپ سواری پر بیٹھنے والوں میں سب سے بہتر (تزک واحتشام کے ساتھ) اور جودوسخا کرنے میں دنیا میں سب سے بڑے داتا نہیں ہیں؟۔یہ سن کر عبدالملک کی باچھیں کھل گئیں، اس کے بعد اس نے کہا کہ اچھا ہجو میں سب سے اچھا شعر کون سا ہے؟ بدوی بولا جریر کا یہ شعر جو اس نے راعی الابل النمیری کی ہجو میں کہا تھا:

فغض الطرف أنک من نمير فلا كعبا بلغت ولا كلابا

ترجمہ: نگاہیں نیچی کر، تو قبیلہ نمیر کا فرد ہے، اور اتنا نیچا ہے کہ نہ قبیلہ کعب کو پہنچ سکا اور نہ کلاب کو۔اب عبدالملک نے کہا کہ اچھا فخر میں سب سے اچھا شعر سناؤ: بدوی نے جواب دیا کہ اس میں بھی جریر کا ہی شعر ہے:

إذا غضبت عليک بنو تميم حسبت الناس كلهم غضابا

ترجمہ: جب بنو تمیم تم سے خفا ہوجاتے ہیں تو تم کو ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا تم سے خفا ہوگئی ہے۔''بہت خوب'' عبدالملک بولا، اچھا غزل کا سب سے اچھا شعر سناؤ۔بدوی نے فورا کہا: جریر ہی کا یہ شعر:

إن العيون التي فی طرفها حور　　　قتلننا ثم لم يحيين قتلانا

ترجمہ: ان آنکھوں نے جو شدید سیاہی اور سفیدی سے مل کر کٹاری بن گئی ہیں، ہمیں جان سے مار ڈالا، پھر ہمارے مردوں کو زندہ کرنے کی فکر بھی نہیں کی۔ بدوی کی اس بالغ نظری کو دیکھ کر اور اتنے عمدہ اشعار سن کر عبدالملک باغ باغ ہوگیا اور حکم دیا کہ بدوی کو انعام واکرام سے نوازا جائے۔

کہتے ہیں اس دعوت میں جریر بھی موجود تھا، اور جب بھی بدوی اس کا شعر پڑھتا وہ فخر سے اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا۔ جب خلیفہ نے بدوی کو انعام دینے کا حکم دیا تو جریر بولا کہ میں بھی بدوی کو انعام دیتا ہوں، چنانچہ بدوی اس موقعہ پر دوگنا انعام لے کر رخصت ہوا۔

نقادوں نے کہا ہے کہ حقیقت نگاری میں جریر کا یہ شعر بے مثال نمونہ ہے:

إني لارجو منک خيراعاجلا　　　والنفس مولعة بحب العاجل

ترجمہ: میں تو آپ کی فوری داد و دہش کا متمنی ہوں کہ نفس ہمیشہ فوری مل جانے والی چیزوں کا فریفتہ ہوتا ہے۔

12.8.4.4 امرا کی مدح سرائی

جریر آبائی مقام میں شعری کاوشوں کے بعد عزت، شرف ومنزلت اور مال و دولت کے حصول کے لیے بصرہ کی جانب رخت سفر باندھ کر حجاج سے جا ملا اور اس کی خوب ستائش کرنے لگا۔ حجاج کے پاس جریر خوب عزت اور قدر ومنزلت حاصل کرتا ہے۔ وہ قصائد جو اس نے حجاج کی مدح میں کہے بہت مشہور ہوئے حتی کہ عبدالملک کو اس کی اطلاع پہنچی اور اس نے جریر کا حجاج کے پاس رہنا نامناسب سمجھا۔ حجاج خلیفہ کی نظر پہچان گیا اور شاعر کو اپنے بیٹے محمد کے ہمراہ دمشق روانہ کر دیا، وہاں پہنچ کر جب جریر نے عبدالملک کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی تو خلیفہ نے اجازت نہ دی اور سخت عتاب و برہمی کے لہجہ میں کہا: ''بس تم حجاج کے لیے ہو''۔ اس کے بعد وہ خلیفہ تک رسائی کے ذرائع پیدا کرنے میں لگا رہا اور لوگوں سے اپنی سفارشیں کراتا رہا حتی کہ اسے عبدالملک کو اپنا وہ قصیدہ سنانے کا موقع مل گیا جس کا مطلع ہے:

إ تصحو أم فؤادک غير صاح　　　عشية هم صحبک بالرواح

جب وہ اس شعر پر پہنچا:

أَلستم خير من ركب المطايا　　　وأندى العالمين بطون راح

تو عبدالملک مسکرایا اور کہا: ''ہم ایسے ہی ہیں اور ایسے ہی رہیں گے''۔ پھر اسے سو اونٹنیاں اور آٹھ چرواہے انعام میں دیے۔ اس قصیدہ کے سنانے اور اخطل کے مرجانے کی وجہ سے جریر تمام خلفا کی نظر میں بالعموم اور عمر بن عبدالعزیز کی نظر میں بالخصوص تمام شعرا سے زیادہ وقیع اور معزز ہوگیا۔ عبدالملک کے بعد جریر نے ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک اور ہشام کی خوب مدح اور ستائش کی ہے۔

عبدالملک بن مروان کی شان میں مدحیہ اشعار:

لولا الخليفة والقرآن يقرؤه　　　ما قام للنا س أحكام ولا جمع

أنت الأمين ِمين الله لاسرف　　　فيما وليت والا هيابة ورع

أنت المبارک يهدي الله شيعته　　　إذا تفرقت الأهواء والشيع

إن البرية ترضى ما ارتضيت لها　　إن سرت ساروا وإن قلت أربعوا أربعوا

12.8.4.5 جریر کے اشعار کی امتیازی خصوصیات:

جریر ایک فطری شاعر تھا۔خوب صورت، سہل اور شیریں الفاظ کا انتخاب کر کے حسین قافیوں اور ہلکے ہلکے معانی ومطالب،خوبصورت رمز وکنایہ اور مناسب تشبیہ واستعارہ کے امتزاج سے اپنے کلام کو اتنا دل آویز،مؤثر اور سحر طراز بنا دیتا تھا کہ منہ سے واہ نکل جاتی تھی اور ہر خاص وعام اس سے یکساں لطف لیتا تھااور وہ خود بھی اپنے فنی کمالات کو دیکھ کر جھوم اٹھتا تھا۔اس کی وجہ بادیہ کی پرورش تھی جہاں زبان بنی سنوری ہوتی تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن وحدیث کا اثر تھا جس سے اس کا اسلوب کلام نکھرا اور چمکا۔ اس کے کمالات کا مظہراس کے وہ قصیدے ہیں جواس نے تشبیب یا عتاب میں کہے ہیں۔اس کے مقابلہ میں فرزدق بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ استعمال کرتا تھا،معانی ومطالب میں بڑی گہرائی پیدا کرتا اور دقیقہ سنجی سے کام لیتا،اسلوب کلام اور انداز گفتگو بڑا ٹھوس اور گمبھیر ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کے کلام سے صرف پڑھا لکھا طبقہ اور خاص ادبی ذوق رکھنے والے علما ہی لطف لیتے تھے۔اور ظاہر ہے ان کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے اسی لیے فرزدق کے کلام کو ہر خاص وعام میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو جریر کے کلام کو ہوئی۔

جریر میں نہ تو اخطل کی سی خباثت وے پرستی تھی نہ فرزدق کی سی درشتی وبدکاری۔ وہ پاکیزگی طبع،نزاکت احساس،عفت،صحیح دینداری اور خوش خلقی کی صفات سے مزین تھا جس کا اثر اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔چنانچہ حسن اسلوب،شیرینی غزل،تلخی ہجو،خوبی مرثیہ اور شاعری کے جملہ اصناف کو بحسن وکمال ادا کرنے میں وہ ممتاز ہوگیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ افق شاعری پر سب سے زیادہ درخشندہ اور شاعریت میں سب سے زیادہ کامل تھا۔

جریر کی نشوونما دیہات میں ہوئی تھی اسی لیے اس کی شاعری خالص دیہاتی اسلامی زندگی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے الفاظ آسان ،معانی فطری اور اسلوب پراثر ہوا کرتا ہے۔اسی وجہ سے اس کی شاعری عوام اور خواص ہر دوطبقہ میں یکساں مقبول رہی ہے۔ نیز اس کے اشعار میں قرآن اور اسلام کا واضح اثر نظر آتا ہے بطور خاص مدح سرائی اور مرثیہ میں۔اپنی اہلیہ ام حزرہ کے مرثیہ اشعار بطور نمونہ:

لولا الحياء لهاجنى استعبار　　ولزرت قبرک والحبيب يزار
ولقد نظرت وما تمتع نظرة　　فى اللحد حيث تمكن الاحفار
ولهت قلبى اذ علتنى كبرة　　وذوو التمائم من بنيک صغار
ولقد اراک كسيت اجمل منظر　　و مع الجمال سكينة ووقار
واذاسريت رايت نارک نورت　　وجها اغر يزينه الاسفار
كانت مكرمة العشير ولم يكن　　يخشى غوائل ام حزرة جار
والريح طيبة اذا استقبلتها　　والعرض لا دنس ولا خوار
صلى الملائكة الذين تخيروا　　والصالحون عليک والابرار
وعليک من صلوات ربک كلما　　نصب الحجيج ملبدين وغاروا

لا يلبث القرناء ان يتفرقوا ليل يكر عليهم ونهار

ایک مرتبہ فرزدق اور اخطل نے جریر کے اشعار کا مذاکرہ کرنے کے بعد یہ اقرار کیا کہ جریر کی شاعری ان کی شاعری سے زیادہ عوام اور خواص ہر دو طبقہ میں مشہور ہیں۔ جبکہ ان کی شاعری صرف خواص اور ادبا کے درمیان ہی مقبول ہے۔

12.9 اکتسابی نتائج

عربی شاعری نے عصر اموی میں بے پناہ ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ نئے نئے موضوعات پر اس عصر کے شعرا نے طبع آزمائی کی، نیز سابق میں موجود بعض موضوعات کو ترقی دے کر اسے نئی شکلیں بھی عطا کیں جس کی اہم مثال غزل ہے، اگر چہ شعر میں غزل کا استعمال کافی قدیم ہے لیکن عصر اموی میں غزل کی ایک منفرد اور ممتاز شناخت وجود میں آئی بلکہ اس میں غزل صریح، غزل عمری اور غزل عذری کے نام سے دو انواع بھی وجود میں آئیں۔ اسی طرح نقائض کے ذریعہ عربی شاعری نے اس عصر کے اہم علمی آثر کے ساتھ ساتھ تاریخی آثار کو بھی محفوظ کرلیا۔ عراق، شام اور حجاز کے علمی، ادبی اور شعری ماحول نے جو کچھ عربی زبان وادب کو دیا ہے وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ شعرا کی مذہبی وابستگی، سیاسی تعلق، باہم مقابلہ آرائی نے جہاں ہر شاعر کی ایک مخصوص جماعت تیار کردی تھی جو اس کی مدد اور مساعدت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ اس طرز عمل نے اختلاف اور تنوع کے ساتھ قبائلی تعصب جسے اسلام نے منع کیا تھا امرا کی سرپرستی میں دوبارہ عام ہونے لگا۔ اس کے علاوہ جملہ اصناف شعر میں بھی اس عصر کی شاعری ممتاز سمجھی جاتی ہے۔ نیز شوکت الفاظ، شاندار اسلوب، بہترین بندش، خوبصورت آب وتاب ودیگر اس عصر کی نمایاں ترین خصوصیات میں شامل ہیں۔

دور اموی کی عربی شاعری اپنے موضوعات، اسالیب، اغراض ومقاصد کے حوالہ سے دوسرے تمام زمانوں کی شاعری سے ممتاز اور منفرد سمجھی جاتی ہے۔ عصر اموی نے ایسے قادر الکلام شعرا عربی زبان کو دیے ہیں جنھوں نے عربی شاعری کے مختلف موضوعات جیسے مدح سرائی، ہجوگوئی، مرثیہ، فخر، سیاسی شاعری، مجون اور غزل وغیرہ کو اپنے منفرد انداز اور دلنشین اسلوب کے ذریعہ انفرادیت سے نوازا ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ میں بچپن ہی سے شاعری کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اس نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی لیکن بطور خاص غزل، عورتوں کے محاسن اور اوصاف اور دل لگی کو منفرد اور غیر مانوس طریقہ سے روشناس کرایا حتی کہ اسے عورتوں کا شاعر کہا جانے لگا، نیز اس کی شاعری میں رقت، سہولت، لہو ولعب اور موسیقی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ اخطل نے بھی مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی اور مدح، فخر، ہجو اور شراب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی عمدہ کلام پیش کیا۔ امرا کی مدح سرائی کی بدولت اسے ''بنوامیہ کا شاعر'' اور ''امیر المؤمنین کا شاعر'' جیسے القاب سے نوازا گیا۔ جریر اور فرزدق نے بھی اپنی شاعری میں تقریبا تمام موضوعات کا احاطہ کیا لیکن انھوں نے نقائض کو اپنے عمدہ کلام کے ذریعہ وجود اور دوام بخشا اور اسے اپنے اشعار کے ذریعہ دور اموی کی سب سے ممتاز شعری صنف بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

12.10 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ عصر اموی میں عربی شاعری اور اس کے اغراض ومقاصد پر جامع نوٹ لکھیے۔

۲۔ نقائض کی نشوونما اور اس کے اہم شعرا پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

۳۔عصر اموی کے شعری مراکز اور ان کی خصوصیات کو مفصل بیان کیجیے۔

۴۔غزل عذری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

۵۔سیاسی شعر کے اسباب اور محرکات کا جائزہ لیجیے۔

۶۔شعر اموی کی فنی خصوصیات کو ذکر کیجیے۔

۷۔عصر اموی کے اہم شعرا پر جامع نوٹ لکھیے۔

۸۔عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

۹۔فرزدق کے اسلوب اور شعری موضوعات پر مفصل گفتگو کیجیے۔

۱۰۔جریر کی شاعری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

۱۱۔عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کی فنی خصوصیات کو بیان کیجیے۔

۱۲۔اخطل کی مدح سرائی کا جائزہ لیجیے۔

12.11 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱۔الجامع في تاريخ الأدب العربي، حنا فاخوري، دار الجيل، بيروت۔لبنان۔

۲۔تاريخ الأدب العربى، أحمد حسن زيات، دار المعرفة، بيروت۔لبنان۔

۳۔المفصل فى تاريخ الأدب العربى، أحمد أسكندرى وأصحابه، دار احياء العلوم، بيروت۔

۴۔عربی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

اکائی 13 عباسی خلافت وحکومت پر ایک طائرانہ نظر

اکائی کے اجزا

13.1 مقصد

13.2 تمہید

13.3 عباسی خلافت وحکومت کا قیام

13.4 عباسی خلافت وحکومت کا دورانیہ اور اس کے ادوار

13.4.1 عباسی خلافت وحکومت کا پہلا دور

13.4.2 عباسی خلافت وحکومت کا دوسرا دور

13.4.3 عباسی خلافت وحکومت کا تیسرا دور

13.4.4 عباسی خلافت وحکومت کا چوتھا دور

13.4.5 عباسی خلافت وحکومت کے زوال کے اسباب وعوامل

13.5 مصر میں عباسی خلافت وحکومت کا احیا

13.5.1 مصر میں عباسی خلافت وحکومت کے خلفا اور ان کا دور اقتدار

13.6 عباسی خلافت وحکومت کے محکمہ جات

13.6.1 عہد عباسی کا عدلیہ

13.6.2 عہد عباسی میں فوج اور پولیس کا نظام

13.6.3 عہد عباسی کا مالی نظام

13.7 عہد عباسی کا نظام تعلیم

13.8 عہد عباسی کا معاشرہ

13.9 عہد عباسی کے اسلامی فرقے

13.9.1 شیعہ

13.9.2 خوارج

13.9.3 مرجئہ

13.9.4 معتزلہ

13.9.5 دیگر فرقے

13.10 عصر عباسی کی علمی سرگرمیاں

13.10.1 تحریک ترجمہ

13.11 عصر عباسی کی نثر نگاری

13.11.1 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات

13.11.2 نثر نگاری کے اصناف

13.12 عصر عباسی کی شاعری

13.12.1 عہد عباسی کے شعرا کے طبقات

13.12.2 عہد عباسی کے شعرا کی فنی وموضوعاتی تقسیم

13.13 عصر عباسی کی تہذیب وتمدن

13.13.1 عہد عباسی کا فن تعمیر

13.13.2 عہد عباسی میں بسائے جانے والے شہر

13.13.2.1 عباسیہ

13.13.2.2 بغداد

13.13.2.3 کرخ

13.13.2.4 مہدیہ/معسکر المہدی/ رصافہ

13.13.2.5 سامراء

13.14 اکتسابی نتائج

13.15 نمونے کے امتحانی سوالات

13.16 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

13.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر طلبہ یہ جان لیں گے کہ عباسی خلافت کا قیام کن حالات اور اسباب کی بنا پر ہوا تھا اور اس کے قیام کی تحریک میں کن کن افراد نے فعال کردار ادا کیا تھا۔ نیز یہ بھی جان لیں گے کہ عہد عباسی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟ عہد عباسی میں اسلامی قلمرو کی حدود اربعہ کیا تھیں اور عباسی خلفا کا مقام ومرتبہ کیا تھا؟ مزید برآں اس عہد میں اسلامی تہذیب وتمدن کو کیونکر فروغ حاصل ہوا اور کس طرح اس عہد میں علوم وفنون نے ارتقائی مراحل طے کیے تھے اور ان کے فروغ میں تحریک ترجمہ نے کیا کردار ادا کیا تھا؟ اس عہد میں عربی ادب کی صورت حال کیا تھی اور شاعری ونثر نگاری کا مقام ورتبہ کیا تھا؟

13.2 تمہید

اسلامی تاریخ میں عباسی خلافت وحکومت کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور اسلامی دور کو حاصل نہ ہوسکا۔ پوری اسلامی تاریخ میں اس عہد کے مدمقابل کسی اور عہد اور دور کو نہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ عہد عباسی نے بعد کے اسلامی ادوار پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسی عہد میں وہ علوم وفنون اوج کمال کو پہنچے جن کی ابتدا عہد اموی میں ہوئی تھی۔ عباسی خلافت وحکومت پانچ سو سال کے عرصہ تک قائم رہی۔ اس عرصہ میں وہ قانون الٰہی کے مطابق عروج وزوال کے ادوار سے بھی گزرتی رہی حتی کہ اپنے دور انحطاط میں جب وہ محض کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی، اس وقت بھی کچھ علاقوں جیسے اندلس وغیرہ کو چھوڑ کر مجموعی طور پر اس کی دینی سیادت ومرکزیت کو تسلیم کیا جاتا تھا اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور خلافت بغداد سے اپنی وابستگی کا- برائے نام ہی سہی- اعتراف واظہار کیا جاتا تھا اور اسے اپنے لیے خیر وشرف سمجھا جاتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں مذہبی، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے عہد عباسی کو زریں دور قرار دیا جاتا ہے کہ انھوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کو عالمی تہذیب وثقافت کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ اس عہد میں علوم وفنون کو جتنی ترقی ہوئی وہ کسی اور دور میں ممکن نہ ہوسکی لہذا اسلامی علوم وفنون کے ارتقا کو عباسی خلافت وحکومت کا سب سے بڑا امتیاز قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

13.3 عباسی خلافت وحکومت کا قیام

عباسی خلافت وحکومت کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششوں پر جب ایک نظر ڈالی جاتی ہے تو اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا ۶۶ھ/ ۶۸۵ء میں اس وقت ہوئی تھی جب مختار نامی شخص نے محمد بن علی بن ابی طالب معروف بہ محمد بن الحنفیہؒ (وفات: ۸۱ھ/ ۷۰۰ء) کے نام علم بغاوت بلند کیا تھا۔ بنوعباس کے استحقاق خلافت کی خاطر ہونے والی اس بغاوت نے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک طاقت کی شکل اختیار کر لی اور اس میں وہ لوگ شامل ہوتے چلے گئے جو کسی نہ کسی وجہ سے اموی خلافت سے ناراض یا بدظن تھے۔

محمد بن الحنفیہ کی وفات کے بعد ان کے پیروکار تین بڑی جماعت میں تقسیم ہوگئے جن میں سے ایک جماعت اور گروہ کی سربراہی ابن الحنفیہؒ کے صاحبزادے ابو ہاشم عبداللہ (وفات ۹۸ یا ۹۹ھ/ ۷۱۶ یا ۷۱۷ء) کر رہے تھے۔ ان کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جنھوں عباسی خلافت وحکومت کے قیام کے لیے بنیادی اور اہم امور انجام دیے تھے۔ اتفاق سے ابو ہاشم عبداللہ بن الحنفیہؒ کی کوئی اولاد نہ تھی اور ان کی وفات ایک ایسے مقام پر ہوئی تھی جہاں خانوادۂ علی بن ابی طالبؓ کا کوئی فرد موجود نہیں تھا اور اہل بیت میں سے صرف حضرت عباسؓ کے پر پوتے

اوراولیں عباسی خلیفہ سفاح ومنصور کے والد محترم محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؒ (وفات ۱۲۵ھ/ ۷۴۳ء) وہاں موجود تھے لہذا ابوہاشم عبداللہ بن الحنفیہ کے متبعین کی ایک جماعت نے یہ دعوی کیا کہ انھوں نے امامت کو بذریعہ وصیت ان کی جانب منتقل کر دیا تھا۔آگے چل کر جہاں یہ منتقلی عباسی خلافت وحکومت کے قیام کا سنگ میل ثابت ہوئی وہیں ''خلافت وامامت کا استحقاق حضرت علیؓ کی اولاد سے حضرت عباسؓ کی اولاد میں منتقل ہوگیا''۔

سیاسی طور پر اموی خلافت کے خاتمہ کے ساتھ عباسی خلافت وحکومت کا آغاز ہوتا ہے۔عباسی خلافت وحکومت کا پہلا اور بنیادی پتھر 'عباسی تحریک' کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز محمد بن علیؒ (وفات ۱۲۵ھ/ ۷۴۳ء) نے اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملکؒ (وفات:۹۹ھ/ ۷۱۷ء) کے عہد خلافت میں کیا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریک کا آغاز حمیمہ (اردن کے صوبہ معان کے جنوب میں واقع ایک گاؤں،بعض مؤرخین نے اسے شام کا علاقہ قرار دیا ہے) سے کیا تھا جہاں سے مختلف علاقوں کے قافلے گذرتے تھے۔ان کی منصوبہ بند کوششوں سے اس کے اثرات تھوڑے ہی دنوں میں خراسان تک پہنچ گئے تھے۔ان کے بیٹے ابراہیم بن محمد (وفات:۱۳۱ھ/ ۷۴۹ء) کی قیادت میں اس تحریک نے مزید طاقت اورقوت حاصل کر لی تھی۔ابراہیم بن محمد کے وزیر ابوسلمہ خلال (وفات: ۱۳۲ھ) اورابومسلم خراسانی (وفات: ۱۳۷ھ) نے کوفہ اورعراق میں اس کا جال سا بچھا دیا تھااور وہ اموی خلافت کے خلاف سب بڑی طاقت بن کر ابھری تھی جس نے آخر کار اموی خلافت کا تختہ پلٹ دیا۔محمد بن علی اور ابراہیم بن محمد کے زمانہ تک عباسی خلافت وحکومت کے لیے راہیں بڑی ہی رازداری کے ساتھ ہموار کی جارہی تھیں کہ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے زمانہ میں یہ راز فاش ہوگیااور انھوں ابراہیم بن محمد کوگرفتار کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس تحریک میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب ابراہیم بن محمد کی وفات کے بعد عباسی تحریک کی قیادت اوراس کا نظم ونسق اولین عباسی خلیفہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد ملقب سفاح (وفات ۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء) کے ہاتھوں میں آیا۔انھوں نے خلافت عباسیہ کے قیام کی راہیں ہموار کرنے کے لیے چند افراد کومنتخب کیا تھا جنھیں 'داعی' کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ابوالعباس عبداللہ بن محمد کے منتخب کردہ افراد مختلف علاقوں میں گھوم گھوم کر مذکورہ تحریک کے اغراض ومقاصد کو کچھ اس طرح بیان کرتے تھے کہ سامعین پر ایک خاص قسم کا جوش وجذبہ پروان چڑھ جاتا تھا۔ساتھ ہی ساتھ وہ انھیں اس تحریک کی مدد واعانت کرنے پر بھی ابھارتے تھے۔ان افراد کی مسلسل کوششوں نے خلافت عباسیہ کے قیام کی تمام تر راہیں ہموار کردیں تھیں۔ان منتخب افراد میں سے ایک پرجوش داعی کا نام ابومسلم خراسانی تھا جنھوں نے خلافت عباسیہ کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا تھا،اور ۱۳۲ھ/ ۷۴۹ء میں عراق کے اہم ترین شہر کوفہ پر قبضہ کر کے خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

13.4 عباسی خلافت وحکومت کا دورانیہ اوراس کے ادوار

عباسی خلافت وحکومت کا دورانیہ پانچ سوسال سے زائد (۱۳۲-۶۵۶ھ/ ۷۵۰-۱۲۵۸ء) عرصہ پر محیط ہے لیکن اس کی اصلی شان وشوکت صرف ابتدائی سوسال تک ہی یعنی خلیفہ متوکل (وفات:۲۴۶ھ/ ۸۶۱ء) کے عہد تک ہی برقرار رہ سکی تھی۔بعد کے ادوار میں عباسی خلفا کی حیثیت دن بدن کم ہوتی چلی گئی تھی حتی کہ آخری عہد میں وہ صرف نام کے خلفا ہی رہ گئے اور اصل اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں رہا کہ ''عباسی خلافت وحکومت کی حیثیت محض تبرک اور عباسی خلیفہ کا مرتبہ صرف دعا گو کا رہ گیا تھا'' اور آخر کار ایک مجبور ولاچار خلافت وحکومت کی مانند

اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی اور تاتاریوں/منگولوں کے ایک ایل خانی حکمراں ہلاکو خان کے ہاتھوں ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

مؤرخین عباسی خلافت وحکومت کو کئی ایک ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ مؤرخین اسے دو ادوار، کچھ تین ادوار اور کچھ چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ عام طور مؤرخین عباسی خلافت وحکومت کو حسب ذیل چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

13.4.1 عباسی خلافت وحکومت کا پہلا دور

☆ ۱۳۲ تا ۲۴۶ھ/ ۷۵۰ تا ۸۶۱ء: اس عہد میں کل دس خلیفہ ہوئے تھے جنھوں نے صحیح معنوں میں حکمرانی کی تھی اور اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے۔ اسی عہد کو عباسی عہد کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ پہلے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

۱- ابوالعباس عبداللہ بن محمد ملقب بہ سفاح (وفات: ۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء)، دور خلافت: ۱۳۲-۱۳۶ھ/ ۷۴۹-۷۵۳ء۔

۲- ابوجعفر عبداللہ بن محمد ملقب بہ منصور (وفات: ۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء)، دور خلافت: ۱۳۶-۱۵۸ھ/ ۷۵۳-۷۷۴ء۔

۳- ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ ملقب بہ مہدی (وفات: ۱۶۹ھ ۷۸۵ء)، دور خلافت: ۱۵۸-۱۶۹ھ/ ۷۷۵-۷۸۵ء۔

۴- ابومحمد موسیٰ بن محمد ملقب بہ ہادی (وفات: ۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء)، دور خلافت: ۱۶۹-۱۷۰ / ۷۸۵-۷۸۶ء۔

۵- ابوجعفر ہارون بن محمد ملقب بہ رشید (وفات: ۱۹۳ھ/ ۸۰۹ء)، دور خلافت: ۱۷۰-۱۹۳ھ/ ۷۸۶-۸۰۹ء۔

۶- محمد بن ہارون ملقب بہ امین (وفات: ۱۹۸ھ/م ۸۱۳)، دور خلافت: ۱۹۳-۱۹۸ھ/ ۸۰۹-۸۱۳۔

۷- ابوالعباس عبداللہ بن ہارون ملقب بہ مامون (وفات: ۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء)، دور خلافت: ۱۹۸-۲۱۸ھ/ ۸۱۳-۸۳۳ء۔

۸- ابواسحاققاسم بن ہارون ملقب بہ معتصم باللہ (وفات: ۲۲۷ھ/ ۸۴۱ء)، دور خلافت: ۲۱۸-۲۲۷ھ/ ۸۳۳-۸۴۱ء۔

۹- ابوجعفر ہارون بن محمد ملقب بہ واثق باللہ (وفات: ۲۳۲ھ/ ۸۴۷ء)، دور خلافت: ۲۲۷-۲۳۲ھ/ ۸۴۱-۸۴۶ء۔

۱۰- جعفر بن محمد ملقب بہ متوکل علی اللہ (وفات: ۲۴۷ھ/ ۸۶۱ء)، دور خلافت: ۲۳۲-۲۴۷ھ/ ۸۴۶-۸۶۱ء۔

13.4.2 عباسی خلافت وحکومت کا دوسرا دور

☆ ۲۴۶ تا ۳۳۴ھ/ ۸۶۱ تا ۹۴۵ء: اس عہد میں کل گیارہ خلیفہ ہوئے تھے۔ اس عہد میں ترک سالاروں کا بول بولا تھا کہ وہ عباسی خلفا کے نام پر حکمرانی کرتے تھے اور اپنے من چاہے فیصلے خلیفہ کے نام پر مسلط کرتے تھے تاہم وہ خلفا کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ دوسرے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

۱- محمد بن جعفر ملقب بہ منتصر باللہ (وفات: ۲۴۸ھ)، دور خلافت: ۲۴۷-۲۴۸ھ/ ۸۶۱-۸۶۲ء۔

۲- احمد بن محمد ملقب بہ مستعین باللہ، دور خلافت: ۲۴۸-۲۵۱ھ/ ۸۶۲-۸۶۵ء۔

۳- ابوعبداللہ محمد بن جعفر ملقب بہ معتز باللہ (وفات: ۲۵۵ھ)، دور خلافت: ۲۵۱-۲۵۵ھ/ ۸۶۵-۸۶۹ء۔

۴- ابوعبداللہ بن واثق ملقب بہ مہتدی باللہ (وفات: ۲۵۶ھ)، دور خلافت: ۲۵۵-۲۵۶ھ/ ۸۶۹-۸۷۰ء۔

۵- ابوالعباس احمد بن متوکل ملقب بہ معتمد علی اللہ (وفات: ۲۷۹ھ)، دور خلافت: ۲۵۶-۲۷۹ھ/ ۸۷۰-۸۹۳ء۔

۶-ابوالعباس احمد بن موفق ملقب بہ معتضد باللہ (وفات: ۲۸۹ھ)، دورِ خلافت: ۲۷۹-۲۸۹ھ/ ۸۹۳-۹۰۲ء۔

۷-ابوعلی علی بن معتضد ملقب بہ مکتفی باللہ (وفات: ۲۹۵ھ)، دورِ خلافت: ۲۸۹-۲۹۵ھ/ ۹۰۲-۹۰۸ء۔

۸-ابوالفضل جعفر بن معتضد ملقب بہ مقتدر باللہ (وفات: ۳۲۰ھ)، دورِ خلافت: ۲۹۵-۳۲۰ھ/ ۹۰۸-۹۳۲ء۔

۹-محمد بن معتضد ملقب بہ قاہر باللہ (وفات: ۳۳۹ھ)، دورِ خلافت: ۳۲۱-۳۲۲ھ/ ۹۳۳-۹۳۴ء۔

۱۰-ابوالعباس احمد بن مقتدر ملقب بہ راضی باللہ (وفات: ۳۲۹ھ)، دورِ خلافت: ۳۲۲-۳۲۹ھ/ ۹۳۴-۹۴۱ء۔

۱۱-ابواسحاق ابراہیم بن مقتدر ملقب بہ متقی باللہ (وفات: ۳۵۷ھ)، دورِ خلافت: ۳۲۹-۳۳۳ھ/ ۹۴۱-۹۴۴ء۔

13.4.3 عباسی خلافت وحکومت کا تیسرا دور

☆ ۳۳۴ تا ۴۴۷ھ/ ۹۴۵ تا ۱۰۵۵ء: اس عہد کے خلفا کی مجموعی تعداد صرف پانچ ہے۔ اس عہد میں آل بُویہ کے افراد نے خلافت عباسی کی زمام سنبھال رکھی تھی اور دراصل وہی عباسی خلافت وحکومت کی سیاہ وسفید کے مالک تھے کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی بھی مسند خلافت پر متمکن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عہد میں خلفا کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی ہو کر رہ گئی کہ امورِ حکمرانی میں انھیں کسی قسم کی دخل اندازی کرنے کی اجازت حاصل نہیں تھی۔ تیسرے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

۱-ابوالقاسم عبداللہ بن مکتفی ملقب بہ مستکفی باللہ (وفات: ۳۳۸ھ)، دورِ خلافت: ۳۳۳-۳۳۴ھ/ ۹۴۴-۹۴۵ء۔

۲-ابوالقاسم فضل بن مقتدر ملقب بہ مطیع للہ (وفات: ۳۶۳ھ)، دورِ خلافت: ۳۳۴-۳۶۳ھ/ ۹۴۵-۹۷۴ء۔

۳-ابوالفضل عبالکریم بن مطیع ملقب بہ طائع للہ (وفات: ۳۹۳ھ) دورِ خلافت: ۳۶۳-۳۸۱ھ/ ۹۷۴-۹۹۱ء۔

۴-ابوالعباس احمد بن مقتدر ملقب بہ قادر باللہ (وفات: ۴۲۲ھ)، دورِ خلافت: ۳۸۱-۴۲۲ھ/ ۹۹۱-۱۰۳۱ء۔

۵-ابوجعفر عبداللہ بن قادر ملقب بہ قائم بامر اللہ (وفات: ۴۶۷ھ)، دورِ خلافت: ۴۲۲-۴۶۷ھ/ ۱۰۳۱-۱۰۷۴ء۔

13.4.4 عباسی خلافت وحکومت کا چوتھا دور

☆ ۴۴۷ تا ۶۵۶ھ/ ۱۰۵۵ تا ۱۲۵۸ء: چوتھے اور آخری دور کے خلفا کی تعداد گیارہ ہے۔ اس زمانہ میں آل سلجوق کو غلبہ حاصل تھا اور وہی عملاً عباسی سلطنت کے کرتا دھرتا بن گئے تھے کہ ان کی چشم ابرو کے اشارے سے خلفا تختِ خلافت پر بٹھائے اور اتارے جاتے تھے۔ اس عہد کے خلفا کا حال بھی تیسرے عہد کے خلفا کی طرح تھا۔ چوتھے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

۱-ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن قائم ملقب بہ مقتدی باللہ (وفات: ۴۸۷ھ)، دورِ خلافت: ۴۶۷-۴۸۷ھ/ ۱۰۷۴-۱۰۹۴ء۔

۲-ابوالعباس احمد بن مقتدی ملقب بہ مستظہر باللہ (وفات: ۵۱۲ھ)، دورِ خلافت: ۴۸۷-۵۱۲ھ/ ۱۰۹۴-۱۱۱۸ء۔

۳-ابومنصور فضل بن مستظہر ملقب بہ مسترشد باللہ (وفات: ۵۲۹ھ)، دورِ خلافت: ۵۱۲-۵۲۹ھ/ ۱۱۱۸-۱۱۳۴ء۔

۴-ابوجعفر منصور بن مسترشد ملقب بہ راشد باللہ، دورِ خلافت: ۵۲۹-۵۳۰ھ/ ۱۱۳۴-۱۱۳۵ء۔

۵-ابوعبداللہ محمد بن مستظہر ملقب بہ مقتفی لامر اللہ، دورِ خلافت: ۵۳۰-۵۵۵ھ/ ۱۱۳۵-۱۱۶۰ء۔

۶-ابوالمظفر یوسف بن مقتفی ملقب بہ مستنجد باللہ، دورخلافت: ۵۵۵-۵۶۶ھ/ ۱۱۶۰-۱۱۷۰ء۔

۷-ابومحمد حسن بن مستنجد ملقب بہ مستضی بامراللہ، دورخلافت: ۵۶۶-۵۷۵ھ/ ۱۱۷۰-۱۱۷۹ء۔

۸-ابوالعباس احمد بن مستضی ملقب بہ ناصرلدین اللہ، دورخلافت: ۵۷۵-۶۲۲ھ/ ۱۱۷۹-۱۲۲۵ء۔

۹-ابونصر محمد بن ناصر ملقب بہ ظاہر باللہ، دورخلافت: ۶۲۲-۶۲۳ھ/ ۱۲۲۵-۱۲۲۶ء۔

۱۰-ابوجعفر منصور ملقب بہ مستنصر باللہ، دورخلافت: ۶۲۳-۶۴۰ھ/ ۱۲۲۶-۱۲۴۲ء۔

۱۱-ابواحمد عبداللہ بن مستنصر ملقب بہ مستعصم باللہ، دورخلافت: ۶۴۰-۶۵۶ھ/ ۱۲۴۲-۱۲۵۸ء۔

مذکورہ بالا ادوار میں عباسی تخت خلافت وحکومت پر مجموعی طور ۴۶ خلفا متمکن ہوئے تھے لیکن ان میں سے صرف دس ابتدائی خلفا نے صحیح معنوں پر خلیفہ وحاکم ہونے کا کردار ادا کیا تھا اور اپنے آپ کو مقتدر اعلی ثابت کیا تھا۔ بعد کے خلفا وحکمراں یا تو ترک امرا کے اشاروں پر ناچتے رہے یا آل بویہ وآل سلجوق کا کھلونا بنے رہے۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے عباسی خلفا کے مقام ومرتبہ کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے: ''پہلے دور کے خلفا اقتدار اعلی کے مالک تھے اور سچ مچ حکمرانی کرتے تھے۔ دوسرے دور میں ترک امرا نے انھیں کٹھ پتلی بنا لیا تھا اور وہ ان کے نام سے حکومت کرتے تھے پھر بھی کسی طرح کا نشان عزت باقی تھا لیکن تیسرے دور میں ان کے نام سے شیعہ امرا آل بویہ اور چوتھے دور میں سنی سلجوق امرا حکومت کرتے تھے''۔

عباسی خلافت وحکومت کی اہمیت وحیثیت اور اس کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے بہت ہی متوازن تبصرہ کیا ہے جن کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اموی خلافت وحکومت کی طرح عباسی خلافت وحکومت بھی اسلام کی متحدہ حکمرانی کا مظہر نہیں تھی۔ اسلام کے مرکزی علاقوں میں عباسی خلافت کو تسلیم کرلیا گیا تاہم متعدد صوبوں میں یا تو اس کی آئینی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا تھا یا کیا گیا تھا تو برائے نام کہ اقتدار اور حکمرانی پر وہاں کے مقامی خاندان ہی قابض رہے جیسے مصر کے سوا پورے افریقہ میں اس خلافت وحکومت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور وہاں کے مقامی حکمراں خاندان ہی وہاں حکمرانی کرتے رہے۔ پورے اندلس میں عباسی خلافت وحکومت کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ بہت جلد وہاں اموی خلافت وحکومت پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم ہوگئی تھی۔ اسی طرح عباسی خلافت وحکومت کے عین عروج کے زمانے میں ہی مشرقی علاقوں میں آزاد حکمراں خاندانوں کا اقتدار قائم ہوگیا تھا جو برائے نام یا صرف برکت کے لیے عباسی خلافت وحکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ اسی طرح عباسی خلافت اور اسلامی حکمرانی دو الگ الگ چیزیں بن کر رہ گئیں تھیں تاہم عباسی خلافت کی دستوری اور قانونی صورت اندلس کے سوا ہر جگہ قائم رہی اور اسے ہی صحیح اسلامی خلافت تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہد عباسی میں جہاں ایک طرف اسلامی حکومت کا شیرازہ بکھرا تھا وہیں فتوحات کا سلسلہ بھی بالکل بند ہوگیا تھا اور اسلامی خلافت وحکومت کا دائرہ سمٹتا چلا گیا حتی کہ اموی خلافت وحکومت کے مقابلہ میں عہد عباسی میں اسلامی حکمرانی کا رقبہ آدھے سے بھی کم ہوگیا تھا جس کی بنیادی وجہ عہد عباسی میں بپا ہونے والی مسلسل بغاوتیں اور آزاد حکمراں خاندان کا مختلف علاقوں میں غلبہ وتسلط تھا۔

عباسی خلافت وحکومت کے سیاسی طور پر محدود اور اپاہج ہونے کے باوجود اسی عہد میں اسلامی تہذیب وتمدن کو اوج کمال حاصل ہوا کہ انھوں نے عہد اموی سے ملنے والے علوم وفنون، معاشرہ ومعیشت اور تہذیب وتمدن کے سرمایہ کو سجا سنوار کر بام عروج پر پہنچا دیا تھا جس کی وجہ

سے اس عہد کو اسلامی تہذیب کا زریں دور کہا جاتا ہے۔

13.4.5 عباسی خلافت وحکومت کے زوال کے اسباب وعوامل

عباسی خلافت وحکومت پانچ سو سال سے زائد عرصے تک قائم رہی اور قانون الٰہی کے مطابق عروج وزوال سے گذرتے ہوئے ہلاکو خاں کے ہاتھوں ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔عباسی خلافت وحکومت کا اصل دور اقتدار تو صرف اس کے ابتدائی سو سال پر محیط ہے جب انھوں نے صحیح معنوں میں حکمرانی کی تھی۔باقی چار سو سال ان کے نام پر مختلف خانوادے حکمرانی کرتے رہے۔کسی بھی حکومت کے زوال کا بنیادی سبب تو حکمرانوں کا شمشیر وسناں کی بجائے طاؤس ورُباب کے دامن میں پناہ لینا ہوتا ہے تاہم اس کے علاوہ کچھ مادی وظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں جو اس زوال کی رفتار بڑھا دیتے ہیں اور آخر کار وہ حکومت وسلطنت صفحۂ ہستی سے ناپید ہوجاتی ہے۔

عباسی خلافت وحکومت کے زوال کے متعدد اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اس کے زوال کے اسباب کسی قدر تفصیل سے بیان کیے جن کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱-عباسی خلافت وحکومت کا بزور طاقت قائم ہونے سے متعدد طاقت ور افراد وخاندان کے دل ودماغ میں حکمرانی کا جذبہ پیدا کردیا تھا کہ طاقت کی بنیاد پر حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔اندلس میں اموی حکومت کے قیام کے کامیاب تجربہ نے اس خیال وجذبہ کو مزید مہمیز دی،جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عین عروج وکمال کے دور میں عباسی سلطنت وریاست کے حصے بخرے ہونے لگے اور عالم اسلام کے متعدد علاقوں میں مستقل سلطنتیں قائم ہوئیں جیسے مغرب میں ادریسی سلطنت،مشرق میں طاہری سلطنت اور صفاری سلطنت۔وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ آزاد حکمرانوں اور سلطنتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا جن میں سے بعض بعض کی سلطنتیں عباسی خلافت کے رقبہ اور طاقت دونوں میں بڑھی ہوئی تھیں۔یہ الگ بات ہے کہ وہ سلطنتیں محض رسمی طور پر عباسی خلافت وحکومت کی بالا دستی کو تسلیم کرتی تھیں کہ اس کے بغیر عوام پر مکمل قابو نہیں پایا جاسکتا تھا۔

۲-زوال کا ایک بنیادی سبب جہاد کی روح کا ختم ہوجانا تھا۔اموی خلافت وسلطنت اپنے اسی جذبہ کی بنا پر فتوحات پر فتوحات حاصل کرتی رہی اور اسلامی قلمرو کا دائرہ مزید سے مزید وسیع ہوتا چلا گیا۔عباسی خلافت وحکومت میں فتوحات کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا اور اسلامی رقبہ کا دائرہ سکڑنے لگا تھا۔جہاں کہیں کچھ فتوحات ہوئیں بھی وہاں عباسی خلافت کا اقتدار بہت عرصہ تک باقی نہ رہ سکا اور اسلامی افواج کی واپسی کے بعد مقبوضہ علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔اس عہد میں ہونے والی کچھ فتوحات ایسی تھیں جو دیگر خاندان کے حکمرانوں کی مرہون منت تھیں،عباسی خلافت کا اس میں کسی بھی قسم کا حصہ نہیں تھا۔

۴-باہمی خانہ جنگی نے بھی عباسی خلافت وحکومت کے زوال میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔

۵-عباسی انتظامیہ کے تمام تر اداروں نے نہ صرف اپنی افادیت کھو دی تھی بلکہ وہ خلافت وحکومت کے لیے مضر ثابت ہوئے کہ وہ بد نظمی،استحصال اور خودغرضی کا نمونہ بن گئے تھے۔وہ تمام ادارے لوٹ مار،رشوت،غبن،بے جا اسراف اور بے ایمانی کا مرکز بن گئے تھے جس کی وجہ سے حکومت کا خزانہ خالی ہوتا چلا گیا اور تمام ترقیاتی کام دھیرے دھیرے بند ہوتے چلے گئے۔

۶-ایرانی اور عرب امرا کی آپسی رسہ کشی اور کھینچ تان نے بھی خلافت وحکومت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

۷-ایرانی اور عرب امرا کی آپسی کشمکش نے ترک امرا کو اقتدار پر قابض ہونے کا موقعہ فراہم کردیا جنھوں نے اپنی جہالت،اسلامی

تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے نتیجہ میں خلافت کے اداروں کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے زوال کی رفتار بڑھا دی تھی۔

۸-اسلامی تعلیمات واصولوں سے روگردانی بھی زوال کا ایک سبب قرار دی جاتی ہے۔

۹-ابتدائی دور کو چھوڑ کر عباسی خلافت وحکومت پر متعدد طالع آزما خاندان کا غلبہ وتسلط بھی اس کے زوال کا ایک سبب بتایا جاتا ہے۔

۱۰-سنی-شیعی اختلافات نے جہاں ایک خلافت وحکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا وہیں سنی معاشرہ بھی مختلف قسم کے بحران اور انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ان سب نے مل کر زوال کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔

۱۱-مختلف باطنی تحریکات جیسے قرامطہ،خوارج اور فاطمی وغیرہ نے بھی زوال میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

۱۲-اسلام دشمن اور خلافت کے مخالف عناصر نے خاص طور سے شیعی عہدیداروں نے ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' کا کردار ادا کیا اور اپنے نامعقول تعصّبات کے سبب غیر ملکی طاقت-منگول-سے ساز باز،عباسی خلافت وحکومت کی آخری کیل ثابت ہوئی کہ انھوں نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔

13.5 مصر میں عباسی خلافت کا احیا

مصر میں عباسی خلافت کا احیا کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہلاکوں خان کے ہاتھوں خلافت عباسیہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی تو پورے عالم اسلام ایک قسم کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔بقول شاہ معین الدین ندوی مرحوم خلافتِ بغداد کے خاتمہ کے بعد ابونصر محمد بن ناصر ملقب بہ ظاہر باللہ(دور خلافت:۶۲۲-۶۲۳ھ/ ۱۲۲۵-۱۲۲۶ء) کے لڑکے ابوالقاسم احمد ملقب بہ مستنصر باللہ کسی طرح تاتاریوں کی قید سے نکل کر عرب سرداروں کی ایک جماعت کے ساتھ ۶۵۹ھ/ ۱۲۶۲ء میں مصر جا پہنچتے ہیں۔اس وقت مصر میں مملوک خاندان کے چوتھے فرمانروا ملک ظاہر بیبرس کا دور اقتدار تھا۔چونکہ خلافت بغداد کو دنیائے اسلام میں ایک دینی مرکزیت کی حیثیت حاصل تھی،سارے مسلمان عباسی خلفا کو اپنا دینی پیشوا سمجھتے تھے اور ان کو اس خلافت کے خاتمہ کا بڑا غم تھا اور اس کے دوبارہ قیام کی دلی آرزو تھی۔جس ملک میں عباسی خلافت کا احیا ہوتا اس ملک اور اس کے حکمرانوں کا مقام ومرتبہ بہت بڑھ جاتا۔ملک ظاہر بیبرس کو یہ موقعہ گھر بیٹھے بیٹھے مل رہا تھا لہذا انھوں نے اس اتفاق سے بھرپور فائدہ اٹھا کر پورے ادب واحترام اور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ مستنصر باللہ کو قاہرہ لے گئے اور ان کے ہاتھوں پر نہ صرف خود بلکہ ارباب حکومت اور عمائدین مصر نے بھی بیعت لی اور مصر میں ان کے نام کا خطبہ وسکہ جاری کر کے عالم اسلام میں عباسی خلافت کی احیا کا عام اعلان ۶۵۹ھ/ ۱۲۶۲ء میں کر دیا جاتا ہے۔اس رسمی کاروائی کے بعد خلیفۂ وقت،ملک ظاہر بیبرس کو ایک دربار عام میں عمائدین سلطنت کے سامنے عباسی خلعت سے نواز کر انھیں عالم اسلام سے متعلق خلافت کی تمام تر ذمہ داریوں کو انجام دینے کا فریضہ سونپ دیتے ہیں اور اس حوالہ سے ان کے مختار مطلق ہونے کا فرمان جاری کر دیا جاتا ہے اور یوں مصر میں عباسی خلافت-نام ہی کی سہی-کے احیا کا عمل اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے جس کا دورانیہ تقریباً پونے تین سو سال پر محیط ہے۔

اس طویل دورانیہ میں مصر کے عباسی خلفا کو مذکورہ بالا رسمی کاروائی-بادشاہ وقت کو اپنی طرف سے امور مملکت کا مختار بنا کر خلعت عباسی سے نوازنا-کے علاوہ کسی بھی قسم کا کوئی بھی اختیار حاصل نہیں تھا تاہم کچھ حوصلہ مند خلفا نے خلافت کے وقار کو قائم کرنے کی کوشش کی،کچھ کو

عارضی کامیابی بھی ملی لیکن زیادہ تر کو اس جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی پاداش میں خلافت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا'۔

13.5.1 مصر میں عباسی خلافت کے خلفا اور ان کا دور اقتدار

مصر میں عباسی خلافت کے تقریباً پونے تین سو سال پر محیط طویل دورانیہ میں حسب ذیل ۱۸؍خلفا نے مسند خلافت کو رونق بخشی تھی۔

۱-ابوالقاسم احمد بن ظاہر بامر اللہ ملقب بہ مستنصر باللہ (وفات:۶۶۱ھ)، دور خلافت:۶۵۹-۶۶۱ھ/ ۱۲۶۲-۱۲۶۳ء

۲-ابوالعباس احمد بن ابوعلی حسن باللہ ملقب بہ حاکم بامر اللہ (وفات:۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء)، دور خلافت:۶۶۱-۷۰۱ھ/ ۱۲۶۳-۱۳۰۱ء

۳-ابوالربیع سلیمان بن حاکم ملقب بہ مستکفی باللہ اول (وفات:۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء)، دور خلافت:۷۰۱-۷۴۰ھ/۱۳۰۱-۱۳۳۹ء

۴-ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن حاکم ملقب بہ واثق باللہ، دور خلافت:۷۴۰-۷۴۱ھ/۱۳۳۹-۱۳۴۰ء

۵-ابوالعباس احمد بن مستکفی ملقب بہ حاکم بامر اللہ ثانی (وفات:۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء)، دور خلافت:۷۴۱-۷۴۸ھ/۱۳۳۹-۱۳۴۷ء

۶-ابوبکر بن مستکفی ملقب بہ معتضد باللہ اول (وفات:۷۶۳ھ/ ۱۳۶۲ء)، دور خلافت:۷۴۸-۷۶۳ھ/۱۳۴۷-۱۳۶۲ء

۷-ابوعبداللہ محمد بن معتضد ملقب بہ متوکل علی اللہ اول (وفات:۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء)، دور خلافت:۷۶۳-۷۸۵ھ/ ۱۳۶۲-۱۳۸۳ء

۸-ابوحفص عمر بن معتصم ملقب بہ واثق باللہ (وفات:۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء)، دور خلافت:۷۸۵-۷۸۸ھ/ ۱۳۸۳-۱۳۸۶ء

۹-زکریا بن معتصم ملقب بہ مستعصم (وفات:۷۹۱ھ)، دور خلافت:۷۸۸-۷۹۱ھ/۱۳۸۶-۱۳۸۹ء

۱۰-متوکل علی اللہ (وفات ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء)، [دوسری مرتبہ]، دور خلافت:۷۹۱-۸۰۸ھ/ ۱۳۸۹-۱۴۰۵ء

۱۱-ابوالفضل عباس بن متوکل ملقب بہ مستعین باللہ (وفات ۸۳۳ھ/)، دور خلافت:۸۰۸-۸۱۶ھ/ ۱۴۰۵-۱۴۱۴ء

۱۲-ابوالفتح داؤد بن متوکل ملقب بہ معتضد باللہ (وفات ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء)، دور خلافت:۸۱۶-۸۴۵ھ/ ۱۴۱۳-۱۴۴۱ء

۱۳-ابوالربیع سلیمان بن معتضد ملقب بہ مستعین باللہ ثانی (وفات ۸۵۴ھ/ ۱۴۵۰ء)، دور خلافت:۸۴۵-۸۵۴ھ/۱۴۴۱-۱۴۵۰ء

۱۴-ابوالبقاء حمزہ بن معتضد ملقب بہ قائم بامر اللہ (وفات ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۸ء)، دور خلافت: ۸۵۴-۸۵۹ھ/ ۱۴۵۰-۱۴۵۵ء

۱۵-ابوالمحاسن یوسف بن معتضد ملقب بہ مستنجد باللہ ثانی (وفات ۸۸۴ھ/ ۱۴۷۹ء)، دور خلافت:۸۵۹-۸۸۴ھ/ ۱۴۵۵-۱۴۷۹ء

۱۶-عبدالعزیز بن یعقوب ملقب بہ متوکل علی اللہ ثانی (وفات ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۷ء)، دور خلافت: ۸۸۴-۹۰۳ھ/ ۱۴۷۹-۱۴۹۷ء

۱۷-یعقوب بن عبدالعزیز ملقب بہ مستمسک باللہ (وفات ۹۲۰ھ/ ۱۵۱۴ء)، دور خلافت: ۹۰۳-۹۲۰ھ/ ۱۴۹۷-۱۵۱۴ء

۱۸-محمد ملقب بہ متوکل علی اللہ ثالث، دور خلافت: ۹۲۰-۹۲۳ھ/ ۱۵۱۴-۱۵۱۸ء

13.6 عباسی خلافت کے محکمہ جات

اموی خلافت کے بہت سے محکمے اور شعبے، عباسی خلافت کو بطور وراثت ملے تھے اور کچھ نئے محکمے بھی بنائے گئے تھے۔ عہد اموی سے بطور وراثت منتقل ہونے والے اہم شعبوں میں فوج، ٹیکس، ڈاک کے علاوہ دیوان الرسائل (خطوط وفرامین کا محکمہ) اور دیوان الخاتم (کاغذات پر مہر لگانے، انھیں سر بمہر کرنے کا محکمہ) تھے تاہم عہد عباسی میں ان میں بہت تبدیلیاں کی گئیں تھیں اور انھیں زیادہ ترقی

یافتہ بنایا گیا تھا۔

عہد عباسی میں جن محکموں کی اساس و بنیاد پڑی تھی وہ حسب ذیل ہیں:

-**دیوان الازمۃ**: اس ادارہ میں مالیات کے خرچ کا حساب رکھا جاتا تھا۔

-**دیوان النفقات**: اس سے مراد اخراجات ومصارف کا خاص نگراں محکمہ تھا۔اسے اور **دیوان الازمۃ** کو آج کی زبان میں کنٹولر اینڈ آڈیٹر جنرل کہا جاسکتا ہے۔

- **دیوان المظالم**: عوام کی شکایات، خاص طور سے عہدے داروں سے ہونے والی شکایات، کو رفع کرنے کی خاطر اس ادارہ کی بنا ڈالی گئی تھی۔

-**دیوان الصوافی**: اس ادراہ کو سرکاری/خلیفہ کی آراضی اور خاص جاگیروں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بنایا گیا تھا جسے آج کی زبان میں رجسٹرار آفس کہا جاسکتا ہے۔

-**دیوان العرض**: یہ محکمۂ فوج کا ایک ذیلی ادارہ تھا جس کی ذمہ داری فوج کی نگرانی اور فوجیوں وسپاہیوں کے معائنہ کرنا تھا۔

-**دیوان التوقیع**: اس ادارہ کے ذریعہ درخواستوں اور شکایات کے نتیجے میں جاری کیے جانے والے احکامات کو نافذ کیا جاتا تھا۔

-**دیوان السر**: اس دفتر کے ذریعہ انتہائی راز داری کے کام انجام دیے جاتے تھے اور بہت ہی رازدارانہ فرامین جاری کیے جاتے تھے۔اس شعبہ کو آج کی زبان میں سیکرٹ سروس یا خفیہ ایجنسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

13.6.1 عہد عباسی کا عدلیہ

عہد عباسی کے عدالتی نظام میں خلیفۂ وقت ہی سب سے بڑا منصف ہوتا تھا۔آج کی زبان میں اسے ''چیف جسٹس'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔وہ ہر قسم کے فیصلے کرسکتا تھا اور اس کے فیصلوں پر کہیں بھی اپیل نہیں کی جاسکتی تھی تاہم خلیفہ سے ہی سے نظر ثانی کی درخواست کی جاسکتی تھی۔اعزازی طور پر وزرا کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مقدمات کی سماعت کریں اور اپنے فیصلے سنائیں۔عام طور قاضیوں کے تقرر کا اختیار خلفا کے پاس ہوتا تھا تاہم کبھی کبھی وزرا بھی یہ فرائض انجام دیا کرتے تھے۔اسی طرح مرکزی قاضی خلیفہ کے ماتحت اور صوبائی قاضی گورنر کے تحت اپنے فرائض منصبی انجام دیا کرتے تھے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عباسی عدلیہ مرکزی عدلیہ، صوبائی عدلیہ اور شہری عدلیہ میں منقسم تھا۔مرکزی عدلیہ کا قاضی'' قاضی القضاۃ'' کہلاتا تھا جو مرکزی عدلیہ کا سب سے بڑا قاضی ہوتا تھا۔اس عہدہ کی شروعات عہد عباسی میں ہی کی گئی تھی۔خلیفہ مہدی کے زمانے میں امام ابویوسف علیہ الرحمہ کو اس عہدہ پر سب سے پہلے فائز کیا گیا تھا۔عہد عباسی کے دیگر ناموران قاضی القضاۃ میں احمد بن ابی داؤد (وفات ۲۴۰ھ/ ۸۵۴م) اور یحییٰ بن اکثم (وفات ۲۴۲ھ/ ۸۵۷ء) کا بھی شمار ہوتا ہے۔

13.6.2 عہد عباسی میں فوج اور پولیس کا نظام

عہد عباسی میں پولیس کا نظام کافی بہتر تھا اور اس کے واجبات وہی تھے جو آج کل کی پولیس انجام دے رہی ہے۔عہد عباسی کی پولیس شہری پولیس اور خلیفہ کے ذاتی محافظ میں منقسم تھی۔اس عہد کی فوج اور اس کے لشکر گاہ کو پانچ حصوں-مقدمہ، میمنہ، میسرہ، قلب اور ساقہ یا مؤخرہ

-میں تقسیم کیا جاتا تھا۔خلیفۂ وقت فوج کا اعلی سربراہ ہوتا تھا اور وہ کبھی کبھی اپنے اس منصب کا عملی استعمال بھی کرتا تھا کہ ہارون رشید، مامون اور معتصم جیسے خلفا نے فوجوں کی قیادت کی تھی اور جنگوں میں بنفس نفیس شریک ہوئے تھے۔خلیفہ کی غیر موجودگی میں فوج کی زمام کار صوبائی امیروں اور گورنروں اور بسا اوقات وزیروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔صوبائی امیروں اور گورنروں کے ماتحت رہنے والی فوج بسا اوقات مرکز کے خلاف بغاوت کا علم بھی بلند کر دیا کرتی تھی۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے خلیفہ معتصم کے زمانے سے فوج میں وردی کے استعمال کو رائج کیا گیا تھا۔

عہد عباسی کی فوج کو حسب ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- بری فوج اور بحری فوج۔

۲-مستقل فوج اور رضا کار فوج۔پہلی قسم کی فوج باقاعدہ تنخواہ یافتہ تھی جب کہ دوسری قسم کی فوج رضا کار فوجیوں پر مشتمل ہوتی تھی جن کی خدمات خاص خاص مواقع پر حاصل کی جاتی تھیں اور انھیں مال غنیمت سے حصہ دیا جاتا تھا۔

۳-گرمائی فوج اور سرمائی فوج۔

13.6.3 عہد عباسی کا مالی نظام

عباسی مالی نظام کی اساس و بنیاد عہد اموی کے مالی نظام پر تھی۔عہد عباسی کے مالی نظام کو زیادہ بہتر بنانے کا سہرا خلیفہ ہارون رشید کے سر بندھتا ہے کہ انھوں نے خلافت وحکومت کے ذرائع آمدنی کو متعین کرنے کے لیے اپنے قاضی القضاۃ امام ابویوسف سے ایک کتاب "کتاب الخراج" لکھوائی۔اس کتاب سے عباسی سلطنت کے مالی نظام کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوجاتی ہے۔

عہد عباسی کی آمدنی کے اہم ترین ذرائع صدقات، عشر، مال غنیمت کا خمس (پانچواں حصہ)، جزیہ، خراج ومحاصل اور فے کی آراضیاں تھیں۔اسی طرح دفینوں، کانوں اور کچھ دیگر واسطوں سے بھی حکومت کو آمدنی ہوتی تھی۔عہد عباسی کا مالی نظام کتنا مستحکم ومضبوط تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید اور مامون کے زمانے میں مالیہ کی کل رقم بالترتیب ساڑھے چون کروڑ درہم اور چالیس کروڑ درہم سے زائد تھی۔عہد عباسی میں مالیہ کی رقم میں حالات کی مناسبت سے اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا۔

13.7 عہد عباسی کا نظام تعلیم

عہد عباسی میں نظامِ تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ وہی برقرار رہا جو عہد اموی سے چلا آرہا تھا لیکن مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی آمیزش نے اس نظام تعلیم میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دیں تھیں۔اس عہد میں نظام تعلیم تین مرحلوں-ابتدائی، ثانوی اور اعلی تعلیم- میں منقسم تھا۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز چار برس کی عمر میں گھر سے ہوتا تھا اور اس کی تکمیل مکاتب میں ہوتی تھی، ابتدائی تعلیم بچے اور بچیوں دونوں کے لیے لازمی تھی۔عام طور پر اسی مرحلہ میں کمزور طبقات کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوجاتا تھا اور وہ اپنے مخصوص پیشوں سے وابستہ ہوجاتے تھے۔اس مرحلہ کی تعلیم میں طلبہ قرآن کا ناظرہ پڑھتے تھے، معمولی حساب وگنتی سیکھتے تھے، قرآن کو حفظ کرتے اور قرأت وتجوید سیکھتے تھے اور حدیث وفقہ اور تاریخ وسیرت کے ابتدائی مرحلوں سے روشناس ہوتے تھے۔

ثانوی تعلیم کے مرحلہ میں بالعموم طلبہ مکاتب کے بڑے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوکر زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے یا خلفا و اہل ثروت کے بچے یا نجی اساتذہ (المؤدبون) سے تعلیم حاصل کرتے تھے جو انھیں ان کے گھر پر جا کر پڑھایا کرتے تھے جنھیں آج عرف عام میں ٹیوٹر (اتالیق) کے نام سے جانا جاتا ہے۔تعلیم کے اس مرحلہ میں طلبہ کو قرآن ،حدیث،فقہ،سیرت ،تاریخ ،ریاضی ودیگر علوم کی کسی حد تک فنی تعلیم دی جاتی تھی۔

اعلی تعلیم کے مرحلے میں طلبہ مختلف علوم وفنون کے اہل علم کے علمی حلقوں میں جا کر اپنے علم میں اضافہ کرتے تھے اور اپنی علمی تشنگی کو دور کرتے تھے۔مفسرین ومحدثین علما،فقہا ،ادبا وشعرا اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین کے حلقے پوری عباسی ریاست ومملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔بغداد،سامراء،مکہ،مدینہ،کوفہ، بصرہ، واسط، دامشق ،نیشاپور، حلب،فسطاط،صنعاء اور بیت المقدس جیسے شہروں میں یہ علمی حلقے زیادہ پائے جاتے تھے۔ان شہروں میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے مراکز بھی پائے جاتے تھے جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گویا افراد اپنے اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق تعلیم حاصل کرتے تھے۔پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے بقول بغداد، دمشق،موصل،کوفہ،بصرہ اور حمص وغیرہ میں اعلی تعلیم کے مراکز کی تعداد بیس تک جا پہنچتی ہے جو بیک وقت علم وفضل کی روشنی پھیلا رہے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد عباسی کے بعض علمی مراکز بعض مخصوص علوم وفنون کے لیے زیادہ مشہور تھے جیسے مدینہ امام مالکؒ کی وجہ سے حدیث کا سب بڑا مرکز تھا،کوفہ وبصرہ نحو کے ساتھ ساتھ فقہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی مشہور ومعروف تھے۔خلیفہ مامون کے زمانے میں بغداد مختلف علوم وفنون کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا جہاں مختلف علوم وفنون کی فنی تعلیم دی جاتی تھی۔

اعلی تعلیم حاصل کرنے والے افراد عام طور سے تمام دینی علوم کے جامع ہوتے تھے۔عام طور سے اعلی تعلیم حاصل کرنے والے پہلے دینی علوم میں مہارت پیدا کرتے تھے پھر کسی مخصوص فن میں کمال حاصل کرتے تھے۔اعلی تعلیم حاصل کرنے والوں میں سائنسی اور سماجی علوم جیسے تاریخ وسیرت نگاری،جغرافیہ،طب اور کیمیا وطبیعیات وغیرہ،حاصل کرنے والے افراد بھی ہوتے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے عہد عباسی کے نظام تعلیم کے ہر مرحلہ میں خصوصاً اعلیٰ تعلیم اور تخصص کے مرحلہ میں اساتذہ کے سامنے قرأت یا ان سے ساعت کو کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ انھیں ذہن میں مکمل طور پر محفوظ کر لیا جائے لہٰذا طلبہ کے لیے نہ صرف قرآن بلکہ احادیث ودیگر علوم وفنون کو مسائل کا ازبر ہونا لازمی قرار دیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں اعلی تعلیم کے بڑے علمی مراکز میں ''بیت الحکمۃ'' کا شمار ہوتا ہے۔خاص طور پر خلیفہ مامون کے زمانہ میں اس مرکز کو سائنسی اور فلسفیانہ علوم وفنون کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

عہد عباسی کے چوتھے دور (۴۴۷ تا ۶۵۶ھ/ ۱۰۵۵ تا ۱۲۵۸ء) میں پہلی سرکاری یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔یہ فضل سلجوقی عہد کے ایک عظیم دانشور ومفکر وزیر نظام الملک طوسی (وفات: ۴۸۵ھ/ ۱۰۹۲ء) کو حاصل ہوا کہ انھوں نے ۴۵۹ھ/ ۱۰۶۶ء میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد بغداد میں ڈالی جو بہت جلد ایک بڑے علمی مرکز میں بدل گیا جسے اس وقت کی سب سے بڑی یونیورسٹی قرار دیا جاتا تھا۔اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے امام غزالی (وفات ۵۰۵ھ) جیسی شخصیت کا شمار نہ صرف اس کے ''اولڈ بوائز'' میں ہوتا ہے بلکہ انھوں نے

وہاں تدریسی فرائض بھی انجام دیے تھے۔ یہ علمی مرکز سقوط بغداد کے بعد بھی باقی رہا اور صدیوں تک علم وفضل کے جویان کی تشنگی دور کرتا رہا ۔بعد میں یہ مرکز ''مدرسہ مستنصریہ''میں مدغم ہو گیا تھا۔

نظام الملک طوسی نے ''مدرسہ نظامیہ'' کے نام سے ہی ایک اور مرکز نیشاپور میں قائم کیا تھا جس کے پرنسپل/ وائس چانسلر امام الحرمین عبدالملک جوینی (وفات:۴۷۸ھ) تھے۔اس وقت نیشاپور میں مزید چار علمی مراکز پائے جاتے تھے۔

عہد عباسی کی دوسری بڑی یونیورسٹی کا قیام عہد عباسی کے بالکل آخر دور میں ہوا تھا۔اس یونیورسٹی کو خلیفہ مستنصر نے ۱۲۳۴ء میں قائم کیا تھا جوان کے نام کی مناسبت سے ''مدرسہ مستنصریہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔یہ عظیم مرکز چودہویں صدی تک برقرار رہنے کے بعد زمانہ کی دست وبرد کا شکار ہو گیا۔

خلافتِ عباسی کا آخری اور چوتھا دور اس لحاظ سے ممتاز ومنفرد قرار دیا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے دیگر ادوار کے مقابلہ میں اس دور انحاط میں علم وفن کے فروغ کے لیے زیادہ سنجیدہ کوششیں کی گئی تھیں۔اسی دور میں بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نظام الملک طوسی کی کوششوں سے بغداد،نیشاپور،طوس کے علاوہ ایران وترکستان میں متعدد اعلیٰ تعلیم کے بڑے مراکز قائم کیے تھے جنھیں آج کی اصطلاح کے مطابق یونیورسٹیز کہا جاسکتا ہے۔ان کے علاوہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے بھی اپنے عہد میں کئی ایک علمی مراکز کی داغ بیل ڈالی تھی۔مزید یہ کہ ''مدرسہ نظامیہ'' سے متاثر ہوکر عراق،شام،فلسطین،مصر،خراسان،ترکستان میں بہت سے مراکز کی داغ بیل ڈالی گئی تھی جن میں سے بخارا،سمرقند،نساء،رے،تبریز،ترمذ،مرو،بلخ کے علمی مراکز زیادہ اہمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔

13.8 عہد عباسی کا معاشرہ

عہد عباسی کا معاشرہ بنیادی طور پر دو اکائیوں-مسلم اور غیر مسلم- پر مشتمل تھا جنھیں حسب ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

-مسلم سماج:مسلم طبقہ عربوں اور غیر عربوں یا موالی پر مشتمل تھا۔

-غیر مسلم سماج: غیر مسلم طبقہ یہودیوں،عیسائیوں اور مجوسیوں وغیرہ پر مشتمل تھا جنھیں اصطلاحی طور پر ذمی سے موسوم کیا جاتا تھا۔

-نسلی یا علاقائی سماج:نسل یا علاقہ کے اعتبار سے عباسی سماج کو عرب، ایرانی،خراسانی،ترک،بربر اور جاٹ وغیرہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

-اقتصادی سماج: اقتصادی لحاظ سے عباسی معاشرہ کو اعلیٰ،اوسط اور ادنیٰ طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

عہد عباسی کا معاشرہ،عہد اموی کے معاشرہ سے کچھ ملتا جلتا تھا۔تاہم اس وقت کا عباسی معاشرہ بقول پروفیر محمد یٰسین مظہر صدیقی اموی معاشرہ سے چھوٹا تھا کہ پورا اندلس وپرتگال اس معاشرہ سے نکل گیا تھا۔اسی طرح عہد عباسی کے معاشرہ کے ہر طبقہ کی اندرونی ساخت میں تبدیلی آئی تھی اوران کے سیاسی،سماجی رتبوں کے ساتھ ساتھ ان کے اقتصادی حالات بھی بدل گئے تھے۔

دینی اعتبار سے عہد عباسی کا معاشرہ صحابۂ کرام اور اکثر تابعین کے فیوض وبرکات سے بالکل ہی تہی دامن ہو چکا تھا۔اس عہد کا صرف ابتدائی حصہ ہی تبع تابعین کے وجود باسعادت وبرکات سے مستفیض ہوسکا تھا کہ خیر القرون کی تیسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔خیرالقرون کی

اس کڑی کے خاتمہ کے بعد عباسی سماج ومعاشرہ عام مسلم سماج ومعاشرہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔

دنیوی لحاظ سے بھی اس عہد میں عرب طبقات کی اکثریت کی اپنے اہم وبلند بالا مقام ومرتبہ سے محرومی نے معاشرتی حالات میں کافی ابتری اورافراتفری پیدا کردی تھی بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ’’اگر اسلامی روایات واقدار کا لحاظ کیا جاتا تو مسلم عباسی معاشرہ میں اتنی افراتفری نہ مچتی‘‘۔عباسی عہد کے زریں دور کے نصف اول میں تو کسی حد تک عرب طبقات کی عزت نفس محفوظ رہی لیکن دھیرے دھیرے ان کا سیاسی وسماجی مقام ومرتبہ گرتا چلا گیا اوران کی اقتصادی حالات بھی بگڑتے چلے گئے تھے کہ پہلے پہل ایرانیوں/خراسانیوں نے ان کی جگہ لے لی تھی اور جب خلیفہ معتصم کے عہد میں ترکوں کو عروج حاصل ہوا اور انھوں نے ایرانیوں کو مناصب حکومت سے بے دخل اور تمام مراعات سے محروم کردیا لیکن اس تبدیلی سے عرب طبقات کی حالت زار میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوسکی۔اسی لیے اس عہد کے معاشرہ وسماج کو ایرانی وترکی عناصر کی برتری والا معاشرہ قرار دیا جاتا ہے جس کے رہن سہن،رسوم ورواج اور طرز معاشرت پر عربوں کی چھاپ کی بجائے ایرانی وترکی رنگ وڈھنگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ’’بہت سی معاشرتی خرابیاں اور عقائد وافکار کی برائیاں بھی پیدا ہوئیں‘‘ ۔

عہد عباسی کے سماج ومعاشرے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا سب سے بڑا مظہر حکمراں طبقہ تھا کہ عہد اموی میں حکمراں خانوادوں نے اپنے دور خلافت وحکومت میں سیاسی اختلاف کے باوجود پورے خانوادہ بنوامیہ کو اپنے ساتھ رکھا اور حکمراں خاندانوں کے ساتھ ساتھ دیگر خاندانوں کو بھی اعلی عہدے اور مناصب سے نوازا گیا تھا جس کی وجہ سے اموی خاندان کا شیرازہ منتشر نہ ہوسکا وہ اور وہ باہم متحد وشیر وشکر رہے۔

اموی خاندان کے مقابلہ میں عہد عباسی میں صرف بنوہاشم کے افراد ہی حکومت کے تمام مناصب پر فائز اور تمام مراعات کے حق دار قرار دیے گئے تھے اور بنوابی طالب،بنونوفل وبنومطلب کے افراد کو کسی بھی قسم کا کوئی عہدہ نہیں دیا گیا تھا۔اس پر مستزاد حضرت علی کے خانوادہ کو بھی سیاسی مقاصد کے پیش نظر دشمن قرار دے دیا گیا تھا جب کہ عباسی خلافت کے لیے راہ ہموار کرنے میں اس خاندان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

عہد عباسی میں حکمراں طبقہ کے ساتھ ساتھ جس طبقے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی تھی وہ طبقۂ موالی تھا لیکن یہ تبدیلیاں پورے طبقۂ موالی میں رونما نہیں ہوئیں تھیں بلکہ ان سے مستفید ومستفیض ہونے والے اس طبقہ کے صرف وہ افراد واشخاص تھے جن کا تعلق دربار خلافت اور حکومت کے گلیاروں سے تھا۔عام طبقۂ موالی کے حالات میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ پورے عہد عباسی میں کمتر اور فروتر ہی رہے۔عام طبقۂ موالی کو صرف یہ مالی فائدہ حاصل ہوا تھا کہ انھیں ان علاقوں میں جزیہ کی ادائیگی سے چھٹکارا مل گیا تھا جہاں نومسلموں پر بھی جزیہ عائد کیا جاتا تھا۔

عہد عباسی کے غیر مسلم طبقات-یہودیوں،عیسائیوں اور مجوسیوں وغیرہ- پر ان حالات کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا تھا وہ ہنوز دیگر اسلامی ادوار کی طرح عباسی خلافت وحکومت کے سائے تلے امن وچین کی زندگی گزار رہے تھے جس کے عوض وہ جزیہ اور اپنی پیداواری زمین پر خراج ادا کرتے تھے۔ذمی طبقہ کو عہد عباسی میں اپنے مذہبی امور کی ادائیگی،سماجی اقدار وروایت کی پابندی کے آزاد تھے اور انھیں ہر طرح کی سماجی ،اقتصادی اور تمدنی آزادی حاصل تھی۔اس عہد میں اس طبقہ کے کچھ افراد کو کچھ حکومتی مناصب پر بھی فائز کیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں غلاموں اور کنیزوں کے مقام ومرتبہ اور ساخت میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔وہ ہر اسلامی دور کی طرح اس

دور میں بھی اپنی اپنی زندگی گزارتے رہے کہ جنگوں میں قیدی بنایا جانا اور بازار میں فروخت کر دیا جانا ان کا مقدر تھا۔اس عہد میں بس فرق یہ آیا تھا کہ ان کی سماجی قدر و منزلت ان کے آقا کے مطابق طے کی جاتی تھی اور انھیں جاگیروں وغیرہ سے بھی نوازا جاتا تھا۔اسی طرح کچھ باندیوں کا خلفا کی بیویاں یا ان کی مائیں ہونے کی وجہ سے ایک مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا تھا حالانکہ سماج میں ان کے باندی ہونے کی حیثیت برقرار تھی۔

ہر سماج کی طرح عہد عباسی کے سماج کو اعلی، متوسط اور کمزور طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کے اقتصادی حالات، طرز رہائش و رہن سہن اور کھانے پینے کا ڈھنگ، اس طبقہ کی منھ بولتی تصویر قرار دی جاسکتی ہے۔

عہد عباسی کا اعلی طبقہ، خلفا، وزرا، امرا، حکومت کے اعلی و اہم اراکین اور ان کے افراد خانہ پر مشتمل تھا۔اسی طبقے میں بڑے تاجروں، کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا بھی شمار ہوتا تھا۔اس طبقے کی آمدنی سب سے زیادہ تھی۔ان کے بعد اس عہد کے متوسط طبقے کا نمبر آتا ہے، یہ طبقہ متوسط آمدنی والوں پر مشتمل تھا جیسے حکومت کے دوسرے درجہ کے ارکین، تنخواہ دار علما، وقضاۃ، درمیانی درجے کے تاجر، کاشت کار اور صنعت کار وغیرہ۔اقتصادی لحاظ سے سب سے کمزور طبقہ غریبوں کا تھا جو عام فوجی و سپاہی، حکومت کے عام کارکنان، معماران، کاریگروں اور مزدوروں پر مشتمل تھا۔

13.9 عہد عباسی کے اسلامی فرقے

حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت کے وسط تک اسلامی معاشرہ متحد و یکجا رہا حتی کہ نومسلم یہودی عبداللہ بن سبا نے اسلامی معاشرہ میں فرقہ بندی کا پہلا بیج بو دیا جو آگے چل کر ''فرقہ بندیوں'' جیسے تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔عہد عباسی میں پائے جانے والے اسلامی فرقوں کا مختصر تعارف درج ذیل سطور میں کرایا جا رہا ہے۔

3.9.1 شیعہ

اسلامی فرقوں میں سب سے قدیم اور اہم فرقہ ''شیعی فرقہ'' ہے۔ابتدائی عہد میں لفظ ''شیعہ'' صرف حامی گروہ اور جماعت کے معنی میں مستعمل ہوتا تھا لیکن بہت جلد اس لفظ نے حضرت علیؓ کے حامیان اور انھیں خلافت کا مستحق سمجھنے والی جماعت کا لقب اختیار کر لیا۔حضرت علیؓ کی شہادت تک یہ جماعت یکجا و متحد رہی لیکن بعد میں وہ مختلف گروہ میں تقسیم ہو گئی لیکن وہ تمام گروہ اپنے اصولی عقائد پر، معمولی ترمیم اور اختلاف کے ساتھ، قائم و دائم تھے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امامت کے تصور نے جنم لیا کہ خلافت کے اصلی مستحقین صرف حضرت امام حسنؓ (وفات ۵۰ھ/ ۶۷۰ء) اور امام حسینؓ (وفات ۶۱ھ/ ۶۸۱ء) ہیں۔امام حسنؓ نے جب حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا تو نہ صرف ان پر لعن و طعن کی گئی بلکہ ان کی اولاد کو بھی خلافت کے استحقاق سے محروم کر دیا گیا۔حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت امام زین العابدینؒ (وفات ۹۴ھ/ ۷۱۳ء) کو حق خلافت کا دعوی کرنے کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ان کے بعد ان کے فرزند محمدؒ کی امامت کو لے کر شیعی فرقہ مختلف ڈھروں میں تقسیم ہو گیا۔تقسیم ہونے والے مختلف گروہ میں ''اثنا عشریہ فرقہ'' سب بڑا فرقہ بن کر ابھرا کہ وہ بارہ امام کے قائل تھے۔اس فرقہ کے بارہویں امام محمد بن حسن عسکری

(وفات ۲۶۱ھ/ ۸۷۴ء) کو''امام غائب'' کہا جاتا ہے کہ وہ سامرا کے ایک غار میں غائب ہوگئے تھے۔انھیں ہی امام مہدی بھی کہا جاتا ہے جن کے ظہور کا انتظار شیعی فرقہ آج بھی کر رہا ہے۔

شیعہ فرقہ وقت کے ساتھ ساتھ گروہ در گروہ میں تقسیم ہوتا چلا گیا۔اس تقسیم کی بنیادی وجہ شیعی عقائد کے حوالے سے پیدا ہونے والے اختلافات تھے۔اس فرقہ کے چار بنیادی فرقے ہیں: کیسانیہ، زیدیہ، امامیہ اور غالیہ۔ یہ چاروں فرقے بھی آگے چل کے مختلف فرقوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں جیسے کیسانیہ مختاریہ اور ہاشمیہ وغیرہ میں تقسیم ہوگئے، زیدیہ، جارودیہ اور سلیمانہ وغیرہ میں بٹ گئے، امامیہ سے باقریہ، اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ وغیرہ جیسی شیعی جماعتیں پیدا ہوئیں اور غالیہ، سبائیہ اور کاملیہ وغیرہ میں منقسم ہوگئے۔

شیعی فرقوں کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ خلافت کا استحقاق صرف اور صرف حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی اولاد کا استحقاق ہے۔انھیں اس حق سے محروم کرنے والے غاصب قرار پائیں گے لہذا ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا یا ظاہری طاقت نہ ہوتو ان کی جڑوں کو کاٹنا ضروری ہے۔اس عقیدے پر شیعی حضرات پورے عہد عباسی میں مکمل طور پر کار پابند رہے کہ کہیں بغاوتوں سے عباسی خلافت کو پریشانیوں میں ڈالتے رہے تو کہیں اس کی جڑوں کو کھودتے رہے جیسا کہ آل بویہ کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے۔خلافت عباسی کے زوال میں اس فرقہ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

13.9.2 خوارج

اس سے مراد وہ فرقہ ہے جنھوں نے مسئلہ تحکیم پر حضرت علیؓ کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی جماعت سے نکل گئے تھے۔مشہور قول کے مطابق حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے اور اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے قول کے مطابق انھیں کوفہ سے باہر نکل جانے کی وجہ سے خوارج کہا جاتا ہے۔دونوں میں وجہ تسمیہ میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑنے کے بعد کوفہ سے نکل کر''حروراء'' نامی مقام پر فروکش ہوگئے تھے۔

اس فرقہ کا بنیادی نظریہ اور عقیدہ ''لاحکم إلا لله'' ہے کہ جس نے بھی اس سے روگردانی کی گویا اس نے اسلامی شعار سے منھ پھیر لیا ہے۔خوارج کے مطابق چونکہ حضرت علیؓ نے مسئلہ تحکیم میں حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے ''لاحکم إلا لله'' کی خلاف ورزی کی تھی لہذا انھوں نے ان کی بیعت ختم کر کے اپنے لیے ایک نیا امام عبداللہ بن وہب راسبی چنا اور اس کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔ابتدائی زمانہ میں خوارج نامی یہ فرقہ اپنے عقیدہ ''لاحکم إلا لله'' کی وجہ سے ''المحکمة'' اور ''حروراء'' کے مقام پر بیعت ہونے کی وجہ سے ''الحروریة'' کہلایا۔بعد میں اس فرقہ کے تمام پیروکاران کو خوارج کے نام دے دیا گیا۔سارے ایک قول کے مطابق ابتدائی عہد کے خوارج ''شراة'' (**شاری** کی جمع، اپنے آپ کو خدا کی راہ میں بیچنے والے) کے نام سے جانے جاتے تھے۔اسی طرح وہ اپنے ایک اہم سردار کے نام نجدہ بن عامر حروری کے نام پر ''النجدات'' بھی کہلاتے ہیں۔

شیعی فرقہ کی طرح خوارج کے وجود میں آنے کا سبب بھی سیاسی ہے لیکن آگے چل کر دونوں فرقوں نے دینی فرقے کا روپ اختیار کر لیا اور اسلامی فرقوں کی ایک مستقل اکائی بن گئے۔بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب ''انھوں نے اپنا پورا دینی نظام اور سیاسی ڈھانچہ بنایا جو ان کے مخصوص نظریات وعقائد پر مبنی تھا۔یہ دینی اور سیاسی نظام مدتوں کی سعی وکاوش اور حکومت وقت کے خلاف ان کی جنگوں کے بعد بنا تھا''۔

خوارج کا یہ فرقہ ابتدائی عہد میں ایک سیاسی طاقت بن کر ابھرا جس نے بہت جلد طاقت وقوت حاصل کر لی وہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں امن وامان قائم نہ رہنے کا ایک بڑا سبب بن گئے جنھوں نے اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول غیر ارادی طور پر حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کی فتح کا سبب بن گئے تھے اور عباسی خلافت وحکومت کے قیام میں بھی مددگار ثابت ہوئے تھے۔خلافت عباسیہ میں ان کی سیاسی اور فوجی طاقت ختم ہوگئی اور وہ محض ایک دینی فرقہ بن کر رہ گیا تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عہد عباسی میں وقتاً فوقتاً سر اٹھانے کی کوشش کی تھی تاہم وہ بہت زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔

آگے چل خوارج کا فرقہ بھی شیعی فرقہ کی طرح مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔خوارج کا سب سے بڑا فرقہ ازارقہ تھا جو نافع بن ازرق کے پیروکار تھے۔دوسرا بڑا فرقہ اباضیہ ہے جو عبداللہ بن اباض کے متبعین تھے۔یہ فرقہ انتہا پسند ازارقہ سے علیحدہ ہوکر بنا تھا جس کے متبعین آج بھی عمان، طرابلس، مشرقی افریقہ، شمالی افریقہ، جنوبی عرب اور جنوبی جزائر میں پائے جاتے ہیں۔تیسرا بڑا فرقہ صفریہ ہے۔یہ فرقہ نافع بن ازرق کے ساتھ ''**استعراض**'' (مخالفین اور ان کے بال بچوں کے قتل) کے مسئلہ پر اختلاف کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔اس فرقہ کو اباضیہ کے بعض اصولوں- جیسے غیر خارجی مسلمان کو مشرک نہ سمجھنا- سے بھی اختلاف تھا۔مشہور قول کے مطابق زیاد بن اصفر کی وجہ سے یہ فرقہ صفریہ کہلاتا تھا۔اس کا دوسرا نام زیدیہ بھی ہے۔خوراج کی اس تیسرے بڑے فرقے کی وجہ تسمیہ کے متعلق اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے کئی اقوال نقل کرتے ہوئے انھیں لغو بھی قرار دیا ہے اور اس کے اشتقاقی عدم تیقن کی وجہ اس کے ابتدائی حالات کا تاریکی میں ہونا قرار دیا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں فرقوں کا شمار خوارج کے بڑے اور اہم فرقوں میں ہوتا ہے جن کی متعدد شاخوں کا ذکر کتب ملل ونحل میں ملتا ہے۔

13.9.3 مرجئہ

یہ ایک دینی فرقہ تھا جو شیعہ اور خوارج کے سخت رویہ اور بالکل متضاد نظریات کی وجہ سے منظر عام پر آیا تھا کہ شیعہ اور خوارج اپنے اپنے عقائد کے مطابق بہت سے لوگوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے اور انھیں کافر قرار دیتے تھے۔یہ دونوں فرقے اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کو باطل کا پیروکار مانتے تھے۔ان کے مقابلہ میں مرجئہ نامی فرقہ وجود میں آیا جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ وہ علی الاعلان اپنے اسلام کے چھوڑنے کا اعتراف نہ کرے، محض گناہ کبیرہ کی بنا پر کسی بھی شخص کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔اس فرقہ کا نام لفظ ''ارجاء'' (مؤخر کرنا، امید ہونا) سے مشتق ہے۔

مرجئہ، مسلمانوں کی آپسی لڑائی کو برا سمجھتے تھے لیکن وہ کسی کو بھی برا نہیں مانتے تھے اور نہ ہی اس کے اعمال کی بنیاد پر اس کے مومن یا کافر ہونے فیصلہ کرتے تھے۔ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ حق وباطل کا فیصلہ آخرت میں ہوگا اور فیصلہ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے لہٰذا اس کے امور میں مداخلت غیر مناسب وغیر ضروری ہے۔

یہ فرقہ مرجئہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کے متعلق فیصلہ کو مؤخر کرنے کے قائل تھے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ایمان واسلام کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ایک دوسری وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھیں اللہ کی ذات سے مغفرت وبخشش کی پوری پوری امید تھی کہ وہ مسلسل گناہ کرنے کے بعد بھی بخش دے گا۔

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے اس فرقہ کے چار مکاتب فکر- خوارج کے مرجئہ، قدریہ کے مرجئہ، جبریہ کے مرجئہ اور خالص

مرجئہ- کا ذکر کیا ہے اور خالص مرجئہ کی ذیلی شاخوں جیسے یونسیہ، عبیدیہ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فرقۂ مرجئہ کو جماعت اہل سنت سے اس لیے الگ قرار دیا جاتا ہے کہ انھوں نے صرف ایمان کو ہی بخشش کا ذریعہ مانا ہے اور وہ عمل پر زور نہیں دیتے ہیں کہ اگر کسی کی وفات حالت ایمان میں ہوجائے تو اس کی بخشش یقینی ہے چاہے اس نے زندگی بھر کسی بھی قسم کے اچھے اعمال نہ کیے ہوں، نہ ہی فرائض کی ادائیگی کیے ہو بلکہ اس سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی ہوتا رہا ہو۔ ان کا یہ نظریہ اہل سنت کے نظریہ سے ٹکراتا ہے کہ وہ بھی کبیرہ گناہ کے مرتکب کے کافر ہونے کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ گناہ کبیرہ وصغیرہ کے مرتکب کی بخشش اور جنت میں داخلہ ان گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ہی ہوگا، سوائے اس کے کہ اس نے مرنے سے پہلے سچی توبہ کر لی ہو۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے بقول ''نجات کے لیے عمل وفرائض اسلام کو خارج کر کے انھوں نے بے عملی بلکہ بد عملی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ایمان اور اسلام دونوں کے اجتماع کو نہیں سمجھ سکے۔ اہل سنت کا عقیدہ صحیح ہے اور مؤثر بھی کہ ایمان وعمل صالح دونوں دنیا وآخرت دونوں میں سعادت ونجات کے لیے ضروری ہیں''۔

مرجئہ فرقہ کے افکار وخیالات کا اثر حکومت وقت پر یہ پڑا تھا کہ ان کی بد عملی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور وہ بدستور امامت وقیادت کا استحقاق رکھتے تھے جب کہ ان کے مقابلہ میں خوارج کا کہنا یہ تھا کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے امامت وقیادت کے منصب پر باقی نہیں رہ سکتے ہیں لہٰذا جب بھی خلفا کی بدعملیوں اور گناہوں کا ذکر کیا جاتا تو ایک طبقہ مرجئہ کے افکار ونظریات کی انھیں معصوم قرار دیتا اور انھیں ان کے حق پر باقی رہنے کا استدلال کرتا تھا۔

13.9.4 معتزلہ

معتزلہ کا شمار بڑے اسلامی فرقوں میں ہوتا ہے۔ یہ فرقہ بھی غیر سیاسی تھا کہ اس کی بنا کی وجہ سیاسی کے بجائے دینی تھی۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے چار بڑے فرقوں- شیعہ، خوارج، مرجئہ اور معتزلہ- میں سے اول الذکر دو فرقے بنیادی طور پر سیاسی گروہ تھے جنھوں نے آگے چل کر دینی فرقہ کا قالب اختیار کر لیا تھا اور مؤخر الذکر دونوں فرقوں کی اساس دین تھا کہ وہ محض دینی نقطہ نظر کے اعتبار سے پروان چڑھے تھے۔ اس فرقہ کا دوسرا نام ''اصحاب عدل وتوحید'' بھی ہے۔ بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب انھیں ''قدریہ'' اور ''عدلیہ'' بھی کہا جاتا ہے

اس فرقہ کا نام لفظ ''اعتزل'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی الگ ہوجانا یا جماعت چھوڑ دینا ہے۔ اسے عجیب اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے کہ خوارج کے معنی بھی الگ ہوجانے والے یا جماعت چھوڑ دینے والے کے ہیں دونوں کے معنی ایک جیسے ہونے کے باوجود دو الگ الگ فرقے بن جانا ہی ان کے وجود میں آنے کے اصل کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خوارج سیاسی بنیادوں پر حضرت علیؓ سے الگ ہوئے تھے جب کہ واصل بن عطاء نے دینی نقطۂ نظر کی بنا پر اپنا جداگانہ راستہ بنایا تھا۔

یہ فرقہ بھی مرجئہ کی طرح مسلمانوں کی خانہ جنگی کے نتیجہ میں وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے وجود میں آنے کا سبب دینی تھا جس میں اس عہد میں فروغ پانے والی فکر اور فلسفہ کی آمیزش ہو چکی تھی۔ اس فرقہ کا ظہور عہد اموی کے اواخر میں ہوا تھا اور عروج وکمال مامون، معتصم اور واثق جیسے عباسی خلفا کے عہد میں ہوا تھا۔ اس فرقے کے بنیادی پانچ اصول- توحید، عدل، وعد وعید، سمع وعقل اور **منزلة بن المزلتين**- ہیں

۔ان پانچ اصولوں پر معتزلہ کے سارے گروہ متفق ہیں تاہم کچھ عقائد واصول ایسے بھی ہیں جن میں وہ آپس میں جزوی اختلاف رکھتے ہیں۔ امامت وخلافت کے حوالے سے ان کے مختلف گروہ مختلف نظریات کے قائل ہیں۔

مذکورہ بالا فرقوں کی طرح اس فرقہ کی بھی کئی شاخیں ہیں جن میں مشہور ترین فرقے واصلیہ (واصل بن عطاء (وفات ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء) کے پیرو کار)،ہذیلیہ(ابوہذیل حمدان بن ہذیل علاف (وفات ۲۳۵ھ/ ۸۴۹ء کے متبعین)اور نظامیہ(ابراہیم بن سیار نظام (وفات ۲۳۱ھ/ ۸۴۵ء) کی پیروی کرنے والے) ہیں۔

یہاں اس بات کی اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فرقوں میں شیعہ اور معتزلہ کا فرقہ ہی عہد عباسی میں سرگرم رہا۔باقی دونوں فرقوں-خوارج اور مرجئہ- میں سے خوارج کا عہد عباسی کے ابتدائی دور میں ہی تقریبا خاتمہ ہو چکا تھا اور ان کی سرگرمیاں نہ کے برابر ہو کر رہ گئیں تھیں جب کہ مرجئہ فرقہ ایسا تھا جو کسی بھی عہد میں بہت سرگرم نہیں رہا۔ان دونوں کے مقابلہ میں عہد عباسی میں شیعوں نے اپنی سرگرمیوں کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ حکومت وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ارباب اقتدار کو مسلسل آزمائش وابتلا میں ڈالے رکھا۔

معتزلہ کا فرقہ اسلامی فرقوں میں اس لحاظ سے بھی منفرد قرار دیا جا سکتا ہے کہ عہد عباسی میں ہی اسے اصل عروج وکمال حاصل ہوا تھا۔انھوں نے اپنے افکار ونظریات کو فروغ دینے کے لیے سیاسی میدان کی بجائے علمی محاذ کو چنا اور اپنے لازوال علمی کارناموں سے اسلامی علوم وفنون کے ذخیرے میں قابل ذکر اور قابل قدر سرمایہ کا اضافہ کیا جن سے آج بھی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

13.9.5 دیگر فرقے

مذکورہ بالا چاروں فرقوں کے علاوہ دیگر فرقے بھی اس عہد میں پائے جاتے تھے جیسے جبریہ،قدریہ،صفاتیہ وغیرہ لیکن معاشرے پر ان کے اثرات بہت ہی کم مرتب ہوئے تھے لہذا ان میں سے کچھ ناپید ہو گئے، کچھ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔

13.10 عصر عباسی کی علمی سرگرمیاں

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون کو بنیادی طور دو پر زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلا زمرہ ان علوم وفنون پر مشتمل ہے جو عصر عباسی کے علما وفضلا کو اسلاف خصوصا عہد اموی سے بطور ورثہ ملے تھے۔دوسرا زمرہ ان علوم وفنون پر مشتمل ہے جن کی بنا عصر عباسی میں رکھی گئی تھی۔عصر عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عہد عباسی کے علما کو بطور ورثہ ملنے والے علوم وفنون کی تعداد زیادہ ہے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے دونوں زمروں کو حسب ذیل علوم وفنون میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

☆اسلامی علوم وفنون جیسے قرآنی علوم،علوم حدیث وفقہ اور ان کے متعلقات۔

☆سائنسی علوم وفنون جیسے کیمیا (کیمسٹری)،طبیعیات (فزکس)،طب (میڈیسن) وغیرہ۔

☆ سماجی علوم جیسے تاریخ وجغرافیہ،فلسفہ ومنطق وغیرہ اور ان کے متعلقات۔

☆ادبی علوم وفنون جیسے نثر نگاری،شاعری، بلاغت وغیرہ اور ان کے متعلقات۔

مذکورہ علوم وفنون میں سے عہد عباسی میں اسلامی علوم وفنون کا سرمایہ سب سے زیادہ مرتب کیا گیا ہے ۔اسلامی علوم وفنون میں علوم قرآن کو سب سے زیادہ نمایاں مقام ومرتبہ حاصل ہے کہ قرآن کے مختلف پہلوؤں کو علمائے اسلام نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا تھااور حاصل مطالعہ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔قرآن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر علمائے اسلام نے قلم نہ اٹھایا ہو۔

قرآن کے بعد حدیث وعلوم حدیث کے موضوع پر ایک معتد بہ ذخیرہ علمائے اسلام نے مرتب کیا تھا۔علم حدیث کے روایتی اور درایتی دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل مباحث کیے گئے ہیں۔حدیث کے ضمن میں اسماء الرجال جیسا علم پروان چڑھا جس کی نظیر آج تک نہ پیش کی جاسکی ہے۔

فقہ اور علوم فقہ پر بھی قابل ذکر سرمایہ مرتب کیا گیا ہے۔سیرت نبوی کے موضوع پر بھی اہم ترین کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔تذکرہ وتراجم کے موضوع پر بھی ایک قابل قدر سرمایہ مرتب کیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا علوم وفنون کے بطن سے نت نئی شاخیں پھوٹیں تھیں جن میں اس عہد میں اتنے بال وپر آئے کہ آگے چل کر انھیں ایک مستقل علم وفن کا درجہ حاصل ہو گیا جیسے فن سیرت نبوی کہ اس کے ابتدائی خدوخال ہمیں حدیث میں ملتے ہیں لیکن آگے چل کر وہ ایک مستقل فن بن جاتا ہے۔اسی طرح فن سیرت نگاری سے فن تاریخ پروان چڑھتا ہے جو آگے چل کر سیرت نبوی سے جدا ہو کر ایک مستقل علم وفن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔جغرافیہ کے بطن سے سفرنامہ جیسی ادبی صنف پروان چڑھتی ہے۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے سماجی علوم وفنون میں تاریخ ،جغرافیہ،تصوف،منطق وفلسفہ اور علم کلام جیسے علوم وفنون شامل ہیں ۔ان علوم وفنون پر عہد عباسی کے علما نے ایک گرانقدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔اسی طرح متعدد ادبی علوم وفنون جیسے علم بلاغت،تنقید اور لغت جیسے علوم وفنون پروان چڑھے تھے۔اس عہد کی نثر نگاری کو عربی ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں قرار دیا جاتا ہے۔اس عہد کی نثر نگاری کے مقابلہ میں صرف عصر جدید کی نثر نگاری کو بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔اس عہد کی شاعری،اس کے موضوعات اور اصناف سخن میں بھی نمایاں تبدیلیاں ملتی ہیں۔

13.10.1 تحریک ترجمہ

تحریک ترجمہ عہد عباسی کی سب سے بااثر علمی تحریک تھی جس نے سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا تھا۔اسی تحریک کے نتیجہ میں مختلف علوم وفنون پروان چڑھے تھے اور عرب علما وفضلا دیگر ممالک کے علمی وادبی سرمایہ سے واقف ہو سکے تھے۔تحریک ترجمہ کی وجہ سے ایک ایسا علمی ماحول پروان چڑھا تھا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔

تحریک ترجمہ کی ابتدا عہد اموی میں خلیفہ خالد بن ولید کے ہاتھوں ہوئی تھی کہ انھوں نے متعدد سائنسی کتب خاص طور کیمیا کی کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا۔ان سے پہلے ان کے جد امجد حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ترجمہ نگاری کی کچھ سرگرمیوں کا سراغ ملتا ہے تاہم حقیقی ترجمہ نگاری کی ابتدا خلیفہ خالد بن ولید کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی کہ انھیں کے عہد میں پہلی مرتبہ علمی وفنی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا۔

عباسی خلافت وحکومت میں فن ترجمہ پر بھرپور توجہ دی گئی بلکہ کچھ زیادہ ہی دی گئی کہ وہ ایک تحریک بن گئی جس کو تیز سے تیز تر کرنے میں عباسی خلفاء، ان کے وزرا، امرا اور دیگر اعیان سلطنت کے ساتھ ساتھ مختلف خانوادوں اور عوام الناس نے بھی نمایاں اور اہم کردار ادا کیا

ہے۔اس تحریک نے ایک ایسی علمی فضا پروان چڑھادی تھی جس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

عہد عباسی میں تحریک ترجمہ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور(۱۳۶ - ۱۹۳ھ/ ۷۵۴-۸۰۸ء):اس دور کی ابتدا خلیفہ منصور کے عہد سے ہوتی ہے اور خاتمہ ہارون رشید کے عہد پر ہوتا ہے۔اس عہد کے اہم مترجمین میں ابن بطریق، جورجیس بن جبرائیل،عبداللہ بن مقفع، یوحنا بن ماسویہ،سلام بن ابرش اور باسیل مطران ہیں۔

دوسرا دور(۱۹۸-۳۰۰ھ/ ۸۱۴-۹۱۳ء):اس دور کی ابتدا خلیفہ مامون کے دور حکومت سے ہوتی ہے۔اس دور کے نمایاں مترجمین میں یوحنا بن بطریق، حجاج بن یوسف مطر،قسطا بن لوقا،عبدالمسیح بن ناعمہ حمصی، حنین بن اسحاق، ثابت بن قرہ صابی، حبیش بن حسن کا شمار ہوتا ہے۔ترجمہ نگاری کا یہ دور تاریخ ترجمہ کا سب سے زریں عہد ہے۔

تیسرا دور(۳۰۱-۴۵۰ھ/ ۹۱۳ء-۱۰۵۸ء): تیسرے دور کے قابل ذکر مترجمین میں سنان بن ثابت بن قرہ، یحییٰ بن عدی،ابوعلی بن زرعہ، ہلال بن ہلال حمصی، متی بن یونس اور عیسی بن سہر بخت ہیں۔اس دور میں فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے کی بجائے ادبی کتابوں، خاص طور پر فارسی ادب کے ترجمے پر خصوصی توجہ دی گئی تھی کہ فلسفہ کی زیادہ تر اہم اور معرکۃ الآرا کتابوں کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

عہد عباسی میں یونانی ، فارسی، کلدانی، نبطی، سریانی، عبرانی، قبطی، سنسکرت، پہلوی، رومی، لاطینی (قدیم رومی زبان) اور آرامی جیسی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا عربی ترجمہ کیا گیا شامل ہیں۔ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی کی تحقیق کے مطابق عہد عباسی میں ۵۰۰ سے زائد مترجمین نے مجموعی طور ۱۹ زبانوں کی کتابوں کو عربی کے قالب میں ڈھالا تھا جنھیں موضوعاتی طور ۳۰/علوم وفنون- طب، ہندسہ وحساب، منطق وفلسفہ، فلکیات، زراعت، تاریخ وسیر، موسیقی، نجوم وہیئت، جغرافیہ، ادیان ومذاہب، تعبیر خواب، سحر اور ادب وغیرہ- میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

عہد عباسی میں ترجمہ کی جانے والی کتب پر کچھ اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں جن کا تعلق ترجمہ کی صحت، مترجمین کا ترجمہ پر قادر نہ ہونے کی بنا پر ترجمہ میں خیانت کرنا اوران کی اکثریت کا غیر مسلم ہونا وغیرہ وغیرہ ہیں لیکن بقول ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی یہ تمام اعتراضات بے سروپا ہیں اوران کا حقیقت سے دور دور تک واسطہ نہیں ہے جن کے متعدد منھ بولتے ثبوت مصادر ومراجع میں موجود ہیں۔

عہد عباسی کی تحریک ترجمہ نے علوم وفنون کے فروغ اور تہذیب وثقافت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اس تحریک کے نتیجے میں عربوں میں ذہنی اور فکری بیداری پیدا ہوئی تھی اور ان کے سامنے غور وفکر کی ایک وسیع دنیا وا ہوگئی تھی۔اس بیداری کا سب سے خوبصورت نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی، سنسکرت، سریانی اور یونانی زبانوں کے علمی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا آغاز ہوا تھا جس کا سلسلہ کئی صدیوں تک چلتا رہا۔مسلم علما وفضلا نے ان تراجم کی مدد سے مختلف علوم وفنون میں اپنی ایک شناخت بنالی تھی۔

تحریک ترجمہ کے اثرات صرف سائنسی اور سماجی علوم پر مرتب نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے اثرات ادبی علوم وفنون پر بھی مرتب ہوئے تھے۔فارسی ادب کا اچھا خاصا سرمایہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا تھا جس سے متاثر ہوکر عرب ادبا نے ایسا عربی ادب تخلیق کیا تھا جو نئے افکار ومیلانات کا ترجمان تھا۔یہ طرز اسلوب، ایرانی وفارسی طرز بیان واسلوب سے کافی متاثر تھا جس کے نتیجہ میں ایک نیا انداز تحریر سامنے آیا جس کی سحر بیانی کے سبھی معترف ہیں۔اس طرز تحریر اور اسلوب بیان نے عربی ادب کے مختلف موضوعات میں کافی کشادگی پیدا کردی تھی۔

تحریک ترجمہ کا ایک نمایاں اثر عربی زبان پر یہ مرتب ہوا تھا کہ اس تحریک نے اس کی بنیادی ماہیت وپہچان ہی بدل کر رکھ دی۔عہد

عباسی میں پروان چڑھنے والی تحریک ترجمہ سے قبل عربی زبان کی پہچان وشناخت صرف ادبی زبان ہونے کی تھی اوراس کا شمارعلمی زبانوں میں نہیں ہوتا تھا۔تحریک ترجمہ کے نتیجے میں علمی مصطلحات اور فلسفیانہ تعبیرات کی وجہ سے عربی زبان کا دامن کافی وسیع اور کشادہ ہوگیا تھاجس کی وجہ سے اس کی محدودشناخت ختم ہوگئی تھی اوراس کا شماربھی علمی زبانوں میں ہونے لگا تھا۔

3.11 عصرعباسی کی نثر نگاری

عربی نثر نگاری کا جتنا فروغ عصرعباسی میں ہوا اتنا فروغ عصرجدید کو چھوڑ کرکسی اور عہد میں نہ ہوسکا۔اس کی بنیادی وجوہات میں مختلف علوم وفنون کا ارتقا،مختلف اقوام وملل اورتہذیب وتمدن کا آپس میں ملاپ وغیرہ شامل ہیں۔اس صورت حال میں تحریک ترجمہ نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیااوراہل علم وفن نے اپنے افکاروخیالات ونظریات کوپیش کرنے کے لیےنظم کی بجائے نثر کا سہارالیا کہ ہرمضمون کوشعری قالب میں نہیں ڈھالا جاسکتا تھا۔اس عہد میں ادبی،سماجی،سیاسی،دینی اور سائنسی علوم وفنون پرمشتمل گرانقدرتصانیف منظرعام پرآئیں جن کے گہرے اثرات اس وقت اور مابعد ادوار پر مرتب ہوئے۔مذکورہ بالا علوم وفنون پرلکھی جانے والی کتب نے جہاں ایک طرف عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم کرداراداکیا وہیں عربی زبان کے دامن کو بہت زیادہ وسیع اوراس قابل بنادیا کہ وہ کسی بھی قسم کے موضوع کا احاطہ کرسکے۔

عہدعباسی میں عربی نثر نگاری اپنے سب اہم اور طاقت وردور میں داخل ہوتی ہے،اس کے موضوعات اورمضامین کا دائرہ کافی وسیع ہوجاتا ہےاوراس کے جلو میں نت نئی خالص ادبی اصناف کا ظہور ہوتا ہےجس کے نتیجے میں اس عہد کی نثر نگاری اوج کمال کوپہنچ جاتی ہے۔عہدعباسی میں پروان چڑھنے والی نثر کا مقابلہ وموازنہ صرف عصرجدید میں پروان چڑھنے والی نثر سے کیا جاسکتا ہے۔

عہدعباسی کی نثر نگاری کوفروغ دینے میں جہاں اسلامی علوم فنون جیسے علوم قرآن وعلوم حدیث وعلوم فقہ وغیرہ نے نمایاں کرداراداکیا تھا وہیں سماجی علوم جیسے تاریخ وجغرافیہ،فلسفہ ومنطق اورعلم کلام وغیرہ نے بھی ایک اہم کرداراداکیا تھا۔ان علوم وفنون کے شانہ بشانہ زبان وبیان سے تعلق رکھنے والے علوم جیسے علم نحو،علم صرف،علم بلاغت وتنقیداورعلم لغت وغیرہ نے بھی عہدعباسی کی نثر نگاری کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کرحصہ لیا تھا۔ان سب پرمستزادخالص ادبی اصناف سخن جیسے خطابت،رسائل وتوقیعات،مقامات وسفرناموں وغیرہ نے عہدعباسی کی نثر نگاری کو چار چاند لگادیے تھے۔ان سب علوم وفنون کی وجہ سے عربی زبان وادب کا دامن اس قدر وسیع ہوگیا تھا کہ اس میں ہرقسم کے موضوعات ومضامین سماگئے تھے اورخشک سے خشک مباحث کوعرب نثر نگاران،خوبصورت اوردلکش انداز بیان اوراسلوب میں پیش کرنے لگے تھے۔

یہ عجیب وغریب اتفاق ہے عہدعباسی کی ادبی اورفنی نثر نگاری کا آغاز ایک غیرعرب کی کوششوں اور پہلوی ادب کے عربی ترجمہ سے ہوتا ہے،عبداللہ بن مقفع نے پنچ تنتر کے پہلوی ترجمہ کوعربی کے قالب میں ڈھال کرکے اسے''**كليلة ودمنة**''سے موسوم کیا تھا جوعربی نثر کا ایک عمدہ نمونہ اور ماڈل بن گیا تھا۔اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی اس کے ساحرانہ اسلوب کے اثرات باقی ہیں اور پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔یہ کتاب اپنی نظیرآپ ہے کہ آج تک اس کا بدل نہ پیش کیا جاسکا اور وہ سہل ممتنع کی ایک ایسی مثال بن گئی جس کی پیروی ناممکن تونہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

عہدعباسی میں خالص نثری ادب کوفروغ دینے اور پروان چڑھانے میں مشہورعباسی ادیب عمروبن بحرالمعروف جاحظ،نے سب سے

اہم کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے خالص ادبی کتب کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور گرانقدر کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔انھوں نے اپنے طرز بیان واسلوب سے عربی نثر کا ایک علمی رنگ وآہنگ متعین کر دیا تھا جس میں ادبیت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

عہد عباسی میں ان دونوں کے علاوہ جن باکمال ادبا نے عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے ان میں ابوعبیدہ، اصمعی، سہل بن ہارون، ابراہیم صولی، ابن قتیبہ، قدامہ بن جعفر، مبرد، ابن العمید، ابوالفرج اصفہانی، صاحب بن عباد، خوارزمی، بدیع الزماں ہمدانی، ابوالقاسم حریری، قاضی فاضل اور ضیاء الدین ابن اثیر وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عصر عباسی میں پروان چڑھنے والی تہذیب وتمدن، سیاست ومعیشت اور معاشرتی انقلاب کے جتنے اثرات شاعری پر مرتب ہوئے، اتنے نثر پر مرتب نہیں ہوئے تھے۔غالباً اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ عربی شاعری کی ایک روایت موجود تھی اور اس کا ایک معتد بہ حصہ اور سرمایہ موجود تھا۔ شاعری کے مقابلہ میں نثری سرمایہ بہر حال کم تھا اور اس کی کوئی مضبوط روایت بھی نہیں پائی جاتی تھی کہ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی نثر کا موازنہ ومقابلہ ماقبل کی نثر سے کیا جاتا، غالباً اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عربی نثر کا بنیادی ارتقا عہد عباسی میں ہی ہوا تھا۔

13.11.1 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی ادبی نثر نگاری اسلوب اور طرز بیان کے اعتبار کو چار طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا طبقہ: اس طبقے کا سردار عبداللہ بن مقفع کو قرار دیا جاتا ہے۔اس طبقہ کے دیگر انشا پردازوں میں یعقوب بن داؤد، جعفر بن یحییٰ، حسن بن سہل، عمرو بن مسعدہ، سہل بن ہارون اور حسن بن وہب وغیرہ ہیں۔

دوسرا طبقہ: اس طبقے کی سربراہی مشہور عباسی ادیب جاحظ کرتے ہیں۔ اس طبقے کے دیگر لوگوں میں ابن قتیبہ، مبرد اور ابوبکر صولی وغیرہ ہیں۔

تیسرا طبقہ: اس طبقے کا امام ابن العمید جیسے ادیب کو قرار دیا جاتا ہے۔اس طبقے میں صاحب بن عباد، وزیر مہلبی، خوارزمی، بدیع الزماں ہمدانی، صابی اور ثعالبی جیسے اصحاب قلم شامل ہیں۔

چوتھا طبقہ: چوتھے طبقے کے سردار قاضی فاضل ہیں۔اس طبقہ میں **المثل السائر** کے مصنف ابن الاثیر، کاتب اصبہانی اور ابوالقاسم حریری وغیرہ ہیں۔

13.11.2 نثر نگاری کے اصناف

عہد عباسی میں فروغ پانے والی نثر نگاری کو ”علمی نثر، فلسفیانہ نثر، تاریخی نثر اور خالص ادبی نثر“ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر کفیل احمد قاسمی صاحب نے خالص ادبی نثر کو قدیم نثر کا تسلسل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اس کی بعض صورتیں اتنی نئی اور اچھوتی تھیں کہ عربوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا تھا......خطابت، مناظرے، علوم لسانیہ، تاریخ نویسی، علوم شرعیہ، فلسفہ اور علم کلام کے ساتھ ساتھ دیگر نثری اصناف کے لیے راہیں ہموار ہوئیں چنانچہ دفتری کارروائیاں، انشا وترسیل کے لیے ترقی کا سبب بنیں تو قصص وحکایات سے لوگوں کی دلچسپی نے نثر کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کی۔نحو وصرف اور بلاغت کی تدوین سے زبان صاف ستھری ہوگئی......اور خالص ادبی نثر کے بے شمار نمونے سامنے آئے۔اب

ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ معیاری اور غیر معیاری نمونوں کی شناخت ہو لہٰذا فن تنقید کے اصول وضوابط کی تدوین ہوئی۔

اس دور کی دیگر نثری اقسام میں مراسلہ نویسی، عہدنامے، وصایا اور توقیعات کو فروغ ہوا دفتری خطوط لکھنے پر انہیں لوگوں کو مامور کیا جاتا تھا جن میں ادب کا ذوق اور بلاغت کا ملکہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو مختلف علوم وفنون سے واقفیت ہوتی تھی۔ یہ مراسلات ملک کے انتظامی امور، حکام کے تقرر، خلفا کے لیے بیعت، فتوحات جہاد، ملک میں امن وامان اور حکام کو وصیت، لوگوں کو تہنیت یا تعزیت جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں''۔

13.12 عصر عباسی کی شاعری

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گوناگوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد وممتاز نظر آتی ہے۔ عہد عباسی کو کئی ایک تہذیبوں اور ثقافتوں کا نقطۂ اتصال قرار دیا جاتا ہے، اس عہد میں مختلف اقوام وملل اور ان کی تہذیب وثقافت ایک دوسرے سے گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عہد عباسی میں شاعری کے فروغ پانے کا ایک اہم وبنیادی سبب اس کا کسب معاش، عزت وشہرت اور مال ودولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن جانا بھی تھا کہ خلفا وامرا اور حکمراں طبقہ کے درباروں میں شعرا کی کافی زیادہ پذیرائی کی جاتی تھی اور انھیں بیش قیمت انعامات سے نوازا جاتا تھا گویا انھیں سرکاری سرپرستی حاصل ہوجاتی تھی۔ اس سرکاری سرپرستی کی وجہ سے اس عہد کے شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلہ میں جتنا زیادہ بڑا اور وسیع میدان اس عہد میں ملا وہ کسی اور دور میں میسر نہیں آسکا تھا۔ اسی طرح انھیں خلفا، حکما اور امرا کی خلوتوں میں رہنے کا زیاد ہ موقع ملتا تھا لہٰذا وہ مکمل یکسوئی وآزادی کے ساتھ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنے فکر وفن کو شاعری کے قالب میں ڈھالتے رہتے تھے جس کے نتیجہ میں عربی شاعری کے دامن مزید مالا مال ہوا اور وہ عربی زبان وادب کی تاریخ میں زندہ وجاوید ہوکر رہ گئے۔

عہد عباسی کی شاعری کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسے فروغ دینے میں خالص عرب افراد کے شانہ بشانہ اہل عجم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد عباسی کی شاعری اہل عجم کی ہی مرہون منت ہے کہ اس عہد کے نمایاں ترین شعرا کا تعلق دیار عجم سے تھا جنھوں نے عربی شاعری کے طرز واسلوب، مضامین وموضوعات، معانی وخیالات اور اوزان وبحور وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کرتے ہوئے عربی شاعری کو ایک نئے رنگ وآہنگ سے روشناس کرایا تھا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعری کے عمدہ ترین شہ پاروں اور متعدد گہر بار اور آبدار موتیوں سے عربی شاعری کے دامن کو بھر دیا تھا۔۔

عصر عباسی کی شاعری، عربی شاعری کے دیگر تمام ادوار سے اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں قدما کے طرز اسلوب وبیان سے صرف نظر کرتے ہوئے شعرا نے ایک نیا طرز واسلوب اختیار کیا تھا کہ وہ محبوبہ کی یاد آنسو بہاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ وڈھنگ سے کرتے ہیں۔ قدیم اصناف سخن - جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ - کے دائرۂ کار میں وسعت کے ساتھ ساتھ چند جدید موضوعات شاعری - غزل غلمان، زہدیات، طردیات، خمریات وغیرہ - منظر عام پر آتے ہیں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے موضوعات شاعری میں مجموعی طور پر کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس

عہد میں بھی قدیم اسلوب وانداز میں شاعری کرنے والے شعرا بھی موجود تھے جن کی شاعری پر جدید ماحول اور حالات واثرات یا تو مرتب ہی نہیں ہوئے تھے یا برائے نام مرتب ہوئے تھے۔

عصر عباسی کی شاعری میں پیدا ہونے والی مختلف قسم کی تبدیلیوں کا تعلق صرف قصیدہ کی شکل اور مطلع کی تبدیلی سے نہیں تھا بلکہ بحور وقوافی سے بھی تھا، اس عہد کے شعرا نے ان میں تبدیلی کرتے ہوئے شعر کی موسیقیت میں اضافہ کر دیا تھا۔انھوں نے جدید تہذیب وثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے نت نئے تجربات کیے جنھیں اتفاق سے دوام حاصل نہ ہوسکا۔انھوں نے مقطعات، مخمسات اور مسمطات جیسے اسلوب سے عربی شاعری کو روشناس کیا لیکن انھیں عام مقبولیت نہ مل سکی۔مزید یہ کہ انھوں معانی میں جدت پیدا کی، الفاظ اور تراکیب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں جس نے آگے چل کر علم بدیع کی بنیاد رکھی تھی۔

اس عہد کی شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی تھی کہ اس نے غنا اور موسیقیت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے تھے، بعض شعرا نے صرف ایسے قصیدے لکھے جنھیں گایا جاسکے۔یہ شعرا کبھی لمبے لمبے قصائد لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی صرف تین تا پانچ اشعار پر مشتمل قصیدے لکھے ہیں تاکہ ان کی دھن بنانے اور گانے میں آسانی ہوسکے۔جب کہ بعض شعرا نے درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے غنا اور شعر کو یکجا کر دیا تھا جیسے اسحاق بن ابراہیم موصلی اور ابراہیم بن مہدی وغیرہ۔

لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے اس عہد کی شاعری میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں تھیں جیسے نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کم کیا جانے لگا، بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کو بتدریج کم کیا گیا اور عجمی الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔شاعری کے اسلوب بیان میں نفاست اور باریکی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحت کلام کا خیال رکھتے ہوئے صنعت 'بدائع' اور اس کی مختلف انواع کو کثرت سے برتا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بحروں کو بکثرت استعمال کیا گیا اور کچھ نئے اوزان وبحور جیسے مستطیل وممتد کا اضافہ ہوا۔شاعری کی اقسام میں جہاں ایک طرف زہدیات، شکاریات (طردیات) اور خمریات کا اضافہ ہوا تو دوسری طرف قوافی میں مسمط اور مزدوج کو فروغ ہوا۔

قصائد کا کھنڈرات کی بجائے محلات وباغات اور شراب وغیرہ سے آغاز، مدح اور ہجو میں مبالغہ آمیزی، تشبیہ واستعارہ کا بکثرت استعمال، قصیدے کے مختلف اجزا میں تناسب وموزونیت کا پایا جانا اور بندش میں ترتیب کی رعایت کا خیال رکھنا وغیرہ کو اس عہد کے اسلوب شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عصر عباسی میں ہونے والی ان جدید تبدیلوں کے باوجود بہت سے شعرا قدیم اسلوب میں ہی اپنی شاعری کے جلوے بکھیر رہے تھے۔وہ شعرا چونکہ ان ہونے والی تبدیلیوں کو روک نہیں سکتے تھے لہٰذا انہوں قدیم اسلوب کی حفاظت کا بیڑا اٹھالیا وہ اپنے جیسے شعرا کو اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ وہ قدیم اسلوب کی پیروی کرتے رہیں۔شاید اسی سے متاثر ہوکر ابن قتیبہ نے بھی اپنی کتاب میں قدیم اسلوب کی حفاظت پر زور دیا تھا۔

13.12.1 عہد عباسی کے شعرا کے طبقات

عہد عباسی کے شعرا کو تین بڑے طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا طبقہ: عہد عباسی کا پہلا طبقہ مخضرم شعرا کا ہے جنھوں نے عہد اموی کا اواخر اور عہد عباسی کا اولین دور پایا تھا۔ایسے شعرا کو اصطلاحی

طور پر ''مخضر مین شعرا'' کہا جاتا ہے۔انھیں شعرا نے عہد عباسی کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔مخضر مین شعرا کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

☆ پہلا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم اسلوب کی ہی مکمل طور پر پیروی اختیار کر رکھی تھی اور بدوی و روایتی انداز فکر میں اپنی شاعری کے جلوے بکھیر رہے تھے۔انھوں نئے انداز بیان اور اسلوب شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا جیسے مروان بن ابی حفصہ، حسین بن مطیر اور ابن ہرمہ وغیرہ۔مؤخر الذکر کے بارے میں مشہور ناقد اصمعی کا کہنا ہے کہ اس کی وفات کے ساتھ ہی اصل عربی شاعری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ آخری شاعر جس کے اشعار سے لغوی استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

☆ دوسرا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم کی حفاظت کرتے ہوئے جدید اسلوب کو اختیار کیا اور قدیم و جدید اسلوب کو یکجا کرتے ہوئے اظہار سخن کرنے کا آغاز کیا اور شاعری کے دونوں انداز و اسلوب میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا تھا۔اس طبقہ کی نمائندگی بشار بن برد اور ابونواس جیسے شعرا کرتے ہیں۔

دوسرا طبقہ: خالص جدید طرز و اسلوب بیان کے شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے عربی شاعری کو نئے آفاق سے روشناس کرایا اور اسے نئے رنگ و آہنگ سے نوازا تھا۔ان شعرا کی زندگی کا بیشتر حصہ تیسری صدی میں گذرا تھا اور اصطلاحی طور پر انھیں ''شعرائے مولدین ''(المولدون) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس طبقہ کے نمائندہ شعرا میں ابوتمام اور بحتری وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ: تیسرا طبقہ ان شعرا پر مشتمل ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چوتھی صدی میں گذرا تھا۔اصطلاحی طور ان شعرا کو ''شعرائے محدثین'' (المحدثون) کہا جاتا ہے جنھوں نے جدید عربی شاعری کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔اس طبقے کے اہم شعرا میں متنبی اور ابوالعلاء معری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

13.12.2 عہد عباسی کے شعرا کی فنی و موضوعاتی تقسیم

مذکورہ بالا شعرا کے طبقات کو موضوعاتی اور فنی لحاظ سے'' **شعراء البداوة**''، ''**الشعراء المجددون**''، ''**الشعراء المحافظون**''، '' **الشعراء المبدعون**''، ''**الشعراء المفتنون**''، ''**شعراء الصنعة**''، اور'' **شعراء المذاهب والوجدان والفكر**'' کے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

شعراء المذاهب والوجدان والفكر کا زمرہ شعرا کی ایک بڑی اکائی پر مشتمل ہے جسے ان کے نظریات، خیالات وافکار کے لحاظ سے **شعراء العباسية، شعراء الشيعة، شعراء العشق،شعراء الزهد والحكمة والمواعظ،شعراء علما**ئاور**شعراء الطبع والزندقة** میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

شعرا کی مذکورہ بالا فنی و موضوعاتی تقسیم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کیا کیا رنگ و روپ کی تھے۔

مذکورہ بالا فنی و موضوعاتی تقسیم کے علاوہ عباسی شعرا کو مجموعی طور پر دو بڑے گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

-پہلا گروپ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے مختلف موضوعات پر اظہار سخن کیا ہے، اس گروپ کے شعرا کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

-دوسرا گروپ ان شعرا کا ہے جنھوں صرف مخصوص موضوعات پر شاعری کے نمونے چھوڑے ہیں اور ان کی شاعری صرف کسی ایک

موضوع یا رنگ کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے عباس بن احنف اور ابن داود نے صرف عشقیہ شاعری کے نمونے چھوڑے ہیں ، ابوالعتاہیہ نے صرف زہد اور حکمت کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے جب کہ ابونواس نے شراب اور اس کے متعلقات کی تصویر کشی اچھوتے انداز واسلوب میں کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کی شاعری کو''الخمریات'' سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

13.13 عصر عباسی کی تہذیب وتمدن

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے بقول اسلامی تہذیب وتمدن کی بنا عہد نبوی میں ہی پڑ چکی تھی، خلافت راشدہ میں اس نے کسی قدر ارتقائی مراحل طے کر لیے تھے، عہد اموی میں ان کی ایک باقاعدہ تنظیم وترتیب ہوئی اور عباسی خلافت میں وہ اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی۔

اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں عصر عباسی کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور عہد وعصر کو حاصل نہ ہوسکا۔اس فضلیت اور برتری کے کئی اسباب ہیں جن میں سے اس کا طویل ترین ہونا، مختلف تہذیب وتمدن کا ملاپ اور اس کے نتیجہ میں اسلامی تہذیب وتمدن کا پروان چڑھنا، عباسی خلفا کا اسلامی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھانے اور علوم وفنون کو فروغ دینے کے تئیں ذاتی طور پر دلچسپی لینا وغیرہ ہیں۔اس عہد میں اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت اپنی پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کچھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صدیوں تک صرف اسی تہذیب وتمدن وثقافت کا بول بالا رہا اور تاریخ انسانی کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں گویا اس کے آگے ماند پڑ گئی تھیں۔اسلامی تہذیب وتمدن کے گہرے اثرات مابعد کے ادوار پر مرتب ہوئے تھے کہ اس نے یوروپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے عباسی تمدن کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:''عباسیوں کے علمی کارناموں کی طرح ان کے تمدنی کارنامے بھی بہت ہیں۔ظاہری نفاست ولطافت اور حسن ودل آویزی کے اعتبار سے ان کا تمدن نہایت بلند تھا اور محاضرات کی مشہور ومعروف کتاب **ألف ليلة و ليلة** میں جو اس کی تصویریں نظر آتی ہیں ، ان کو اگرچہ تاریخی اعتبار واستناد کا درجہ حاصل نہیں ہے اور اس میں بہت سے افسانے اور خرافات بھی شامل ہیں لیکن ان سے قطع نظر خالص تمدنی اور معاشرتی مرقعے بڑی حد تک صحیح ہیں''۔

مولانا مرحوم نے سادہ عرب تہذیب وتمدن میں ہونے والی تبدیلیوں کے اسباب بھی بیان کیے ہیں جن کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ایک فطری اور سادگی پسند مذہب ہے جس کا دامن بیجا تمدنی تکلفات سے پاک ہے۔اسلامی تمدن اپنے اصلی رنگ روپ میں یعنی سادہ مگر پرکار شکل میں خلافت عہد راشدہ تک ہی برقرار رہ سکا کہ فتوحات کی کثرت اور مال ودولت کی فراوانی کے باوجود خلفائے راشدین کی زندگی اور ان کی طرز معاشرت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوسکی تھی اور وہ پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے اور زمین پر ہی سوجاتے تھے۔اسی طرح اس عہد کی عام معاشرت بھی سادگی پسند تھی کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں دوسری قوموں سے اختلاط کے اثرات ظاہر نہیں ہونے پائے تھے تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ فتوحات کی وسعت اور مال ودولت کی فراوانی کے اثرات عہد فاروقی سے ہی مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عمال کی اس حوالے سے باز پرس بھی کی تھی۔

عہد اموی میں جدید تہذیب وثقافت کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے تھے لیکن چونکہ ان میں عربی عصبیت پوری طرح موجود تھی اور وہ عربوں کی خصوصیات کے تحفظ کے لیے کوشاں بھی رہتے تھے لہذا بیرونی تمدن کا غلبہ نہ ہوسکا اور بعض معاشرتی تکلفات کو چھوڑ کر عربوں کا طرز معاشرت بڑی حد تک برقرار اور باقی رہا مگر تبدیلی وتغیر کا آغاز ہو چکا تھا۔

عہد اموی کے بعد جب بنو عباس نے زمام خلافت واقتدار کو سنبھالا تو عربی تہذیب کی سادگی کی جگہ ایران وروم کی چمک دمک والی دیدہ زیب تہذیب نے لے لی اور عباسی خلافت، مذہب کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں عجمی رنگ میں رنگ گئی جس کے بنیادی اسباب میں سے مسلمانوں میں مذہبی روح کا کمزور ہونا، عباسی خلافت کے قیام میں اہل عجم کا بنیادی کردار ادا کرنا، عباسی خلافت کے اہم عہدوں پر عجم کا فائز ہونا اور اہل عجم کی قدیم اور شاندار تہذیب سے متاثر ہونا تھا۔ان اسباب کی وجہ سے عجمی تمدن مکمل طور پر عربوں میں سرایت کر گیا، وہ جسمانی طور پر تو عرب ہی رہے لیکن ان کی روح عجمی ہو کر رہ گئی۔قرآنی اصول کے مطابق ظاہری طور پر ہر برے پہلو میں بھی کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو بھی پوشیدہ رہتا ہے لہذا یہاں بھی اس شر سے ایک خیر کا پہلو ایسا نکلا جس نے ایک زمانے کو ایک زمانے تک مبہوت و مسحور کر رکھا تھا یعنی جس طرح عرب عجمی تمدن سے متاثر ہوئے تھے اسی طرح عجمی تہذیب بھی عربی تہذیب وثقافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور دونوں کی آمیزش سے ایسا دلکش اور بوقلموں تمدن پیدا جو مسلمانوں کا معیاری تمدن قرار پایا جس کی بالا دستی صدیوں تک برقرار رہی اور اس کے سامنے تمام قدیم تہذیبیں اور ثقافتیں ماند پڑ گئیں۔

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب نے عصر عباسی کی اسلامی تہذیب وتمدن کے اثرات پر جامع تبصرہ کیا ہے کہ ''ان (عباسی خلفا) ہی کے سبب خالص اسلامی تمدن کو پروان چڑھنے کا موقعہ ملا۔ ہماری اسلامی شناخت، ایمانی تشخص اور ملی امتیاز کے قیام، وجود اور بقا اور تسلسل میں ان کا صدقہ آج بھی جاری ہے''۔

تمدن ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں کسی بھی قوم کے تمام پہلو سما جاتے ہیں۔ یہ لفظ اپنے اندر بہت وسعت اور گیرائی رکھتا ہے کہ اس میں حکومت وسیاست، تہذیب ومعاشرت، علوم وفنون، اجتماعی زندگی کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ درج ذیل سطور میں عہد عباسی کے تمدن کے کچھ اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

13.13.1 عہد عباسی کا فن تعمیر

کسی بھی قوم کے تمدن کا ایک بڑا مظہر وہ خوبصورت، پرشکوہ اور بلند وبالا مضبوط عمارتیں ہوتی ہیں جنھیں اس قوم کے باہمت وباذوق افراد نے تعمیر کروایا ہو۔ان عمارتوں میں جہاں ایک طرف اس قوم کی شوکت وعظمت پنہاں ہوتی ہے وہیں تو دوسری طرف وہ ان کے اعلی ونفیس ذوق جمال کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

عباسی تمدن کا سب سے دل آویز نمونہ بغداد وسامراء ودیگر شہروں کے محلات قرار دیے جاتے ہیں جنھیں مختلف خلفا وامرا جیسے منصور، ہارون رشید، متوکل، واثق اور یحییٰ برمکی وغیرہ نے زر کثیر صرف کر کے تعمیر کروایا تھا۔عہد عباسی میں تعمیر کیے جانے محلات میں ''قصر الذهب''، ''قصر الخلد''، ''قصر الرصافة''، '' قصر أم حبيب''، ''القصر الهاروني''، ''القصر الجعفري''، ''قصر التاج''، '' قصر دارا لشجرة''، ''قصر الفردوس''، ''قصر يحيىٰ '' جیسے محلات کے علاوہ بنو برامکہ اور آل بویہ کے محلات جیسے قصر دارلخلافة /القصر الحسنى وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں جو اپنی اپنی خوبصورتی کی خود ہی مثال تھے۔عہد عباسی کے محلات کی شان وشوکت اور آرائش وزیبائش کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امرا ووزرا کے محلات پر قصر خلافت کا دھوکہ ہوتا تھا۔ان محلات کی خوبصورتی ودیدہ زیبی اور حسن وجمال اور دیگر تعمیری خصوصیات کو پڑھ کر آج کا انسان بھی اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتا ہے۔

عہد عباسی میں فن تعمیر اپنے کمال وعروج کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔فن تعمیر کی ترقی کا اندازہ عہد عباسی کے محلات وباغات،سرکاری عمارتوں اوراس عہد میں بسائے جانے والے شہروں سے لگایا جاسکتا ہے۔پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے عہد عباسی کے فن تعمیر کی جن خصوصیات وامتیازات کا ذکر کیا ہے جن کا خلاصہ حسب ذیل سطور میں بیان کیا جارہا ہے:

۱-عمارتوں کا خوبصورت، وسیع وعریض اور کشادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا مضبوط و مستحکم ہونا۔یہ عمارتیں بڑے بڑے ہالوں اور کشادہ کمروں پر مشتمل ہوتی تھی جن میں انسانی زندگی کی اہم ضروریات جیسے ہوا، پانی اور روشنی وغیرہ کا مکمل انتظام ہوتا تھا۔

۲-عمارتوں میں باغ بنوانا اور کثرت سے سایہ دار درخت کا لگایا جانا۔

۳-عمارتوں پر محراب،گنبد،قبہ،برجیاں اور چھوٹے میناروں کا تعمیر کرنا۔

۴-عمارتوں کی تعمیر میں سنگ سرخ،سنگ سیاہ اور سنگ مرمر کا استعمال عام طور پر کیا جاتا تھا۔ان کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لیے قیمتی پتھروں کا بھی استعال کیا جاتا تھا۔

۵-عمارتوں کی دیواریں اور فصیلیں بہت چوڑی ہوتی تھیں کہ اس میں رہنے والے افراد موسم کی سختی سے محفوظ رہ سکیں اور دشمنوں کے لیے بھی وہ لقمۂ تر نہ ثابت ہوں۔

۶-عمارتوں میں استحکام اور خوبصورتی کا امتزاج پایا جانا۔

۷-سڑکوں کی تعمیر میں اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ سیدھی ہوں اور وہ زاویہ قائمہ پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوں یا ملتی ہوں۔

۸-شہر کے اردگرد خندق اور اس کے بعد فصیل کا موجود ہونا اور فصیل میں کم از کم چار سمت کے اعتبار سے چار دروازے ہونا۔

13.13.2 عہد عباسی میں بسائے جانے والے شہر

کسی بھی عہد کے تمدن کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ اس عہد میں کن کن شہروں کی تاسیس ہوئی تھی اور ان شہروں کا نظم ونسق کیسا تھا۔شہروں کی تاسیس کا آغاز خلافت راشدہ سے ہی ہوچکا تھا جس کا سلسلہ عہد عباسی میں بھی جاری رہا۔درج ذیل سطور میں عہد عباسی میں بسائے گئے شہروں کا مختصراً ذکر کیا جارہا ہے۔

13.13.2.1 عباسیہ

پہلے عباسی خلیفہ سفاح نے انبار کے کھنڈروں اور دریائے فرات کے کنارے پر ۱۳۴ھ/ ۷۵۲ء میں عباسیہ نامی شہر بسایا تھا اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔اس شہر میں خلیفہ، وزرا اور دیگر امرا واعیان حکومت کے محلات کے ساتھ ساتھ دیگر عمارتوں جیسے منڈی ومسجد وغیرہ کو تعمیر کیا گیا تھا۔ بازار بسائے گئے تھے اور پل وغیرہ بنائے گئے تھے۔اسی شہر کو **مدینة المنصور** بھی کہا جاتا ہے کہ بغداد کی تعمیر سے قبل انھوں نے بھی وہاں قیام فرمایا تھا اور کچھ عمارتیں تعمیر کروائیں تھیں۔

13.13.2.2 بغداد

عہد عباسی میں تعمیر شدہ بغداد کا نام پڑھنے یا سننے سے ہی ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ آج کی دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہر کا

تصور ہوتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ اس کے بارے میں مذکور ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بغداد جیسے ترقی یافتہ شہر کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔اس تصور کو فروغ دینے میں یقینی طور پر اس کی افسانوی و اساطیری حیثیت کا دخل بھی ہے۔تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ اور منظم طور پر بسایا ہوا شہر تھا جس کی مثال بعد کی صدیوں میں مشکل سے ملتی ہے۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ’’بغداد کی قسمت میں بابل،سلوقیہ اور مدائن کی جگہ لینا اور ان سب سے بازی لے جانا لکھا تھا‘‘۔

خلیفہ منصور نے اپنے دور خلافت میں ایک نیا دارالخلافہ بنانے و بسانے کا جب ارادہ کیا تو مختلف مقامات کا جائزہ لینے کے بعد ان میں سے موزوں ترین مقام ’’بغداد‘‘ نامی گاؤں کا انتخاب کیا گیا۔اس گاؤں کی ’’آب و ہوا عمدہ،زمین شاداب اور علاقہ خوبصورت تھا۔دریائے دجلہ قریب بہتا تھا لہذا پانی اور سبزہ کی فراوانی تھی‘‘۔گولائی کی شکل والا یہ شہر باقاعدہ ایک نقشہ اور مکمل منصوبہ بندی کے بعد دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر بسایا گیا تھا۔اس کے چاروں طرف مضبوط و مستحکم فصیل بنائی گئی تھی جس کے اردگرد ایک چوڑی خندق کھودی گئی تھی۔فصیل شہر میں چاروں سمت کے اعتبار سے چار دروازے بنائے گئے تھے۔ان تمام دروازوں کا فاصلہ،خلیفہ کے محل سے یکساں اور برابر تھا۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ’’اپنے بیرونی استحکامات اور اندرونی نقشے کے لحاظ سے یہ شہر ایک بڑا قلعہ معلوم ہوتا ہے‘‘۔

یہ شہر گولائی کی شکل میں بسایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا مرکزی علاقہ،اپنے مختلف حصوں سے یکساں فاصلہ پر تھا۔انتظامی امور کے پیش نظر شہر کو دو سڑکوں کے ذریعہ چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا جو وسط شہر میں ایک دوسرے سے جاملتی تھیں۔یہ سڑکیں نہروں کے کنارے کنارے بنائی گئی تھیں اور ان کی تعمیر کچھ اس انداز سے کی گئی تھی وہ آگے جا کر چاروں طرف سے قصر خلافت سے جاملتی تھیں۔

بغداد کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔وسطی حصہ میں خلیفہ کا محل ’’قصر الذهب‘‘،خاندان خلیفہ کے دیگر افراد کی رہائش گاہیں،جامع مسجد اور سرکاری عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔شہر کے دوسرے حصہ میں امرا و اعیان سلطنت کے محلات و دفاتر بنائے گئے تھے۔شہر کا تیسرا حصہ عام آبادی پر مشتمل تھا جبکہ چوتھے حصہ میں ہر قسم کے بازار پائے جاتے تھے۔بغداد کے ہر حصے میں آبادی کے حساب اور وہاں کی ضرورت کے مطابق مساجد تعمیر کی گئیں تھیں۔

عرب مؤرخین کے مطابق ایک بے مثل نقشہ کے اعتبار سے اس شہر کی تعمیر کا آغاز یکم جمادی الاولی ۱۴۵ھ/ ۲ راگست ۷۶۲ء ہوا اور اس کی تکمیل میں تقریباً پانچ سال کا عرصہ لگ گیا کہ ۱۴۹ھ/ ۷۶۶ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔اس دورانیہ میں روزآنہ ایک لاکھ مزدور،کاریگر اور انجینئر کام کرتے تھے۔اس شہر کی تعمیر پر آنے والی لاگت اور خرچے کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں ایک قول کے مطابق اس کی تعمیر پر ایک کروڑ اسی لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے تو دوسرے قول کے مطابق دس کروڑ درہم خرچ ہوئے تھے۔سرکاری دستاویز کے مطابق اس کی تعمیر پر چالیس لاکھ آٹھ سو تراسی درہم خرچ ہوئے تھے۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف یہ رقم قابل قبول نظر آتی ہے۔

خلیفہ منصور کے ہاتھوں بسائے گئے اس شہر نے بہت جلد ایک مقام و مرتبہ حاصل کر لیا جس میں ضروریات کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً بہت سی نمایاں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں جیسے مختلف شفاخانے قائم کیے گئے،حمام،مدارس اور مساجد تعمیر کی گئیں اور پل وغیرہ بنائے گئے۔پورے عہد عباسی میں دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اس شہر کو مرکزیت حاصل تھی لہذا چاروں طرف اصحاب علم و فضل اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے جن کی وجہ سے وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن کا سب سے بڑا گہوارہ بن گیا تھا جس کا فیض صدیوں جاری رہا۔اسی شہر میں **بيت الحكمة** موجود تھا جس

نے علوم وفنون کی ارتقا میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا۔اس شہر میں مختلف قسم کے اصحاب علم وفضل اور ماہرین صنعت وحرفت کی تعداد کا کچھ اندازہ خطیب بغدادی کی کتاب ''تاریخ بغداد'' سے لگایا جاسکتا ہے۔

بغداد اپنے حسن انتظام اور خوبصورتی کی وجہ سے ایک نمونہ ومثال بن گیا تھاحتی کہ دوسرے ملکوں کے فرمانروا۔جیسے قیصر روم وغیرہ۔ اس کا نقشہ بنوانے اور اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

بغداد کے حسن جمال کی تعریف میں شعرا رطب اللسان رہے ہیں اور اسے جنت ارضی قرار دیتے ہیں۔ان کا یہ قول مبالغہ پر مبنی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عالیشان وبلند وبالا محلات،خوبصورت باغات،سرسبز دیہات،شہر کا حسن انتظام ہر ایک کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔اس عہد میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ بغداد کے علاوہ ساری دنیا دیہات ہے اور جس نے بغداد نہیں دیکھا اس نے دنیا نہیں دیکھی۔غالبا اسی مقولے سے متاثر ہو کر لاہور کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔

یہ شہر اپنی تعمیر کے بعد سے لے کر خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک اس کا دارالخلافہ رہا اور صدیوں تک اسلامی ثقافت وتہذیب کا سرچشمہ بنا رہا تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس پر بھی دہلی کی طرح ادبار وزوال کے سائے بار بار پڑتے رہے ہیں اور وہ بار بار ابھرتا ڈوبتا رہا ہے لیکن '' کچھ بات ہے کہ ہستی مٹی نہیں ہماری'' کے مصداق وہ آج بھی عراق کی راجدھانی کی شکل میں موجود ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے بغداد کی آبادی میں وسعت اور دیگر مسائل کو کے پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے اردگرد کئی شہر آباد کیے گئے تھے اسی لیے غالبا مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اسے ایک کی بجائے کئی شہروں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔گویا دوسرے لفظوں میں بغداد کو ''أم البلاد''(مختلف شہروں کے وجود میں آنے کا سبب) بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔درج ذیل سطور میں ان شہروں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو بغداد کے اردگرد بنائے اور بسائے گئے تھے۔

13.13.2.3 کرخ

اس شہر کو بھی خلیفہ منصور نے ۱۵۷ھ/ ۷۷۴ء میں بسایا تھا۔اس شہر کو بسانے کا بنیادی مقصد بغداد میں موجود بازاروں اور منڈیوں کو وہاں منتقل کرنا تھا۔یہ پہلے بغداد کا ایک محلہ یا قصبہ تھا لیکن بغداد کی بڑھتی ہوئی آبادی اور تجارتی مرکز بن جانے کی وجہ سے بغداد کی وہاں تاجروں کی ہر وقت آمد ورفت جاری رہتی تھی۔یہ عمومی چھل پہل حفاظتی اعتبار سے مناسب نہیں تھی لہذا خلیفہ منصور نے بغداد میں موجود بازاروں اور منڈیوں کو شہر سے باہر ایک نیا شہر بسا کر وہاں منتقل کرنے کا احکامات نافذ فرمائے۔

اس شہر کے تمام بازار بغداد کے بازار کے طرز پر بنائے گئے تھے کہ ہر جنس کا بازار الگ الگ بنایا گیا تھا۔بازار کے ساتھ ساتھ مساجد،سرکاری عمارتیں اور سڑکیں وغیرہ کی بھی تعمیر کی گئیں تھیں۔کرخ کا ذکر بار بار بغداد اور عباسی خلافت کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔یہ شہر شیعوں کی زیادہ آبادی والا شہر تھا اور بغداد میں سنیوں کے خلاف بپا ہونے والی شورشوں میں وہاں کے باشندوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔یہ شہر بھی کئی بار اجڑا اور بسا ہے اور اس کے بطن گیتی سے متعدد علما وفضلا نے جنم لیا ہے۔مزید یہ کہ چوتھی صدی کے نصف اول کے کچھ عباسی خلفا جیسے مقتدر،قاہر اور راضی کے زمانے کے کچھ سکے ملتے ہیں جو کرخ کے دارالضرب میں ڈھالے گئے تھے۔اسی طرح یہاں کی شراب بھی بہت اچھی

اور عمدہ مانی جاتی تھی جن کا ذکر ابونواس اور ابوالعتاہیہ کے اشعار میں ملتا ہے۔

13.13.2.4 مہدیہ/معسکر المہدی/رصافہ

اس شہر کو بھی خلیفہ منصور نے ہی تعمیر کرایا تھا۔اس شہر کی تعمیر کا آغاز ۱۵۱ھ/ ۷۶۸ء میں ہوا تھا اور تکمیل ۱۵۷ھ/ ۷۷۳ء میں ہوئی تھی۔ یہ شہر انھوں نے اپنے بیٹے مہدی کے نام پر دجلہ کے دوسرے کنارے پر بسایا تھا۔اس شہر کو بسانے کی بنیادی وجہ خلیفہ وقت کی یہ حکمت تھی کی جنگی مصالح کے پیش نظر فوج کو منقسم رکھا جائے ۔اس شہر میں ولی عہد کی عمارت کے علاوہ سرکاری عمارتیں،دیگر ضروری عمارتیں، فوجی بیرکیں اور مسجدیں بھی بنائی گئی تھیں ۔ یہ شہر بغداد سے چھوٹا تھا تاہم اس میں شہر کے تمام لوازمات جیسے باغات ،نہریں وغیرہ پائے جاتے تھے حتی کہ اس کے اردگرد فصیل وشہر پناہ بھی تعمیر کی گئی تھی اور اس کے چاروں طرف خندق کھودی گئی تھی۔تاریخ کی کتابوں اس شہر کا ذکر ''معسکر المهدي'' اور رصافہ کے نام سے بھی ملتا ہے۔موخر الذکر کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہارون رشید نے وہاں ''رصافہ'' نام کا ایک محل بنایا تھا۔اس شہر میں کثرت سے محلات بنائے گئے تھے۔ ہارون رشید کے زمانے میں یہ ایک عظیم شہر بن گیا تھا۔

13.13.2.5 سامراء

بغداد کے شمال میں تیس میل کے فاصلہ پر موجود اس شہر کو خلیفہ معتصم نے ۲۲۳ھ/ ۸۳۸ء میں دریائے دجلہ کے مشرقی کنارہ پر بسایا تھا لیکن اس کا مکمل عروج عباسی خلافت کے دور اول کے آخری خلیفہ متوکل علی اللہ کے عہد میں ہوا تھا اور اس عہد کے معا بعد اس شہر کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا۔

سامراء کے اصل نام کے حوالہ سے اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے کئی اقوال نقل کیے ہیں جیسے ''سام-راہ''، ''سائی-امُرا''،''سا-مُرا''۔مؤخر الذکر دونوں لفاظ کے معنی ''خراج ادا کرنے کی جگہ'' ہے۔عباسی خلفا کے سکوں پر ''سامراء''(سَرَّ من رأی) ثبت ہے۔ بہر اصل نام جو بھی ہو وہ عوامی زبان میں بگڑتے بگڑتے ''سامراء'' کے نام سے مشہور ومعروف ہو گیا۔اس شہر کو بسانے کا بنیادی سبب ترک افواج کی کثرت اور کے بیجا رویوں سے جب عوام کو بہت زیادہ شکایتیں ہونے لگیں تو انھوں نے بغداد کے طرز پر ایک نیا شہر بسانے اور وہاں ترک افواج کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔

سامراء کے وسط میں خلیفہ اور ان کے خاندان کے افراد کے لیے محلات بنائے گئے تھے۔ان سے متصل امرا واعیان حکومت کے محلات اور سرکاری دفاتر تعمیر کیے گئے تھے ۔ ہر محلہ کی آبادی الگ الگ افراد پر مشتمل تھی۔ اجناس کے اعتبار سے بازار بنائے گئے تھے۔آبادی کے لحاظ سے حمام اور مساجد تعمیر کی گئی تھیں ۔ان کے علاوہ باغات ،نہریں وغیرہ بھی اس شہر میں موجود تھے جن سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا تھا۔

اس شہر کی تعمیر کا بنیادی سبب چونکہ ترک افواج کے لیے اقامت گاہیں بنانا تھا لہذا ان کی اقامت گاہیں شہر سے بالکل الگ تعمیر کی گئیں تھیں اور انھیں شہر والوں سے یا شہر والوں کو ان سے ملنے جلنے پر پابندی تھی۔

اس شہر کی اہمیت اور قدر قیمت کا اندازہ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۲۱ تا ۲۷۶ھ/ ۸۳۶ تا ۸۸۹ء کے دوران سات عباسی خلفا نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا اور اپنے اپنے زمانے میں اس شہر میں نمایاں تبدیلیاں کرتے

ہوئے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے اور وہاں نئے نئے محلات بنائے تھے۔ تاہم ان کا یہ بیان محل نظر ہے کہ مذکورہ دورانیہ کا اعتبار سات خلیفہ کی تعداد خلیفہ مہتدی باللہ پر ختم ہوجاتی ہے ۔خلیفہ مہتدی باللہ کی خلافت کا دورانیہ صرف ایک سال -۲۵۵ تا۲۵۶ھ/ ۸۶۹ تا ۸۷۰ء- ہے۔ ان کے بعد ہونے والے خلیفہ معتمد علی اللہ کا دور خلافت ۲۵۶ تا۲۷۹ھ/ ۸۷۰ تا ۸۹۳ء ہے لہذا اس بات کا امکان ہے کہ ان سے تعداد اور دورانیہ نقل کرنے میں چوک ہوگئی ہو۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آگے چل مقالہ نگار نے خود ہی وہاں مقیم ہونے آخری خلیفہ کا نام معتمد علی اللہ ذکر کیا ہے۔

یہ شہر عباسی عہد میں پروان چڑھنے والی تہذیب وتمدن کی ایک اہم ونمایاں مثال ہے بقول مقالہ نگار اردودائرۃ المعارف الاسلامیہ'زمانہ حال میں کی جانے والی کھدائی سے اس کی تعمیر وتزئین کے اہم طرز وطریق سے متعلق خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اس سے مسلمانوں کی ثقافت کی وہ دل آویز شکل سامنے آتی ہے جو اپنی چمک سے اس وقت کی دنیا کو خیرہ کر رہی تھی۔ سامراء ایک ایسا مرکز تھا جہاں دنیا بھر سے ماہرین فن جمع ہوئے تھے اور انھوں نے بغیر کسی منافست ومسابقت کے اپنے اپنے فن سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا تھا۔ سامراء ایک ایسی کٹھالی ہے جس میں یونانی، شامی قبطی اور ایرانی ہندی فن ڈالے گئے تھے اور اس اختلاط سے ایک نیا فن پیدا ہوا تھا جس میں کسی کو کسی پر غلبہ پانے کی کوشش کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا ہے'۔

13.14 اکتسابی نتائج

اسلامی تاریخ میں عباسی خلافت وحکومت کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور اسلامی دور کو حاصل نہ ہوسکا۔ اس دور کو مذہبی، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے اسلامی ادوار کا سب سے زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ سیاسی طور پر اموی خلافت کے خاتمے کے ساتھ عباسی خلافت وحکومت کا آغاز ہوتا ہے ۔عباسی خلافت وحکومت کے قیام کا پہلا اور بنیادی پتھر 'عباسی تحریک' کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز محمد بن علیؒ (وفات ۱۲۵ھ/ ۷۴۳ء) نے حمیمہ سے کیا تھا جس نے مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے آخر کار اموی خلافت کا تختہ پلٹ دیا اور ۱۳۲ھ/ ۷۴۹ء میں عراق کے اہم ترین شہر کوفہ پر قبضہ کر کے وہاں کی جامع مسجد میں ابوالعباس عبداللہ بن محمد کی خلافت کا اعلان کردیا گیا۔

عباسی خلافت وحکومت کا دورانیہ پانچ سو سال سے زائد (۱۳۲-۶۵۶ھ/ ۷۵۰-۱۲۵۸ء) عرصہ پر محیط ہے۔اس طویل دورانیے میں مجموعی طور ۴۶ رخلفا مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تھے لیکن ان میں صرف دس خلفا نے صحیح معنوں میں اقتدار اعلی سنبھالا تھا اور بعد کے خلفا ترکوں، آل بویہ اور سلجوقیوں کے اشارے پر سرتسلیم خم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عباسی خلافت وحکومت کی اصلی شان وشوکت صرف ابتدائی سو سال تک ہی یعنی خلیفہ متوکل (وفات: ۲۴۶ھ/ ۸۶۱ء) کے عہد تک ہی برقرار رہ سکی تھی ۔ بعد کے ادوار میں عباسی خلفا کی حیثیت دن بدن کم ہوتی چلی گئی تھی حتی کہ وہ صرف نام کے خلفا ہی رہ گئے اور اصل اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں رہا اور آخر کار ایک مجبور ولاچار خلافت وحکومت کی مانند اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

دیگر ادوار اور عہد عباسی کے انتظامیہ کے مابین پایا جانے والا سب سے نمایاں فرق یہ پیدا ہوا تھا اس عہد کے تمام اہم مناصب پر عربوں کی بجائے ایرانیوں اور ترکوں کو سونپ دیے گئے تھے جس نے عرب طبقات میں ایک خاص قسم کی بے چینی پیدا کردی ۔ اس بے چینی کو عباسی خلافت وحکومت کے زوال کا ایک اہم سبب مانا جاتا ہے۔

عہدِعباسی میں انتظامیہ کا اعلی سربراہ خلیفۂ وقت ہوتا تھا جو ہرقسم کے فیصلے کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ انتظامی امور کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے عباسی انتظامیہ کو مرکزی،صوبائی اور علاقائی انتظامیہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔مرکزی انتظامیہ خلیفۂ وقت کی نگرانی میں اپنے امورانجام دیتا تھا،جب کہ صوبائی وعلاقائی انتظامیہ کی باگ ڈور گورنرس اوران کے ذریعہ منتخب کیے گئے افراد کے ہاتھ میں ہوتی تھی تاہم وہ خلیفہ وقت کے سامنے اپنے تمام فیصلوں اور امور کے جوابدہ ہوتے تھے۔

عہدعباسی میں ،عہد اموی سے بطور وراثت منتقل ہونے والے اہم شعبوں میں فوج وپولیس،ٹیکس،ڈاک کے علاوہ **دیوان الرسائل** (خطوط وفرامین کا محکمہ) اور **دیوان الخاتم** (کاغذات پرمہر لگانے ،انھیں سربمہر کرنے کا محکمہ) تھے تاہم عہدعباسی میں ان میں بہت تبدیلیاں کی گئیں تھیں اور انھیں زیادہ ترقی یافتہ بنایا گیا تھا۔

عہدعباسی میں **دیوان الأزمة**،**دیوان النفقات**، **دیوان المظالم**،**دیوان الصوافی**،**دیوان العرض**،**دیوان التوقیع**اور**دیوان السر** جیسے محکموں کی اساس وبنیاد پڑی تھی ۔ان کے علاوہ عدلیہ اور مالیہ کے محکمے تھے۔یہ تمام محکمے منظم اصول وضوابط کی بنیادوں پر اپنے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔

عہدعباسی میں تجارتی سرگرمیاں پورے عروج پر پہنچی ہوئی تھیں جنھیں مقامی،ملکی اور غیرملکی تجارت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ملکی وغیرملکی تجارت کے اہم مراکز میں بغداد،کرخ،سامراء،بصرہ،کوفہ، ابلہ، دمشق، حلب، انطاکیہ،حماۃ،موصل،مکہ،مدینہ،طائف،یمن،بحرین اور صنعاء کے علاوہ مصر وافریقہ کے مختلف شہر تھے۔عہدعباسی کی تجارت بری اور بحری دونوں راستوں سے کی جاتی تھی اور روم،ہندوستان،چین اور اندلس جیسے ممالک سے مختلف قسم کے سامان تجارت لائے اورمنگوائے جاتے تھے اور یہاں کے بازار میں فروخت کیے جاتے تھے۔

عہدعباسی میں زراعت کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔اس عہد کا زراعتی نظام چار حصوں میں منقسم تھا۔ایک وہ زمینیں تھیں جن پر کاشت کار خود ہی کھیتی باڑی کرتے تھے اوراس کے سارے منافع کے مالک ہوتے تھے۔زمین کی دوسری قسم وہ تھی جن کے مالک خود کاشت نہ کر کے اسے بٹائی پر چھوٹے کاشت کاروں کے حوالہ کر دیتے تھے۔زمین کی تیسری قسم ''خالصہ اراضی'' کہلاتی ہے جو خلفا کے قبضہ میں ہوتی تھیں لیکن اس کے حقیقی مالک مسلمان ہوتے تھے۔چوتھی قسم کے تحت بنجر زمینیں آتی ہیں کہ جوانھیں آباد کرتا وہی ان کا مالک قرار پاتا تھا۔عباسی خلفا کی ذاتی دلچسپیوں اور بہترین طرز عمل کی وجہ سے زراعتی نظام بہت اچھا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اس عہد کا مالیہ کافی مضبوط ہوگیا تھا۔

عہدعباسی میں گیہوں،چاول،جو،کھجور،دال ،سرسوں،کپاس، گنا اور مختلف قسم کی سبزیوں،انگور اور دیگر پھلوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بھی کاشت کی جاتی تھی۔

عہدعباسی میں صنعت وحرفت کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔عہدعباسی میں پروان چڑھنے والی صنعتوں میں کپڑے کی صنعت کو کافی ترقی اور عروج حاصل ہوا تھا کہ مختلف قسم کے اونی،سوتی اور ریشمی کپڑے تیار جاتے تھے۔ساتھ ہی ساتھ قالین ،خیمے اور پردے وغیرہ بھی تیار کیے جاتے تھے۔اسی طرح مختلف دھاتوں سے برتن سازی،خاص طور سے شیشے سے برتن بنانے کی صنعت کافی ترقی کر لی تھی۔ برتن سازی کے ساتھ زخرف یعنی برتنوں پر گلکاری اور مختلف قسم کے نقش ونگار بنانے کا فن بھی پروان چڑھا تھا۔

عہدعباسی میں پروان چڑھنے والی دیگر صنعتوں میں لکڑی اور لوہے، زرگری وزیورسازی،روغن گری،عطرسازی،صابن سازی،پھلوں

کی صنعت اور چمڑے کی صنعت نے بھی کافی ترقی کر لی تھی۔

عہد عباسی میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی آمیزش نے قدیم نظام تعلیم میں کافی تبدیلیاں پیدا کردیں تھیں جو تین مرحلوں-ابتدائی،ثانوی اور اعلی تعلیم-میں منقسم تھا۔

عہد عباسی میں اعلی تعلیم کے بڑے علمی مراکز میں ''بیت الحکمۃ'' کا شمار ہوتا ہے۔خاص طور پر خلیفہ مامون کے زمانے میں اس مرکز کو سائنسی اور فلسفیانہ علوم وفنون کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

عہد عباسی کے چوتھے دور (۴۴۷ تا ۶۵۶ھ/ ۱۰۵۵ تا ۱۲۵۸ء) کو اس کے دیگر ادوار کے مقابلہ میں اس دور میں علم وفن کے فروغ کے لیے زیادہ سنجیدہ کوششیں کی گئی تھیں اور مختلف مقامات بڑے بڑے علمی مراکز قائم کیے گئے تھے۔اس دور کی خاص بات یہ کہ اس دور میں پہلی سرکاری یونیورسٹی ''مدرسہ نظامیہ'' کا قیام نظام الملک طوسی کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔یہ علمی مرکز سقوط بغداد کے بعد بھی باقی رہا اور صدیوں تک علم وفضل کے جویان کی تشنگی دور کرتا رہا۔اپنے آخری دور میں یہ مرکز ''مدرسہ مستنصریہ'' میں مدغم ہوگیا تھا۔

عہد عباسی کی دوسری بڑی یونیورسٹی کا قیام عہد عباسی کے بالکل آخر دور میں ہوا تھا۔اس یونیورسٹی کو خلیفہ مستنصر نے ۱۲۳۴ء میں قائم کیا تھا جو ان کے نام کی مناسبت سے ''مدرسہ مستنصریہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔یہ عظیم مرکز چودہویں صدی تک برقرار رہنے کے بعد زمانے کی دست وبرد کا شکار ہوگیا۔

عہد عباسی کا معاشرہ بنیادی طور پر دو اکائیوں-مسلم اور غیر مسلم-پر مشتمل تھا جسے مسلم سماج (عرب وموالی)،غیر مسلم سماج (یہود یا ور عیسائی وغیر)،نسلی یا علاقائی سماج (ایرانی اور ترک وغیرہ) اور اقتصادی سماج (اعلی،اوسط اور ادنی طبقہ) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

دینی اعتبار سے عہد عباسی کا معاشرہ صحابۂ کرام اور اکثر تابعین کے فیوض وبرکات سے بالکل ہی تہی دامن ہو چکا تھا۔اس عہد کا صرف ابتدائی حصہ ہی تبع تابعین کے وجود با سعادت وبرکات سے مستفیض ہوسکا تھا۔ان کے بعد کا عباسی سماج ومعاشرہ عام مسلم سماج ومعاشرہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔

دنیوی لحاظ سے بھی اس عہد میں عرب طبقات کی اکثریت کی اپنے اہم وبلند بالا مقام ومرتبے سے محرومی نے معاشرتی حالات میں کافی ابتری اور افراتفری پیدا کردی تھی اور ان کا سیاسی وسماجی مقام ومرتبہ دھیرے دھیرے گرتا چلا گیا اور ان کی اقتصادی حالات بھی بگڑتے چلے گئے تھے۔اس عہد کے معاشرے وسماج کو ایرانی وترکی عناصر کی برتری والا معاشرہ قرار دیا جاتا ہے جس کے رہن سہن،رسوم ورواج اور طرز معاشرت پر عربوں کی چھاپ کی بجائے ایرانی وترکی رنگ وڈھنگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

عہد عباسی کا سماج اقتصادی لحاظ سے اعلی،متوسط اور ادنی طبقات پر مشتمل تھا۔ان طبقات کا رہن سہن،بود باش اور کھانے پینے کا معیار ان کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا آئینہ تھا کہ سماج کا ہر طبقہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے اپنی زندگی گزارتا تھا۔

عہد عباسی میں پائے جانے والے اہم اسلامی فرقوں میں شیعہ،خوارج،مرجئہ اور معتزلہ تھے۔دیگر فرقوں میں قدریہ،جبریہ وغیرہ بھی پائے جاتے تھے۔شیعہ اور خوارج کا ظہور سیاسی طور پر ہوا تھا لیکن بعد میں انھوں نے دینی فرقوں کا روپ دھار لیا تھا۔ان کے مقابلے میں مرجئہ اور معتزلہ خالص دینی وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئے تھے۔ان چاروں فرقوں کے اثرات عہد عباسی کی حکومت وسماج پر مرتب ہوئے تھے۔

عصر عباسی اس لحاظ سے بھی ممتاز قرار دیا جاتا ہے کہ اس عہد میں علمی سرگرمیاں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔عصر عباسی کی علمی تحریک کا سب سے بڑی خصوصیت یہ قرار دی جاتی ہے کہ اس میں علما وفضلا کو ہر قسم کی آزادی تھی لہذا وہ سب اپنے اپنے مذہب اور عقیدے پر عمل کرتے ہوئے علوم وفنون کو فروغ دینے میں مصروف عمل رہا کرتے تھے۔اس آزادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف علوم وفنون نے اپنے ارتقائی مراحل کو بہت تیزی سے طے کرلیا اور اپنے اوج کمال کو جا پہنچے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے علوم وفنون کو اسلامی علوم وفنون (جیسے قرآنی علوم،علوم حدیث وفقہ وغیرہ)،سائنسی علوم وفنون (جیسے کیمیا،طبیعیات اور طب وغیرہ) سماجی علوم (جیسے تاریخ وجغرافیہ،فلسفہ ومنطق وغیرہ) اور ادبی علوم وفنون(جیسے نثر نگاری،شاعری، بلاغت وغیرہ) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام علوم فنون کے مختلف موضوعات پر اس عہد کے علما وفضلا نے گرانقدر تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا ہے جن کی فنی عظمت اور علمی معیار کا اعتراف آج بھی کیا جاتا ہے۔ان کے مقابلے میں ادبا اور شعرا نے لازوال نمونے چھوڑے ہیں جنھوں نے عربی شاعری ونثر کے دامن کو مزید وسیع کردیا تھا۔

عہد عباسی کی سب سے خاص بات یہ کہ اس عہد میں سائنسی مزاج میں بہت زیادہ ترقی ہوئی تھی اور علمائے عہد عباسی نے ہر موضوع پر غور وفکر کر کے اہم ترین کتب مرتب کیں۔اس عہد میں سائنسی علوم وفنون نے نمایاں طور پر ارتقائی مراحل طے کیے تھے جس کے گہرے اور دور رس اثرات بعد کی صدیوں پر مرتب ہوئے تھے۔اس عہد کی سائنسی ترقیوں کو ہی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں علوم وفنون کے ارتقائی عمل میں تحریک ترجمہ نے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی کردار ادا کیا تھا۔اسی تحریک کے نتیجے میں مختلف علوم وفنون پروان چڑھے تھے اور عرب علما وفضلا دیگر ممالک کے علمی وادبی سرمایہ سے واقف ہوسکے تھے۔انھوں نے ترجمہ شدہ کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف علوم وفنون میں نت نئے تجربے کیے اور انھیں کامیابی سے ہمکنار بھی کیا۔تحریک ترجمہ کی وجہ سے ایک ایسا علمی ماحول پروان چڑھا تھا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔

تحریک ترجمہ کا ایک نمایاں اثر عربی زبان پر یہ مرتب ہوا تھا کہ اس تحریک نے اس کی بنیادی ماہیت وپہچان ہی بدل کر رکھ دی تھی کہ عہد عباسی سے قبل اس کی پہچان وشناخت صرف ادبی زبان ہونے کی تھی اور اس کا شمار علمی زبانوں میں نہیں ہوتا تھا۔تحریک ترجمہ کے نتیجہ میں علمی مصطلحات اور فلسفیانہ تعبیرات کی وجہ سے عربی زبان کا دامن کافی وسیع اور کشادہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اس کی محدود شناخت ختم ہوگئی تھی اور اس کا شمار بھی علمی زبانوں میں ہونے لگا تھا۔

عربی نثر نگاری کا جتنا فروغ عصر عباسی میں ہوا اتنا فروغ عصر جدید کو چھوڑ کر کسی اور عہد میں نہ ہوسکا۔اس عہد میں عربی نثر نگاری اپنے سب سے اہم اور طاقت ور دور میں داخل ہوتی ہے کہ اس کے موضوعات اور مضامین کا دائرہ کافی وسیع ہوجاتا ہے اور اس کے جلو میں نت نئی خالص ادبی اصناف کا ظہور ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس عہد کی نثر نگاری اوج کمال کو پہنچ جاتی ہے۔اس کی بنیادی وجوہات میں مختلف علوم وفنون کا ارتقا،مختلف اقوام وملل اور تہذیب وتمدن کا آپس میں ملاپ وغیرہ شامل ہیں۔اس صورت حال میں تحریک ترجمہ نے ''سونے پہ سہاگہ'' کا کام کیا اور اہل علم وفن نے اپنے افکار وخیالات ونظریات کو پیش کرنے کے لیے نظم کی بجائے نثر کا سہارا لیا اور ادبی،سماجی،سیاسی،دینی اور

سائنسی علوم وفنون پر مشتمل گرانقدر تصانیف بطور یادگار چھوڑیں ہیں۔ان کتب نے جہاں ایک طرف عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہیں عربی زبان کے دامن کو بہت زیادہ وسیع اور اس قابل بنا دیا کہ وہ کسی بھی قسم کے موضوع کا احاطہ کر سکے۔

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گونا گوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد و ممتاز نظر آتی ہے۔عہد عباسی میں شاعری کے فروغ پانے کا ایک اہم و بنیادی سبب اس کا کسب معاش، عزت وشہرت اور مال ودولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن جانا ہے کہ سرکاری سرپرستی کی وجہ سے اس عہد کے شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلے میں جتنا زیادہ بڑا اور وسیع میدان اس عہد میں ملا وہ کسی اور دور میں میسر نہیں آ سکا تھا۔

عہد عباسی کی شاعری کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسے فروغ دینے میں خالص عرب افراد کے شانہ بشانہ اہل عجم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد عباسی کی شاعری اہل عجم کی ہی مرہون منت ہے کہ اس عہد کے نمایاں ترین شعرا کا تعلق دیار عجم سے تھا جنھوں نے عربی شاعری کے طرز و اسلوب، مضامین وموضوعات، معانی وخیالات اور اوزان وبحور وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کرتے ہوئے عربی شاعری کو ایک نئے رنگ وآہنگ سے روشناس کرایا تھا۔

عباسی عہد میں عربی شاعری میں نمایاں ترین تبدیلیاں ہوئیں تھیں کہ وہ صحرا و بیابان سے نکل باغات اور محلات کے اردگرد گھومنے لگی تھی اور نت نئے موضوعات پر شعرا نے طبع آزمائی کرنی شروع کردی تھی۔فلسفیانہ افکار وآرا کے نمایاں اثرات اس عہد کی شاعری پر مرتب ہوئے تھے۔دیگر ادوار کے مقابلے میں اس عہد کی شاعری اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں قدما کے طرز اسلوب وبیان سے صرف نظر کرتے ہوئے شعرا نے ایک نیا طرز واسلوب اختیار کیا تھا۔وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ وڈھنگ سے کرتے ہیں۔قدیم اصناف سخن -جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ- کے دائرۂ کار میں وسعت کے ساتھ ساتھ چند جدید موضوعات شاعری -غزل غلمان، زہدیات، طردیات، خمریات وغیرہ- منظر عام پر آئے تھے۔

عصر عباسی کی شاعری میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تعلق صرف قصیدہ کی شکل اور مطلع کی تبدیلی سے نہیں تھا بلکہ بحور وقوافی سے بھی تھا کہ شعرا نے ان میں تبدیلی کرتے ہوئے شعر کی موسیقیت میں اضافہ کر دیا تھا۔مزید یہ کہ انھوں معانی میں جدت پیدا کی تھی اور الفاظ اور تراکیب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں تھیں۔

لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے اس عہد کی شاعری میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں تھیں جیسے نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کم کیا جانے لگا، بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کو بتدریج کم کیا گیا اور عجمی الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔شاعری کے اسلوب بیان میں نفاست اور باریکی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحت کلام کا خیال رکھتے ہوئے صنعت 'بدائع' اور اس کی مختلف انواع کو کثرت سے برتا گیا تھا۔چھوٹی چھوٹی بحروں کو بکثرت استعمال کیا گیا اور کچھ نئے اوزان وبحور جیسے مستطیل وممتد کا اضافہ ہوا۔شاعری کی اقسام میں جہاں ایک طرف زہدیات، طردیات اور خمریات کا اضافہ ہوا تو دوسری طرف قوافی میں مسمط اور مزدوج کو فروغ ہوا۔

عہد عباسی کی شاعری اپنے مقاصد، موضوعات، مضامین، خیالات، لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے ماقبل کی عربی شاعری سے جداگانہ نظر آتی ہے کہ اس عہد کے تقاضوں کے مطابق اور اس وقت کے ماحول وحالات سے متاثر ہوکر شعرا نے اپنی شاعری کے محور نگاہ کو تبدیل

کرلیا تھا اوران کی شاعری صحرا کی بے پایاں وسعت، فطری مناظر،کھنڈرات،مٹی کے مکانات اورخیموں کی تصویر کشی کرنے کے بجائے شہری زندگی کی رونق اور لوازمات، محلات و باغات، لہو ولعب، طرب ونشاط اور دوستوں کے ساتھ راگ ورنگ کی محفلوں کی عکاسی کرنے لگی تھی۔اس عہد کی شاعری قدیم وجدید کا ایک ایسا خوبصورت وحسین سنگم پیش کرتی ہے جس کا نمونہ کسی اور دور میں نہیں ملتا ہے۔

عباسی عہد میں اسلامی تہذیب وتمدن اپنی پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کچھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صدیوں تک صرف اسی کا بول بالا رہا اور تاریخ انسانی کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں گویا اس کے ماند پڑ گئی تھیں ۔اسلامی تہذیب وتمدن کے گہرے اثرات مابعد کے ادوار پر مرتب ہوئے تھے کہ اس نے یوروپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

کسی بھی قوم کے تمدن کا ایک بڑا مظہر وہ خوبصورت ، پرشکوہ اور بلند وبالا مضبوط عمارتیں ہوتی ہیں جنھیں اس قوم کے باہمت و باذوق افراد نے تعمیر کروایا ہو۔ان عمارتوں میں جہاں ایک طرف اس قوم کی شوکت وعظمت پنہاں ہوتی ہے وہیں دوسری طرف وہ ان کے اعلی ونفیس ذوق جمال کا منھ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

عباسی تمدن کا سب سے دل آویز نمونہ بغداد وسامراء ودیگر شہروں کے محلات قرار دیے جاتے ہیں جنھیں مختلف خلفا وامرا جیسے منصور، ہارون رشید،متوکل، واثق اور یحییٰ برمکی وغیرہ نے زر کثیر صرف کر کے تعمیر کروایا تھا۔عہد عباسی کے محلات کی شان وشوکت اور آرائش وزیبائش کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امرا ووزرا کے محلات پر قصر خلافت کا دھوکہ ہوتا تھا۔ان محلات کی خوبصورتی ودیدہ زیبی اور حسن وجمال اور دیگر تعمیری خصوصیات کو پڑھ کر آج کا انسان بھی اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتا ہے۔

عہد عباسی میں فن تعمیر اپنے کمال وعروج کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔فن تعمیر کی ترقی کا اندازہ عہد عباسی کے محلات وباغات،سرکاری عمارتوں اور اس عہد میں بسائے جانے والے شہروں سے لگایا جاسکتا ہے۔اس عہد کے تمدن کی جھلک عباسی باغات میں بھی نظر آتی جو اپنے حسن ترتیب اور نظم ونسق کی بنا پر آج کے جدید ترین پارکوں کے مدمقابل قرار دیے جاسکتے ہیں۔

کسی بھی عہد کے تمدن کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ اس عہد میں کن کن شہروں کی تاسیس ہوئی تھی اور ان شہروں کا نظم ونسق کیسا تھا۔اس عہد میں بسائے جانے والے شہروں میں عباسیہ، بغداد، کرخ، سامرا،مہدیہ یا رصافہ جیسے ترقی یافتہ شہر شامل ہیں۔عہد عباسی میں بسائے جانے شہروں میں سے بغداد نے ایک افسانوی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ اس کا نام پڑھنے یا سننے سے ہی ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ آج کی دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہر کا تصور ہوتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ اس کے بارے میں مذکور ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ اور منظم طور پر بسایا ہوا شہر تھا جس کی مثال بعد کی صدیوں میں مشکل سے ملتی ہے۔بغداد اپنے حسن انتظام اور خوبصورتی کی وجہ سے ایک نمونہ ومثال بن گیا تھا حتی کہ دوسرے ملکوں کے فرمانروا- جیسے قیصر روم وغیرہ -اس کا نقشہ بنوانے اور اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

عہد عباسی کے تمدن کی جھلک اس عہد کے کھانے پینے،طرز رہائش، عام مکانات وباغات کی تعمیر،صنعت وحرفت، زراعت اور تجارت میں بھی نظر آتی ہے۔

13.15 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

۱-عباسی تحریک پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
۲-مصر میں عباسی خلافت کے احیا کے پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے اس پر ایک نوٹ لکھیے۔
۳-عہد عباسی کے انتظامیہ پر سیر حاصل بحث کیجیے۔
۴-عہد عباسی کے اہم اسلامی فرقوں کا جائزہ لیں۔
۴-تحریک ترجمہ اور اس کے اثرات پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
۵-عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے اس عہد کی نثر نگاری کی اصناف کو بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

۱-عباسی خلافت وحکومت کے زوال کے اسباب وعوامل پر روشنی ڈالیے۔
۲-عہد عباسی کی تجارت وزراعت پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
۳-عہد عباسی کے مختلف محکمہ جات پر سیر حاصل بحث کیجیے۔
۴-عہد عباسی کے معاشرہ پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
۵-عہد عباسی کی علمی سرگرمیوں کا ایک مکمل جائزہ پیش کریں۔
۶-عہد عباسی میں عربی شاعری کے فروغ اور اس کی خصوصیات واصناف پر ایک نوٹ لکھیے۔

13.16 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

۱-تاریخ تہذیب اسلامی	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، جلد سوم۔
۲-تاریخ اسلام	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد سوم وچہارم۔
۳-المامون	علامہ شبلی نعمانی۔
۴-تاریخ الأدب العربي (العصر العباسي الأول والثانی)	شوقی ضیف۔
۵-الجامع في تاریخ الأدب العربي	حنا فاخوری۔
۶-تاریخ الأدب العربي	احمد حسن زیات۔
۷-الأدب في عصر العباسیین (الجزء الأول والثاني)	محمد زغلول سلام۔
۸-ضحی الاسلام، جلد سوم	احمد امین۔
۹-اردو دارۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ عباسیہ، مدارس وغیرہ۔	

اکائی 14 عہد عباسی میں علوم وفنون کا ارتقا

اکائی کے اجزا

14.1 مقصد

14.2 تمہید

14.3 عصر عباسی میں فروغ پانے والے علوم وفنون

14.4 اسلامی علوم وفنون

14.4.1 علوم القرآن

14.4.1.1 علم تفسیر

14.4.1.2 عہد عباسی میں تفاسیر کی اقسام

14.4.1.2.1 تفسیر بالماثور

14.4.1.2.2 تفسیر بالرائے

14.4.1.2.3 دیگر اقسام تفسیر

14.4.1.3 علم قراءت

14.4.1.4 علم تجوید القرآن

14.4.1.5 علم اسباب النزول

14.4.1.6 علم الناسخ والمنسوخ

14.4.1.7 علم لغات القرآن

14.4.2 حدیث اور علوم حدیث

14.4.2.1 تدوین احادیث کے ادوار

14.4.2.2 عہد عباسی میں مرتب کردہ مجموعۂ احادیث

14.4.2.2.1 الجامع الصحیح

14.4.2.2.2 السنن

14.4.2.2.3 **المسند/المسانید**

14.4.2.2.4 **المصنف**

14.4.2.3 عہد عباسی کا سرمایۂ حدیث

14.4.2.4 علوم الحدیث

14.4.2.5 علم اسماء الرجال/علم رجال الحدیث

14.4.2.6 علم الجرح والتعدیل

14.4.2.7 علم مختلف الحدیث

14.4.2.8 علم علل الحدیث

14.4.2.9 مشکل الحدیث

14.4.2.10 علم غریب الحدیث

14.4.2.11 علم الناسخ والمنسوخ

14.4.2.12 علم موضوعات الحدیث

14.4.2.13 علم اصول الحدیث

14.4.3 فقہ اور اصول فقہ

14.4.3.1 فقہ کی تعریف

14.4.3.2 تدوین فقہ کے ادوار

14.4.3.3 عہد عباسی کا فقہی سرمایہ

14.4.3.3.1 فقہ حنفی

14.4.3.3.2 فقہ مالکی

14.4.3.3.3 فقہ شافعی

14.4.3.3.4 فقہ حنبلی

14.4.3.3.5 فقہ جعفری

14.4.3.4 فقہی علوم

14.4.3.4.1 علم اصول فقہ

14.4.3.4.2 علم الفرائض/علم المیراث

14.4.4 سوانحی ادب

14.4.4.1 سیرت نبوی

14.5 سائنسی علوم وفنون

14.5.1 کیمیاء (کیمسٹری)

14.5.2 طبیعیات/طبعیات (فزکس)

14.5.3 طب (میڈیسن)

14.5.4 ریاضی، ہندسہ اور حساب

14.5.5 علم ہیئت اور نجوم

14.5.6 علم جغرافیہ

14.5.7 علم معدنیات (Geology,Minerology)

14.5.8 علم نباتیات/نباتات (Botany)

14.5.9 علم حیوانات (Zoology)

14.6 سماجی علوم

14.6.1 علم تاریخ

14.6.2 فلسفہ ومنطق

14.6.3 علم کلام

14.6.4 علم تصوف

14.7 ادبی علوم وفنون

14.7.1 نثر نگاری

14.7.1.1 تنقید اور علم بلاغت

14.7.1.2 ادب الرحلات

14.7.1.3 علم لغت

14.7.1.3.1 تدوین لغت نگاری کے مراحل

14.7.1.3.2 عربی لغت نگاری کے اسکول

14.7.2 شاعری

14.8 اکتسابی نتائج

14.9 نمونے کے امتحانی سوالات

14.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

14.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد عصر عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون سے متعارف کرانا ہے۔اس اکائی کو پڑھ کو ہم اس بات سے واقف ہوسکیں گے کہ علوم وفنون کے اعتبار سے عصر عباسی کو تمام اسلامی ادوار میں کیا مقام ومرتبہ حاصل تھا؟ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ اس عہد میں ہونے والی ترقیاں کتنی ہمہ جہت تھیں کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں تھا جس میں اس عہد کی سرگرمیوں کی وجہ سے نمایاں تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں۔

14.2 تمہید

اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں عصر عباسی کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور عہد وعصر کو حاصل نہ ہوسکا۔اس فضلیت اور برتری کے کئی اسباب ہیں،جن میں سے اس کا طویل ترین ہونا،عباسی خلفا کا اسلامی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھانے اور علوم وفنون کو فروغ دینے کے تئیں ذاتی طور پر دلچسپی لینا،مختلف تہذیب وتمدن کا ملاپ اور اس کے نتیجہ میں پروان چڑھنے والی ایک رنگ برنگ تہذیب کا پروان چڑھنا وغیرہ ہیں۔اس عہد میں اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت اپنی پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کچھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صدیوں تک صرف اسی تہذیب وتمدن وثقافت کا بول بالا رہا اور تاریخ انسانی کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں گویا اس کے ماند پڑ گئی تھیں۔

عصر عباسی میں ہونے والی گوناگوں تبدیلیوں اور ترقیوں میں علوم وفنون کا فروغ پانا بھی شامل ہے۔جس طرح اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اکثر اسلامی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ دیگر علوم وفنون کی بنا عہد اموی میں رکھی جا چکی تھی،اسی طرح اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے،ان علوم وفنون پر مکمل بال وپر عہد عباسی میں آئے تھے اور اسی عہد میں وہ اپنی پوری تابنا کی اور رعنائی کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے تھے اور اسلامی تہذیب وتمدن کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

عصر عباسی میں پروان چڑھنے والی علمی تحریک اور اس کے ثمرات سے ایک طویل عرصہ تک فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مغربی اور یورپین ممالک کی ترقی میں اس تحریک نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔متعدد مغربی مصنفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغرب کی ترقی میں عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی علمی تحریک کا کافی اور نمایاں حصہ ہے جس نے انھیں اندھیروں سے نکال کر اجالوں سے روشناس کرایا تھا۔

14.3 عصر عباسی میں فروغ پانے والے علوم وفنون

عصر عباسی میں فروغ پانے والے علوم وفنون کی تاریخ پر جب ایک سرسری نگاہ ڈالی جاتی ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان علوم وفنون کو دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ وہ علوم وفنون جو عصر عباسی کے علما وفضلا کو اسلاف سے بطور ورثہ ملے تھے۔ان علوم وفنون کی تعداد زیادہ ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ ان کی ہی اکثریت ہے تو غلط و بیجا نہیں ہوگا۔

☆ وہ علوم وفنون جن کی بناء عصر عباسی میں رکھی گئی تھی۔مجموعی طور پر ان علوم وفنون کی تعداد کم ہے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے دونوں زمروں کو حسب ذیل علوم وفنون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ اسلامی علوم وفنون جیسے قرآنی علوم، علوم حدیث وفقہ اوران کے متعلقات ۔

☆ سائنسی علوم وفنون جیسے کیمیاء(کیمسٹری)،طبیعیات/طبعیات(فزکس)،طب(میڈیسن) وغیرہ۔

☆ -سماجی علوم جیسے تاریخ،جغرافیہ،فلسفہ اورمنطق وغیرہ اوران کے متعلقات ۔

☆ ادبی علوم وفنون جیسے نثرنگاری،شاعری، بلاغت وغیرہ اوران کے متعلقات ۔

مذکورہ بالاعلوم وفنون کے بطن سے نت نئی شاخیں پھوٹیں تھیں جن میں اس عہد میں اتنے بال وپرآئے کہ آگے چل کرانھیں ایک مستقل علم وفن کا درجہ حاصل ہوگیا، جیسے فن سیرت نبوی کہ اس کے ابتدائی خد وخال ہمیں حدیث میں ملتے ہیں،لیکن آگے چل کر وہ ایک مستقل فن بن جاتا ہے۔اسی طرح فن سیرت نگاری سے فن تاریخ پروان چڑھتا ہے جوآگے چل کرسیرت نبوی سے جدا ہوکرایک مستقل فن کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔

عہد عباسی میں علوم وفنون کا ذکر کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ درج ذیل سطور میں صرف ان علما وفضلا کے علمی کارناموں جن کا تعلق سلطنت عباسیہ سے تھا۔اس بحث میں اندلسی علما اورعہد عباسی کے بعد کے علما کے کارناموں کا ذکرنہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس مبحث میں بہت سے نامور مصنفین کا ذکر موجودنہیں ہے جیسے قاضی عیاض، ابن خلدون، ابن بطوطہ اورابن جبیر وغیرہ۔

14.4 اسلامی علوم وفنون

فطری طور پر اسلامی علوم فنون کا ارتقا عہد عباسی میں زیادہ ہوا تھا کہ وہ مختلف علوم وفنون جن کی ابتدا عہد نبوی تا عہد اموی کے دوران ہوئی تھی وہ اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے عہد عباسی میں بام عروج پر پہنچ گئے ۔ان علوم وفنون کا ایک مختصر جائزہ حسب ذیل سطور میں پیش کیا جارہا ہے۔

14.4.1 علوم القرآن

قرآن کریم ایک ابدی اورجامع کتاب ہے جسے زندگی کے تمام معاملات میں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا تھا۔قرآن کریم میں ایک مکمل ضابطۂ حیات بیان کیا گیا ہے۔قرآن کریم میں صرف اصول وکلیات ہی بیان کیے گئے جن کی تفصیل اورتشریح احادیث نبویہ میں بیان کی گئی ۔بقول امام شاطبی ’’قرآن کریم اختصار کے باوجود جامع ہے اوروہ جامع اسی اعتبار سے ہے کہ اس میں دین کے اصول وکلیات جمع ہوگئے ہیں۔جب نزول قرآن کی تکمیل ہوگئی تو شریعت مکمل ہوگئی‘‘۔

تقریبا تمام اسلامی علوم فنون کا منبع قرآن کریم ہی ہے لہذا یہ بات باعث حیرت واستعجاب نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن کریم اوراس کے مختلف پہلوؤں پر بہت کثرت سے لکھا گیا ہے اسلامی علوم وفنون کے اسی مہتم بالشان حصہ کوعلوم القرآن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

علوم قرآنی کی چند شاخوں کی بنیاد صحابہ،تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں ہی ڈالی جاچکی تھی۔خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عثمانؓ نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے نسخہ قرآن مجید کی نقول سے مصحف کی کاپیاں تیارکرواکرگویا علم رسم القرآن یا علم الرسم العثمانی کی بنیاد رکھ دی تھی۔خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالبؓ نے عربی زبان خاص طور سے قرآن مجید کی حفاظت کے لیے ابوالاسود دؤلی کے ذریعہ کچھ قواعد مرتب

کر کے **علم اعراب القرآن** کی بنا ڈال دی تھی۔علوم قرآن کے حوالہ سے صحابہ کرامؓ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس،عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت اور ابی بن کعب وغیرہ کی کوششوں کو تابعین کرامؒ جیسے امام مجاہد، امام عکرمہ، امام قتادہ، امام عطاء بن یسار، امام سعید بن جبیر، امام حسن بصری اور زید بن اسلم وغیرہ اور تبع تابعین کرامؒ نے جیسے حضرت امام مالک بن انس وغیرہ نے اپنے عمل مسلسل سے مزید آگے بڑھایا اور ’’علوم القرآن کے سلسلے میں پیشرو مفکرین کا کردار ادا کیا اور اس موضوع پر بنیادی اور اساسی معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا‘‘۔ان حضرات کی کوششوں کے نتیجہ میں **علم التفسیر، علم اسباب النزول، علم المکی و المدنی، علم الناسخ و المنسوخ** اور **علم غریب القرآن** و دیگر علوم قرآنی کی بنا پڑی تھی اور ان موضوعات پر اس قدر سے کثرت سے لکھا گیا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان علوم نے عہد تدوین میں مستقل علوم کا قالب اختیار کیا تھا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ علوم القرآن کی جدید اور جامع اصطلاح کو اس کے وسیع تر مفہوم میں سب سے پہلے علی بن ابراہیم بن سعید حوفی (م ۴۳۰ھ) نے استعمال کیا تھا اور تیس جلدوں پر مشتمل **البرهان في علوم القرآن** مرتب کی تھی۔

علوم القرآن کے موضوع پر مجموعی یا کسی ایک علم قرآن پر متعدد کتب لکھی گئیں ہیں جیسے عبدالرحمن مقدسی (م ۶۶۵ھ) کی **المرشد الوجيز في علوم القرآن العزيز**، امام زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی **البرهان في علوم القرآن** اور امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی **الاتقان في علوم القرآن** وغیرہ۔لیکن یہ اور ان جیسی کتب عہد عباسی کے بعد لکھی گئی ہیں لہٰذا یہاں ان کا تذکرہ نہیں کیا جارہا ہے۔

درج ذیل سطور میں قرآنی علوم کی اہم اور بنیادی علوم کا ذکر کیا جارہا ہے۔

14.4.1.1 علم تفسیر

عہد تدوین میں علم تفسیر کو دیگر تمام قرآنی علوم پر فوقیت و برتری حاصل ہے کہ اسے تمام علوم قرآنی میں اصل و اساس ہونے کا شرف حاصل ہے۔قرآن کی تفسیر کا آغاز عہد نبوی سے ہی ہو چکا تھا۔آپ ﷺ خود ہی اس سب سے بڑے شارح تھے کہ متعدد احادیث کرام میں قرآن کریم کی آیات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔آپ ﷺ کے بعد قرآن کی تفسیر کا فریضہ صحابہ کرامؓ نے انجام دیا جن میں سخلفائے اربعہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، اُبیؓ بن کعب، ابوموسی اشعری، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ کا شمار مفسرین صحابہ میں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا صحابہ کرامؓ میں سے حضرت اُبیؓ بن کعب نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنی تفسیر لکھی تھی۔ یہ تفسیر ناپید ہوچکی ہے تاہم اس کی مرویات کا ایک معتد بہ حصہ کتب تفاسیر و احادیث خاص طور سے تفسیر طبری از محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، مسند امام احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم اور میں محفوظ ہوگیا ہے۔ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اپنی تفسیر لکھی تھی لیکن وہ بھی ناپید ہوچکی ہے تاہم اس کی مرویات کتب تفاسیر و احادیث میں بکھری ہوئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حلقۂ درس سے ایک معتد بہ تعداد نے استفادہ کیا تھا جنھوں نے علم تفسیر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ان کے شاگردوں میں سے سعید بن جبیر (۹۳ھ) اور ابوالعالیہ نے باقاعدہ اپنی اپنی تفاسیر لکھی تھیں جن کا شمار اولین اور بنیادی تفاسیر میں کیا جاتا ہے لیکن صد افسوس کہ وہ زمانہ کی دست و برد کا شکار ہوچکی ہیں۔اول الذکر نے مشہور اموی خلیفہ مروان بن عبدالملک کی فرمائش پر

قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف ''عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے، وہ درحقیقت یہی تفسیر ہے''۔

عہد اموی میں مفسرین کا دائرہ بہت بڑھ جاتا ہے تاہم تدوین کا عمل خال خال ہی نظر آتا ہے۔ عہد اموی میں مرتب کی جانے والی تفاسیر میں محمد بن کعب قرظی (م ۱۰۸ھ)، عطاء بن ابی رباح (م ۱۱۴ھ) کی تفاسیر بھی شامل ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین کرام سے استفادہ کرتے ہوئے اتباع تابعین نے تفسیر کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں جن میں سفیان بن عیینہ، وکیع بن جراح، شعبہ بن حجاج، یزید بن ہارون اور عبد بن حمید رحمہم اللہ کے نام نامی زیادہ نمایاں اور ممتاز ہیں۔

عہد عباسی کے مشہور مفسرین میں ابن جریج رومی اموی (م ۱۵۰ھ)، مقاتل بن سلیمان (م ۱۵۰ھ)، حسین بن واقد قرشی مروزی (م ۱۵۷ھ)، شعبہ بن حجاج (م ۱۶۰ھ)، سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)، اسماعیل بن ابراہیم اسدی (م ۱۹۴ھ)، سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ)، وکیع بن جراح (م ۱۹۷ھ)، عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ)، آدم بن ایاس (م ۲۲۰ھ)، سُریج بن یونس بغدادی (م ۲۳۵ھ)، ابن راہویہ (م ۲۳۸ھ)، احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) عمرو بن علی باہلی (م ۲۴۹ھ)، رَوح بن عُبادہ قیسی (م ۲۵۰ھ)، امام دارمی (م ۲۵۵ھ) ابن ابی ثلج بغدادی (م ۲۵۷ھ)، اسماعیل بن یزید قطان (م ۲۶۰ھ)، امام تستری (۲۷۳ھ)، بقی بن مخلد (م ۲۷۶ھ) ابواحمد عسّال (م ۲۸۲ھ)، بکر بن سہل دمیاطی (م ۲۸۹ھ)، ابراہیم بن معقل نسفی (م ۲۹۵ھ)، محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی (م ۳۱۰ھ)، حسین بن محمد اصفہانی (م ۳۶۹ھ)، ابواللیث سمرقندی (م ۳۷۵ھ)، ابوجعفر ہروی (م ۳۸۱ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.1.2 عہد عباسی میں تفاسیر کی اقسام

عہد عباسی کی کتب تفاسیر کو بنیادی طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

14.4.1.2.1 تفسیر بالماثور

مذکورہ بالا اصطلاح ان تفاسیر کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جن میں قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح احادیث نبوی، اقوال صحابہ و تابعین کی روشنی میں کی گئی ہو۔ تفسیر ماثور کی سب سے اہم تفسیر امام محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی ہے۔ اس تفسیر کا نام ''تفسیر جامع البیان عن تأویل آی القرآن'' ہے لیکن مصنف کی نسبت سے ''تفسیر طبری'' کے نام سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ اس تفسیر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تمام علما اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی متعدد خصوصیات کی وجہ سے اس جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی ہے۔ بقول علامہ سیوطی ابن جریر محض نقل اقوال پر اکتفا نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ ان کی توجیہ بھی کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تفسیر کو دیگر تفاسیر کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہے۔

تفسیر طبری کے علاوہ اس زمرہ کی مشہور تفاسیر میں ''بحر العلوم'' از ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی (م ۳۷۵ھ)، تفسیر ابن عطیہ دمشقی (م ۳۸۳ھ)، ''الکشف والبیان عن تفسیر القرآن'' از ابواسحق ثعلبی (م ۴۲۷ھ)، تفسیر ابن ماوردی (م ۴۵۰ھ)، تفسیر امام واحدی (م ۴۶۸ھ)، ''معالم التنزیل'' از حسین بن مسعود فراء بغوی (م ۵۱۶ھ)، ''زادالمسیر في علم التفسیر'' از حافظ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) اور ''موجز التاویل عن معجز التنزیل'' از ابن کامل ہیں۔

14.4.1.2.2 تفسیر بالرائے

اس اصطلاح کا استعمال ان تفاسیر کے لیے کیا جاتا ہے جن میں کسی آیت کی تفسیر وتشریح اپنے قیاس اور رائے کے مطابق کی گئی ہو ۔ان تفاسیر کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں علما کے مختلف اقوال بیان کیے جاتے ہیں۔ جواز اور عدم جواز سے قطع نظر،ان کا جائزہ محض علم وفن کے اعتبار سے لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے تفسیر کا دامن بہت ہی متنوع اور قسم قسم کی تفاسیر سے مالا مال نظر آتا ہے جس نے اس فن کو آگے بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی: ''تفسیر بالرای میں مختلف مکاتیب فکر کی نمائندگی ملتی ہے۔ان میں عام مفسرین کرام ہیں اور خاص فنون کے ماہرین بھی جیسے فقہ وتصوف وغیرہ۔ مسلم فرقوں میں شیعہ اور معتزلہ مفسرین کی تفاسیر بھی ہیں''۔

تفسیر بالرائے کے زمرہ میں ''الکشاف'' کونمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ) کے زور قلم کا نتیجہ ہے ۔ یہ تفسیر عقلی انداز پر مرتب کی جانے والی تفاسیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف الاسلامیۃ اردو: اس تفسیر میں بلاغت کے نکات اور اعجاز قرآنی کی مختلف جہات کو سوال وجواب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس تفسیر میں اسرائیلیات کا ذکر خال خال ہی پایا جاتا ہے۔لغوی اور نحوی بحثیں قابل قدر ہیں مگر معتزلی طرز فکر کی وجہ سے اس میں تکلف اور تعصب سے کام لیا گیا ہے۔

اس زمرہ کی دوسری اہم تفسیر ''مفاتيح الغيب'' ہے۔اس تفسیر کے مصنف فخر الدین محمد بن عمر رازی (م ۶۰۶ھ) ہیں۔ یہ تفسیر ''تفسیر کبیر'' کے نام سے زیادہ مشہور ومتداول ہے۔اس کا شمار فلسفیانہ تفاسیر میں بھی ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی کہ تفسیر بالرائے کے زمرہ میں شامل اکثر تفاسیر جیسے: ''أنوار التنزيل وأسرار التاويل'' از قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی (م ۶۸۵ھ) ہیں، ''مدارک التنزيل'' از امام نسفی، عبداللہ بن احمد (۷۱۰ھ) وغیرہ عہد عباسی کے بعد لکھی گئی تھیں۔

14.4.1.2.3 دیگر اقسام تفسیر

عہد عباسی میں کی تفاسیر کی فہرست پر نظر ڈالنے یہ اندازہ ہوتا ہے انھیں شیعی ،صوفیانہ تفاسیر اور فقہی تفاسیر جیسے زمرات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے تفسير القرآن از امام تستری (۲۷۳ھ)، ''حقائق التفسير'' از امام سلمی (م ۴۱۲ھ)، ''لطائف الاشارات'' از امام قشیری (م ۴۶۵ھ) اور ''عرائس البيان'' از امام ابومحمد روز بہان (م ۶۰۶ھ) وغیرہ۔

14.4.1.3 علم قراءت

اس علم سے وہ علم مراد ہے ''جس میں قرآنی کلمات کے ادا کی کیفیت اور اس میں جو اختلاف ہے وہ بیان کیا جاتا ہے اور اختلاف قراء ات کو اس کے ناقلین کی جانب منسوب کیا جاتا ہے تا کہ قرآن مجید میں لفظ اور لہجے کی تحریف کو راہ پانے کا موقع نہ ملے''۔

قراءت قرآنی کو بنیادی طور پر تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔تحقیق ۲۔حدر ۳۔تدویر۔ پہلی قسم میں قراءت کے حوالہ سے ہر چیز کو مکمل طور پر دھیان دیتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے قراءت کی جاتی ہے۔دوسری قسم میں قراءت کو تیزی اور روانی سے پڑھا جاتا ہے

،جب کہ تیسری قسم میں مذکورہ بالا قراءت کی دونوں قسموں کے مابین توسط اختیار کیا جاتا ہے۔

عہد نبوی سے اس علم کا آغاز ہو چکا تھا۔مشہور قول کے مطابق اس وقت کے مشہور سات عربی لہجات کے مطابق قرآن کا نزول ہوا تھا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام ؓ کو ان لہجات کی تعلیم دی تھی تا ہم یہ فن اموی عہد اور عباسی عہد میں جا کر پایۂ تکمیل پر پہنچا تھا۔ پروفیسر محمد رضوان علوی کا یہ کہنا کہ ’’ان قراءتوں کے پیدا ہونے کی اصل وجہ عربی رسم الخط کی ناقص نوعیت تھی‘‘ بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے کہ قراءتوں کا اختلاف دراصل لہجات کا اختلاف ہے۔

مشہو سبعہ قراء میں سے تین کا تعلق خالص اموی دور سے تھا۔اموی دور سے تعلق رکھنے والے قرائے کرام میں امام عبداللہ بن عامر یحصبی (۲۱-۱۱۸ھ)،امام عبداللہ بن کثیر داری (۴۵-۱۲۰ھ) اور امام عاصم بن ابی النجود کوفی (۱۲۷ھ) ہیں جن کے شاگردوں نے اس فن کو عہد عباسی میں پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

سبعہ قراء میں تین قرائے کرام کا تعلق اموی اور عباسی دونوں ادوار سے ہے، انھوں نے اپنی آنکھیں تو اموی دور میں کھولیں لیکن وفات عہد عباسی میں ہوئی تھی۔دونوں عہد سے تعلق رکھنے والے قرائے کرام میں امام ابو عمرو بن العلاء بصری (۶۸-۱۵۴ھ)،امام حمزہ بن حبیب زیات کوفی (۸۱-۱۵۷ھ) اور امام نافع بن عبدالرحمن مدنی (نحو ۷۰-۱۶۹ھ) شامل ہیں۔

خالص عباسی عہد سے تعلق رکھنے والے قاری، امام علی بن حمزہ کسائی (م ۱۸۹ھ) تھے۔

مذکورہ بالا سبعہ قراء کی فہرست میں جب امام ابوجعفر یزید بن قعقاع مدنی (م ۱۳۰ھ)،امام ابومحمد یعقوب بن اسحاق حضرمی (م ۲۰۵ھ) اور ابومحمد خلف بن ہشام بن ثعلب بزار بغدادی (م ۲۲۹ھ) کو شامل کر لیا جاتا ہے تو قراء عشرہ کی فہرست مکمل ہو جاتی ہے، جن میں صرف امام ابوجعفر یزید بن قعقاع مدنی (م ۱۳۰ھ) کا تعلق اموی دور سے ہے جب کہ باقی ماندہ دونوں ائمۂ قرأت کا تعلق عہد عباسی سے ہے۔علم قراءت کو پروان چڑھانے میں قراء سبعہ/قراء عشرہ کے شاگردوں نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

فن قراءت پر ایک اہم کتاب کے مؤلف ابوعبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) کے بقول ’’قراءت سبعہ‘‘ کی اصطلاح کا چلن دوسری صدی سے عام ہوا تھا ورنہ اس سے پہلے بہت سے قراء کا ذکر ملتا ہے جن کی جانب کسی نہ کسی قراءت کو منسوب کیا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں اس فن پر قلم اٹھانے والوں میں ابوعبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ)،خلف بن ہشام،ابن مجاہد (م ۳۲۴ھ)،ابن کامل،ابوطاہر، ابوبکر نقاش ،ابوبکر محمد بن حسن،ابومعشر عبدالکریم طبری (م ۴۷۸ھ) ابوالعلاء حسن بن محمد ہمدانی (۵۶۹ھ) اور علی بن محمد بن عبدالصمد سخاوی (م ۶۴۳ھ) جیسے اہل قلم شامل ہیں۔

عہد عباسی میں فن قرأت کی اہم تصانیف میں ’’احتجاج القرأة‘‘ از مبرد (م ۲۸۶ھ) ’’الاحتجاج في القراءات‘‘ از ابوبکر ابن مقسم مقری (م ۳۵۴ھ)، اور ’’البديع في القراءات السبع‘‘ از ابن خالویہ (م ۳۷۰ھ) کا شمار ہوتا ہے۔

14.4.1.4 علم تجوید القرآن

علم قرأت کے ساتھ ساتھ علم تجوید بھی پروان چڑھتا رہا۔تجوید کے لغوی معنی ’’کسی کام کو بہترین طریقے سے انجام دینا ہے‘‘ اور اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ ’’دوران تلاوت قرآن کے الفاظ کی بہترین طریقے سے ادائیگی اور صحت مخارج کے ساتھ قرآن کی تلاوت اس طرح کی

جائے کہ حسن ولطف اپنی انتہا کو پہنچ جائیں''۔

علم تجوید فن قرأت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، اس کا دائرہ علم قرأت کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے۔اس موضوع پر موسیٰ بن عبیداللہ خاقانی بغدادی (م ۳۲۵ھ) نے پہلی کتاب لکھی تھی۔علی بن محمد سخاوی (م ۶۴۳ھ) نے بھی اس موضوع پر ''جمال القرّاء وکمال الاقراء'' نامی کتاب لکھی تھی۔

14.4.1.5 علم اسباب النزول

علم اسباب نزول سے:''وہ علم مراد ہے جس کے ذریعہ یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ فلاں آیت کب اور کس واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی''۔امام شاطبی نے اس علم کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''سبب نزول کے معلوم ہوجانے سے قرآن فہمی میں ہر اشکال کا ازالہ ہوجاتا ہے۔اس لیے قرآن مجید کے مطالب ومعانی سمجھنے کے لیے یہ علم بہت ناگزیر ہے''۔

مذکورہ علم پر سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد امام عکرمہ (م ۱۰۷ھ) نے قلم اٹھایا تھا۔امام سیوطی اور حاجی خلیفہ نے امام بخاری کے استاد امام علی بن عبداللہ مدینی (م ۲۳۴ھ) کو اس فن کا اولین مصنف قرار دیا ہے۔ان کے علاوہ امام علی بن احمد واحدی (م ۴۲۷ھ) نے ''**أسباب النزول**'' لکھی تھی۔اس فن پر لکھی جانے والی اہم کتب عہد عباسی کے بعد لکھی گئیں تھیں۔

مذکورہ بالا مستقل کتب کے علاوہ تفسیر بالماثور کے زمرہ سے تعلق رکھنے والی کتب تفاسیر میں بھی آیات کے اسباب نزول کا ذکر کیا گیا ہے۔

14.4.1.6 علم الناسخ والمنسوخ

اس علم سے مراد وہ علم لیا جاتا ہے جس میں کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے کی نشاندہی کی جاتی ہے۔متقدمین ومتأخرین میں سے بعض علما اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کی متعدد یا کچھ آیات منسوخ ہوچکی ہیں۔انھوں نے اس حوالہ سے اپنے افکار وآرا اور خیالات ونظریات کو قلم بند کیا ہے جس نے آگے چل کر ''علم الناسخ والمنسوخ'' کا قالب اختیار کرلیا۔اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں ''المصفی بأکف أهل الرسوخ في الناسخ والمسوخ'' از ابن جوزی (م ۵۹۷ھ)،''ناسخ القرآن ومنسوخه'' از ابراہیم حربی،''ناسخ القرآن ومنسوخه'' از ابراہیم کشی،''ناسخ القرآن ومنسوخه'' از ابواسمٰعیل ترمذی،''ناسخ القرآن ومنسوخه'' از جعفر بن مبشر ثقفی،''ناسخ القرآن ومنسوخه'' از عطا بن مسلم خراسانی،''ناسخ القرآن ومنسوخه'' از کلبی،''الناسخ والمنسوخ'' از ابوبکر بردعی،''الناسخ والمنسوخ'' از ابوبکر حازمی،''الناسخ والمنسوخ'' از جعد شیبانی،''الناسخ والمنسوخ'' از ابوالحسن قمی،''الناسخ والمنسوخ'' از ابن حنبل،''الناسخ والمنسوخ'' از امام سجستانی وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.1.7 علم لغات القرآن

قرآن کریم کے زیر اثر پروان چڑھنے والے علوم میں علم لغت بھی ہے۔قرآن کے مفردات کے معانی سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے علم لغت جیسا فن وجود میں آیا تھا جس نے آگے چل کر عربی زبان کے مکمل الفاظ کے معانی کو بیان کرنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے مشکل اور نادر الفاظ کے معانی ومطالب کا سلسلہ تو عہد نبوی سے شروع ہوچکا تھا کہ

حضرت عبداللہ بن عباس کے بیان کردہ قرآنی الفاظ کے معانی ومطالب کا ذکر تفاسیر وکتب حدیث میں ملتا ہے۔مذکورہ موضوع پر سب سے پہلے ہیثم بن عدی کوفی (م ۲۰۷ھ) نے کتاب لکھی تھی۔ان کے بعد مشہور نحوی سیبویہ کے استاد ابو زید سعید بن اوس انصاری (م ۲۱۵ھ) ،فراء، اصمعی،محمد بن یحییٰ قطیعی وغیرہ نے بھی لغات القرآن کے عنوان سے کتابیں لکھی تھیں۔ان کے علاوہ مصادر اس موضوع پر کچھ اور کتابوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جیسے "معاني القرآن" از یونس بن حبیب (م ۱۸۲ھ)،" معانی القرآن"ازمؤرج بن عمرو سدوسی (م ۱۹۵ھ) ،"لغات القرآن" ازمحمد بن یحییٰ بصری،"ما اتفقت الفاظه واختلفت معانيه في القرآن"ازمبرد،'اما اتفقت ألفاظه ومعانيه في القرآن" ازابوعمر دوری،"مفردات القرآن" ازراغب اصفہانی۔

اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں ان کتابوں کو بھی ایک لحاظ سے شامل کیا جاسکتا ہے جو غریب القرآن کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔اسی طرح کتب تفاسیر میں بھی قرآنی الفاظ کے معانی ومفاہیم کو بیان کیا گیا ہے۔عام کتب لغات میں بھی قرآنی الفاظ کے معانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دیگر علوم قرآنی میں علم حروف القرآن،علم اجزاء القرآن،علم اقسام القرآن،علم مصادر القرآن،علم سجود القرآن،علم ضمائر القرآن،علم المکی والمدنی جیسے "المكي والمدنيمن القرآن واختلاف المكي والمدني في آية" از ابوعبداللہ محمد شریح ابن احمد مقری جیسے موضوعات پر بھی عہد عباسی میں کتابیں لکھی گئی تھی۔

علوم القرآن کی بحث کو ختم کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ علوم القرآن میں کچھ علوم ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست قرآن سے تھا جن میں سے بعض کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔

علوم القرآن کے علوم کی دوسری قسم ان علوم پر مشتمل ہے جن کا تعلق براہ راست قرآن سے نہیں تھا،لیکن وہ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ''قرآن مجید کے زیر اثر ارتقا پذیر ہوئے اور مسلمانوں نے اپنی مخصوص دینی ثقافت،قومی مزاج اور ذہانت وفطانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان علوم کو چار چاند لگا دیے مثلاً تاریخ،جغرافیہ اور سیر وسوانح وغیرہ''۔ان علوم کا ذکر ان شاءاللہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

14.4.2 حدیث اور علوم حدیث

علم حدیث کو بنیادی طور پر دوشاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:۱۔علم روایت ۲۔علم درایت۔علم روایت کی ابتدا کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مروی احادیث نبوی کی تعداد بہت بڑھ گئی اور اس میں ربط ویابس مواد شامل کیا جانے لگا تو حدیث نبوی کی صحت کو جانچنے،پرکھنے اور مختلف فیہ مسائل کو سمجھنے کے لیے کچھ اصول وضوابط بنائے گئے۔ان میں سے کچھ اصولوں کا تعلق احادیث کی اسناد سے تھا کہ صرف وہی احادیث قابل اعتبار قرار پائیں گی جس میں سند کا غیر منقطع سلسلہ موجود ہوگا۔ان اصول وضوابط کو''علم روایت'' یا''علم اسناد'' سے موسوم کیا گیا۔علم روایت کے بطن سے علم اسماء الرجال جیساعظیم الشان فن وجود میں آیا جس کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی ہے۔

اصول وقواعد کی دوسری قسم کا تعلق احادیث کے مختلف پہلوؤں سے تھا۔ان جملہ اصول وضوابط کو''علم درایت'' یا''علم اصول الحدیث'' کا نام دیا گیا۔علم درایت ایسے قوانین ومباحث کا مجموعہ ہے جس کی روشنی میں راوی کے ثقہ ہونے یا نہ ہونے،صحیح یا کمزور اور مقبول یا

مردود ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے علم درایت، کسی روایت کے مطلب ومضمون کی عقلی تنقید کا نام ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ علوم حدیث کے اکثر علوم جیسے علم الجرح والتعدیل، علم مختلف الحدیث اور علم علل الحدیث وغیرہ کا تعلق علم درایت سے ہی ہے۔

درج ذیل سطور میں حدیث اور علوم حدیث سے متعلق ان علمی کوششوں وکاوشوں کا مختصرا ذکر کیا جارہا ہے جو عہد عباسی کی مرہون منت ہیں۔

14.4.2.1 تدوین احادیث کے ادوار

اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کے مقالہ نگار نے حدیث اور اس کے علوم کو سات ادوار میں تقسیم کیا ہے:

۱-عہد صحابہ سے قرن اول تک۔

۲-دوسری صدی ہجری جس میں احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا تاہم تدوین کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔

۳-تیسری صدی ہجری تا چوتھی صدی کا نصف اول۔ اس عہد میں حدیث سے متعلق کئی علوم سامنے آئے تھے اور علم حدیث ایک خاص فن بن گیا تھا۔

۴-چوتھی صدی کے نصف آخر تا اوائل ساتویں صدی۔ اس مدت میں علوم حدیث نے بہت زیادہ ترقی کر لی تھی اور فن کے معراج پر پہنچ گئے تھے۔ اسی عہد میں "المحدث الفاصل بين الراوي والواعي" از امام رامہرمزی (م ۳۶۰ھ)، "الكفاية في قوانين الرواية" اور "الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع" از خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) اور "معرفة علوم الحديث" از امام حاکم نیساپوری (م ۴۰۵ھ) جیسی اہم کتب مرتب کی گئیں تھیں۔ اول الذکر کتاب کو علم اصول حدیث کی اولین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

۵-پانچویں صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک۔ اس عہد میں جرح وتعدیل کا فن بام عروج پر پہنچتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس عہد کی علمی عطایا و دین میں ابن الصلاح کی "علوم الحديث" معروف بہ مقدمۃ ابن الصلاح جیسی بلند پایہ کتاب بھی شامل ہے۔

۶-گیارہویں صدی تا تیرہویں صدی۔ اس عہد کو تقلید کا دور کہا جاتا ہے کہ اس میں اجتہاد کا خاتمہ ہو چکا تھا اور قدما کی کتابوں کو سامنے رکھ کر کتابیں لکھی جارہی تھیں۔

۷-چودہویں صدی و مابعد۔ اس عہد میں مستشرقین اور مغربی علما نے حدیث کی حجیت پر شک وشبہ کا اظہار کیا تھا جس کا کافی وشافی جواب دیا گیا تھا۔ اس عہد کو درایت کا نیا دور کہا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام ادوار میں سے پہلا اور آخری دور مکمل طور پر اور دوسرا اور چھٹا دور جزوی طور پر اس سبق کے دائرہ میں شامل نہیں ہے۔ حسب ذیل سطور میں باقیماندہ ادوار میں حدیث کے ارتقائی مراحل کا ذکر کیا جارہا ہے۔

ان ادوار پر سرسری نظر ڈالنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی تدوین کا آغاز عہد نبوی میں ہی ہو چکا تھا جس کا ایک اہم نمونہ ڈاکٹر حمید اللہ علیہ الرحمہ کی کوششوں سے منظر عام پر آچکا تھا۔ اولیں مجموعۂ احادیث "صحيفة همام بن منبه" کے نام سے موسوم کیا جاتا

ہے۔خلافت راشدہ اور عہد اموی میں تدوین کے عمل کا آغاز ہو چکا تھا تاہم احادیث کے تمام اہم مجموعے عہد عباسی میں ہی مرتب کیے گئے تھے اور انھیں مرتب کرنے میں بہت ہی محنت شاقہ اور دقت نظری سے کام لیا گیا تھا۔

تدوین حدیث کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث کو مرتب اور مدون کرنے کے لیے مختلف طریقۂ کار کو بروئے کار لایا گیا تھا جن کا بنیادی مقصد احادیث کی حفاظت تھی۔احادیث کے ابتدائی مجموعے موضوع و مضمون کی بجائے راویوں کے اعتبار سے مرتب کیے گئے تھے۔بعد میں انھیں تسہیل و تفہیم کی ضرورتوں کے پیش نظر مضامین و مطالب کے اعتبار سے کیا گیا تھا۔

14.4.2.2 عہد عباسی میں مرتب کردہ مجموعۂ احادیث

تقریباً پورے عہد عباسی میں احادیث کے مجموعے مرتب کیے جاتے رہے ہیں اور حدیث کے مختلف پہلوؤں پر اہل قلم اپنی اپنی تصانیف قلم بند کرتے رہے ہیں۔عہد عباسی کے تمام ادوار میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اس لحاظ سے ممتاز ترین قرار دی جا سکتی ہے کہ اسی صدی میں احادیث کے تمام اہم مجموعوں خصوصاً صحاح ستہ کو مرتب کیا گیا تھا۔عہد عباسی میں حدیث کے مجموعوں کو مختلف جہات سے مرتب کیا گیا تھا جن کی مناسبت سے انھیں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے:

14.4.2.2.1 الجامع الصحیح

اس اصطلاح کا اطلاق ان مجموعۂ احادیث پر کیا جاتا ہے جن میں صرف ان احادیث کو جمع کیا گیا ہے جو درایت اور روایت کے اصول و معیار پر مکمل اترتی ہیں۔ان مجموعوں میں جگہ پانے والی احادیث، ظن غالب کی بنا پر صحیح قرار دی جاتی ہیں۔ایسے مجموعوں کو ''الجامع الصحیح'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان مجموعوں میں امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)، امام مسلم بن حجاج قشیری (م ۲۶۱ھ) کے مرتب کردہ مجموعے زیادہ وقیع اور اہمیت کے حامل ہیں جنھیں ''الصحیحین'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ ان میں ''صرف وہ حدیثیں درج ہیں جو بالکل صحیح تسلیم کی گئی ہیں''۔

صحیحین کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی صحیح احادیث کے مجموعہ تیار کیے تھے جنھیں ان کے مرتبین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جیسے صحیح ابن خزیمة (م ۳۱۱ھ)، صحیح ابي عوانة (م ۳۱۶ھ) اور صحیح ابن حبان البستی (م ۳۵۴ھ) وغیرہ۔

14.4.2.2.2 السنن

کچھ محدثین نے صحیح احادیث کے ساتھ دوسری اقسام کی احادیث جیسے حسن احادیث وغیرہ کو بھی اپنے اپنے مجموعوں میں جگہ دی تھی جن کا مقام و مرتبہ صحیح حدیث سے کچھ کم اور فروتر ہوتا ہے لیکن انھیں غلط نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ایسے مجموعۂ احادیث کو ''السنن'' کہا جاتا ہے۔اس زمرہ میں امام ابوداؤد، سلیمان بن اشعث (م ۲۷۵ھ)، امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسی ترمذی (م ۲۷۹ھ)، امام احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ) اور امام ابن ماجہ، محمد بن یزید (م ۲۷۳ھ) کی کتب احادیث کو اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔

مذکورہ بالا سنن اربعہ، جن کا شمار صحاح ستہ میں کیا جاتا ہے، کے علاوہ دیگر مجموعے بھی سنن کے نام سے مرتب کیے گئے تھے جیسے ''سنن الدارمی'' (م ۲۵۵ھ)، سنن الدار قطنی (م ۳۸۵ھ)، السنن الکبیرة اور السنن الصغیرة از امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) وغیرہ۔

14.4.2.2.3 المسند/المسانید

اس اصطلاح کا استعمال ان مجموعۂ احادیث کے لیے کیا جاتا ہے جن میں احادیث اور اقوال نبوی کو راویوں کے اعتبار سے کو جمع کیا گیا تھا۔احادیث کے ابتدائی مجموعوں کو "المسند/المسانید" سے موسوم کیا جاتا ہے۔عام طور ان مجموعۂ احادیث کو ان کے مرتب کرنے والے سے منسوب کیا جاتا ہے۔اس قسم کے مجموعے عہد عباسی سے قبل بھی مرتب کیے جا چکے تھے۔عہد عباسی کی اہم مسانید میں مسند ابوداؤد طیالسی(م ۲۰۳ھ)،مسند اسد بن موسی اموی(م ۲۱۲ھ)،مسند عبیداللہ بن موسی بغدادی(م ۲۱۳ھ)، مسند مسدد بن مسرہد بصری(م ۲۲۸ھ)،مسند نعیم بن حماد خزاعی مصری(م ۲۲۹ھ)،مسند اسحاق بن راہویہ(م ۲۳۸ھ)،مسند ابن ابی شیبہ(م ۲۳۹ھ)،مسند احمد بن حنبل(م ۲۴۱ھ)،مسند احمد بن منیع (م ۲۴۴ھ)،مسند امام بزار(م ۲۹۲ھ)،مسند ابن حبان (م ۳۵۴ھ)اور مسند الخوارزمی از احمد بن محمد برقانی(م ۴۲۵ھ)وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.2.2.4 المصنف

مسند کے مقابلہ میں دیگر مجموعۂ احادیث کو مصنف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ انھیں احادیث کے مضمون کے اعتبار سے ابواب کی شکل میں مرتب کیا گیا تھا۔اس قسم کے مجموعہ کو پہلی مرتبہ امام عبدالرزاق صنعانی (م ۲۱۱ھ) نے مرتب کیا تھا جسے ''**مصنف عبدالرزاق**'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان کے بعد ابن ابی شیبہ(م ۲۳۵ھ) نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جسے علمی دنیا میں ''**مصنف ابن ابی شیبة**'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان کے علاوہ امام طحاوی(م ۳۴۰ھ) نے بھی ''**المصنف**'' کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔صحاح ستہ کا شمار بھی احادیث کے اسی زمرہ احادیث ''مصنف'' میں ہوتا ہے کہ ان میں بھی احادیث کو موضوع کے اعتبار سے مختلف ابواب کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔

14.4.2.3 عہد عباسی کا سرمایۂ حدیث

عہد عباسی میں حدیث اور اس کے علوم سے متعلق مرتب کی جانے والی کتب وتصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جس کا ان صفحات میں استیعاب نہیں کیا جا سکتا ہے تاہم ضروری اور اہم کتب احادیث کی ایک نامکمل فہرست حسب ذیل درج کی جارہی ہے:

امام مالک بن انس(م ۱۷۹ھ) کی "کتاب المؤطا"،عبدالرزاق بن ہمام (م ۲۱۱ھ) کی "الجامع الکبیر" اور "المصنف"،امام اسحاق بن راہویہ(م ۲۳۸ھ) کی" المسند"،ابن ابی شیبہ(م ۲۳۹ھ) کی "المسند"،امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی" المسند،کتاب الزهد" اور "الجرح والتعدیل" وغیرہ،امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) کی "الجامع الصحيح" المعروف بصحیح البخاری،"الأدب المفرد"،"التاريخ الكبير"، "التاريخ الصغير" اور" كتاب الضعفاء"،امام مسلم بن حجاج (م ۲۶۱ھ) کی "الجامع الصحيح"، "المسند الكبير"،"الجامع"، "الكنى و الأسماء"، "أوهام المحدثين"،طبقات التابعين اور "كتاب العلل" وغیرہ، امام ابن ماجہ، محمد بن یزید(م ۲۷۳ھ) کی کتاب السنن، امام ابوداؤد، سلیمان بن اشعث(م ۲۷۵ھ) کی کتاب السنن اور کتاب المراسیل،امام محمد بن عیسی ترمذی(م ۲۷۹ھ) کی الجامع الالکبیر (صحیح الترمذي/سنن الترمذي)، الشمائل النبوية اور كتاب العلل وغیرہ، امام ابن خیثمہ(م ۲۷۹ھ) کی تاريخ ابن خيثمة، امام احمد بن علی نسائی(م ۳۰۳ھ) کی کتاب السنن،

المجتبی اور الضعفاء والمتروکون، امام ابویعلی، احمد بن علی (م ۳۰۷ھ) کی کتاب المعجم، المسند الکبیر اور المسند الصغیر، امام ابن خزیمہ، محمد بن اسحاق (م ۳۱۱ھ) کی صحیح ابن خزیمۃ، امام محمد بن احمد طحاوی (م ۳۴۰ھ) کی المصنف، امام محمد بن حبان بستی (م ۳۵۴ھ) کی صحیح ابن حبان، کتاب الثقات اور کتاب التابعین، امام سلیمان بن احمد طبرانی (م ۳۶۰ھ) کی المعجم الکبیر، المعجم الأوسط اور المعجم الصغیر، امام احمد بن عبداللہ عجلی (م ۳۶۱ھ) کی کتاب الثقات، امام ابن عدی (۳۶۵ھ) کی الکامل، امام علی بن عمر دارقطنی (م ۳۸۵ھ) کی سنن الدرقطني، ابن شاہین بغدادی، عمر بن احمد (م ۳۸۵ھ) کی کتاب السنة یا المسند، تاریخ أسماء الثقات اور معجم الشیوخ وغیرہ، ابن مندہ، محمد بن اسحاق (م ۳۹۵ھ) کی معرفة الصحابة اور فتح الباب في الکنی والألقاب، امام حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) کی المستدرک اور معرفة علوم الحدیث، امام احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ) کی السنن الکبری، السنن الصغری، دلائل النبوة، معرفة السنن والآثار اور الجامع المصنف في شعب الایمان وغیرہ، امام خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی الکفایة في أصول الروایة، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، الفوائد المنتخبة، شرف أصحاب الحدیث، الرحلة في طلب الحدیث، الأسماء والألقاب، السابق واللاحق في تباعد ما بین وفاة الراویین عن شیخ واحد اور کتاب المتفق والمفترق، امام ابن ماکولا، علی بن ہبۃ اللہ (م ۴۷۵ھ) کی الاکمال اور تکملة الاکمال، امام ابن اثیر، مبارک بن محمد (م ۶۰۶ھ) کی جامع الأصول في أحادیث الرسول، النهایة، الشافي في شرح مسند الشافعي، تجرید أسماء الصحابة اور منال الطالب في شرح طوال الغرائب، امام ابن اثیر، علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) کی أسد الغابة في معرفة الصحابة، امام ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) کی کتاب مقدمة ابن الصلاح۔

14.4.3 علوم الحدیث

قرآن کی طرح حدیث کے بطن سے پروان کچھ علوم پروان چڑھے تھے جنھیں علوم الحدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ان کا تعلق براہ راست حدیث نبوی سے ہی ہے۔ درج ذیل سطور میں اختصار کے ساتھ ان علوم کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

14.4.3.1 علم اسماء الرجال/علم رجال الحدیث

احادیث کی صحت وسقم وضعف وغیرہ کو جانچنے اور پرکھنے کے کچھ اصول وضوابط بنائے گئے تھے جن میں سے کچھ کا تعلق ''علم روایت'' سے تھا تو کچھ کا تعلق ''علم درایت'' سے تھا۔ راویوں کے ثقہ ہونے یا نہ ہونے کے لیے چند رہنما اصول مقرر کیے گئے جس کے نتیجہ میں اسماء الرجال جیسا فن وجود میں آیا جس کی نظیر آج تک کسی اور مذہب وملت کے پیروکار پیش نہ کرسکے۔

حدیث نبوی وسیرت نبوی کے جلو میں اسماء الرجال جیسا عظیم الشان علم پروان چڑھا تھا کہ اہل علم حضرات کو اس ضرورت کا احساس ہوا کہ صحتِ روایت کے لیے راویوں کے حالات زندگی اور ان کی دینی واخلاقی حیثیت کے متعلق بھی معلومات فراہم کی جائیں تاکہ ان کی مرویات کی درجہ بندی ہوسکے۔ اس احساسِ ضرورت نے اسماء الرجال جیسے علم کو کچھ اس طرح پروان چڑھایا کہ ہزاروں اشخاص کے حالات زندگی محفوظ ہوگئے۔

اس علم میں راویانِ احادیث کو بحیثیت ’’راوی حدیث‘‘ جائزہ لیا جاتا ہے۔اسی علم کو فن رجال الحدیث بھی کہا جاتا ہے۔اس علم کی ذیلی شاخیں بھی ہیں جیسے طبقات رواۃ،علم جرح وتعدیل وغیرہ۔ان موضوعات پر علما نے اس قدر لکھا ہے کہ وہ ایک مستقل علم بن گئے تھے۔

اسماء الرجال کا فن خالص مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے ۔اس فن میں راویان احادیث کے اسماء،القاب مختصر حالات زندگی،اخلاق واوصاف،روایت حدیث میں ان کے مقام ومرتبہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔راویان احادیث کے حالات زندگی کو اکٹھا کرنے میں اس فن کے ماہرین نے خاصی مشقت اٹھائی تھی ۔ایک ایک راوی کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے وہ قریہ قریہ گئے تھے،مختلف شہروں کی خاک چھانی تھی ، حاصل شدہ معلومات کو مختلف اعتبار سے جانچا اور پرکھا تھا جب تب جا کر اسماء الرجال جیسا فن وجود میں آیا اور اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب وتصانیف میں ہزاروں افراد کے حالات زندگی کو محفوظ کر دیا گیا۔مستشرقین عام طور سے مسلمانوں کے کارناموں کا کھل کا اعتراف نہیں کرتے ہیں ؛لیکن اس فن میں وہ ان کی تندہی اور جانفشانی کا اعتراف کیے نہ رہ سکے کہ اس جیسا فن کسی نے بھی ایجاد نہیں کیا تھا۔اس ضمن میں مشہور مستشرق اسپرنگر/ شپرنگر کے قول نے سند کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔ان کا قول ہے:’’دنیا میں نہ کوئی قوم ایسی گزری ہے،نہ آج تک موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو‘‘۔

فن اسماء الرجال خالص عہد عباسی کی پیداوار ہے۔اس فن پر پہلی کتاب ابوسعید یحییٰ بن سعید بن فروخ (م ۱۹۸ھ) کی جانب منسوب کی جاتی ہے ۔سوئے اتفاق سے یہ کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔اس فن پر امام بخاری (م ۲۵۶ھ) کی التاریخ الکبیر ،التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء کا شمار اہم کتابوں میں ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ بطور علم اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔اس فن میں امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی کتاب کا نام ’’کتاب المفردات والوحدان‘‘ ہے۔انھوں نے طبقات تابعین پر بھی ایک کتاب بطور یادگار چھوڑی ہے۔امام مسلم کے معاصر احمد بن عبداللہ عجلی (م ۲۶۱ھ) نے ’’کتاب الجرح والتعدیل‘‘لکھی۔امام نسائی (م ۳۰۳ھ) کی ’’کتاب الضعفاء والمتروکین‘‘ کا شمار بھی اس فن کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) نے بھی ضعیف راویوں کے حالات پر ایک اہم کتاب بطور یادگار چھوڑی ہے۔

اس فن کی دیگر کتب وتالیفات میں ابن سعد (۲۳۰ھ) کی الطبقات الکبری،ابن خیثمہ (م ۲۷۹ھ) کی تاریخ ابن خیثمة،امام نسائی کی (۳۰۳ھ) کی التمییز اور تاریخ الضعفاء،ابن جارود (م ۳۰۷ھ) کی الأحاد في الصحابة، محمد بن احمد دولابی (م ۳۱۰ھ) کی کتاب الأسماء والكنى،ابن ابی حاتم کی الجرح والتعدیل،عثمان بن السکن (م ۳۵۳ھ) کی کتاب الحروف في الصحابة،ابن حبان (م ۳۵۴ھ) کی کتاب التابعين، کتاب المراسیل اور کتاب الكنى ،امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) کی المختلف والمؤتلف في أسماء الرجال، احمد بن محمد کلاباذی (م ۳۹۸ھ) کی أسماء رجال صحيح البخاري جس کے مختلف نام مصادر میں ملتے ہیں:الكلام على رجال البخاري/الإرشاد في معرفة رجال البخاري/ الهداية والإرشاد في معرفة أهل الثقة والسداد،عبدالغنی بن سعید ازدی (م ۴۰۹ھ) کی المؤتلف والمختلف في أسماء نقلة الحديث اور مشتبه النسبة ،ابن الطحان،یحییٰ بن علی (م ۴۱۶ھ) کی المختلف والمؤتلف ،ابن منجویہ،احمد بن علی (م ۴۲۸ھ) کی رجال صحيح مسلم،امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) کی کتاب الأسماء والصفات،خطیب بغدادی،احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی المتفق والمفترق،المؤتلف تكملة المختلف،ابن ماکولا (م ۴۷۵ھ) کی الإكمال في المختلف والمؤتلف من أسماء الرجال،محمد بن احمد ابو وردی (م ۵۰۷ھ) کی المختلف والمؤتلف،محمد بن طاہر مقدسی (۵۰۸ھ) کی

الجمع بين رجال الصحيحين، ابن مندہ (م ۵۱۱ھ) کی ذکر من عاش من مائۃ وعشرین سنۃ من الصحابۃ، ابن الجوزی (۵۹۷ھ) کی کتاب الضعفاء والمتروکین اور أسماء الضعفاء والواضعین، حافظ عبدالغنی مقدسی (م ۶۰۰ھ) کی الکمال في أسماء الرجال، ابن اثیر جزری، علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) کی أسد الغابۃ في معرفۃ الصحابۃ، ابن نجار بغدادی (م ۶۴۳ھ) کی الکمال في معرفۃ الرجال وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.3.2 علم الجرح والتعدیل

علم الجرح والتعدیل کا شمار، علم اسماء الرجال کی فروعات میں ہوتا ہے جس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ ''راوی کو کن حالات میں ترک کیا جاتا ہے اور اس کی توثیق وتعدیل کے لیے کیا شرائط ہیں''۔ اس علم کو ''علم معرفۃ الرجال'' سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس علم کی کسوٹی پر حدیث نبوی کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے مقام ومرتبہ کی تعیین کرتے ہوئے درجہ بندی کی جاتی ہے۔ کشف الظنون کے مؤلف نے اس علم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''یہ وہ علم جس میں راویوں کی جرح وتعدیل ایسے مخصوص الفاظ سے کی جاتی ہے جن سے راویان حدیث کے مراتب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ علم اسماء الرجال کے فروع میں سے ہے...... اس کا مقصد شریعت اسلامیہ کی حفاظت وصیانت ہے، لوگوں پر طعن وجرح مقصود نہیں''۔

اس فن پر متعدد علما نے قلم اٹھایا ہے اور اس کی جمع وتدوین میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک گرانقدر سرمایہ متقدمین ومتاخرین علما نے بطور یادگار چھوڑا ہے جن کا ذکر اسماء الرجال کے تحت کیا جاچکا ہے کہ اس علم کا تعلق بنیادی طور اسی علم سے ہے۔ یہاں صرف اس فن کی چند اہم کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

کتاب الجرح والتعدیل از امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، کتاب الجرح والتعدیل از احمد بن عبداللہ عجلی (م ۲۶۱ھ)، الجرح والتعدیل از ابن ابی حاتم (م ۳۲۷ھ)، کتاب الثقات از ابن حبان بُستی (م ۳۵۴ھ)، کتاب الثقات از عجلی (م ۲۶۱ھ)، الکامل في الجرح والتعدیلیا الکامل في معرفۃ الضعفاء والمتروکین از ابن عدی جرجانی (م ۳۶۵ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3 علم مختلف الحدیث

اس علم کے ذریعہ ظاہری طور پر ایک دوسرے سے متناقض اور متضاد نظر آنے والی احادیث کے درمیان جمع وتطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جاتا ہے۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کے بقول ''ایسی روایات کو جن کا تعارض دور ہوسکتا ہے اصطلاح محدثین میں مختلف الحدیث کہتے ہیں''۔ اس علم کو علم تطبیق احادیث، اختلاف الحدیث، تأویل مختلف الحدیث بھی کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے امام شافعی (م ۲۰۴ھ) نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''اختلاف الحدیث'' تھا۔

اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں ''اختلاف الحدیث'' از علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ) ''تأویل مختلف الحدیث'' از ابو یحییٰ ساجی (م ۳۰۷ھ)، ''مشکل الآثار'' از محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) اور ''مشکل الآثار'' از طحاوی وغیرہ ہیں۔

14.4.3.4 علم علل الحدیث

اس علم میں ان پوشیدہ اور دقیق اسباب وعلل سے بحث کی جاتی جن کی بنا پر کسی حدیث کی صحت پر اعتراض کیا جاتا ہے جب کہ ظاہری

طور پر اس حدیث میں کوئی سقم اور کمی نہیں نظر آتی ہے۔امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ)، زکریا بن یحییٰ ساجی، ابوبکر خلال (م ۳۱۱ھ)، ابن ابی حاتم (م ۳۲۷ھ)، ابن عدی (۳۶۵ھ)، علی بن عمر دار قطنی (م ۳۷۵ھ)، ابوعبداللہ حاکم (م ۴۰۵ھ) اور ابن الجوزی (۵۹۷ھ) جیسے اکابر محدثین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

14.4.3.5 مشکل الحدیث

عہد عباسی میں قرآن کی طرح حدیث کے مشکل الفاظ کے معانی و مفاہیم کو متعین کرنے کے لیے علما نے کتب لکھیں ہیں جیسے ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) نے صحیحین کے مشکل الفاظ کے معانی و مفاہیم کو "شرح مشکل الصحیحین" نامی کتاب میں بیان کیا ہے۔

14.4.3.6 علم غریب الحدیث

جس طرح اہل علم نے قرآن کریم کے غریب اور نامانوس الفاظ کے معانی پر کتابیں لکھی ہیں اسی طرح احادیث کے مشکل اور شاذ و نادر الفاظ پر بھی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ اس علم کے ذریعہ متن حدیث کے ان الفاظ کے معانی و مفاہیم کو متعین کیا جاتا ہے جن کا مطلب قلت استعمال کی وجہ سے واضح اور صاف نہیں ہوتا ہے۔اس موضوع پر ابوعبیدہ معمر بن مثنی (م ۲۰۱ھ) نے پہلی کتاب لکھی تھی۔ دوسری کتاب لکھنے کا سہرا نصر بن شمیل مازنی (م ۲۰۴) کے سر بندھتا ہے۔ تیسری کتاب ابوعبید قاسم بن سلّام ہروی (م ۲۲۴ھ) نے چالیس سالہ شب و روز کی محنت کے بعد "غریب الحدیث" کے نام سے مرتب کی تھی۔

اس موضوع کی پر لکھی جانے والی دیگر کتب میں "غریب الحدیث" از ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ)، "غریب الحدیث" از قاسم بن محمد انباری (م ۳۰۴ھ)، "غریب الحدیث" از ابن انباری محمد بن قاسم (م ۳۲۸ھ)، "التقریب في علم الغریب" از قاضی نور الدین محمود بن احمد ہمدانی فیّومی (م ۳۳۴ھ)، "غریب الحدیث" از ابوسلیمان حمد بن محمد خطّابی بستی (۳۸۸ھ)، "الفائق في غریب الحدیث" از زمخشری (م ۵۳۸ھ) ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کی "غریب الحدیث" اور "النهاية في غريب الحديث" از ابن اثیر (م ۶۰۶ھ) کا شمار اہم کتب میں ہوتا ہے۔

14.4.3.7 علم الناسخ والمنسوخ

جس طرح قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ آیات پائی جاتی ہیں اسی طرح حدیث شریف میں ناسخ و منسوخ احادیث ملتی ہیں لہذا قرآن کے علم الناسخ والمنسوخ کی طرح احادیث میں بھی علم الناسخ والمنسوخ پایا جاتا ہے۔اس علم میں ان احادیث سے بحث کی جاتی ہے جن میں جمع و تطبیق یا راجح و مرجوح ہونے کی کوئی شکل نہ پائی جاتی ہو۔اس موضوع پر لکھی جانے کتابوں میں " الناسخ والمنسوخ" از امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)، "ناسخ الحدیث ومنسوخه" از ابوبکر اثرم (م ۲۶۱ھ)، "ناسخ الحدیث ومنسوخه' از ابن شاہین بغدادی (م ۳۸۵ھ)، "الاعتبار في بيان الناسخ والمنسوخ من الآثار" از ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی (۵۸۴ھ) اور "الناسخ والمنسوخ" از ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) وغیرہ ہیں۔

14.4.3.8 علم موضوعات الحدیث

اس علم سے مراد وہ علم جس کے ذریعہ موضوع اور گڑھی ہوئی احادیث کا پتہ چلتا ہے۔اس علم کا تعلق درایت سے ہے۔محدثین عظام

نے واضعین حدیث کو پرکھنے اور جانچنے کے کچھ پیمانے بنائے تھے اور ان کی روشنی میں سخت محنت اور جانفشانی کے بعد موضوع احادیث کو مستقل کتابوں میں اکٹھا اور یکجا کر دیا ہے۔اس موضوع پر علامہ ابن جوزی (۵۹۷ھ) نے "الموضوعات في الأحاديث المرفوعات" نامی کتاب لکھی تھی۔

14.4.3.9 علم اصول الحدیث

احادیث نبوی کو روایت اور درایت کی روشنی میں جمع کیا گیا ہے۔درایت سے متعلق اصول کو علم اصول الحدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر غالباً پہلی کتاب امام رامہرمزی (م ۳۶۰ھ) نے لکھی تھی اور اسے "المحدث الفاصل بین الراوی والواعي" کے نام سے موسوم کیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے محمد بن حبان بُستی (م ۳۵۴ھ) نے قلم اٹھایا تھا اور "التقاسیم والأنواع" نامی کتاب مرتب کی،لیکن وہ زمانہ کی دست وبرد کا شکار ہوچکی ہے۔

علم اصول حدیث پر لکھی جانے والی دیگر اہم کتب میں امام حاکم نیساپوری (م ۴۰۵ھ) کی "معرفة علوم الحدیث"، ابُونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کی "طبقات المحدثین والرواۃ"، خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی "الکفایة اور الجامع لآداب الشیخ والسامع"، ابوحفص عمر بن عبدالمجید قرشی (م ۵۸۰ھ) کی "ما لا یسع المحدث جهله"، عمر بن بدر (م ۵۳۲ھ) کی "المغنی في علم الحدیث" اور ابن صلاح (۶۴۳ھ) کی "علوم الحدیث" معروف بہ "مقدمة ابن الصلاح" وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن کی طرح حدیث نے بھی جغرافیہ، تاریخ، سیرت وسوانح، علم انساب وقبائل کے ساتھ ساتھ مختلف لسانی علوم وفنون کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

14.4.3 فقہ اور اصول فقہ

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے اور زندگی میں درکرآنے والے تمام مسائل کا صحیح اور قابل عمل حل پیش کرتا ہے۔عہد نبوی کا معاشرہ بہت ہی پاک وصاف معاشرہ تھا۔اس عہد میں فقہی مسائل کا تعلق عام طور سے زندگی کے روزمرہ کے معمولات اور عبادات کے مسائل سے تھا۔عہد خلافت راشدہ تا عہد عباسی تک اسلامی قلمرو کے رقبہ میں بہت زیادہ وسعت اور مختلف اقوام و تہذیب کے ملاپ وملن کے نتیجہ میں نت نئے مسائل سے اس وقت کے معاشرے دوچار ہوئے تھے، جن کا حل اس وقت کے علما وفقہا نے قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا تھا۔ان مختلف ادوار کے علما وفضلا وفقہا کی کاوشوں نے ''علم فقہ'' کی شکل اختیار کر لی اور اسلامی علوم وفنون کے دائرہ کو مزید وسیع کر دیا۔

14.4.3.1 فقہ کی تعریف

فقہ کی مشہور تعریف امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب کی جاتی ہے "هو معرفة النفس ما لها وما علیها" (نفس کو اس بات کا علم ہونا کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں)۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ: ''یہ مفہوم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی وسیع ہے لہٰذا علما نے اسے زیادہ قطعی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے ''هو العلم بالاحکام الشرعیة العملیة

من أدلتها التفصيلية"(تفصیلی دلائل کے ساتھ عملی شرعی احکام کا علم) اور اس کی غرض وغایت عذاب جہنم سے نجات اور جنت کا حصول ہے اور اس کا شرف دین سے متعلق ہونا اور ثواب کے حصول کا باعث ہونا ہے"۔

فقہ کے چار بنیادی مآخذ ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ ان مآخذ میں خلفائے راشدین کا تعامل/ تعامل صحابہ (کسی معاملہ میں صحابہؓ کا طرز عمل) کو بھی شامل کیا جاتا ہے، کچھ اصحاب علم نے اس کے مآخذ کے دائرہ کو وسعت دیتے ہوئے اس کے دس مآخذ بتائے ہیں، جن میں مذکورہ مآخذ کے علاوہ مسلمان حکمرانوں کی جانب سے جاری کردہ وہ نظامات (انتظامات) ہیں جو قرآن وسنت کے خلاف نہ تھے اور جن سے فقہا نے اپنی برأت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا، ثالثوں کے فیصلے جن سے قرآن وسنت اور اجماع کی نفی نہیں ہوتی ہے، وہ ہدایات جو آپ ﷺ نے، صحابہ کرام اور تابعین عظام نے، فقہائے کبار کے مشورے سے مسلمان سلاطین وحکمرانوں نے اپنے گورنرس اور سفرا کے لیے جاری کی تھیں، بین الاقوامی تعلقات کے حوالہ سے ایسی قانون سازی جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو اور عرف عام/ عادت کو شامل کیا جاتا ہے تاہم ان کی حیثیت ضمنی ہی قرار دی جاتی ہے۔

14.4.3.2 تدوین فقہ کے ادوار

علم فقہ نے مختلف ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ ان ارتقائی مراحل کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- دور نبوی ﷺ۔

۲- دور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم۔ یہ دور، خلافت راشدہ تک محیط ہے۔

۳- دور صغار صحابہ وتابعین۔ یہ دور خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوتا ہے اور زوال خلافت وحکومت اموی تک پھیلا ہے۔

۴- تدوین فقہ کا بنیادی دور جس میں اس نے ایک مستقل علم کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ زمانہ دوسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ تیسری صدی کے اختتام پر ہوتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی میں ہی اس فن نے اپنے بال و پر نکالے تھے۔ اسی عہد میں منظم فقہی مسالک کا ظہور ہوا کہ بنیادی چار مکاتب فقہ پروان چڑھے: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ اسی عہد میں امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) کا مکتب فقہ بھی پایا جاتا ہے، لیکن وہ رواج نہ پاسکا اور تاریخ فقہ اسلامی کا ایک حصہ بن گیا۔

۵- وہ دور جس میں ائمہ کرام کے اجتہادات اور ان کے بیان کردہ مسائل کا ناقدانہ اور باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا۔ اس دور کا خاتمہ بنیادی طور پر سقوط بغداد کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے تاہم یہ دور خلافت عباسی کے خاتمہ کے بعد کچھ عرصہ تک مصر میں قائم ہونے والی حکومتوں تک محیط ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہ کی ابتدا بھی عہد عباسی میں ہوئی اور خاتمہ بھی اسی عہد کے خاتمہ پر ہوتا ہے۔

۶- دور تقلید کی ابتدا اور دور اجتہاد کا خاتمہ۔

مذکورہ بالا ادوار میں سے مکمل چوتھا دور اور پانچویں دور کا اکثر حصہ ہی عہد عباسی سے تعلق رکھتا ہے لہذا باقی ماندہ ادوار سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف عہد عباسی میں پروان چڑھنے اور علم فقہ اور اصول فقہ کے اہم علما اور ان کی کتب کا ذکر درج ذیل سطور میں کیا جا رہا ہے۔

14.4.3.3 عہد عباسی کا فقہی سرمایہ

عہد عباسی میں منظر عام پر آنے والی کتب وتصانیف کا استیعاب تو مشکل ہے تاہم اس فن کی اہم کتابوں کا ذکر حسب ذیل سطور

میں مشہور فقہی مکاتب فکر کے اعتبار سے کیا جارہا ہے:

14.4.3.3.1 فقہ حنفی

حنفی مکتب فکر کی اہم کتب میں" مسند الامام أبي حنیفة" ازقاضی ابو یوسف (م۱۸۲ھ)،اسی کتاب کو بعد میں محمد خوارزمی (م۶۵۵ھ)جامع مسانید أبي حنیفة کے نام سے مکمل کیا تھا،کتاب الخراج، اختلاف أبي حنیفة وابن أبي لیلی اور کتاب الرد علی سیر الأوزاعي ازقاضی ابویوسف(م۱۸۲ھ)،کتاب المؤطا،الجامع الصغیر، الجامع الصغیر،المبسوط،السیر الصغیر،السیر الکبیر ازامام محمد بن حسن شیبانی(م۱۸۹ھ)،کتاب المجرد لأبي حنیفةترتیب ازحسن بن زیادلولوی(م۲۰۴ھ)،الإسعاف في أحکام الأوقاف ازاحمد بن عمر خصاف(م۲۶۱ھ)،اختلاف الفقہاءازامام طحاوی(م۳۲۱ھ)، مختصرالقدوری ازابوالحسن قدوری (م۴۲۸ھ)، شرح السیر الکبیر ازامام سرخسی(م۴۸۳ھ)، البدائع شرح تحفة الفقہاءازابوبکر بن مسعود (م۵۸۷ھ)، فتاوی قاضی خان،شرح الجامع الصغیر اور شرح الزویات ازقاضی حسن بن منصور خان(م۵۹۲ھ)، کتاب الہدایة ازعلی بن ابوبکر فرغانی مرغینانی(م۵۹۳ھ)،شرح الجامع الکبیر از امام عبدالمطلب بن الفضل حلبی(م۶۱۶ھ)،شرح الجامع الکبیر اور شرح السیر الکبیر ازمحمد بن احمد بخاری(م۷۶۳ھ)وغیرہ۔

14.4.3.3.2 فقہ مالکی

مالکی مکتب فکر کی اہم کتب میں"کتاب المؤطا"ازامام مالک بن انس(۱۷۹ھ)،"القضاء في البنیان" ازعبداللہ بن عبدالحکم،"المختصر الکبیر،کتاب الوثائق والشروط"اور"کتاب آداب القضاة" ازمحمد بن عبداللہ بن عبدالحکم مصری(م۲۶۸ھ)، "المبسوط"ازقاضی اسماعیل بن اسحاق،"الموازیة"ازمحمد بن ابراہیم بن زیادموازاسکندری(م۲۸۱ھ)،"الزاهي الشعباني"از ابن قرطی،محمد بن قاسم (م۳۵۵ھ)وغیرہ۔

فقہ مالکی کا فروغ زیادہ تر اندلس اورافریقہ میں ہوا تھا،لہذا اس کی اہم اور بنیادی کتابیں انھیں دیار وامصار خاص طور سے اندلس میں لکھی گئیں تھیں۔اندلس چونکہ اکائی کے دائرۂ کار میں شامل نہیں ہے اس لیے وہاں لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر یہاں نہیں کیا جارہا ہے۔

14.4.3.3.3 فقہ شافعی

شافعی اسکول کی اہم کتب میں"کتاب الأم" از امام شافعی، الجامع الکبیر،الجامع الصغیر،مختصر المزنی، المنثور، المسائل المعتبرة،کتاب الوثائق اور الترغیب وغیرہ ازامام مزنی،اسماعیل بن یحیٰی(م۲۶۴ھ)،"کتاب الرباء" از ابن زیادنیشاپوری (م۳۲۴ھ)،الفروع المبتکرة الغریبة،أدب القاضي اور الفرائض وغیرہ ازمحمد بن احمد حداد(م۳۴۴ھ)،شرح الرسالة ازامام قفال، محمد بن اسماعیل(م۳۶۵ھ)،شرح مختصر المزني ازقاضی ابوطیب طبری(م۴۵۰ھ)، الحاوی،أدب الدنیا والدین اور الأحکام السلطانیة وغیرہ ازعلی بن محمد ماوردی(م۴۵۰ھ)،الشامل اور الکامل از ابونصر صبّاغ(م۴۷۷ھ)،نہایة المطلب في درایة المذهب، الشامل في أصول الدین والإرشاد ازامام الحرمین جوینی (م۴۷۸ھ)،کتاب الوجیز،کتاب الوسیط،کتاب البسیط،اختصار

المختصر اورغاية الغور وغیرہ از امام غزالی (م ۵۰۵ھ)،شرح الوجیز از امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)،شرح المحرر اور شرح الوجیز از امام عبدالکریم رافعی (م ۶۲۳ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3.4 فقہ حنبلی

حنبلی اسکول کی اہم کتب میں الرسالة از عبدوس بن مالک (م ۲۵۰)، مسائل أحمد بن حنبل از ابوبکر اثرم (م ۲۶۱ھ)، الجامع از ابوبکر خلال (م ۳۱۱ھ)، کتاب السنة از حسن بن علی (م ۳۲۹ھ)،المختصر في الفقه از امام عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ)، الخلاف مع الشافعي از عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ)،الإرشاد اور شرح الخرقي از ابوعلی محمد بن احمد ہاشمی (م ۴۲۸ھ)،رؤوس المسائل، شرح المذاهب اور أدب الفقه از ابوجعفر بن ابی موسیٰ (م ۴۷۰ھ)،الفنون از علی بن عقیل ظفری (م ۵۱۳ھ)،المجموع في الفروع از ابوحسین بن فراء بغدادی (م ۵۲۶ھ)، المغني في شرح الخرقي از امام ابن قدامہ (م ۶۲۰ھ)،المنتقی،المحرر اور منتهى الغاية في شرح الهداية از امام ابن تیمیہ،عبدالسلام بن عبداللہ (م ۶۵۲ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3.5 فقہ جعفری

شیعی فقہی اسکول کی اہم کتب میں الکافي از محمد بن یعقوب کلینی (م ۳۲۹ھ)،من لا یحضره الفقیه از علی بن حسین قمی (۳۸۱ھ) المقنعة از شیخ مفید محمد بن نعمان تلعکبری (م ۴۱۳ھ)،الشافي از علی بن حسین موسوی (۴۳۶ھ)، کنز الفوائد از محمد بن علی کراجکی (م ۴۴۹ھ)،الناصریات از سید مرتضی،الانتصار،الاستبصار فیما اختلف من الاخبار اور تهذیب الأحکام از طوسی (۴۶۰ھ)۔

مذکورہ بالا اہم فقہی مکاتب کے علاوہ بھی دیگر فقہی اسکول عہد عباسی میں موجود تھے،لیکن وہ بہت دیر تک باقی نہ رہ سکے جیسے ابن حزم کا فقہی اسکول،لہٰذا ان کا ذکر یہاں نہیں کیا جا رہا ہے۔

فقہی مذاہب پر مشتمل کتابوں میں احکام القرآن کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ وہ فقہی احکام ومسائل سے بحث کرتی ہیں۔ان کتابوں کا ذکر قرآنی علوم کے تحت علم احکام القرآن کے تحت کیا جا چکا ہے۔

14.4.3.4 فقہی علوم

14.4.3.4.1 علم اصول فقہ

علم اصول فقہ سے مراد وہ اصول وضوابط ہیں جن پر فقہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔یہ اصول وضوابط، شریعت اسلامی کے بنیادی مآخذ (قرآن،حدیث،اجماع اور قیاس) کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور ان سے مسائل کے صحیح استنباط کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے وہ ”قواعد ومباحث کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ذریعے تفصیلی دلائل سے شریعت کے عملی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے“۔

فقہ اور اصول فقہ کی ابتدا اور اس کی ترقی وترویج کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں وسعت کے ساتھ گوناگوں مسائل جنم لینے لگے اور ان کے حوالہ سے علما کے مختلف فیصلے سامنے آنے لگے جو دھیرے دھیرے فکر وتشویش کا باعث بنتے چلے گئے، اس صورت حال نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ فقہی احکام کے حوالہ سے کچھ اصول مرتب کر دیں تا کہ کسی بھی معاملہ میں فیصلوں میں کسی حد تک یکسانیت پیدا ہو سکے۔

مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ ان اصول وضوابط کو سب سے پہلے امام ابو یوسفؒ نے (م ۱۸۲ھ) مرتب کیا تھا لیکن وہ زمانہ کے دست وبرد کا شکار ہو کر رہ گئے۔ان کے بعد امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) نے "الرسالة" میں انھیں مدون کر دیا تھا، لہذا انھیں ہی اس فن کا بانی سمجھا جاتا ہے۔اصول فقہ کے میدان میں امام محمد بن محمد ماتریدی (م ۳۳۳ھ) کی مآخذ الشرائع، امام قفال، محمد بن اسماعیل (م ۳۶۵ھ) کی **أصول الفقه**، امام ابو بکر جصاص (م ۳۷۰ھ) کی **أصول الجصاص**، امام عبید اللہ بن عمر دبوسی (م ۴۳۰ھ) کی **تقويم الأدلة**، عبد الجبار معتزلی کی بکتاب **العمدة**، ابو الحسین محمد بن طیب بصری معتزلی (م ۴۶۳ھ) کی **شرح العمدة**، امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) کی **كتاب البرهان**، امام سرخسی (م ۴۸۳ھ) کی **تمهيد الفصول في الأصول**، امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی **المستصفى**، امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) کی **كتاب المحصول** اور **معالم في أصول الدين**، سیف الدین آمدی (م ۶۳۱ھ) کی **أحكام الإحكام**، تاج الدین ارموی (م ۶۵۶ھ) کی کتاب "**الحاصل**"، ابن حاجب مالکی (م ۶۴۶ھ) کی **منتهى السؤل والأمل الى علمي الأصول والجدل**، امام بزدوی کی **أصول البزدوی** کا شمار اہم ترین کتب میں ہوتا ہے، جن میں سے بعض کی شروح لکھی گئیں اور خلاصے تیار کیے گئے تھے جو اپنے فنی مباحث کی وجہ سے مشہور ومعروف ہیں۔

14.4.3.4.2 علم الفرائض/علم المیراث

اسلام ایک فطری مذہب ہے، جس میں معاشرہ اور خاندان کے ہر فرد کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق وواجبات وغیرہ کو متعین کر دیا گیا ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔انسانی حیات کا ایک اہم باب وراثت بھی ہے۔اسلام نے اس حوالہ سے بھی احکام وقوانین بتائے ہیں جو نہ صرف کسی کو بھی اس کے ادنی سے ادنی حق محروم کرنے سے روکتے ہیں؛ بلکہ وہ اسلامی نظام وارثت کو دنیا کے تمام تر نظام وراثت سے ممتاز اور منفرد بناتے ہیں۔اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول: "اسلام کا قانون وراثت فطری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے، عائلی محبت کے رشتوں کو استوار کرتا ہے، فرد کے غیر معتدل احساس فردیت کو معتدل بنا کر سچا اجتماعی شعور پیدا کرتا ہے اور دولت کے غیر منصفانہ ارتکاز کو روکتا ہے"۔

علم میراث کا شمار فقہ اسلامی کے اہم فنون میں ہوتا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ فرمان نبوی "تعلموا الفرائض وعلموها الناس فانها نصف العلم" سے لگایا جاسکتا ہے۔

علم میراث کے موضوع پر عہد عباسی میں حسب ذیل کتب مرتب کی گئی ہیں:

"**كتاب الفرائض**" از حسن بن زیاد لولوی (م ۲۰۴ھ)، "**كتاب الفرائض**" از یزید بن ہارون بن زاذان واسطی (م ۲۰۶ھ)، "**كتاب الفرائض**" از امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، "**كتاب جامع الفرائض**" از عبد الحمید بن سہل (تیسری صدی ہجری)، "**الاجوزة الرحبية**" (منظوم) از محمد بن علی رجبی (م ۵۷۷ھ)، "**مفتاح الفرائض في علم الفرائض**" از محمد بن سعدان عصفیری (م نحو ۶۱۳ھ) وغیرہ۔

14.4.4 سوانحی ادب

اسلامی علوم وفنون میں سیرت وسوانح کا بھی شمار ہوتا ہے۔جوں جوں علم کا دائرہ وسیع ہوتا رہا توں توں بعض اصطلاحات بعض علوم

وفنون کے لیے مختص ہوتی چلی گئیں تاہم کبھی کبھی ان کا استعمال دیگر معنوں میں بھی کیا جاتا ہے۔مثال کے طور سیرت کے لفظ کو عام طور سے سیرت نبوی سے مختص کیا جاتا ہے اور دیگر افراد کی سیرت کے لیے لفظ سوانح کا استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ دونوں لفظ ایک دوسرے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

سوانحی ادب سے مراد' وہ تصانیف ہیں جن میں افراد کے حالات وواقعات تفصیل یا اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔تاریخ میں بھی افراد کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن تاریخ اور سوانح میں فرق یہ کہ تاریخ میں جن افراد کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ اس عصر اور معاشرہ کے پورے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے، جب کہ سوانح میں کسی فرد کی زندگی کو اجاگر کیا جاتا ہے،اس فن میں زمانہ کا ذکر ضمنی طور آتا ہے''۔

سوانحی ادب کو دینی اور غیر دینی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلی قسم میں سیرت رسول ﷺ کے علاوہ صحابۂ کرام ؓ ،راویان احادیثؒ،مفسرینؒ ومحدثینؒ اور صوفیہؒ وغیرہ کے حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں۔دوسری قسم میں عام اصناف علم وفن جیسے شعرا واطبا وغیرہ کے حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں۔

سوانحی ادب کے سرسری جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس فن کے جلو میں سیرت نبوی،طبقات صحابہ،فن اسماء الرجال،مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے تذکرے اور عمومی تذکرے پر مشتمل کتابیں مختلف انداز میں مرتب کی گئیں۔

14.4.4.1 سیرت نگاری

سوانحی ادب میں فن سیرت نبوی کو سب سے بلند پایہ مقام ومرتبہ حاصل ہے۔اس فن کا آغاز عہد صحابہ سے بلکہ عہد نبوی سے ہوجاتا ہے کہ بعض صحابہ کی مرویات میں آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف واقعات،شمائل وغیرہ کا ذکر ملتا ہے تاہم وہ سلسلہ زبانی روایات تک ہی محدود رہا۔عہد صحابہ میں کم از کم حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے حوالہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہفتہ کے سات دنوں میں سے ہر دن کو کسی نہ کسی علم کے درس وتدریس کے لیے مختص کردیا تھا۔ان علوم میں ''علم مغازی'' بھی تھا جس کا وہ ہفتہ میں ایک دن درس دیا کرتے تھے۔

ابتدا میں فن سیرت کو''علم مغازی'' سے موسوم کیا جاتا تھا اور اسے احادیث کے مجموعہ میں مرتب کیا گیا تھا،تقریبا حدیث کی ہر کتاب میں''کتاب المغازی'' کا باب شامل ہوتا تھا۔کچھ مواد تفاسیر میں ملتا ہے کہ مفسرین نے متعدد آیات کی تفاسیر میں آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا تھا،خاص طور سے ان آیات میں جن کا تعلق آپ ﷺ کی ذات گرامی سے تھا۔

تاہم عہد اموی میں یہ علم ایک مستقل فن کی شکل اختیار کرلیتا ہے کہ سیرت کی اولین کتاب ''مغازي عروة بن زبير''مرتب کی جاتی ہے۔اس کتاب کے بعد فن سیرت نبوی مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتا رہا جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے،تاہم اس کا بنیادی اور عہد زریں ''عہد عباسی'' ہی قرار پاتا ہے کہ اسی عہد میں سیرت نبوی کی تمام بنیادی اور اہم کتابیں مرتب کی گئیں تھیں۔

اس عہد میں فن سیرت نبوی ،فنی معارج کی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔اس عہد کے سب سے نمایاں سیرت نگار امام ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) ہیں،جن کی کتاب کو فن سیرت نگاری میں''ام الکتاب'' کا درجہ حاصل ہے۔انھوں نے خلیفہ منصور کی فرمائش پر سیرت کے موضوع پر ایک اہم اور ضخیم کتاب لکھی تھی جو زمانہ کی دست وبرد کا شکار ہوگئی۔ساتھ ہی ساتھ انھوں نے سیرت نبوی کا درس دینے کا باقاعدہ اہتمام کیا تھا اور شاگردوں کی ایک معتبر جماعت تیار کردی تھی جن میں سب سے نمایاں شاگرد ابن ہشام (م ۲۱۸ھ) ہیں،جن کی روایت کردہ

سیرت ''سیرت ابن ہشام''، ابن اسحاق کی مفقود کتاب کا نعم البدل بن گئی ہے۔

عہد عباسی کی کتب سیرت میں مذکورہ بالا دونوں کتب کے علاوہ کتاب المغازي از معمر بن راشد بصری (م ۱۵۷ھ)، کتاب المغازي از ابومعشر نجیح سندھی مدنی (م ۱۷۰ھ)، کتاب المغازي از عبدالملک بن محمد مدنی (م ۱۷۶ھ)، کتاب المغازي از علی بن مجاہد رازی (م ۱۸۳ھ)، کتاب المغازي از یحییٰ بن سعید اموی (م ۱۹۴ھ)، امام واقدی (م ۲۰۷ھ) کی کتاب المغازي، تركة النبي از حماد بن اسماعیل ازدی (م ۲۶۷ھ)، أمهات النبي ﷺ از محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ)، سيرة النبي والخلفاء الراشدين از ابوزرعہ دمشقی (م ۲۸۰ھ)، مشہور محدث محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ) کی الشمائل النبوية والخصائل المصطفوية/کتاب الشمائل، کتاب صفة النبي از ابن شعیب انصاری (م ۳۵۳ھ)، ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ)، کتاب الوفاء بأحوال المصطفى، الروض الأنف از عبدالرحمن سہیلی (م ۵۸۱ھ)، سيرة النبي وأصحابه العشرة از حافظ عبدالغنی مقدسی (م ۶۰۰ھ) اور الاملاء المختصر في شرح غريب السير از ابوذر خشنی (م ۶۰۴ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- علم حدیث کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مراحل تدوین کو بیان کیجیے۔

2- عہد عباسی کے سرمایۂ فقہ پر روشنی ڈالیے۔

14.5 سائنسی علوم وفنون

خالص سائنسی علوم وفنون کی بنا عہد اموی میں پڑ چکی تھی۔ اس سمت میں پیش رفت کرنے کا سہرا حضرت خالد بن یزید اموی کے سر بندھتا ہے۔ عہد عباسی کے علما نے انہیں کے لگائے ہوئے پودے سے استفادہ کیا، پھر اس میں اپنے تجربات ومشاہدات سے اضافہ کیا اور آخر کار اس منصب پر پہنچ گئے جہاں وہ غیر عربی سرمایہ سے بے نیاز ہو گئے اور معروضی اور حقیقی تجربات کی روشنی میں سائنسی علوم کو پختہ بنیادوں پر قائم کیا تھا۔

قبل اس کے کہ سائنسی علوم پر گفتگو کا آغاز کیا جائے اس بات کی وضاحت بہتر معلوم ہوتی ہے کہ عہد عباسی میں ''إخوان الصفا'' جیسی علمی تحریک پروان چڑھی تھی جس میں فلسفہ، زندگی کے اسرار ورموز اور اس جیسے دیگر مسائل کو زیر بحث لایا گیا تھا جنھیں ''رسائل أخوان الصفا'' کے نام سے مرتب کر دیا گیا تھا۔ ان رسائل میں عہد عباسی کی علمی تحریک پر بھی جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف علوم وفنون میں عباسی علما وفضلا کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اس کتاب میں کئی ایک موضوعات پر بحث کی گئی ہے لہذا اس کا بار بار ذکر کرنے کی بجائے صرف یہیں ذکر کر دیا گیا ہے۔

14.5.1 کیمیا (کیمسٹری)

فن کیمیا کی بنیاد خالد بن یزید اموی نے ڈالی تھی کہ انھیں سائنسی علوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس فن پر یونانی کتب کا ترجمہ کروایا، خود تجربات کیے اور کتاب الحرارات، کتاب الصحيفة الكبير اور کتاب الصحيفة الصغير جیسی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں ہیں۔

عہد عباسی کے اولین کیمیا داں کا نام جابر بن حیان (م ۲۰۰ھ) ہے جو خالد بن یزید کے شاگرد تھے۔ وہ زندگی بھر مختلف دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش میں لگے رہے جس کے نتیجہ میں انھیں دھاتوں کے خواص کا علم حاصل ہوتا چلا گیا تھا۔ انھوں نے سائنسی نظریات کے ساتھ ساتھ سائنسی تجربات پر زور دیا ہے۔ اس فن کو پروان چڑھانے میں ان کا کردار کافی اہم ہے۔ انھوں نے مختلف قسم کے تیزاب بنائے تھے، دھاتوں کے پگھلانے اور بھاپ کے ذریعہ کسی چیز کو معدوم کرنے کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ اس موضوع پر سو سے زائد کتابیں ان کی منسوب کی جاتی ہیں جن میں أسرار الكيمياء، أصول الكيمياء، العهد، كتاب الرحمة، كتاب التجميع، الذبياق الشرقي اور كتاب السبعين زیادہ اہم ہیں۔

عہد عباسی کے ماہرین کیمیا میں مشہور صوفی ذوالنون مصری، ابوبکر رازی، ابن وحشیہ جنبلاوی، عثمان بن سوید اخمیمی، راہب اصفن، ابوبکر علی بن محمد خراسانی، محمد بن یزید دبیس، ابوالعباس احمد بن محمد، ابوابراہیم اسحاق، ابوجعفر محمد بن علی شلمغانی، یعقوب کندی (م ۲۵۴ھ)، ہمدانی، ابوحیان توحیدی (م ۴۱۴ھ)، ابن سینا، محمد بن مالک صالحی خوارزمی (م ۴۲۵ھ)، مؤید الدین طغرائی (م ۵۵۳ھ) اور موسی بن ارفع انصاری (م ۵۵۳ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

اس فن پر لکھی جانے والی اہم کتب میں سر الأسرار از امام رازی، مقالة وجوب صناعة الكيمياء از فارابی (م ۳۳۹ھ)، عين الصنعة وعون الصناع از محمد بن مالک صالحی خوارزمی (م ۴۲۵ھ)، حقائق الاستشهاد، كتاب الأنوار والمفاتيح، مفاتيح الرحمة اور أنوار الحكمة از مؤید الدین طغرائی، شذور الذهب از ابوالحسن موسی بن ارفع انصاری (م ۵۵۳ھ)، أبطال دعوى المدعين صناعة الذهب والفضة من غير معادنها از یعقوب کندی، الجوهرتين العتيقتين از ہمدانی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

14.5.2 طبیعیات (فزکس)

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم فنون میں طبیعیات کا بھی شمار کیا جاتا ہے، تاہم اس فن کے متعلق معلومات بہت کم دستیاب ہیں جس کی غالباً بنیادی وجہ اس کا ریاضی اور علوم فلکیات وہندسہ سے گہرا تعلق ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ علم ان علوم سے خلط ملط ہوکر رہ گیا اور اس کی واضح شکل وصورت سامنے نہ آسکی اور ماہرین طبیعیات کی کاوشیں اور کارنامے سب کے سب مذکورہ علوم کے کھاتے میں چلے گئے۔

مسلم ماہرین فن نے طبیعیات کو "العلم الطبيعي" کا نام دیا ہے جب کہ فارابی نے اس کے یونانی نام کو معرب کرتے ہوئے اسے "الفيزيقيا" سے موسوم کیا ہے۔

عہد عباسی میں فن طبیعیات کے ماہرین میں جن شخصیات کا شمار کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں: یعقوب کندی (م ۲۵۷ھ) مؤلف علم البصر، امام ابوبکر ارزی مؤلف "سبب وقف الأرض في السماء"، امام فارابی، امام ابن سینا، ابوریحان بیرونی، ابوالبرکات بغدادی (م ۵۴۷ھ)، ابن مسکویہ، ابومعشر بلخی اور ابن ہیثم (م ۴۳۰ھ) ابن ہیثم مؤلف "كتاب المناظر" وغیرہ۔

14.5.3 طب (میڈیسن)

فن طب کو بنیادی طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔ عملی طب، ۲۔ نظریاتی طب۔ عملی طب ہر جگہ اور ہر زمانہ میں موجود رہا ہے،

لیکن اس موضوع پر کوئی سرمایہ موجود نہیں ہے، وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور معاشرہ کی ضروریات کو پوری کرتا رہا۔ نظریاتی طب/علمی طب کا آغاز عہد نبوی سے ہوتا ہے، بعض احادیث میں مختلف اشیا کی صفات وفوائد کا ذکر ملتا ہے۔ ان احادیث کو طب نبوی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعد کے علما جیسے ابن قیم الجوزیہ (م ۷۵۱ھ) نے طب نبوی پر مشتمل تمام روایات کو یکجا کر کے اسے کتابی شکل دے دی۔

اموی دور میں بھی اس فن کے دونوں پہلوؤں (عملی اور نظری) پر کام کیا گیا، خالد بن یزید کی کوششوں سے پہلی مرتبہ یونان کے نظریاتی طب کا تعارف اسلامی دنیا میں کرایا گیا۔ دیگر اموی خلفا - خصوصاً خلیفہ مروان بن حکم - نے بھی اس فن کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

فن طب کا آغاز وارتقا تو یونان وہند میں ہوا لیکن اس کو ایک خاص منہج دینے اور قالب میں ڈھالنے کا فریضہ عرب اطبا نے انجام دیا۔ پتھری نکالنے اور چیچک کا علاج مسلم اطبا کی اولیات میں سے ہے۔ انھوں نے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی علم طب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت جلد اپنی جداگانہ راہ بنالی۔ انھوں نے قدیم طبی سرمایہ میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ نت نئے تجربات سے فن طب کا دامن اس قدر وسیع اور مالا کر دیا کہ یورپ میں آج صرف اسی کا بول بالا ہے۔

جدید طب کو فروغ دینے میں مسلمانوں کی کوششوں اور کاوشوں کا دخل ہے، انھوں نے ہی جنوبی اٹلی کے شہر سلرنو میں پہلا میڈیکل کالج کھولا تھا۔ بارہویں صدی میں یورپ کے مختلف شہروں میں جیسے بولونیہ، پادووہ اور پیرس میں جدید علوم کے فروغ کے لیے کئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جہاں متقدمین کی عربی کتابوں، خاص طور سے بوعلی سینا کی القانون في الطب، امام رازی کی المنصوری کے تراجم کی روشنی میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیے جاتے تھے۔

عہد عباسی کے مشہور اطبا میں یعقوب کندی (م ۲۵۷ھ) مؤلف **طبقات الأطباء**، عملی اور نظری طب کے ماہر، چیچک کا علاج دریافت کرنے والے اور رَے اور بغداد کے شفاخانے کے نگراں (ڈین/انچارج) محمد بن زکریا رازی (۳۲۰ھ) مؤلف **کتاب الحاوي**، **سر الطب**، **المرشد**، **کتاب التفهيم والتشجير**، **کتاب الجدرى والخصبة** اور **کتاب الطب الملوكي** وغیرہ، مختلف دواؤں کے موجد موفق بن علی ہروی (م ۳۴۰ھ) مؤلف **حقائق الأدوية**، امراض چشم کے ماہر اور موتیا بند کا آپریشن کرنے والے ا بوالقاسم عمار موصلی (م ۳۸۸ھ) مؤلف **علاج العين**، مشہور فلسفی وطبیب ابن مسکویہ (۴۲۱ھ) مؤلف **کتاب الأشربة** اور **کتاب البطيخ**، شیخ بوعلی بن سینا (م ۴۲۸ھ) مؤلف **کتاب القانون في الطب**، **کتاب الأدوية القلبية** اور **کتاب القولنج** اور امراض چشم کے ماہر علی بن عیسی (م ۴۴۱ھ) مؤلف **تذكرة الكحالين** وغیرہ شامل ہیں جن کے تجربات، مشاہدات اور علمی کاوشوں پر جدید علم طب اور میڈیکل سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

14.5.4 ریاضی، ہندسہ اور حساب

مسلم علما وفضلا نے ریاضی، ہندسہ اور حساب اور اس کی مختلف شاخوں کے حوالہ سے اہم کارنامے انجام دیے ہیں جو آگے چل کر یورپ میں پروان چڑھنے والے مذکورہ فنون کے لیے خشت اول ثابت ہوئے تھے۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ: ''الجبرا کے لفظ سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بانی مسلمان ہیں۔ امام خوارزمی کی کتاب "**الجبر والمقابلة**" کے انگریزی ترجمہ سے اہل یورپ نے کافی استفادہ کیا تھا۔ مشہور مستشرق نالینو (Nalino)، مسلمانوں کو اس فن میں یورپ کا استاد مانتے ہیں''۔

مذکورہ مقالہ نگار مزید لکھتے ہیں: ''فن ہندسہ کے بانی تو اہل ہند ہیں لیکن اس سے یورپ کو روشناس کرانے کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھتا ہے۔انھوں نے اہل ہند کے اس فن سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف مشینوں کی ایجاد میں بھی گراں قدر کارنامے انجام دیے تھے جن کی مدد سے وہ بہت سی عظیم الشان جنگوں میں کامیاب وکامران رہے تھے''۔

عہد عباسی میں-خاص طور سے عہد مامونی میں-فن ریاضی وحساب نے ترقی کے اہم مراحل طے کیے۔خلیفہ مامون کے زمانے میں خانوادۂ بنوشاکر نے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔اس خاندان کے تمام افراد ریاضی کی تمام شاخوں مثلا ہندسہ،علم الحیل والحرکات(Mechanics)اور اقلیدس وغیرہ کا خاص ذوق رکھتے تھے۔وہ نہ صرف اس علوم کے ماہر تھے بلکہ انھوں نے اس میں عجیب ونادر کتابیں لکھیں جو''حیل بنوموسیٰ'' کے نام سے مشہور ہیں۔

عباسی دور کے مشہور ریاضی دانوں میں احمد عبداللہ حبش(م ۲۱۴ھ)،یحییٰ بن ابی منصور(م ۲۱۴ھ)،حجاج بن یوسف مطر(م ۲۱۴ھ) مؤلف مقدمات اقلیدس،ابوطیب سند بن علی (م ۲۲۴ھ) مؤلف کتاب المنفصلات والمتوصلات،کتاب الحساب الهندي،کتاب الجمع والتفريق،کتاب القواطع،اور کتاب الجبر والمقابلة،عباس بن سعید جوہری(م ۲۲۹ھ)،خانوادہ بنوشاکر،محمد بن موسیٰ(م ۲۵۳ھ)،احمد بن موسیٰ(م ۲۴۰ھ)اور حسن بن موسیٰ(م ۲۵۴ھ)مؤلف ''كتاب الحيل''،محمد بن موسیٰ خوارزمی (م ۲۳۲ھ) مؤلف''الجبر والمقابلة''،ابومحمد عدلی قاینی(م ۳۷۷ھ)مؤلف ''كتاب المساحة''،ابوالوفاء بوزجانی(م ۳۸۸ھ)،ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد(م ۴۴۰ھ) مؤلف'' الآثار الباقية''و''القانون المسعودي'، ابوالحسن علی احمد نسوی(م ۴۴۰ھ)،عمر خیام،عمر بن ابراہیم (م ۵۲۶ھ)مؤلف ''المكعبات،الجبر والمقابلة۔وغیرہ حضرات بہت اہم ہیں۔

مذکورہ بالا اہم اور باکمال ماہرین فن کے علاوہ نوبخت(م ۱۵۷ھ)،ان کے بیٹے فضل(م ۱۹۷ھ)محمد بن جابر بنانی(م ۳۰۵ھ)،محمد بن احمد خوارزمی(م ۳۶۱ھ)، ابوسہل وَیجَن بن رستم(م نحو ۳۹۰ھ)ابوالحسن کوشیار(م ۴۵۹ھ)،مظفر اسفرازی(م ۵۱۵ھ) موجد میزان آرشمیدس،ابوعباس لوکری،ابوفتح کوشک اور ابن رقیقہ(م ۶۳۵ھ) نے بھی فن ریاضی وہندسہ میں شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔

14.5.5 علم ہیئت اور نجوم

علم ہیئت ونجوم کا شمار بھی ان علوم وفنون میں ہوتا ہے جن سے عرب تحریک ترجمہ کے واسطہ سے واقف اور روشناس ہوئے تھے جس کی خشت اول عہد اموی میں ڈالی جاچکی تھی لیکن دیگر علوم کی طرح انھوں نے اس علم میں بھی جلد ہی اپنا لوہا منوالیا اور اہم وبنیادی علمی سرمایہ فراہم کیا۔لہذا یہ کہنا کہ اس علم کو پروان چڑھانے میں مسلمان علما وفضلا کی کوششوں کا بہت زیادہ دخل ہے تو غلط اور بیجا نہیں ہوگا۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ''اس فن کو فن کے درجہ تک پہنچانے کا سہرا صرف مسلم علما،خاص طور سے عہد عباسی کے علما کے سر بندھتا ہے۔انھوں نے اپنے مدمقابل آسماں پر پائے جانے والے ستاروں کی ایک فہرست تیار کی تھی اور جس نام سے ان ستاروں کو موسوم کیا اس میں آج تک تبدیلی نہیں کی جاسکی۔اس فن میں علمائے یورپ نے اپنا پہلا قدم مشہور منجم وہیئت داں فرغانی کی کتاب''مبادیات علم النجوم'' کی روشنی میں اٹھایا تھا'۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ علم ہیئت،علم نجوم،علم ریاضی،ہندسہ اور حساب کا آپس میں بہت ہی گہرا تعلق ہے اور وہ تقریبا ایک دوسرے سے لازم وملزوم ہیں کی جو ہیئت ونجوم کا ماہر ہوگا وہ ریاضی وہندسہ یا کم ازکم ریاضی کا بھی ماہر ہوگا یہی وجہ ہے عہد عباسی کے بہت سے

علما وفضلا مذکورہ بالا تمام فنون میں یکساں قدرت ودست گاہ رکھتے تھے۔

عباسی خلیفہ منصور کو اس علم سے خاصا شغف ودلچسپی تھی جس کے نتیجہ میں اس علم نے ترقی کی کئی منازل طے کر لی تھی۔ دیگر عباسی خلفا جیسے خلیفہ مہدی، خلیفہ ہارون رشید اور خلیفہ مامون کو بھی اس فن سے بہت شغف ودلچسپی تھی لہذا یہ علم دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔

عہد عباسی کے ماہرین فلکیات، و ہیئات وریاضیات کی فہرست طویل ہے ، ان میں سے چند مشہور یہ ہیں: ابراہیم بن جندب (م ۱۵۷ھ) مؤلف **علم الحیل** (علم میکانک)، یحییٰ بن ابی منصور (م ۲۱۴ھ) مؤلف **کتاب الزیج الممتحن** ، **کتاب الارصادلة** اور **مجموعة رسائل أبی جماعة في الارصاد**، احمد بن کثیر فرغانی (م ۲۲۳ھ) مؤلف "**جوامع علوم النجوم**علی بن عیسی اصطرلابی (م ۲۲۴ھ)، ثابت بن قرہ حرانی (م ۲۸۸ھ) مؤلف **ترکیب الأفلاک**، **طوابع الکواکب**، **الھیئة**، **علة الکسوف والخسوف**، **الرصد** اور **العمل في الکرة**، ابر بن سنان (م ۲۹۱ھ)، محمد بن جابر بنانی (م ۳۰۵ھ)، محمد بن احمد خوارزمی (م ۳۶۱ھ)، ابومحمد عدلی قاینی (م ۳۷۷ھ)، ابوالوفا جوزجانی (۳۸۸ھ) مؤلف "**کتاب المنازل**" اور "**کتاب الزیج**"، عمر بن خیام (م ۵۲۶ھ)۔

مذکورہ بالا علم ہیئت ونجوم کے ماہرین واکابرین کے علاوہ فضل بن نوبخت (م ۱۹۷ھ)، موسی بن شاکر (م ۲۱۳ھ)، ان کے بیٹوں- محمد، احمد ،حسن-، شیخ بوعلی ابن سینا (م ۳۷۰ھ)، ابن اعلم علوی (م ۳۷۹ھ)، احمد بن محمد سجستانی (م ۴۳۳ھ)، علی نسوی (م ۴۴۰ھ)، ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۴۰ھ) اور مظفر اسفرازی (م ۴۶۰ھ) کا شمار بھی عہد عباسی کے اہم ماہرین فلکیات اور ہیئت دانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس موضوع پر گرانقدر کارنامے انجام دیے تھے۔

14.5.6 علم جغرافیہ

علم جغرافیہ کے پروان چڑھنے کا بنیادی سبب تو قرآن کریم ہی ہے، تاہم اس فن کی ترویج میں حدیث نبوی اور سیرت نبوی نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے کہ جن جن مقامات کا ذکر ان میں آیا تھا اس کی تحقیق وتلاش میں عرب جغرافیہ دانوں نے اپنی پوری توانائی صرف کردی تھی جس کا اندازہ سید سلیمان ندوی کے مذکورہ بالا قول سے لگایا جاسکتا ہے۔

اس علم میں مسلمانوں کی خدمات (خاص طور سے عہد عباسی میں) کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انھیں دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆عرب کے جغرافیہ پر مشتمل کتب

☆عرب کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے جغرافیہ پر مشتمل تالیفات

مذکورہ بالا دونوں قسم کی تالیفات میں مسلمان جغرافیہ دانوں نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اپنی اپنی کتابوں میں مختلف انداز سے معلومات کا ذکر کیا ہے۔ اس فن میں "کتاب النوادر" از ابوزیاد کلابی کی کتاب کو عربی کی پہلی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ مصنف نے ۲۰۰ھ کے اواخر میں اس کتاب کو تالیف کیا تھا۔

عہد عباسی کے مشہور جغرافیہ دانوں میں ابوزید بلخی مؤلف **صور الأقالیم**، ابن خرداذبہ (م ۲۸۰ھ) مؤلف **المسالک**

والممالک، احمد بن فضلان (م۳۰۹ھ) مؤلف جغرافیا، یعقوبی (۳۱۵ھ) مؤلف کتاب البلدان، ابراہیم بن محمد اصطخری (م۳۴۶ھ) مؤلف صور الأقالیم اور مسالک الممالک، علی بن حسین مسعودی (م۳۴۶ھ) مؤلف مروج الذهب ومعدن الجوهر، ابن حوقل، محمد بن علی (م بعد ۳۶۷ھ) مؤلف المسالک والممالک أو صورة الأرض، محمد بن احمد مقدسی بشاری (م نحو ۳۸۰ھ) مؤلف أحسن التقسيم في معرفة الأقاليم، محمد بن محمد ادریسی (م۵۶۰ھ) مؤلف نزهة المشتاق في ذكر الأمصار والأقطار والبلدان اورروض الانس ونزهة النفس المعروف بالممالک والمسالک، اور یاقوت بن عبداللہ رومی حموی (م ۶۲۶ھ) مؤلف معجم البلدان اور مراصد الاطلاع علی أسماء الأماكن والبقاع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

14.5.7 علم معدنیات (Geology,Minerology)

عہد عباسی میں اس فن کا آغاز ارسطو کی کتب کے ترجمے سے ہوتا ہے۔مسلمان علما نے اس فن میں گرانقدر کارنامے انجام دیے ہیں جس نے آگے چل کر کان کنی اور علم ارضیات جیسے فنون کو پروان چڑھایا تھا۔

اس فن کو علم کیمیا سے یک گونہ تعلق ہے۔عہد عباسی کے علما نے قیمتی پتھروں کے خواص اور مختلف قسم کی معدنیات کو دریافت کیا تھا اور تجربات کو کتابی شکل میں ''حجریات'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ اس میدان کے ماہرین میں جابر بن حیان (م۲۰۰ھ)،عطارد بن محمد حاسب (م۲۱۴ھ) ابوطیب سند بن علی (۲۲۴ھ)، یعقوب کندی (م۲۵۴ھ)، ابوریحان بیرونی محمد بن احمد (م۴۴۰ھ) اورشہاب الدین طفاشی (م۶۵۱ھ) ہیں۔

مذکورہ بالا ماہرین فن نے اپنے تجربات کی روشنی میں اصلی اور نقلی دھاتوں کی پہچان،قیمتی پتھروں کے اوصاف اور مختلف قسم کی دھاتوں اور معدنیات کے متعلق قیمتی معلومات کو اپنی اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔

اس فن کی اہم کتابوں میں کیمان المعادن، کتاب الجوهر الكبير، رسائل في الحجر از جابر بن حیان، الجواهر والأحجار ازعطارد بن محمد حاسب، رسالة فيأنواع الجواهر الثمينة اور رسالة في أنواع الحجارة والجواهر از یعقوب کندی، کتاب أزهار الأفكار في جواهر الأحجار ازشہاب الدین طفاشی وغیرہ ہیں۔

اس فن کے نمایاں ماہرین میں ابوریحان بیرونی کا شمار ہوتا ہے۔انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے ''الجماهر في معرفة الجواهر'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔انھوں نے اٹھارہ قیمتی پتھروں کی قدر ثقالت کی تقریباً صحیح حد متعین کی ہے۔

شہاب الدین طفاشی (م۶۵۱ھ) نے اپنی کتاب ''أزهار الأفكار في جواهر الأحجار'' میں پچیس قیمتی پتھروں کا مطالعہ کر کے ان کے مآخذ، جغرافیائی کیفیات، خالص ہونے، اس کی قیمت اور طبی اوصاف پر بحث کی ہے۔طفاشی کی کتاب کا شمار اس فن کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔

14.5.8 علم نباتات (Botany)

یہ علم فن حیاتیات (Biology) کی ایک شاخ ہے جس نے آگے چل کر ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔اس علم میں نباتات کے

خواص واوصاف، ان کی اقسام، فوائد ونقصانات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔اس فن کے ماہرین نے جڑی بوٹیوں کی ہزاروں اقسام دریافت کیں اور ان کے اوصاف وخواص وغیرہ کو اپنی اپنی کتابوں میں اجاگر کیا ہے۔اس علم نے دواسازی اور رنگ سازی اور علم زراعت (Agronomy) کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس فن کی نمایاں تصانیف میں جابر بن حیان (م ۲۰۰ھ) کی کتاب الدود، عبدالملک اصمعی (م ۲۱۳ھ) کی کتاب النبات والأشجار، جاحظ (م ۲۵۵ھ) کی کتاب الزرع والنخل، ابوحنیفہ دینوری (م ۲۸۵ھ) کی کتاب النبات، ابن وحشیہ، احمد بن علی (م بعد ۲۹۱ھ) کی أسرار الطبیعیات في خواص النبات، ابن سینا (م ۳۷۰ھ) کی القانون في الطب، محمد بن احمد تمیمی (م نحو ۳۹۰ھ) کی ماھیة الرمد وأنواعه وأسبابه وعلاجه اور المرشد الی جواهر الأغذية، موفق بن علی ہروی کی کتاب الابنية عن حقائق الأدوية، علی بن عیسی (م ۴۲۱ھ) کی تذکرة الکحالیین اورابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۴۰ھ) کی الصیدلة في الطب، محمد بن محمد ادریسی (م ۵۶۰) کی الجامع لصفات أشتات النبات وغیرہ شامل ہیں۔

14.5.9 علم حیوانات (Zoology)

اس علم کو پروان چڑھانے میں عباسی علما اور ماہرین فن نے نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔یہ علم بھی دراصل فن حیاتیات (Biology) کی ایک شاخ ہے جس نے آگے چل کر ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔اس فن پر سب سے پہلے جاحظ (م ۲۵۵ھ) نے قلم اٹھایا تھا۔ان کی کتاب ''کتاب الحیوان''بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ''طبعی خصائص سے زیادہ مذہبی اور افسانوی چیزوں پر زور دیتی ہے لیکن وہ اس فن کی اولین کتابوں میں ہے،اس میں بہرحال نظریۂ ارتقا،حیوانی نفسیات وجبلت کا اچھا بیان پایا جاتا ہے''۔

اس فن میں نمایاں کردار ادا کرنے والے علما میں ابوعبیدہ معمر بن مثنی (م ۲۰۹ھ) ہیں۔انھوں نے اس موضوع پر تقریباً سو سے زائد کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے نصف کتابیں صرف گھوڑے اوران کی اقسام، عادات وخصائل اور دیگر متعلقات کو بیان کرتی ہیں اور باقی ماندہ کتابیں دیگر حشرات ارض جیسے اونٹ، بھیڑ، بکری، سانپ، بچھو وغیرہ سے بحث کرتی ہیں۔ان کی کتابوں میں طبقات الفرس، کتاب الخیل، کتاب الحیات اور کتاب العقارب جیسی کتب شامل ہیں۔

عبدالملک اصمعی (م ۲۱۳ھ) نے بھی اس فن پر قلم اٹھایا ہے۔انھوں نے کتاب الخیل، کتاب الإبل، کتاب الوحوش، کتاب الشاة جیسی کتب لکھی ہیں۔

مشہور فلسفی کندی نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے لیکن ان مطالعہ کے محور کا زیادہ حصہ پرندوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے اپنے حاصل مطالعہ کو رسالة في الطائر الانسي، رسالة في تمريخ الحمام، رسالة في النخل، اور رسالة في الحشرات جیسے رسائل میں پیش کیا ہے۔

عہد عباسی کے دیگر علما نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن انھوں نے اپنے حاصل مطالعہ کو مستقل کتب میں پیش کرنے کی بجائے انھیں منتشر انداز میں نقل کیا ہے جیسے ابن سینا نے کتاب الشفاء میں حیوانات کی نفسیات کو اجاگر کیا ہے اور ابن مسکویہ نے نظریۂ ارتقا پر بحث کرتے ہوئے حیوانات کے بارے میں عمدہ بحث کی ہے۔اسی طرح ابن قتیبہ دینوری نے عیون الأخبار میں اس علم کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

معلومات کی جانچ

1-عہد عباسی میں علم معدنیات کے فروغ پر روشنی ڈالیے۔

2-عہد عباسی میں علم جغرافیہ کے فروغ پر ایک نوٹ لکھیے۔

14.6 سماجی علوم

14.6.1 علم تاریخ

علم تاریخ کی ابتدا سیرت نبوی سے ہوتی ہے،قرآن میں چند مقامات وواقعات، چند قوموں اور حکومتوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جن کی تحقیق نے مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سیرت نبوی کو مدون ومرتب کریں۔سیرت نبوی کے جلو میں سیرت صحابہ، عام سوانح نگاری اور اسماء الرجال جیسے فنون پروان چڑھے۔اردو دائرہ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول:''مغازی کی ہردلعزیزی، عام فتوحات کی تاریخ نویسی کا موجب بنی''۔تاریخ نویسی کی بنیاد عہد اموی میں ڈالی گئی،حضرت معاویہؓ کی فرمائش پر عبید بن شریہ نے ''کتاب الملوک وأخبار الماضیین'' نامی کتاب لکھی، جسے علم تاریخ کی پہلی کتاب بھی قرار دیا جاتا ہے۔عہد اموی میں اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں زیاد بن ابیہ،ابومخنف،عوانہ بن حکم اور وہب بن منبہ وغیرہ شامل ہیں۔ان اوائل مؤرخین کی کتابیں زمانہ کی دست وبرد کا شکار ہو چکی ہیں بس ان کا ذکر مصادر میں پایا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں اس فن کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا کہ اس کی مختلف شکلیں سامنے آئیں بلکہ یہ کہا جائے کہ حقیقی تاریخ نویسی کا آغاز اسی عہد میں ہوا تو بیجا نہیں ہوگا۔عہد عباسی کے دور اول میں تاریخ نویسی،سیرت نبوی اور مغازی کی شکل میں سامنے آئی تھی جس کی وجہ سے اسے سیرت ومغازی کا دور کہا جاتا ہے۔اس عہد کی مشہور کتب سیرت ومغازی میں ابن اسحاق (م۱۵۱ھ)،ابن ہشام (م۲۱۸ھ)، واقدی (م۲۰۷ھ) اور ابن سعد (م۲۳۰ھ) کی کتب سیرت ومغازی شامل ہیں۔عہد عباسی میں لکھی جانے والی کتب سیرت کا ذکر سوانحی ادب کے تحت کیا جا چکا ہے۔

دوسرے دور میں فتوحات کی کثرت اور اسلامی رقبہ کی وسعت کی وجہ سے تاریخ نویسی نے سیرت ومغازی کی جگہ لے لی اور مؤخر الذکر فن نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔عہد عباسی کے مشہور مؤرخین میں احمد بن یحییٰ بلاذری (م۲۷۹ھ)،محمد بن جریر طبری (م۳۱۰ھ)، علی بن حسین مسعودی (م۳۴۶ھ)، احمد بن اسحاق یعقوبی (م۳۱۵ھ)،ابن مسکویہ،احمد بن محمد (۴۲۱ھ)، خطیب بغدادی،احمد بن علی (م۴۶۳ھ)،ابن عساکر،علی بن حسن (م۵۷۱ھ)،ابن اثیر،علی بن محمد (م۶۳۰ھ)،،ابن ایاس،حمزہ اصفہانی،ابن جوزی (م۵۹۷ھ) اور عبدالرحمن بن محمد ادریسی وغیرہ شامل ہیں۔

متقدمین کی کتب تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں تاریخ نویسی کے دو بنیادی طریقے رائج تھے:

ا۔واقعات کو سنین کے اعتبار سے سند کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔اس طرز تالیف میں نہ تو واقعات کی ترتیب میں تسلسل پایا جاتا ہے اور نہ ہی عبارت کا ربط برقرار رہتا ہے۔اس طرز تالیف کے نمایاں مؤرخین میں محمد بن جریر طبری (م۳۱۰ھ)،ابن اثیر جزری،علی بن محمد

(م ۶۳۰ھ) وغیرہ ہیں۔ تاریخ کے لغوی معنی ’’وقت کی تعیین‘‘ کے اعتبار سے تاریخ نویسی کا یہ طریقہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن واقعات اور عبارات میں عدم تسلسل اور ان کے درمیان ربط کے فقدان کی وجہ سے کچھ گراں بھی محسوس ہوتا ہے۔

اس طرز تالیف کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے اس طرز اسلوب کی پیروی کرنے والے مؤرخین کا بنیادی مقصد ’’مجرد واقعات نگاری‘‘ تھا کہ جو کچھ پیش آیا ہے اسے من وعن پوری امانت ودیانت کے ساتھ قلم بند کردیا جائے۔

۲۔ دوسرا طرز تالیف قرآن کے واقعات کو بیان کرنے کے طرز وانداز سے متاثر ہوکر سامنے آیا تھا کہ قرآن میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کر کے اس سے کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچنا تھا۔ قرآن میں مذکور واقعات سے کسی نتیجہ کا اخذ کرنے کو اصول وکلیہ بناتے ہوئے کچھ مؤرخین نے اپنی کتب تاریخ میں واقعات کو ایک تسلسل اور ترتیب سے بیان کرتے ہوئے حکومتوں کے عروج وزوال سے بھی بحث کا آغاز کیا تھا۔ اس طرز تاریخ نویسی میں علی بن حسین مسعودی (م ۳۴۶ھ)، ابن طقطقی، ابن خلدون اور ابن عبری وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے طرز تالیف کے حوالہ سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ پوری طرح سے قرآن کے واقعات بیان کرنے کے طرز واسلوب کی پیروی ہے کہ مؤرخ کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ گزرے ہوئے واقعات وحوادث کو بیان کردیا جائے بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان واقعات وحوادث کے درمیان پائے جانے والے ربط کو بھی اجاگر کرے اور ان کی تعلیل وتحلیل بھی کرے اور ان اسباب وعلل کی نشان دہی کرے جو قوموں کے عروج وزوال کا سبب وباعث ہوسکتے ہیں۔

دوسرے دور میں تاریخی واقعات میں نقد وتبصرہ کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں، لہذا علی بن حسین مسعودی (م ۳۴۶ھ)، ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) اور حمزہ بن حسین اصفہانی (م ۴۲۸ھ) کی کتب میں واقعات وحوادث پر تنقیدی اشارات ملتے ہیں۔ یہ تنقیدی اشارات آگے چل کر مکمل اور کھل کر سامنے آتے ہیں، مؤرخ فخری کی کتاب ’’الآداب السلطانية‘‘ میں افراط وکثرت کے ساتھ تنقیدی مواد ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں عباسی خلفا، خاص طور سے ہارون رشید پر سخت تنقید کی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے علما وفضلا کو کس قدر علمی آزادی حاصل تھی۔

عہد عباسی میں عالمی تاریخ نویسی کا رجحان سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے اس عہد کی تاریخ نویسی کو عالمی تاریخ نویسی اور مقامی تاریخ نویسی کے دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم کی کتب وتصنیفات میں ابتدائے آفرینش سے تاحال زمانہ مؤلف تک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے جب کہ دوسری قسم کی کتابوں میں کسی مخصوص علاقہ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے جس میں اس علاقہ کی تاریخ، وہاں کے تمدن وثقافت کے ساتھ ساتھ اس علاقہ کے سربرآوردہ اور مشہور اشخاص کے حالات زندگی بھی بیان کیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کا شمار جیسے ’’تاریخ بغداد‘‘ اور ’’تاریخ دمشق‘‘ وغیرہ کا شمار تراجم وتذکرہ کی کتب میں بھی ہوتا ہے۔

عالمی تاریخ نویسی کے زمرہ کی قیادت امام طبری محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ) مؤلف تاريخ الرسل والملوك معروف بہ تاريخ الطبري کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کے علاوہ عالمی تاریخ نویسی کرنے والے مؤرخین میں احمد بن اسحاق یعقوبی (م ۳۱۵ھ) مؤلف تاريخ اليعقوبي، علی بن حسین مسعودی (م ۳۴۶ھ) مؤلف مروج الذهب اور التنبيه والاشراف، ابن مسکویہ، احمد بن محمد (۴۲۱ھ) مؤلف تجارب الأمم وتعاقب الهمم، ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) مؤلف کتاب المنتظم، ابن اثیر جزری علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) مؤلف الكامل في

التاریخ، وغیرہ۔

مقامی تاریخ نویسی میں احمد بن محمد ازرقی (م۲۵۰ھ) کی تاریخ مكة، ابن شاذان، حسن بن خلف (م۲۴۶ھ) کی أخبار المدینة، ابن عبدالحکم (۲۵۷ھ) کی تاریخ ولاة مصر، عمر بن شبہ (م۲۶۴ھ) کی تاریخ البصرة، ابن طاہر طیفور (م۲۸۰ھ) کی تاریخ بغداد، ابن النجار، محمد بن جعفر (م۴۰۲ھ) کی تاریخ الكوفة، خطیب بغدادی، احمد بن علی (م۴۶۳ھ) کی تارخ بغداد، ابن عساکر، علی بن حسن (م۵۷۱ھ) کی تاریخ دمشق، ابن جوزی (م۵۹۷ھ) کی مکہ ومدینہ کی تاریخ پر مشتمل کتاب مثير عزم الساكن إلى أشرف الأماكن، کمال الدین حلبی (م۶۶۰ھ) کی بغیة الطلب في تاریخ حلب وغیرہ کا شمار اہم کتب وتالیفات میں ہوتا ہے۔

عہد عباسی میں بعض مؤرخین نے اپنی کتابوں میں صرف بلاد وامصار کی فتوحات کی تفاصیل یا بلاد وامصار کے عمومی حالات بیان کی ہیں، جیسے فتوح الشام اور فتوح العراق از امام واقدی (م۲۰۷ھ)، فتح مصر والمغرب والأندلس از ابن عبدالحکم، عبدالرحمن بن عبداللہ (م۲۵۷ھ)، فتوح البلدان از بلاذری (م۲۷۹ھ) اور كتاب البلدان از یعقوبی (م۳۱۵ھ)، النواحي از ابن ابی عون (م۳۲۲ھ) البلدان از قدامہ بن جعفر (م۳۳۷ھ) وغیرہ۔

14.6.2 فلسفہ ومنطق

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون میں ایک فن ''فن فلسفہ ومنطق'' بھی ہے۔ اس فن کے بانی مبانی یونانی علما وفضلا تھے، لیکن مسلمانوں نے ان کی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے بہت جلد اس فن میں اپنی جداگانہ راہ متعین کر لی۔

عہد عباسی کے مسلم فلاسفہ کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم ان فلاسفہ پر مشتمل ہے جو یونانی فلسفہ میں پوری طرح ڈوب گئے تھے۔ دوسری قسم ان فلاسفہ پر مشتمل ہے جنھوں نے اسلامی افکار اور یونانی فلسفہ کے درمیان توافق وتطابق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

عہد عباسی میں فلسفہ کے دو بنیادی مرکز تھے: ۱۔ جندیسابور ۲۔ حران۔ تیسرے مرکز ''اسکندریہ'' کے اثرات صرف عہد اموی تک ہی پائے جاتے ہیں۔ اس عہد کے مشہور فلاسفہ میں یحییٰ بن ابی منصور (م۲۱۸ھ)، یعقوب کندی (م۲۴۸ھ)، محمد بن زکریا رازی (م۳۲۰ھ) مؤلف الشكوك والمناقصات اور في السيرة الفاضلة، ابونصر فارابی (م۳۳۹ھ) مؤلف المدينة الفاضلة، ابوسلیمان محمد بن طاہر منطقی (م۳۷۰) مؤلف صوان الحكمة، ابن مسکویہ (م۴۲۱ھ) مؤلف تهذيب الأخلاق اور الفوز الأصغر، ابن سینا (م۴۲۸ھ) مؤلف الحاصل والمحصول اور كتاب الاشارات والتنبيهات، ابوالبرکات بغدادی (م۴۶۰ھ) مؤلف المعتبر، امام غزالی (م۵۰۵ھ) مؤلف تهافة الفلاسفة، امام محمد بن عمر رازی (م۵۴۳ھ)، شیخ الاشراق شہاب الدین (م۵۵۶ھ) مؤلف حكمة الاشراق اور مشارع ومطارحات، وغیرہ شامل ہیں۔

عہد عباسی میں تمام مشہور یونانی فلاسفہ جیسے سقراط، افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے، ان کی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے، ان کی بنیاد پر مستقل بالذات کتابیں لکھی گئیں جن میں ان کی خامیوں اور غلطیوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں مسلم فلاسفہ نے ''اخوان الصفاء'' کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی جس کے باقاعدہ اجلاس ہوتے تھے جس میں

مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ان مباحثوں ومذاکروں کو بعد میں کتابی شکل میں مرتب کرلیا جاتا تھا جسے آج کی علمی دنیا میں ''رسائل اخوان الصفا'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

14.6.3 علم کلام

علم کلام کی بنیاد عہد عباسی میں پڑی تھی جس کی بنیادی وجہ مختلف نظریات وافکار رکھنے والی اقوام وملل - جیسے ایرانی، یونانی، ہندوستانی اقوام وملل- سے مسلمانوں کا میل جول تھا۔عہد عباسی میں مسلمانوں کا جن اقوام وملل کے ساتھ اختلاط ہوا تھا ان کے پاس مذہبی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کا بھی ذخیرہ تھا۔مسلمان اس ذخیرہ سے متاثر ہوئے اورانھوں نے ان اقوام وملل کے ساتھ مختلف علمی ،فکری اور دینی تبادلۂ خیالات کیا جس کے نتیجہ میں غیر شعوری طور ایک فکری وعلمی دھارا،اسلامی عقائد وافکار کے دھارے میں شامل ہوگیا جس کے دوررس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

تحریک ترجمہ کی وجہ سے یونانی فلسفہ سے عرب روشناس ہوئے اورخلیفہ مامون کے عہد تک یونانی ومجوسی فلسفہ کی بیشتر کتابوں کوعربی زبان کے قالب میں ڈھال دیا گیا تھا جس کی وجہ سے عرب معاشرہ میں فلسفہ کا چلن عالم ہوگیا تھااور ایک خاصا بڑا طبقہ اسلامی عقائد وعبادات کی تعبیر ان فلسفیانہ افکار کی روشنی میں کرنے لگا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئے رجحان نے جنم لیا،عقائد وافکار کوعقل کی بنیاد پر پرکھا اور جانچا جائے۔اس رجحان نے مختلف اسلامی فرقوں جیسے خوارج،شیعہ،معتزلہ،جہمیہ،مرجئہ اور قدریہ کو پیدا کیا جنھوں نے اپنے اپنے عقائد وافکار کوعقل ونقل دونوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔مسلم علما نے ان فرقوں کے باطل نظریات کورد کرنے کے لیے ایک نئے علم کی بنا ڈالی اوراسے ''علم کلام'' سے موسوم کیا۔علم کلام کوایک ایسا علم قرار دیا جاتا ہے جو دینیات اور فلسفہ کے بین بین ہے اورعلوم وافکار کے دومتضاد نظاموں کومربوط کرنے میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم کلام کے آثارعہد صحابہ ہی سے ملتے ہیں لیکن جدید علم کلام کے سنہری دور کا آغاز امام ابوالحسن اشعری (م ۳۲۴ھ) کی ذات والاصفات سے ہوتا ہے۔جنھوں نے معتزلی عقائد وافکار کی تردید بہت کامیابی کے ساتھ کی تھی۔ان کی کتاب ''مقالات الإسلاميين''کا شمارعلم کلام کی بنیادی اوراہم ترین کتب میں کیا جاتا ہے۔ان کے مکتب فکر کو''اشاعرہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس مکتب فکر کی نمائندگی کرنے والوں میں عکاشہ کرمانی، ابن کُلاب،عبداللہ بن سعید بصری (م نحو ۲۴۰ھ)،حسین بن علی کرابیسی (م ۲۴۵ھ)،خشیش بن اصرم نسائی (م ۲۵۳ھ)، ابوبکر سمرقندی (م ۲۶۸ھ)،ابوسعید دارمی (م ۲۸۲ھ)،ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)،ابن مجاہد (م ۳۷۰ھ)،ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ)،امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ)،امام غزالی (۵۰۵ھ)،عمر بن محمد نسفی (۵۳۷ھ) وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔

علم کلام کے دوسرے مکتب فکر کو''ماتریدیہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے،اس مکتب فکر کے بانی ابومنصور محمد بن محمد ماتریدی (م ۳۳۳ھ) ہیں۔انھوں نے علم کلام کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں جیسے **كتاب التوحيد، كتاب المقالات،بيان أوهام المعتزلة،الرد على القرامطة** اور **كتاب الجدل**وغیرہ۔

مذکورہ بالا دونوں مکاتب فکر کے درمیان اصولی اختلافات بہت ہی کم ہیں۔جن مسائل میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ان کا تعلق فروعی مسائل سے ہے۔ان مکاتب فکر کے درمیان پایا جانے والا بنیادی فرق غالباًان کا دو الگ الگ فقہی مسلک کا پیروکار ہونا ہے،

اشعری مکتب فکر کے اکثر نمائندگان کا تعلق فقہ شافعی سے ہے جب کہ ماتریدی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما کی اکثریت احناف پر مشتمل ہے۔ امام ابوعذبہ حسن بن عبدالحسن نے ان دونوں مکاتب کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو اپنی کتاب "كتاب الروضة البهية فيما وقع بين الأشاعرة والماتريدية" میں اجاگر کیا ہے۔ اشعری مکتب فکر، ماتریدی مکتب فکر کے مقابلہ میں زیادہ مشہور ومروج ہے اس کی وجوہات میں سے اس کا ماتریدی مکتب فکر سے پہلے وجود میں آنا اور اشاعرہ کے تصنیفی ذخیرہ کی کثرت وغیرہ ہے۔

علم کلام کی مشہور کتب میں حسین بن علی کرابیسی (م ۲۴۵ھ) کی کتاب المقالات، خشیش بن اصرم نسائی (م ۲۵۳ھ) کی کتاب الاستقامة، ابوبکر سمرقندی (م ۲۶۸ھ) کی معالم الدين، ابوسعید دارمی (م ۲۸۲ھ) کی نقض على المريسي الجهمي، ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) کی کتاب التوحيد، مکحول نسفی (م ۳۱۸ھ) کی الرد على أهل البدع والأهواء، امام احمد بن محمد طحاوی (۳۲۲ھ) کی بيان السنة والجماعة معروف به العقيدة الطحاوية، امام علی بن اسماعیل اشعری (م ۳۲۴ھ) کی مقالات الاسلاميين، الابانة عن أصول الديانة، رسالة في استحسان الخوض في علم الكلام وغیرہ، امام محمد بن محمد ماتریدی (م ۳۳۳ھ) کی کتاب التوحيد، شرح الفقه الأكبر، كتاب المقالات في علم الكلام (دوسرا نام: آراء أصحاب المذاهب والفرق)، كتاب أوهام المعتزلة، كتاب الأصول في أصول الدين وغیرہ، شیخ ابن تیمیہ کی عقيدة أهل السنة والفرق الناجية، الرسالة المدنية في تحقيق المجاز والحقيقة في صفات الله تعالى، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح، رسالة في القضا والقدر، بغية المرتاد في الرد على المتفلسفة والقرامطة والباطنية، منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة والقدرية (دوسرا نام: الرد على الروافض والإمامية) وغیرہ، ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) کی كتاب التمهيد، كشف الأسرار اور دقائق الكلام، امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) کی الشامل اور الإرشاد، امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی محك النظر، معيار العلم، تهافة الفلاسفة، الجام العوام عن علم الكلام اور عقيدة أهل السنة، امام نجم الدین نسفی، عمر بن محمد (م ۵۳۷ھ) کی العقائد النسفية شامل ہیں،

14.6.4 علم تصوف

تیسری صدی ہجری میں جب تصوف کی تدوین کی ضرورت پیش آئی تو زبان وقلم کا استعمال ایک امرِ ناگزیر تھا چنانچہ صوفیہ نے خود ہی احوال وواردات کی ترجمانی کے لیے الفاظ کا سہارا لیا اور حال کو قال میں بدلنے کی کوششوں کا آغاز کیا" اور نتیجہ میں تصوف کے موضوع پر ایک گرانقدر علمی سرمایہ اکٹھا ہوگیا۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون میں علم تصوف کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس فن کے بڑے بڑے ائمہ اس عہد کی زینت رہے ہیں جنھوں نے اپنے قول وفعل کے ذریعہ اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس فن کا المیہ یہ رہا ہے کہ یہ ہمیشہ افراط وتفریط کا شکار رہا ہے کہ اس کے مؤیدین اس کی تائید میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ بسا اوقات اسلامی تعلیمات واحکامات کو نظرانداز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس فن کے مخالفین کو اس علم میں کوئی بھی اور کسی بھی قسم کی کوئی خیر اور بھلائی نظر نہیں آتی ہے اور وہ اسے محض ایک دکھاوا اور فریب قرار دیتے ہیں۔ دونوں فریق اپنی اپنی انتہا پر نظر آتے ہیں جب کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ تصوف کا

شمار اسلامی علوم وفنون میں ہوتا ہے جس کے دھارے عہد نبوی سے جا ملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عہد نبوی وعہد صحابہ میں اس کا مدلول دوسرا تھا۔

قبل اس کے کہ عہد عباسی میں تصوف کے حوالہ سے علمی سرگرمیوں کا ذکر کیا جائے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اس عہد میں تصوف کے تین بنیادی مراکز- بصرہ، کوفہ اور بغداد- تھے جس کی سرزمین سے بڑے بڑے اور اکابر صوفیا نے جنم لیا تھا۔ اسی طرح اس فن پر کتابیں مرتب کرنے کا آغاز صوفیا کے تیسرے طبقہ نے چوتھی صدی ہجری میں کیا تھا۔ اس فن پر اولیں کتابیں ابن ابی دنیا، عبداللہ بن محمد (م ۲۸۱ھ) کے چھوٹے چھوٹے رسائل کو قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح امام جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) کی طرف کتاب المناجات منسوب کی جاتی ہے۔ تاہم مستقل تصانیف کا آغاز چوتھی صدی ہجری سے ہوتا ہے۔

عہد عباسی میں فن تصوف پر مرتب کی جانے والی مشہور کتب میں ابو محمد خلدی (م ۳۴۸ھ) کی **حكايات الأولياء**، ابونصر سراج (م ۳۷۸ھ) کی **كتاب اللمع** (ص ۱۳۲)، امام ابوبکر محمد کلاباذی (م ۳۸۰ھ) کی **كتاب التعرف لمذهب أهل التصوف**، امام نیساپوری (م ۴۱۲ھ) کی **عيوب النفس**، ابوعبدالرحمن سلمی (م ۴۲۱ھ) کی **طبقات الصوفية**، ابونعیم اصفہانی (۴۳۰ھ) کی **حلية الأولياء**، سعید الواعظ (م ۴۵۰ھ) کی **رياض الأنس**، امام ابوالقاسم قشیری (م ۴۶۵ھ) کا **الرسالة القشيرية**، شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) کی **فتوح الغيب**، **الغنية لطالب طريق الحق/غنية الطالبين**، **الفيوضات الربانية** اور **الفتح الرباني**، شیخ شہاب الدین سہروردی، یحییٰ بن حبش (م ۶۳۲ھ) کی **عوارف المعارف**، **حكمة الإشراق**، **مقامات الصوفية** اور **معاني مصطلحاتهم**۔

ان کے علاوہ ابوسعید اعرابی کی **كتاب الوجد**، امام محاسبی کی تصانیف، ابراہیم خواص کی کتاب **معرفة المعرفة**، بایزید بسطامی کی **شطحيات**، اور اس کی شرح از جنید بغدادی، امام حسین بن منصور حلاج کی **كتاب الطواسين** کا شمار بھی اس فن کی اہم کتب میں ہوتا ہے اور ذوالنون مصری (م ۲۴۰ھ)، ابوحارث محاسبی، ابراہیم ادہم، بایزید بسطامی کا شمار اس فن کے اکابرین میں ہوتا ہے۔

14.7 ادبی علوم وفنون

عہد عباسی میں دیگر علوم وفنون کی طرح خالص ادبی علوم وفنون کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا جنھیں بنیادی طور دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔ شاعری ۲۔ نثر نگاری۔ جس طرح عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے دیگر علوم وفنون نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا تھا اسی طرح خاص ادبی علوم وفنون کے دوررس اور نمایاں اثرات یورپی زبان وادب پر مرتب ہوئے تھے، مثال کے طور پر دانتے کی طربیۂ خداوندی (Divina Commedia) میں مسلمانوں کے پروردہ علم کائنات، واقعہ معراج، محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کی کتابوں، ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ) کے فلسفیانہ خیالات اور مسلمان صوفیہ کے تصور عشق کا عکس جابجا جھلکتا ہے۔ اسی طرح الف ليلة وليلة نے مغربی ادب پر خاصا اثرات مرتب کیے اور اٹلی وفرانس میں قصہ گوئی کی مختلف قسموں کو پروان چڑھانے اور انھیں فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ درج ذیل سطور میں بہت ہی ایجاز واختصار کے ساتھ ادبی علوم وفنون کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کی تفصیلات دیگر اکائیوں میں بیان کی جاچکی ہیں۔

14.7.1 نثر نگاری

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے ادب کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں شاعری کے مقابلہ میں نثر نگاری کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا اور اس کے مختلف اصناف وانواع سامنے آئے تھے۔ عربی ادب میں ہونے والی یہ نمایاں تبدیلی تحریک

ترجمہ کے فروغ اوراس کے مرتب ہونے والے اثرات ونتائج کہ وجہ سے ممکن ہوسکی تھی کہ عرب ادبا وعلما کے سامنے فکر وفن کی ایک نئی دنیا آباد ہوگئی تھی جس کی تعبیر کے لیے نثر ہی سب سے عمدہ اور بہتر ذریعہ تھی کہ اس عہد میں پروان چڑھنے والے موضوعات کے حوالہ سے شاعری کو کہیں نہ کہیں کو اپنی تنگئی دامن کا احساس ہوتا تھا۔

عہدعباسی کی نثر نگاری کوفروغ دینے میں جہاں اسلامی علوم فنون جیسے علوم قرآن وعلوم حدیث وعلوم فقہ وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا وہیں سماجی علوم جیسے تاریخ وجغرافیہ، فلسفہ ومنطق اور علم کلام وغیرہ نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ان علوم وفنون کے شانہ بشانہ زبان وبیان سے تعلق رکھنے والے علوم جیسے علم نحو، علم صرف، علم بلاغت، علم لغت وغیرہ نے بھی عہدعباسی کی نثر نگاری کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ان سب پر مستزاد خالص ادبی اصناف سخن جیسے خطابت، رسائل وتوقیعات، مقامات وسفرناموں وغیرہ نے عہدعباسی کی نثر نگاری کو چار چاند لگادیے تھے۔ان سب علوم وفنون کی وجہ سے عربی زبان وادب کا دامن اس قدر وسیع ہوگیا تھا کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات ومضامین سماگئے تھے اور خشک سے خشک مباحث کو عرب نثر نگاران، خوبصورت اور دلکش انداز بیان اور اسلوب میں پیش کرنے لگے تھے۔

قبل اس کے عہدعباسی میں پروان چڑھنے والے خالص ادبی علوم وفنون کا ذکر کیا جائے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان ادبی علوم وفنون کوفروغ دینے میں عربوں کے مقابلہ میں غیرعرب اقوام (حضرات موالی) نے زیادہ اہم اور مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

یہ عجیب وغریب اتفاق ہے عہدعباسی کی ادبی اور فنی نثر نگاری کا آغاز ایک غیرعرب کوششوں اور پہلوی ادب کے عربی ترجمہ سے ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مقفع (م ۱۴۰ھ) نے ''پنچ تنتر'' کے پہلوی ترجمہ کو عربی کے قالب میں ڈھال کر کے اسے ''**كليلة ودمنة**'' موسوم کیا تھا جو عربی نثر کا ایک عمدہ نمونہ اور ماڈل بن گیا تھا۔اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی اس کے ساحرانہ اسلوب کے اثرات باقی ہیں اور پڑھنے والے اس کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے کہ آج تک اس کا بدل نہ پیش کیا جاسکا اور وہ سہل ممتنع کی ایک ایسی مثال بن گئی جس کی پیروی ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

عہدعباسی میں خالص نثری ادب کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں مشہور عباسی ادیب جاحظ، عمرو بن بحر (م ۲۵۵م) نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے خالص ادبی کتب کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور گراں قدر کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔انھوں نے اپنے طرز بیان واسلوب سے عربی نثر کا ایک علمی رنگ وآہنگ متعین کردیا تھا، جس میں ادبیت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔انھوں نے جہاں ایک طرف عربی تنقید کے اہم بنیادی مباحث کو ''**البيان والتبيين**'' میں اجاگر کیا تو دوسری طرف **كتاب الحيوان، كتاب البغال، كتاب التبصر بالتجارة، تنبيه الملوك ،الدلائل والاعتبار على الخلق والتدبر، العراقة والفراسة، الربيع والخريف، الحنين الى الأوطان، البرصان والعرجان والعميان والحولان** وغیرہ جیسی خالص علمی کتابیں لکھیں۔

جاحظ کی اولیات میں اس بات کا شمار بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے عربی زبان میں طنز ومزاح کی اولین کتاب لکھی تھی اور اسے ''**كتاب البخلاء**'' سے موسوم کیا تھا۔یہ کتاب جہاں ایک طرف عباسی سماج ومعاشرہ کے ایک پہلو کی منہ بولتی تصویر ہے تو دوسری طرف طنز ومزاح کا ایک اچھوتا اور نادر نمونہ ہے۔طنز ومزاح کے موضوع پر انھوں نے ''**الجد والهزل**'' نامی ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ان کے دیگر رسائل کے ساتھ ''**مجموع رسائل**'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

14.7.1.1 تنقید اور علم بلاغت

عربوں کے اندر تنقیدی شعور فطری طور پر پایا جاتا ہے جس کے ہلکے اور دھندلے نقوش عہد عباسی سے ماقبل دور میں پائے جاتے ہیں لیکن یہ فن، بطور فن عہد عباسی میں پروان چڑھا تھا اور اس مقام ومنزل پر پہنچ گیا تھا کہ جس تک وہ زمانہ ماضی میں کبھی بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ یہ بات بلاخوف وتردد کہی جاسکتی ہے کہ عصر جدید کو چھوڑ کر عربی تنقید کبھی بھی اس قدر بلند مقام پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس تنقیدی شعور کو پروان چڑھانے میں فصاحت قرآنی (اعجاز القرآن) کے اسرار ورموز نے کے مطالعہ نے ادبی تنقید کا ایک نیا راستہ کھول دیا تھا جس کے نتیجہ میں ادبی تنقید کا ایک قابل ذکر سرمایہ سامنے آتا ہے۔

عہد عباسی میں تنقید کا ایک نیا رنگ سامنے آتا ہے کہ اسی عہد میں پہلی مرتبہ دوشاعروں کے درمیان موازنہ ومقارنہ کرنے کا چلن سامنے آیا جیسے آمدی کی کتاب الموازنة بين أبي تمام و بحتری وغیرہ۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ دوشعرا کے درمیان مقارنہ اور موازنہ کے کچھ نمونے عہد جاہلی میں پائے ہیں؛ لیکن چونکہ وہ نتائج کسی قواعد وضوابط پر مشتمل نہیں تھے؛ بلکہ صرف عربی الفاظ کے بہتر استعمال اور فیصلہ کرنے والے کے ادبی ذوق پر مشتمل ہوتے تھے لہذا ان کا مقابلہ وموازنہ عہد عباسی کے ''ادب مقارن'' سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

فن تنقید کے موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں جاحظ مؤلف البيان والتبيين اور كتاب الحيوان، کے علاوہ محمد بن سلام جمحی (م ۲۳۲ھ) مؤلف طبقات فحول الشعراء، ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) مؤلف الشعر والشعراء اور كتاب المعارف، ابوعباس محمد بن یزید مبرد (م ۲۸۶ھ) مؤلف الكامل اور الروضة، ثعلب (م ۲۹۱ھ) مؤلف قواعد الشعر، ابن طبا طبا (م ۳۲۲ھ) مؤلف عيار الشعراء، ابوالفرج اصفہانی (م ۳۵۶ھ) مؤلف كتاب الأغاني، ابن معتز (م ۲۹۶ھ) مؤلف كتاب البديع اور طبقات ابن المعتز، ابواحمد یحییٰ بن علی منجم (م ۳۰۰ھ) کا رسالة في المفاضلة بين العباس والعتابي، محمد بن عمران (م ۳۸۴ھ) مؤلف الموشح، صاحب بن عباد (م ۳۸۵ھ) مؤلف الكشف عن مساوي المتنبي، ابومنصور ثعالبی (م ۴۲۹ھ) مؤلف يتيمة الدهر، ابن سنان خفاجی (م ۴۶۶ھ) مؤلف سر الفصاحة، عبدالقاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) مؤلف دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغة، اسامہ بن منقذ (م ۵۸۴ھ) مؤلف البديع في نقد الشعر، ابن سناء المُلک (م ۶۰۸ھ) مؤلف دار الطراز، ابن جبارة علی بن اسماعیل (م ۶۳۲ھ) مؤلف نظم الدرر في نقد الشعر، ضیاء الدین ابن اثیر (م ۶۳۷ھ) مؤلف المثل السائر، وغیرہ جیسے باکمال اشخاص شامل ہیں۔

14.7.1.2 ادب الرحلات

عہد عباسی میں ایک بالکل نئے ادبی فن کا ظہور ہوتا ہے جسے ''أدب الرحلة/الرحلات'' (سفرنامے) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر انسان کی فطرت میں جستجو اور نت نئے جہانوں کی جستجو وتلاش پائی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کچھ کے اندر ہی یہ داعیہ اتنی شدت اور طاقت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تمام تر خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں اور زمین کی مسافتوں کو طے کرنے کا آغاز کردیتے ہیں اور راستے کی مشکلات ومصائب کو برداشت کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی اس جرأت اور بہادری نے نئے جہانوں کو دریافت کیا جن سے اس وقت کی دنیا ناواقف تھی۔

انسان اور سفر کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ مختلف مقاصد کے حصول کے لیے رخت سفر باندھتا رہا ہے۔ ان مسافران

تلاش وجستجو نے اپنے سفر کے حالات کو قلم بند کرنے کا اہتمام بھی کیا تھا جس کے نتیجہ میں ''سفر نامہ'' (ادب الرحلۃ) جیسی صنف کا آغاز ہوتا ہے ۔اس صنف کے آغاز وارتقا کے دھارے کو بھی ان علوم وفنون سے ملایا جاسکتا ہے جو قرآن کے زیر اثر پروان چڑھے تھے، قرآن میں متعدد مقامات پر کائنات ارضی وسماوی پر غور وخوض کرنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ساتھ ہی ساتھ {أولم يسيروا في الأرض} کے ذریعہ رخت سفر باندھنے کی دعوت دی گئی تا کہ کائنات ارضی میں چھپے ہوئے خزانوں اور اس کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوا جاسکے۔

قرآن کریم کے اولین مخاطب عرب تھے۔وہ پہلے ہی سے ملکوں ملکوں اور صحرا بہ صحرا گھومنے پھرنے کے قائل تھے۔قرآن کریم کی آیات تدبر نے ان کے شوق کو مزید مہمیز دے دی، بس کچھ مقاصد سفر بدل گئے تھے اور نتیجہ میں جغرافیہ اور سفر نامے جیسی علمی وادبی صنف نے جنم لیا۔

''أدب الرحلة'' کی صنف کا آغاز فن جغرافیہ کے جلو میں عہد عباسی سے ہوتا ہے، اس عہد کے مسافروں نے مختلف مقاصد کے پیش نظر بہت کثرت کے ساتھ دنیا کی خاک چھانی تھی اور ماحصل کو کتابی شکل میں مدون کر دیا تھا۔اس عہد میں سفر ناموں کے فروغ پانے کے مختلف اسباب وعلل جیسے فریضۂ حج کی ادائیگی وزیارت نبوی، تجارت، طلب علم، بادشاہ وقت کی خواہش کے مطابق ممالک وامصار کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور نت نئے جہانوں کی سیر وغیرہ پائے جاتے تھے۔

عہد عباسی میں مرتب کیے جانے والوں سفر ناموں کو بحری اور بری سفر ناموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ابتدائی بحری سفر ناموں میں ''ألف ليلة وليلة'' میں مذکور سندباد بحری کے قصے، بزرگ بن شہریار کی جانب منسوب بحری سفر کے احوال اور جہاز راں ابن ماجد کے آثار علمیہ وغیرہ۔ابتدائی بری سفر ناموں میں سلام ترجمان، ابن وہب قرشی، سلیمان تاجر، ابوزید حسن، احمد بن فضلان، ابودلف مسعد بن مہلہل خزرجی وغیرہ کے سفر نامے شامل ہیں۔ان بحری وبری سفر ناموں میں جغرافیہ دانوں کی مرتب کردہ کتب جغرافیہ بھی شامل ہیں کہ ان میں بھی کسی نہ کسی حد تک ''سفر نامہ'' کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

عہد عباسی میں لکھے جانے والے سفر نامے جہاں ایک طرف ان ممالک وامصار کی جغرافیائی کیفیت بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور ثقافت اور معاشرہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کے مقالہ نگار نے اس عہد کے سفر ناموں کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''انھوں نے دور دراز ممالک کے سفر کیے، تمام دنیا کے عجائبات دریافت کیں......انھوں نے ایسے سفر نامے مرتب کیے جن سے دنیا کے ان ممالک کے حالات معلوم ہوئے جہاں اہل یورپ کا گزر تک نہ ہوا تھا۔ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے سفر نامے معلومات کے خزانے ہیں''۔

قبل اس کے کہ عربی سفر ناموں کا ذکر کیا جائے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی سفر نامے عرب جغرافیہ دانوں کے مرتب کردہ ہیں اور ان میں سفر نامہ کی خصوصیات کے مقابلہ جغرافیائی احوال وکیفیات کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔اسی بنیاد پر ان کتب کا شمار ''سفر نامے'' کے مقابلہ میں جغرافیہ کی کتابوں میں ہوتا ہے تاہم ان کا تعلق ایک ناحیہ سے عربی سفر ناموں سے بھی ہے۔غالباً اسی وجہ سے ''الرحلة والرحالون المسلمون'' کے مصنف ڈاکٹر احمد رمضان احمد نے عربی سفر ناموں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے:

-الرحالة الجغرافيون: اس زمرہ کے تحت انھوں نے اہم اولین جغرافیہ دانوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی کتب میں پائے جانے ''سفر نامے'' کے عناصر کو اجاگر کیا ہے۔اس زمرہ میں ابن خُرّ دَاذْبہ، عبیداللہ بن احمد (نحو ۲۸۰ھ) مؤلف **المسالک والممالک**، قدامہ بن

جعفر (م ۳۳۷ھ) مؤلف كتاب الخراج، احمد بن اسحاق معروف بہ یعقوبی (م ۳۱۵ھ) مؤلف كتاب البلدان، ابراہیم بن محمد اصطخری (م ۳۴۶ھ) مؤلف صور الأقاليم، ومسالك الممالك، ابن فقیہ ہمدانی، مؤلف مختصر كتاب البلدان، ابن رستہ، احمد بن عمر مؤلف الأعلاق النفيسة، حسن بن احمد ہمدانی معرف بہ ابن حائک مؤلف صفة جزيرة العرب، علی بن حسین مسعودی (۳۴۶) مؤلف مروج الذهب ومعدن الجوهر، ابن حوقل، محمد بن علی (م بعد ۳۶۷ھ) مؤلف المسالك والممالك أو صورة الأرض، محمد بن احمد مقدسی بشاری (م نحو ۳۸۰ھ) مؤلف أحسن التقسيم في معرفة الأقاليم، ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۴۰ھ) مؤلف تاريخ الهند اور الآثار الباقية عن القرون الخالية، محمد بن محمد ادریسی (م ۵۶۰ھ) مؤلف نزهة المشتاق في ذكر الأمصار والأقطار والبلدان، اور یاقوت بن عبداللہ رومی حموی (م ۶۲۶ھ) مؤلف معجم البلدان اور مراصد الاطلاع على أسماء الأماكن والبقاع۔

مذکورہ بالا زمرہ میں ڈاکٹر احمد رمضان احمد نے عہد عباسی سے تعلق رکھنے والے سلّام ترجمان، ابن فضلان اور ابودلف کا بھی ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے ان کے تصانیف ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔

ڈاکٹر احمد رمضان احمد نے ان الرحالة الجغرافيون کے علاوہ دیگر جغرافیہ دانوں جیسے عبیداللہ بکری، ابن خلدون، ابوالفداء اسماعیل اور احمد بن یحییٰ فضل اللہ عمری کا بھی ذکر کیا ہے؛ لیکن چونکہ وہ اکائی کے دائرہ میں نہیں آتے ہیں کہ ان میں سے کچھ کا تعلق اندلس سے ہے تو کچھ کا تعلق عہد عباسی کے بعد کے عہد سے ہے۔ مذکورہ زمرہ کے سفرناموں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر احمد رمضان احمد کی کتاب کا نصف سے زائد حصہ اسی اولین زمرہ پر مشتمل ہے۔

-الرحالة المشارقة: اس زمرہ میں مصنف نے ان حضرات کا ذکر کیا ہے جن کے اسفار کی تفاصیل ''سفرنامے'' کے فنی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر نے اپنے سفرناموں کو مستقل بالذات تصنیف نہیں بنایا ہے۔ اس زمرہ میں مصنف نے اسامہ بن مرشد بن علی بن منقذ (م ۵۸۴ھ)، عبدالکریم بن محمد سمعانی (م ۵۶۲ھ) عمارۃ بن علی یمنی (م ۵۶۹ھ)، علی بن ابی بکر بن علی ہروی (م ۶۱۱ھ)، عبداللطیف بن یوسف بغدادی (م ۶۲۹ھ)، زکریا بن محمد قزوینی (م ۶۸۲ھ) مؤلف ''آثار البلاد وأخبار العباد'' (وہ آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے قاضی تھے تاہم وفات عہد عباسی کے بعد ہوئی تھی) کا ذکر کیا ہے اور فن سفرنامہ میں ان کے مقام ومرتبہ کا ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا زمرہ میں انھوں نے ناصر خسرو کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنا سفرنامہ فارسی میں لکھا تھا جس کا یحییٰ خشاب نے عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

-الرحالة المغاربة: اس زمرہ میں مصنف نے ان سفرناموں کا ذکر کیا ہے جن کے مصنفین کا شمار اندلس کے اہل علم وفضل میں ہوتا ہے جیسے ابن جبیر اور ابن بطوطہ وغیرہ۔ چونکہ اس زمرہ کے افراد مذکور اکائی میں شامل نہیں ہیں لہذا ان کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''أدب الرحلة'' کی اہم ترین تصانیف کا تعلق اسی زمرہ سے ہے کہ ان کا ذکر اگر ''**أدب الرحلة**'' سے نکال دیا جائے تو عہد وسطی میں ''أدب الرحلة'' کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہاں اس بات کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والا سفرنامہ، سفرنامہ سے زیادہ جغرافیہ کی تفاصیل بیان کرتا ہے بلکہ وہی تصانیف ہی عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے ادب الرحلة کا نمونہ ہیں، کمزور نمونہ ہی سہی۔ عہد عباسی کے ''أدب الرحلة'' کی وہ کتابیں جنھیں جغرافیہ داں حضرات نے مرتب نہیں کیا تھا، وہ

بھی "ادب الرحلۃ" کا مکمل نمونہ نہیں ہیں کہ وہ بھی کتب جغرافیہ کی طرح دیگر موضوعات کی کتب میں ضمناً ذکر کیے گئے ہیں جیسے ابن منقذ نے "کتاب الاعتبار" میں "أدب الرحلۃ" کے حوالہ سے کچھ نقل کیا ہے لیکن اس کتاب کا بنیادی تعلق سفرنامہ کی بجائے سیرت وتاریخ سے ہے۔

14.7.1.3 علم لغت

یہ علم بھی ان علوم وفنون میں شامل ہے جو قرآن کے زیر اثر پروان چڑھے تھے اور ان کی ترتیب وتہذیب میں احادیث نبویہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔اس کی ابتدا قرآن وحدیث کے الفاظ کے معانی ومفاہیم کے بیان کرنے سے ہوئی تھی جو آگے چل کر تمام عربی الفاظ کے معانی ومفاہیم کو بیان کرنے پر محیط ہو گیا تھا۔اس علم کے بالکل ابتدائی نقوش عہد نبوی وصحابہ میں ہی ملتے ہیں تاہم اس وقت کتابوں کی بجائے افراد خصوصا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے رجوع کیا تھا اور مشکل الفاظ کے معانی دریافت کیے جاتے تھے۔عہد اموی میں لغت نگاری کے کچھ آثار ملتے ہیں،قرآن وحدیث کے الفاظ پر مشتمل کچھ کتابوں کا ذکر مصادر میں پایا جاتا ہے؛لیکن فنی طور پر اس کا ارتقا عہد عباسی میں ہی ہوا تھا،اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مشہور لغوی اور علم عروض کے بانی خلیل بن احمد فراہیدی (م ۱۷۰ یا ۱۷۵ھ) کے عہد تک عرب فن لغت سے واقف نہیں تھے۔

فن لغت کے پروان چڑھنے کی بنیادی وجہ اسلامی فتوحات کی وسعت کے نتیجہ میں مختلف اقوام وملل پر مشتمل معاشرہ کا وجود میں آنا تھا۔مخلوط معاشرہ میں عربی زبان،اپنی اصل سے دور ہوتی چلی جارہی تھی اور اس کی شکل میں بگاڑ پیدا ہونے لگا تھا،لہذا اصل اور صحیح عربی زبان کے محافظ علما نے اس کی بقا کے لیے کمر کس لی اور دیہات اور بادیہ میں جا کر خالص اور فصیح عربی سیکھنے کا اہتمام کیا۔اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کے مقالہ نگار کے بقول"عرب کے فصیح بادیہ نشینوں کے ساتھ علمائے لغت کے ربط واتصال نے پہلے تدوین لغت اور آگے چل کر لغت نویسی کی بنا ڈالی۔اس طرح عربی زبان ہمیشہ کے کے لیے آمیزش واختلاط سے محفوظ ہوگئی......انھوں نے عربی زبان کے تحفظ کے سلسلے میں جس عرق ریزی اور جانکاہی کا ثبوت دیا ہے،دنیا کی کوئی زبان اس کی ہمسری کا دعوی نہیں کرسکتی ہے"۔

لغت (Dictionary) کے لیے عربی میں "المعجم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اس کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا جو مفردات لغت کی کثیر تعداد اور ان کے معانی ومطالب پر مشتمل ہو اور اسے حروف ہجا یا موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہو۔یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی کہ لفظ "المعجم" کا استعمال سب سے پہلے امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) نے صحیح بخاری کے ایک باب کے عنوان میں غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کی فہرست کا ذکر کرتے ہوئے کیا تھا۔بعدازیں انھوں رواۃ حدیث کا ذکر "المعجم الکبیر" اور "المعجم الصغیر" میں کیا۔ان کے علاوہ متعدد علما نے صحابۂ کرام،رواۃ احادیث اور محدثین پر مشتمل کتابوں کو "المعجم" کے نام سے موسوم کیا تھا جیسے محدث ابو یعلی احمد بن علی (م ۳۰۷ھ) کی کتاب "معجم الصحابۃ"،ابن بنت منیع کی "المعجم الکبیر" اور "المعجم الصغیر" وغیرہ۔مؤخر الذکر دونوں کتابیں صحابۂ کرام کے اسما پر مشتمل ہیں۔فن اسماء الرجال کے موضوع پر لکھنے والی متعدد کتب کو "المعجم" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چونکہ ان محدثین نے اپنی کتب کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا،لہذا علمائے لغت نے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اپنی کتب کو مؤلف "المعجم" سے موسوم کر دیا کہ وہ کتابیں بھی عام طور سے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئیں تھیں جب کہ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کے مقالہ نے اس کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے"غالبا کسی زبان کی کتاب لغت پر معجم کا

اطلاق اس لیے کیا جانے لگا کہ اعجام (حروف پر نقطے لگانا) سے التباس دور ہوکر وہ حرف واضح ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ کلمات حروف ہجا ہی سے مرکب ہوتے ہیں''۔

اوپر یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ عربی لغت نویسی کا آغاز عہد نبوی وعہد صحابہ سے ہی ہو چکا تھا۔عہد اموی میں اس کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں تاہم ان تمام ادوار کا جو کچھ سرمایہ بھی ملتا ہے ان کا تعلق عام لغت نگاری کے بجائے قرآن وحدیث کے مشکل الفاظ سے تھا۔فنی طور پر اس علم لغت کا آغاز خلیل بن احمد فراہیدی کی کتاب ''کتاب العین'' سے ہوتی ہے جسے اصطلاحی طور پر ڈکشنری کہا جاسکتا ہے۔

14.7.1.3.1 تدوین لغت نگاری کے مراحل

عربی لغت نگاری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی تدریجی مراحل سے گزری ہے:

پہلا مرحلہ:اس مرحلہ میں صحابۂ کرام آپ ﷺ سے قرآن وحدیث کے مشکل الفاظ کے معنی دریافت کر کے یا توانھیں زبانی یاد کرلیتے تھے یا انھیں لکھ لیا کرتے تھے۔تدوین لغت کا یہ پہلا مرحلہ صرف قرآن وحدیث کے مشکل الفاظ مشتمل ہے۔

دوسرا مرحلہ:اس مرحلہ میں صحابۂ کرام آپس میں قرآن وحدیث کے مشکل الفاظ کے معنی دریافت کرتے تھے۔اس مرحلہ کے نمائندہ فرد حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔انھیں اس عہد کی چلتی پھرتی ڈکشنری کہا جاتا تھا کہ وہ قرآن وحدیث کے مشکل الفاظ کے معانی بیان کرتے تھے اور''مفردات کی تشریح عربی اشعار کی روشنی میں کرتے تھے''۔

تیسرا مرحلہ:اس مرحلہ میں سب سے پہلے مفردات کو بغیر کسی ترتیب کے اکٹھا وجمع کردیا گیا تھا۔دوسرے مرحلہ میں مفردات کو معانی وموضوعات کے اعتبار سے جمع کیا گیا۔اس مرحلہ میں ایک دوسرے سے ملتے ان الفاظ جمع کیا گیا جو شکل اور معنی کے اعتبار سے ایک جیسے تھے جیسے قَدَّ اور قَطَّ (چیرنا اور پھاڑنا بالترتیب)، قَضَم اور خَضَم (چبانا) وغیرہ۔

اس مرحلہ میں ایک موضوع سے متعلق الفاظ کو جمع کیا گیا تھا جیسے کتاب الإبل، کتاب النبات، کتاب الحشرات، کتاب النخیل وغیرہ۔

چوتھا مرحلہ:اب تک جو کچھ لغوی سرمایہ جمع ہو چکا تھا اس کی روشنی میں عام لغت نویسی کا آغاز ہوا تھا۔عام لغت نویسی کی ابتدا دوسری صدی ہجری میں خلیل بن احمد فراہیدی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ان کی کتاب ''کتاب العین'' کو اس فن کی اولین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔اس کتاب کو انھوں حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے لیکن اس کی ترتیب میں حروف کے مخارج کو ملحوظ رکھا گیا ہے ،یعنی پہلے حلقی حروف، اس کے بعد زبان سے نکلنے والے الفاظ، اس کے بعد دانتوں سے نکلنے والے الفاظ پھر لبو سے نکلنے والے الفاظ۔حروف حلقی -حرف عین- سے شروع ہونے کی وجہ سے ہی اس کتاب کو''کتاب العین'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

عہد عباسی کے دیگر مشہور لغت نگاران میں ابوعمرو بن علاء ،زَبَّان بن عمار تمیمی (م ۱۵۴ھ) مؤلف النوادر، یونس بن حبیب (م ۱۸۲ھ) مؤلف اللغات اور النوادر، امام کسائی (م ۱۸۹ھ) مؤلف ما تلحن فيه العامة، مؤرج بن عمرو سدوسی (م ۱۹۵ھ) مؤلف کتاب الأنواء ،نضر بن شمیل (م ۲۰۳ھ) مؤلف کتاب الصفات، کتاب الأشجار، کتاب الوحوش، کتاب الأنوائ اور المعانی وغیرہ، ابوعمرو اسحاق بن مرار شیبانی (م ۲۰۶ھ) مؤلف کتاب الجیم اور کتاب اللغات، یحییٰ بن زیاد دیلمی (م ۲۰۷ھ) مؤلف البهاء فيما تلحن فيه العامة، ابوعبیدہ معمر بن مثنی (م ۲۰۹ھ) مؤلف ما تلحن فيه العامة، ابوزید انصاری، سعید بن اوس (م ۲۱۵ھ) مؤلف النوادر، الهمز،

المطر، الشجر اور خلق الإنسان وغیرہ، عبدالملک بن قُرَیب اصمعی (م۲۱۶ھ) مؤلف کتاب الإبل، کتاب الأضداد، کتاب خلق الإنسان اور کتاب الخیل وغیرہ، ابوعبید قاسم بن سلام ہروی (م۲۲۴ھ) مؤلف الغریب المصنف، ابن الاعرابی کوفی محمد بن زیاد (م۲۳۱ھ) مؤلف أسماء الخیل وفرسانها اور أسماء البئر وصفاتها، ابوعثمان بکر بن محمد مازنی (م۲۴۸) مؤلف ما تلحن فیه العامة، ابوحاتم سجستانی، سہل بن محمد (م۲۴۸ھ) مؤلف ما تلحن فیه العامة، کتاب الأضداد اور کتاب الإبل، ابوحنیفہ دینوری (م۲۸۲ھ) مؤلف ما تلحن فیه العامة، ابوالہیذ ام گلاب بن حمزہ عقیلی حرانی (م۲۹۰ھ) مؤلف ما تلحن فیه العامة، ابن درید ازدی (م۳۲۱ھ) مؤلف الجمهرة في اللغة، تقویم اللسان، اللغات اور المقصور والمدود، ابوابراہیم اسحاق بن ابراہیم فارابی (م۳۵۰ھ) مؤلف دیوان الأدب، ابوعلی قالی، اسماعیل بن قاسم بغدادی (م۳۵۶ھ) مؤلف البارع، ازہری، ابومنصور محمد بن احمد (م۳۷۰ھ) مؤلف تهذیب اللغة، صاحب بن عباد (م۳۸۵ھ) مؤلف المحیط، محمد بن حسن جَرْبَاذَقانی (م۳۸۶ھ) مؤلف حرف العین في الضاد والظاء من کتاب الروحة، ابن فارس، احمد بن زکریا (م۳۹۰ھ) مؤلف مقاییس اللغة اور المجمل، اسماعیل بن حماد جوہری (م۳۹۳ھ) مؤلف الصحاح، ابوہلال عسکری (م۳۹۵ھ) مؤلف ما تلحن فیه الخاصة، التلخیص، المعجم، الفروق، ابومنصور ثعالبی، عبدالملک بن محمد (م۴۲۹ھ) کی فقه اللغة، ابوغالب تمام بن غالب (م۴۳۶ھ) مؤلف الموعب، محمود بن عمر زمخشری (م۵۳۸ھ) مؤلف أساس البلاغة، حسن بن محمد صاغانی (م۶۵۰ھ) مؤلف العباب الزاخر، مجمع البحرین، الشوارد فیاللغة، الأضداد، ما تفرد به بعض أئمة اللغة اور التکملة وغیرہ ہیں۔

دیگر مشہور کتب لغات جیسے لسان العرب، القاموس اور تاج العروس وغیرہ عہد عباسی کے بعد مرتب کی گئیں تھیں اس لیے ان کے مؤلفین کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ہے۔

14.7.2 شاعری

عہد عباسی میں شاعری میں بھی کافی بال و پر آئے تھے جن کا تفصیلی ذکر شاعری پر مشتمل اکائی میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم حسب ذیل سطور میں مختصر طور پر عہد عباسی کی شاعری کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گوناگوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد وممتاز نظر آتی ہے۔ اس عہد میں مختلف اقوام وملل اور ان کی تہذیب وثقافت ایک دوسرے سے گلے ملتی ہوئی نظر آتے ہیں۔ اس عہد کے سماجی، ثقافتی اور علمی وادبی ماحول نے ایک ایسی فضا تیار کر دی تھی جس کی مثال پوری اسلامی تاریخ میں نظر نہیں آتی ہے۔ اس عہد کی مخصوص فضا میں عربی شاعری اپنے نئے رنگ وروپ میں پروان چڑھتی ہے اور ایسے بیش بہا نمونے پیش کرتی ہے جس نے عربی شاعری کا دامن کو بہت سارے گہر آبدار سے بھر دیا تھا اور اس کی قدر وقیمت میں گراں قدر اضافہ کر دیا تھا۔

عصر عباسی کی شاعری، عربی شاعری کے دیگر تمام ادوار سے اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں شعرا، متقدمین شعرا کے طرز اسلوب وبیان سے قطع نظر ایک نیا طرز واسلوب اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ محبوبہ اور اس کی نشانیوں کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ وڈھنگ سے کرتے ہیں جس میں شہری تمدن اور بود باش

کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری میں ایک طرف جہاں قدیم اصناف سخن - جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ - کے دائرۂ کار میں وسعت پیدا ہوئی تھی وہیں چند جدید موضوعات شاعری - جیسے غزل غلمان، زہدیات، طردیات، خمریات وغیرہ - پر شعرا دادِ سخن دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے موضوعات شاعری میں مجموعی طور سے کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ان تمام تر تبدیلیوں کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں بھی کچھ شعرا ایسے موجود تھے جن کی شاعری پر جدید ماحول اور حالات اثرات یا تو مرتب ہی نہیں ہوئے تھے یا برائے نام مرتب ہوئے تھے اور وہ قدیم اسلوب و انداز میں ہی شاعری کر رہے تھے۔

عہد عباسی کی شاعری پر جب ایک طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کو فروغ دینے میں شعرا کے ساتھ ساتھ سماج کے مختلف طبقات جیسے عباسی خلفا، وزرا، امرا اور عمائدین سلطنت، نثر نگاران اور علما دین وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا کہ ایک طرف جہاں عباسی خلفا، وزرا، امرا اور عمائدین سلطنت نے شعرا کی سرپرستی کی تھی تو دوسری طرف انھوں نے خود بھی دادِ سخن حاصل کی تھی اور شاعری کے عمدہ نمونے بطور یادگار چھوڑے تھے۔

عہد عباسی میں شاعری کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس عہد میں شاعری کسب معاش، عزت و شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گئی تھی۔ اسی طرح مملکت عباسیہ میں شاعری کے اہم مرکز بغداد کے علاوہ دیگر مراکز و مقامات بھی پائے تھے جہاں کے امرا اور حکمرانوں کے دربار میں شعر و شاعری کی سرپرستی کی جاتی تھی نتیجۃً شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلہ میں زیادہ بڑا اور وسیع میدان ملا اور انھوں نے اپنی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اچھے انداز و اسلوب میں پیش کیا۔

عہد عباسی کے شعرا کو تین بڑے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طبقہ مخضرم شعرا کا ہے جنھوں نے عہد اموی کا اواخر اور عہد عباسی کا اولیں دور پایا تھا۔ انھیں شعرا نے عہد عباسی کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقہ کے اہم نمائندہ شاعر بشار بن برد اور ابونواس ہیں۔ دوسرا طبقہ شعرائے مولدین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ تیسری صدی میں گذرا تھا۔ انھوں نے اپنے پیش رو شعرا کے کاج کو آگے بڑھاتے ہوئے عربی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے نوازا تھا۔ اس طبقہ کے نمائندہ شعرا میں ابوتمام اور بحتری وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ تیسرا طبقہ شعرائے محدثین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چوتھی صدی میں گذرا تھا۔ انھوں نے بھی عربی شاعری کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقہ کے اہم شعرا میں متنبی اور ابوالعلاء معری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا شعرا کو موضوعاتی اور فنی لحاظ **شعراء البداوة، الشعراء المجددون، الشعراء المفتنون، شعراء الصنعة، الشعراء المحافظون، الشعراء المبدعون** اور **شعراء المذاهب والوجدان والفكر** کے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

مؤخر الذکر طبقہ شعرا کی ایک بڑی اکائی پر مشتمل ہے جسے ان کے نظریات، خیالات و افکار کے لحاظ سے انھیں **شعراء العباسية** (حکومت وقت کے دربار سے منسلک شعرا)، **شعراء الشيعة** (شیعی نظریات کے حامل شعرا)، **شعراء العشق** (شعرائے غزل)، **شعراء الزهد والحكمة والمواعظ** (شعرائے زہد و حکمت و موعظت)، **شعراء علماء** (علوم و فنون کو نظم کرنے والے شعرا)، اور **شعراء الطبع**

والزندقۃ (فطرت اورزندیقیت کے نمائندہ شعرا) جیسے زمروں میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔

14.8 اکتسابی نتائج

تاریخ اسلامی کا سب سے زریں عہد عہد عباسی ہے جس میں گونا گوں قسم کی ترقیاں ہوئیں۔علوم وفنون نے ارتقائی مراحل طے کیے اور اوج کمال تک پہنچ گئے تھے۔عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون کو بنیادی طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلا زمرہ ان علوم وفنون پر مشتمل ہے جو عصر عباسی کے علما وفضلا کو اسلاف خصوصا عہد اموی سے بطور ورثہ ملے تھے۔دوسرا زمرہ ان علوم وفنون پر مشتمل ہے جن کی بنا عصر عباسی میں رکھی گئی تھی۔عصر عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم وفنون پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عہد عباسی کے علما کو بطور ورثہ ملنے والے علوم وفنون کی تعداد زیادہ ہے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے علوم وفنون کو فنی لحاظ سے اسلامی، سائنسی، سماجی اور ادبی علوم وفنون میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ان علوم وفنون میں اسلامی علوم وفنون کا سرمایہ سب سے زیادہ ہے۔اسلامی علوم وفنون میں علوم قرآن کو سب سے زیادہ نمایاں مقام ومرتبہ حاصل ہے، قرآن کے مختلف پہلوؤں کو علماے اسلام نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا اور حاصل مطالعہ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔قرآن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر علمائے اسلام نے قلم نہ اٹھایا ہو۔

قرآن کے بعد حدیث وعلوم حدیث کے موضوع پر ایک معتد بہ ذخیرہ علمائے اسلام نے مرتب کیا تھا۔علم حدیث کے روایتی اور درایتی دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل مباحث کیے گئے ہیں۔حدیث کے ضمن میں اسماء الرجال جیسا علم پروان چڑھا جس کی نظیر آج تک نہ پیش کی جاسکی ہے۔

فقہ اور علوم فقہ پر بھی قابل ذکر سرمایہ مرتب کیا گیا ہے۔سیرت نبوی کے موضوع پر بھی اہم ترین کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔تذکرہ وتراجم کے موضوع پر بھی ایک قابل قدر سرمایہ مرتب کیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے سماجی علوم وفنون میں تاریخ، جغرافیہ، تصوف، منطق وفلسفہ اور علم کلام جیسے علوم وفنون شامل ہیں ۔ان علوم وفنون پر عہد عباسی کے علما نے ایک گراں قدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔اسی طرح متعدد ادبی علوم وفنون جیسے علم بلاغت، تنقید اور لغت جیسے علوم وفنون پروان چڑھے تھے۔اس عہد کی نثر نگاری کو عربی ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں قرار دیا جاتا ہے۔اس عہد کی نثر نگاری کے مقابلہ میں صرف عصر جدید کی نثر نگاری کو بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔اس عہد کی شاعری، اس کے موضوعات اور اصناف سخن میں بھی نمایاں تبدیلیاں ملتی ہیں۔

عہد عباسی کی سب سے خاص بات یہ کہ اس عہد میں سائنسی مزاج میں بہت زیادہ ترقی ہوئی تھی، علمائے عہد عباسی نے ہر موضوع پر غور وفکر کر کے اہم ترین کتب مرتب کیں۔اس عہد میں سائنسی علوم وفنون نے نمایاں طور پر ارتقائی مراحل طے کیے تھے، جس کے گہرے اور دوررس اثرات بعد کی صدیوں پر مرتب ہوئے۔اس عہد کی سائنسی ترقیوں کو ہی یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام علوم وفنون میں عہد عباسی کے علما وفضلا نے بہت ہی اہم کتب بطور یادگار چھوڑی ہیں۔اس عہد کے علما وفضلا کی علمی

کاوشوں اور کوششوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کا برملا اعتراف تمام حق پسند اہل علم ودانش کرتے ہیں۔

14.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1-علم اعراب ومعانی القرآن پر ایک نوٹ لکھیے۔

2-عہد عباسی میں مدون کیے جانے والے مجموعۂ احادیث کو کن کن زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

3-علم اصول فقہ پر ایک نوٹ لکھیے۔

4-عہد عباسی میں فن کیمیاء کے فروغ پر روشنی ڈالیے۔

5-علم ہیئت ونجوم میں عہد عباسی کے علما کی خدمات کا مختصر تعارف کرایے۔

6-علم جغرافیہ میں عہد عباسی کے علما وفضلا کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

7-فن تفسیر پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

8-فن اسماء الرجال پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

9-فقہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کے ادوار تدوین اور مشہور فقہی مکاتب پر روشنی ڈالیے۔

10-فن سیرت نبوی کے آغاز وارتقا کا تفصیل سے جائزہ لیجیے۔

11-عہد عباسی میں طب کے فروغ پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

12-عہد عباسی میں فن تاریخ کے فروغ پر ایک نوٹ لکھیے۔

13-عہد عباسی کی نثر نگاری کا جائزہ لیجیے۔

14.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

-تاريخ الأدب العربي (العصر العباسي الأول) — ڈاکٹر شوقی ضیف

-الجامع في تاريخ الأدب العربي — حنا فاخوری

-تاريخ الأدب العربي — احمد حسن زیات

-عصر العباسيين (الجزء الأول والجزء الثاني) — ڈاکٹر محمد زغلول سلام

-تاریخ تہذیب اسلامی (حصہ سوم: خلافت عباسی) — از پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء (طبع اول)

-عربی ادب کی تنقیدی تاریخ — پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

-اردو دائرۃ المعارف

اکائی 15 عصر عباسی میں فنی نثر کا ارتقا

اکائی کے اجزا

15.1 مقصد

15.2 تمہید

15.3 عہد عباسی کی نثر نگاری

15.3.1 عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب وعوامل اور اس کے امتیازات وخصائص

15.3.2 عہد عباسی میں نثر نگاری کے ارتقائی مراحل

15.3.3 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات

15.4 نثر نگاری کے اصناف

15.4.1 خطابت

15.4.2 توقیعات

15.4.3 مراسلات

15.4.4 مناظرے

15.4.5 مقامات

15.4.6 تنقید نگاری

15.5 نمائندہ نثر نگار اور نمونہ کلام

15.5.1 ابن المقفع (۱۰۶-۱۴۲ھ)

15.5.2 سہل بن ہارون (م ۲۱۵ھ)

15.5.3 ابراہیم بن عباس بن محمد الصولی (۱۷۶-۲۴۳)

15.5.4 جاحظ (۱۵۹ھ-۲۵۵ھ)

15.5.5 ابن قتیبہ (۲۱۳-۲۷۶ھ)

15.5.6 ابن العمید (م ۳۶۰ھ)

15.5.7 صاحب بن عباد (۳۲۶-۳۸۵ھ)

15.5.8 بدیع الزماں ہمدانی (۳۵۸ھ-۳۹۸ھ)

15.5.9 قاضی فاضل (۵۲۹-۵۹۶ھ)

15.5.10 ضیاء الدین ابن الاثیر

15.6 اکتسابی نتائج

15.7 نمونے کے امتحانی سوالات

15.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

15.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر ہم اس بات سے واقف ہوسکیں گے کہ عہد عباسی میں نثر نگاری کے پروان چڑھنے کے کیا اسباب تھے؟ شاعری کے مقابلہ میں نثر نگاری نے کیونکر ترقی کی تھی اور اس کا معیار و مرتبہ کس قدر بلند تھا؟ ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے نثر نگاران کے حالات، علمی وادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کے اصناف سخن سے واقف ہوا جا سکے گا۔

15.2 تمہید

عباسیوں اور امویوں کی طویل سیاسی کشمکش بالآخر ۱۳۲ھ میں عباسی حکومت کے قیام پر ختم ہوئی۔ تاریخ ادب عربی کے مختلف ادوار میں عباسی دور (۱۳۲ تا ۶۵۶ھ/ ۷۵۰ تا ۱۲۵۸ء) عام طور سے اہم دور سمجھا گیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں سلطنت عباسیہ کے حدود میں رہنے والے باشندے چاہے وہ کسی قوم اور کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، قابل لحاظ ترقی کی راہ پر گام زن رہے۔ اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہے اس کے آغاز میں یونانی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی اور ایرانی علوم عربی میں منتقل ہوئے اور عربوں نے انہیں اس طرح اپنایا کہ وہ عربوں کا بیش قیمت ورثہ بن گئے۔ مجموعی طور پر عباسی معاشرہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ بن گیا تھا جس میں سماج کی ساری بنیادی ضرورتیں پائی جاتی تھیں۔ ویسے تو عباسی حکومت تیرہویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی پر ختم ہوئی لیکن مسلم معاشرہ میں اور زبان وادب وغیرہ میں زوال کے آثار گیارہویں صدی میں شروع ہو چکے تھے۔

ادب چونکہ زندگی کا آئینہ ہوتا ہے لہٰذا جب انسان کی زندگی اور رہن سہن میں تبدیلی آتی ہے اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدلتے ہیں تو ادب بھی اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہے۔ دور جاہلی کے ادب اور سلامی ادب میں جس طرح سوچنے اور سمجھنے کی تبدیلی کی وجہ سے نمایاں فرق ملتا ہے اسی طرح عباسی دور میں طرز زندگی بدل جانے سے عربی ادب میں بھی نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ چنانچہ عباسی دور کا ادب اسلامی اور اموی دور کے ادب سے جداگانہ نظر آتا ہے۔ اس دور میں ادب میں جو تبدیلیاں آئیں وہ یکا یک نہیں تھیں بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اثرات ظاہر ہوئے تھے۔ ابتدا میں کچھ لوگوں نے قدیم طرز پر لکھنے کی کوشش کی لیکن ایرانی اثرات کے دباؤ میں وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ حتیٰ کہ عباسی دور کے اواخر میں یہ تبدیلی اتنی زیادہ ہوگئی کہ عربی ادب کا ڈھانچہ تو صرف عربی تھا لیکن اس کی اصل روح فارسی تھی۔

15.3 عہد عباسی کی نثر نگاری

نئے طرز زندگی اور مفتوحہ ممالک سے میل جول کا اثر اس زمانہ کی نثر نویسی پر بھی صاف ظاہر ہوتا ہے۔ نثر نے قوت، عمق اور وسعت میں ترقی کی۔ افکار، موضوعات اور اغراض میں حیات جدیدہ کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس دور کے نثر میں معنی میں وسعت، مضامین میں تنوع اور الفاظ کی زیب وزینت پر زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ ادیبوں نے معنوی اور لفظی دونوں طرح کے حسن کا برابر خیال رکھا۔ اس دور کے آغاز ہی سے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں طوالت کو فارسی اثر کی وجہ سے اپنانا شروع کر دیا تھا، جب کہ بعض لوگ ایسے بھی تھے، جو اس ڈر سے کہ کہیں جدت پسندی عربی نثر کے لیے نقصان دہ نہ ہو مختصر نویسی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے۔ عباسی دور کا مشہور وزیر اور ادب نواز جعفر بن یحییٰ برمکی کہا کرتا تھا ''لو استعطم أن تكون كتبكم كالتوقيعات فافعلوا'' یعنی اگر تمہیں قدرت ہو کہ تمہاری

تحریریں مختصر نوٹ کی طرح ہوں تو تم ایسا ہی کرو۔

اسی نظریہ پر بہت سے لوگوں نے عمل بھی کیا جس کی مثال طاہر بن حسین کے اس مختصر خط سے ملتی ہے جو اس نے خلیفہ مامون کو لکھا تھا: "كتابي إلى أمير المؤمنين ورأس عيسى بن ماهان بين يديه وخاتمه في يدي وعسكره مصروف تحت أمري والسلام" (میرا یہ خط امیر المومنین کے لیے ہے، عیسی بن ماہان کا سران کے سامنے ہے، اس کی انگشتری میرے قبضہ میں ہے اور اس کا لشکر میرے حکم کے تابع ہے) لیکن اس کے برعکس دوسری طرف ایسے رسائل بھی تھے کہ جن میں طوالت کو اختیار کیا جاتا تھا، بالا رادہ بہترین الفاظ لکھے جاتے تھے اور لکھنے والا ان کو مرتب کرنے میں کافی محنت سے کام لیتا تھا۔ جملوں میں موسیقیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عباسی دور کے شروع میں مقفی اور مسجع نثر بھی فطرت سے زیادہ قریب تھی اور اس میں زیادہ تکلف سے کام نہیں لیا جاتا تھا لیکن اسی دور کے آخر میں جب زبان میں فساد پیدا ہوگیا تو سجع میں زیادہ تکلف اور آورد سے کام لیا جانے لگا۔ زبان کی خامیوں کو مقفی اور مسجع نثر لکھ کر پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اطناب میں حدود کو ختم کر دیا گیا۔ پہلے جو بات دو یا چار جملوں میں پوری ہو جاتی تھی اب اسی کو ادا کرنے کے لیے کئی صفحات رنگین کر دیئے جاتے تھے مگر پھر بھی نفس مطلب پورا نہیں ہوتا تھا۔ اطناب کو اختیار کرنے والا سب سے پہلا شخص عبد الحمید بن یحییٰ کاتب تھا جو فارسی النسل ہونے کی وجہ سے اپنی اصل زبان کی خصوصیات کو عربی زبان میں لانا چاہتا تھا۔

15.3.1 عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب وعوامل اور اس کے امتیازات وخصائص

عباسی دور میں مجموعی طور پر نثر فنی کی نشوونما میں متعدد عوامل کارگر رہے تھے۔ انشا پردازوں کو پہلے کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ آزادی تھی۔ قرآن کریم اور احادیث سے استفادہ اور استدلال نے ان کی عبارتوں میں نکھار پیدا کر دیا تھا اور اسی کے ساتھ فارسی اثرات سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس دور کی نثر میں عام طور پر تمہیدی کلمات اور مقدمات کا اضافہ ہوا اور منتخب عبارات آغاز اور اختتامیہ کے طور پر استعمال ہوئیں۔ آسان عبارات، واضح اسلوب، منتخب پرشکوہ الفاظ، معنی میں گہرائی اور افکار وخیالات میں ترتیب اس دور کی نمایاں خصوصیات ہیں لہٰذا ان تمام چیزوں کا مجموعہ ان ادیبوں کی انشا پردازی میں ایک مخصوص انداز پیدا کر دیتا ہے جو ان کو دیگر زمانہ کے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔

عباسی دور میں نثر نگاری کی ترقی میں حسب ذیل عوامل واسباب نے نمایاں کردار ادا کیا ہے:

۱- انشا پردازوں کو غیر معمولی قسم کی آزادی کا حاصل ہونا۔

۲- عربوں کا غیر عربوں کے ساتھ میل جول اور ان قوموں کی تہذیب وتمدن نے عربوں پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے اور اہل عرب کی عقلوں کو پختہ کرنے اور اسلامی افکار وثقافت کے نشوونما وفروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

۳- عربوں کا ان تمام تہذیب وتمدن سے استفادہ کر کے ان میں سے صالح نافع کو اختیار کرنا۔

۴- ہر طرح کی آزادی نے غیر عرب مسلمانوں کو اس کا اہل بنا دیا تھا کہ وہ حکومت وقت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کو حاصل کر لیں۔ ان لوگوں نے اپنی تہذیب وتمدن کو عربوں میں پھیلایا اور عرب وغیر عرب کی فکری کش مکش کے نتیجہ میں عربوں میں فکری بیداری اور عربی عقل میں پختگی آئی۔

۵-عباسی دور کے سیاسی طور پر مستحکم طویل دورانیہ نے علمی وفکری فضا کو ہموار کیا۔

عہد عباسی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات وامتیازات حسب ذیل ہیں:

ا-اس دور میں ادبی نثر، قصص وحکایات، دفتری تحریروں، دینی وسیاسی خطابت پر مشتمل تھا اورادبا نے ہر قسم کے موضوعات اوراغراض پر خامہ فرسائی کی۔

۲-اس دور کی نثر میں تسلسل افکار، علمی گہرائی، فلسفیانہ اورمنطقی وسعت کی چھاپ نظر آتی ہے جودیگر قوموں کے تہذیبی اثرات کی وجہ سے اس دور کے نثر پر پڑی۔

۳-اس دور کی نثر میں بلند خیالی اوروضاحت پائی جاتی ہے۔ ادبا نے اعتدال کی راہ اختیار کی اوراپنے احساسات وجذبات کی سچی ترجمانی کی۔ یہ سلسلہ چلتارہا حتی کہ عباسی دور کے اواخر میں حکومت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ انشا پردازی میں بھی کمزوری پیدا ہوگئی۔ انشا پردازوں نے کچھ انواع بدیع کے زیراثر اور کچھ فارسی زبان کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے کلام کوحسین اور خوش نما بنانے کی کوشش کی اوراس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زبان کا ڈھانچہ توعربی تھامگر اس کی اصل روح بدل چکی تھی۔ عبارتوں کوحسین بنانے میں اس قدر غلوکیا کہ الفاظ بھونڈے ہوگئے اورمعانی ناقص۔ اگر یہ رجحان خالص عربی نثر کے بجائے خطوط نویسی، وصایا اورعہدناموں تک محدود رہتا تو بہتر ہوتا مگر یہ اسلوب کتابوں کی تصنیف اورعلوم کی تدوین میں استعمال کیا جانے لگا۔

۴-عباسی دور کے آغاز میں عبارتوں میں ایجاز، اطناب اور مساواۃ کا استعمال مناسب طریقہ پر ہوتا تھا، الفاظ سہل اورشیریں ہوتے تھے اورمعانی میں وضاحت کا اہتمام کیا جاتا تھا اوراس کے لیے امثال وحکم، قرآن وحدیث اوراقوال عرب سے استشہاد کیا جاتا تھا۔لیکن چوتھے دور میں، جس کے سردار قاضی فاضل تھے، اسلوب میں سجع بندی اور بدیع پسندی کے ساتھ توریہ اورتجنیس میں اس قدرغلو ہوا کہ اس زمانہ میں انشا پردازی محض تکلفات کا مجموعہ بن کررہ گئی، جس میں الفاظ کی خوبصورتی کا اہتمام ہوتا تھالیکن مضمون ناقص اورخیال نامکمل ہوا کرتے تھے۔

۵-اس دور میں ایسے ایسے انشا پرداز بھی ہوئے کہ جنھوں نے نثر نویسی میں یگانگت کو باقی رہنے نہیں دیا اورجدا جدا اسالیب کا استعمال ہونے لگا، چنانچہ جاحظ کے دور میں ابن عبدربہ کے جیسے ابن المقفع کے پیروکاراور ابن العمید کے دور میں شریف رضی جیسے حضرت علی کے اسلوب کا اتباع کرنے والے ملتے ہیں۔ یہ صورت حال عربی نثر میں جدت اورقدامت دونوں رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔

15.3.2 عہد عباسی میں نثر نگاری کے ارتقائی مراحل

عصر عباسی کا دورانیہ ۱۳۲ تا ۶۵۶ھ/ ۷۵۰ تا ۱۲۵۸ء پر محیط ہے اور اسے اسلامی تاریخ کا عہد زریں قرار دیا جاتا ہے، بقول احمد حسن زیات ''حکومت عباسیہ کا زمانہ اسلام کا وہ زریں عہد ہے جس میں مسلمان تمدن وتہذیب اورعمران واقدار کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل یا اس کے بعد پھر کبھی اس بلندی پر نہ پہنچے۔فنون اسلامیہ اس دور میں پھلے پھولے، آداب عربیہ نے نشوونما پائی۔ غیر ملکی علوم کے ترجمے کیے گئے۔عقل عربی پک کرتیار ہوئی اورغوروفکر، بحث وتمحیص کے لیے ایک وسیع جولان گاہ پائی''۔ اس دور کے علمی کارناموں کا جائزہ لیتے وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ علم وفن کی وہ کونسی صنف ہے جو اپنے اندر شان انفرادیت نہیں رکھتی ہے، علوم قرآن، علوم حدیث، فقہ، نحو، علم لغت، معانی وبیان، تاریخ نویسی، جغرافیہ، فلسفہ اور طب یہ تمام موضوعات ایسے ہیں کہ جن میں اس دور کی خدمات روز

روشن کی طرح نمایاں ہیں۔اس دور میں شعروشاعری کے ساتھ ساتھ نثرنویسی کے معیار کو کسی اعتبار سے کم تر نہیں کہا جاسکتا ہے۔

عبداللہ بن المقفع (۱۴۲ھ)، سہل بن ہارون(۲۱۵ھ)، جاحظ (۲۵۵ھ)، ابن العمید (م ۳۶۰ھ)، صاحب بن عباد (م ۳۸۵ھ)،قاضی فاضل (م ۵۹۶ھ)،ابوعبیدہ (م ۲۰۹ھ)،اصمعی (م ۲۱۶ھ)، ابن قتیبہ (م۲۷۶ھ)،ابن رشید (م ۴۵۶ھ) ،بدیع الزماں ہمدانی (م ۳۹۸ھ)، ابوالقاسم حریری (م۵۱۶ھ) اور قدامہ بن جعفر (م ۳۳۷ھ) جیسے لوگوں نے اس صنف کو جلابخشی اور انھیں لوگوں کی خدمات پر اس عہد کے نثری کارناموں کا شاندار محل تعمیر ہوا۔اس کے باغ میں نئے نئے پھول کھلے اور اس گلشن کی بہار آج تک قابل رشک شمار کی جاتی ہے۔

عربی نثر کے ارتقا کے سلسلہ میں عصر عباسی اول ۱۳۲ تا ۲۳۲ھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔نثر کے ارتقا میں دیگر علوم وفنون کے ترجموں سے مدد ملی۔ یونان،ایران اور ہندوستان کی ثقافتوں کا گہرا اثر عربی زبان وادب پر پڑا اور عربی نثر نے ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرلیا۔فلسفہ اور دیگر علوم کے مباحث کے لیے گنجائش پیدا ہوئی،غوروفکر کا معیار بلند ہوا اور تراجم کی بدولت دیگر زبانوں کے شاہکار عربی میں منتقل ہوئے جس سے عربی نثر میں ایک نئے رنگ کی آمیزش ہوئی اور اسے نئے فنون سے آشنا ہونے کا موقعہ ملا۔

جس طرح سیاسی اور اجتماعی حالات کے اعتبار سے عباسی دور کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح اس دور کے انشا پردازوں کو بھی درج ذیل چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔پہلا دور ۱۳۲ھ تا ۲۳۲ھ،خلافت عباسی کے آغاز سے متوکل کی تخت نشینی تک۔

۲۔دوسرا دور ۲۳۲ھ تا ۳۳۴ھ،متوکل کی تخت نشینی سے بنو بویہ کی حکومت کے قیام تک۔

۳۔تیسرا دور ۳۳۴ھ تا ۴۴۷ھ، بنو بویہ کے غلبہ بغداد سے سلاجقہ کی آمد تک۔

۴۔چوتھا دور ۴۴۷ھ تا ۶۵۶ھ،سلاجقہ کی حکومت سے تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی بغداد تک۔

15.3.3 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات

عہد عباسی کے نثر نگاران کو حسب ذیل طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا طبقہ: اس طبقہ کا سردار ابن المقفع ہے۔بقول حسن زیات ’’اس کے اسلوب میں نیرنگی عبارت، جملوں کو (چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں) توڑنا، الفاظ میں ہم آہنگی، سہل پسندی، معانی کا زیادہ اہتمام اور سجع بندی سے گریز شامل ہیں‘‘۔ اس طبقہ کے دیگر انشا پردازوں میں یعقوب بن داؤد، جعفر بن یحیی ، حسن بن سہل، عمرو بن مسعدہ، سہل بن ہارون اور حسن بن وہب ہیں۔اس طبقہ کے نثر نگاری کی وہی خصوصیات ہیں جو عبداللہ بن المقفع کے نثر کی ہیں۔

دوسرا طبقہ :اس طبقہ کا سردار جاحظ ہے،عبارت کے آسان اور پرشوکت ہونے میں اس کا اسلوب پہلے طبقہ کے اسلوب سے زیادہ مشابہ ہے۔لیکن اسی کے ساتھ مختصر جملے لکھنا، بات سے بات نکالتے چلے جانا (استطراد)،ایک جملہ کو بہت سے مقفیٰ یا غیر مقفیٰ فقروں میں توڑنا، الفاظ اور جملوں میں اطناب،،قاری کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ اور ٹھوس مضامین میں ظرافت اور ہنسی مذاق کی آمیزش،مضمون کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا اور مطلب کو کھول کر بیان کرنا،عقل ومنطق سے استدلال کے ساتھ ساتھ نقلی وعقلی دلائل سے استشہاد اور اثنائے عبارت میں

دعائیہ جملے لانا شامل ہیں۔اس طبقہ کے دیگر لوگوں میں ابن قتیبہ (۲۷۶ھ)، مبرد (م ۲۸۵ھ) اور ابوبکر صولی (م ۳۳۵ھ) ہیں۔

تیسرا طبقہ: اس طبقہ کا سردار ابن العمید ہے۔اس کا اسلوب نہایت دل نشین اور طبیعت کو موہ لینے اور وجدان پر قابو پا لینے والا ہے۔ کہ وہ بالکل شاعرانہ طریقہ ہے، جس میں وزن کے علاوہ کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور یہ طرز ادا اپنی لازمی قیود کی پابندی اور تمام اسالیب پر غالب آنے کی وجہ سے یورپ کے قدیم تقلیدی (مقبول عام) اسلوب سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اس اسلوب کے لیے چھوٹے چھوٹے مسجع جملے، تجنیس (متشابہ وہم شکل الفاظ) تاریخ اور دیگر علوم کے لطائف کی آمیزش، اثنائے عبارت میں شعروں سے استشہاد، نفس مضمون کی سلامتی وعمدگی کے ساتھ تخیل وتشبیہ میں وسعت، لازمی قیود ہیں۔ اس اسلوب کو اپنانے والوں میں صاحب بن عباد (۳۸۵ھ)، وزیر مہلبی (۳۵۲ھ)، خوارزمی (م ۳۸۳ھ) بدیع الزماں ہمدانی (۳۹۸ھ)، صابی اور ثعالبی (۴۲۹ھ) ہیں، مقامات اسی طبقہ کے آثار میں ہیں۔

چوتھا طبقہ: چوتھے طبقہ کا سردار قاضی فاضل ہے، اس کے اسلوب کی بنیاد سجع بندی اور بدیع پسندی میں تیسرے طبقہ کے اسلوب کے مطابق ہے لیکن توریہ (لفظی ہیر پھیر)، ابہام اور تجنیس میں اس نے اس قدر غلو کیا کہ اس کے زمانہ میں انشا پردازی محض تصنع وتکلفات کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔اس طبقہ کی انشا پردازی کے الفاظ نہایت خوبصورت اور خوش نما ہوتے ہیں، لیکن مضمون ناقص اور خیال نامکمل۔ اس طرز کے انشا پردازوں میں المثل السائر مصنف ابن الاثیر (م ۶۳۷ھ)، کاتب اصبہانی (م ۵۶۳ھ) اور ابوالقاسم حریری (۵۱۶ھ) وغیرہ ہیں۔

حسن زیات نے مذکورہ بالا چاروں طبقات میں ہر طبقہ کی خدمات اس عہد کے اعتبار سے اہم اور ممتاز قرار دیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انشا پردازوں کے اس عقیدہ نے کہ اسلاف سے منقول نثر کو حفظ کر لینا ثقافت وادب کا لازمہ اور تفوق وبرتری کا ذریعہ ہے، قلموں میں یگانگت باقی نہ رہنے دی اور اسالیب کو جدا جدا کر دیا، جس کی وجہ سے ایک ہی زمانہ میں انشا پردازی کے مختلف طریقے ہونے لگے۔ چنانچہ آپ کو جاحظ کے زمانہ میں ابن عبدربہ جیسے ابن المقفع کے مقلد اور ابن العمید کے زمانہ میں شریف رضی جیسے امام علیؓ کے پیرو ملیں گے۔لیکن بایں ہمہ تمام ہم عصر انشا پرداز اپنے سیاسی واجتماعی حالات کے سامنے مجبور ہوجاتے ہیں اور ان کی انشا پردازی میں ایک مخصوص انداز پیدا ہوجاتا ہے جو ان کو دوسرے زمانوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

15.4 نثر نگاری کے اصناف

عہد عباسی کے نثری ارتقا میں دیگر علوم وفنون کے ترجموں سے مدد ملی اور ارتقا کا یہ عمل نقل وترجمہ سے مکمل ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مشرق وسطی کی قومیں جب عربوں سے رابطہ میں آئیں تو اپنی ثقافت اور علوم سے عربوں کو متعارف کرایا۔۔عربی نثر کی ترقی میں تحریک ترجمہ کا نمایاں اثر پڑا اور ہر عمدہ کتاب کو عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس دور میں لفظی ترجمہ پر زیادہ زور تھا لیکن دوسرے دور میں مترجمین کا میلان سلیس ترجمہ کی جانب ہوا۔ اس دور کے ترجمہ میں فصاحت اور روانی کی وجہ یہ تھی کہ علمائے لغت اور علمائے بیان کی کوششوں سے لوگ فصاحت وبلاغت کی شرطوں سے واقف ہونے لگے تھے؛ لیکن جب اہل عرب کا میل جول دیگر اقوام سے ہوا اور بالخصوص ایرانیوں کے اثرات غالب آنے لگے تو انھوں نے تکلف اور تصنع سے کام لینا شروع کر دیا اور ایجاز کے بجائے ان کی عبارتوں میں اطناب غالب آتا گیا۔ اس اختلاط اور اثر پزیری کے بعد عربی نثر ایک نئے رخ پر چل پڑی اور اس کی متعدد شاخیں وجود میں آئیں مثال کے طور پر علمی نثر، فلسفیانہ نثر، تاریخی نثر اور خالص ادبی نثر جو

ایک طرح سے قدیم نثر کا تسلسل تھی مگر اس کی بعض صورتیں اتنی نئی اور اچھوتی تھیں کہ عربوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔اسی کے ساتھ اس نثر نے لغوی اور شرعی علوم کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی، جس کے نتیجہ میں ایک بڑا لغوی و دینی سرمایہ وجود میں آ گیا۔اس عہد کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی بیش تر فنون کے مآخذ اس دور کی تصنیفی یادگار ہیں۔

عہد عباسی میں نثر نگاری کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔خطابت، مناظرے، علوم لسانیہ، تاریخ نویسی، علوم شرعیہ، فلسفہ اور علم کلام کے ساتھ ساتھ دیگر نثری اصناف کے لیے راہیں ہموار ہوئیں چنانچہ دفتری کارروائیاں، انشا و ترسیل کے لیے ترقی کا سبب بنیں تو قصص و حکایات سے لوگوں کی دلچسپی نے نثر کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کی۔نحو و صرف اور بلاغت کی تدوین سے زبان صاف ستھری ہوگئی، تاریخ، جغرافیہ، لغت نویسی، بلاغت و بیان، تصوف، فقہ و اصول فقہ، حدیث و اصول حدیث، فلسفہ، طب، کیمیا، نجوم اور خالص ادبی نثر کے بے شمار نمونے سامنے آئے۔اب ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ معیاری اور غیر معیاری نمونوں کی شناخت ہو لہٰذا فن تنقید کے اصول وضوابط کی تدوین ہوئی۔ نقد و نظر کا معیار متعین کرنے میں جاحظ کی **البیان و التبیین**، قدامہ بن جعفر کی **نقدالنثر**، ابراہیم بن مدبر (م ۲۷۸ھ) کی تصنیف **الرسالۃ العذراء** اور اسحاق بن ابراہیم (م ۳۳۷ھ) کی کتاب **البرھان فی وجوہ البیان** کو اہمیت حاصل ہے۔

اس دور کی دیگر نثری اقسام میں مراسلہ نویسی، عہد نامے، وصایا اور توقیعات کو فروغ ہوا۔ دفتری خطوط لکھنے پر انہیں لوگوں کو مامور کیا جاتا تھا جن میں ادب کا ذوق اور بلاغت کا ملکہ ہوتا تھا۔ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو مختلف علوم وفنون سے واقفیت ہوتی تھی۔ یہ مراسلات ملک کے انتظامی امور، حکام کے تقرر، خلفا کے لیے بیعت، فتوحات جہاد، ملک میں امن وامان اور حکام کو وصیت، لوگوں کو تہنیت یا تعزیت جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں۔

علوم وفنون کی یہ تاریخ ساز ترقی خود بخود پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے پس پشت حکمراں طبقہ کی تائید و اعانت شامل تھی۔ خلفا کی دیکھا دیکھی دیگر امرا اور ارباب ثروت بھی علمی مشاغل کی سرپرستی کرتے تھے۔عباسیوں نے اور ارباب ثروت نے ادب نوازی میں جس کشادہ قلبی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی بدولت مختلف علوم وفنون کی تدوین و ارتقا کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ صاحبان تصنیف کو گراں قدر انعامات سے نوازا جاتا تھا ان کے لیے وظائف خاص تھے اور ملازمتوں میں ان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ مدارس، مکاتب، لائبریریاں اور جامعات حکومت کے زیر انتظام قائم ہوئیں ان سب کا ثمرہ یہ تھا کہ تعلیم و تصنیف کو بے حد فروغ ہوا۔

15.4.1 خطابت

اس دور کے اوائل میں بھی سیاسی خطابت کا زور رہا کیونکہ بنوامیہ کی حکومت کو ختم کرنے اور اپنے حق خلافت کو ثابت کرنے کے لیے انہیں ایسے خطیبوں کی ضرورت تھی جو ان کے حق میں فضا ہموار کر سکیں۔حکومت کو مستحکم کرنے، فوج کو جنگ پر آمادہ کرنے اور وفود کے خیر مقدم کرنے کے لیے خطابت کو قدر و منزلت حاصل تھی۔عباسی خلفا میں منصور (م ۱۵۸ھ) مہدی (م ۱۶۹ھ)، ہارون رشید (م ۱۹۳ھ) اور مامون (م ۲۱۸ھ) کا شمار عمدہ خطیبوں میں ہوتا تھا۔ان کے علاوہ داود بن علی (م ۱۳۳ھ)، خالد بن صفوان (تقریباً ۱۳۳ھ) اور شبیب بن شیبہ (م ۱۷۰ھ) میں خطابت کا بڑا ملکہ موجود تھا۔ جب عباسی حکومت پوری طرح مستحکم ہوگئی تو فن خطابت کی طرف عدم توجہ نے اس فن کو زوال پذیر

کر دیا اور اس کی جگہ شاہی فرامین اور مکاتیب نے لے لی، خطبات صرف جمعہ، عیدین اور نکاح کے لیے محدود ہو گئے۔

اموی دور کی طرح عباسی دور میں بھی دینی خطابت اور وعظ گوئی کو ترقی ہوئی۔ واعظوں کی ایک بڑی تعداد بغداد، کوفہ اور بصرہ کے مساجد میں وعظ و نصیحت کا فریضہ انجام دیتی تھی، ان میں زہاد، فقہا، محدثین اور متکلمین ہر طرح کے لوگ تھے۔ یہ لوگ خلفا کی مجلسوں میں بھی وعظ و نصیحت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ خلفاء کی مجالس میں وعظ و نصیحت کرنے والوں میں تین لوگوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ پہلا شخص خلیفہ منصور کا خطیب عمرو بن عبید معتزلی (م ۱۴۴ھ)، دوسرا خلیفہ مہدی کا خطیب صالح بن عبدالجلیل اور تیسرا ہارون رشید کا خطیب ابن السماک (م ۳۴۴ھ) ہے۔

اس دور کے واعظین اپنے خطبوں میں آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ اور سابق واعظوں کے اقوال سے استشہاد کرتے تھے۔ جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں واعظین کا ذکر ایک مستقل فصل میں کیا ہے۔ ان واعظین کی وجہ سے نثر کو معنوی لحاظ سے کافی ترقی ہوئی کیونکہ یہ لوگ معنی آفرینی کے ساتھ دقیق نکات، منتخب الفاظ اور حسن اسلوب کے ساتھ کلام پیش کرتے تھے۔ ان واعظوں میں سب سے زیادہ شہرت موسی بن سیار اسواری، صالح مرّی، عمرو بن فائد اور قاسم بن یحییٰ ضریر کو حاصل ہوئی۔

15.4.2 توقیعات

توقیعات سے مراد وہ مختصر اور بلیغ نوٹ ہے جو توقیع نگار بادشاہ یا وزیروں کے سامنے پیش کرتا تھا۔ خود خلفا اور وزرا بھی یہ نوٹ لکھتے تھے۔ خلفا میں سفاح، منصور اور ابن المعتز اور ان کی توقیعات مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ جعفر بن یحییٰ برمکی (م ۸۰۳) فضل بن سہل (م ۲۰۳ھ) احمد بن ابوطاہر طیفور (م ۲۸۰ھ) کو اس صنف میں مہارت حاصل تھی۔ بہت سے لوگ توقیع میں کوئی آیت یا شعر بھی لکھ دیا کرتے تھے۔

15.4.3 مراسلات

اس کے علاوہ اخوانیات کے متعلق مراسلت کو بھی بے حد ترقی ہوئی۔ اس قسم کے مراسلت میں ان لوگوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہوتی تھی جو، شوق، خوف، مدح، ہجو، عتاب، اعتذار، تہنیت یا تعزیت کے مفہوم کے حامل ہوتے تھے۔ اموی دور میں یہ مضامین اشعار کے ذریعہ ادا کیے جاتے تھے لیکن عباسی دور میں نثر کا دائرہ وسیع ہوجانے کے بعد ان مضامین کو نثر میں ادا کرنا ممکن ہوگیا۔ اس قسم کے رسائل میں تعزیت کے موضوع پر رسائل کی کثرت ہے۔ عتاب میں ادیب مہذب انداز میں اپنے غصہ کا اظہار کرتا تھا۔ اس کی بہترین مثال ابن عمید (م ۳۶۰ھ) کے اس رسالہ میں دیکھی جا سکتی ہے جو اس نے ابن بلکا کو رکن الدولۃ کی نافرمانی پر لکھا تھا۔ یہ رسائل (خطوط) کبھی تفریحی مجلسوں میں وقت گذاری، کبھی محض ملاقات اور وقت گذاری اور کبھی مبارکباد دینے کے لیے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ اس دور کے رسائل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عباسی دور کے ادبا ان تمام اصناف سخن کو اپنے رسائل میں استعمال کرتے تھے جنھیں شعرا نے اختیار کیا تھا حتیٰ کہ فطری مناظر کی عکاسی کے لیے بھی ان کا استعمال ہوا ہے۔

دیوانی مراسلہ نگاروں میں عمارۃ بن حمزہ، مسعدہ بن سعد، یحییٰ برمکی، ابراہیم بن عباس صولی، جعفر بن یحییٰ برمکی، محمد بن عبدالملک الزیات، سلیمان بن وہب اور حسن بن وہب وغیرہ مشہور ہیں۔

15.4.4 مناظرے

اس دور میں مناظروں کا بھی دور دورہ رہا۔ ابو الہذیل علاف (م ۲۲۷ھ)، نظّام (م ۲۲۱ھ)، واصل بن عطا (م ۱۳۱ھ) اور عمرو بن عبید (م ۱۴۳ھ)۔ زیادہ شہرت کے حامل تھے۔ ان متکلمین نے اس زمانہ میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑی جس میں شک وشبہ اور بحث ومباحثہ کی گنجائش نہ ہو۔ جاحظ نے کتاب البیان و التبیین اور کتاب الحیوان میں ان کی فصاحت وبلاغت کو بیحد سراہا ہے۔ مناظروں اور بحث ومباحثے کے معیار کو برقرار رکھنے کی خواہش نے ان لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ علم بلاغت میں مہارت حاصل کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کس طرح ایک متکلم اپنے مخالف کو زور بیان کی وجہ سے اپنی بات منوانے اور اسے ساکت کرنے میں مہارت حاصل کرسکتا ہے اور کس طرح وہ اپنے طرز بیان، منتخب الفاظ اور حسن ادا سے سامعین کو متاثر کرسکتا ہے۔ جاحظ کی کتاب الحیوان کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسا موضوع نہ ملے گا کہ جس سے انھوں نے تعرض نہ کیا ہو۔ یہ لوگ اپنے شاگردوں کو بھی مناظرے کی مشق کرواتے تھے جس میں وہ ان کی حرکات و سکنات، الفاظ واقوال، اشارے واصوات، قیاس وعلل اور طریقہ استدلال کو جانچتے تھے اور ان کی خامیوں کی طرف اشارہ بھی کرتے تھے۔ ان متکلمین کے طفیل عربی زبان کے اسلوب میں بقول شوقی ضیف ”اس قدر لچک پیدا ہوگئی کہ وہ دقیق معانی کی ادائیگی پر قادر ہوگئی اور عباسی طرز اظہار کے بلیغ نمونے تخلیق کیے۔۔۔۔۔ دوسری صدی کے سبھی بڑے ادیب خواہ ان کا تعلق ابن المقفع جیسے مترجم کی جماعت سے ہو یا سہل بن ہارون کے گروہ سے سبھی اسی فصیح وبلیغ اسلوب کا استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ یہ اسلوب جاحظ کے پاس آکر اوج کمال کو پہنچ جاتا ہے“۔

15.4.5 مقامات

”مقامہ“ اس مختصر، دلچسپ اور خوش اسلوب حکایت کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی نصیحت یا لطیفہ ہو۔ یہ لفظ مقام سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھڑے ہونے کی جگہ پھر اس کے معنوں میں وسعت پیدا کرکے اسے مجلس اور جگہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔ بعد میں کثرت استعمال سے مجلس میں پڑھے جانے والے خطبے اور پند ونصائح کو بھی مقامہ یا مجلس کہا جانے لگا جیسے **مقامات الخطباء**، **مقامات القصاص** اور **مقامات الزھاد**۔ حکایت کی یہ صنف عہد عباسی کے وسط میں سامنے آئی اور اس کی ابتدا ابن فارس نے کی پھر اس کے شاگرد بدیع الزماں نے اسے اوج کمال تک پہنچایا۔ مقامہ سے مقصود نہ تو جمال حکایت ہے نہ حسن وعظ اور نہ افادۂ علمی بلکہ وہ ایک فنی اور ادبی تحریر ہے جس میں نہ تو تخیل نفسی ہے نہ ہی فنی قصہ نگاری بلکہ مقامات لکھنے والوں کی زیادہ تر توجہ تحسین لفظی اور مسجع ومقفی عبارات لکھنے پر رہی جن کا اولین مقصد اپنے لسانی ملکہ کا اظہار کرنا تھا اور ثانیا نوجوان ادبا کو انشا پردازی کی مشق بہم پہنچانا۔ ابن القفطی کا یہ قول کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ”انشا پردازی کی مشق اور نظم ونثر کے دوسرے اسالیب سے واقفیت کے سوا مقامات سے کوئی اور شے کی کشید نہیں کی جاسکتی“۔

مقامات کے دور رس اثرات عربی زبان وادب پر مرتب ہوئے ہیں، ہمدانی کے ”ابلیسی مقامہ“ سے متأثر ہوکر ابن شہید اندلسی اور ابو العلاء معری نے عالم مابعد الطبعیات کا اپنا سفر نامہ لکھا اور اس عالم کے حالات کو قوت متخیلہ کے مدد سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ مزید برآں یہی صنف آگے چل کر فن قصہ نگاری اور ناول نگاری کی بنیاد بن جاتی ہے۔

15.4.6 تنقید نگاری

عربوں میں تنقیدی شعور فطری طور پر پایا جاتا ہے، جس کے ہلکے اور دھندلے نقوش عہد عباسی سے ماقبل دور میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہ فن بطور فن عصر عباسی میں پروان چھڑھا تھا اور اس مقام ومنزل پر پہونچ گیا تھا جس تک وہ زمانہ قدیم میں کبھی نہیں بہونچا سکا تھا۔ یہ بات بلا خوف وتردد کہی جا سکتی ہے کہ عصر جدید کو چھوڑ کر عربی تنقید کبھی بھی اس قدر بلند مقام پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس تنقیدی شعور کو پروان چڑھانے میں فصاحت قرآنی (اعجاز القرآن) کے اسرار ورموز نے اہم کردار ادا کیا ہے، قرآنی فصاحت وبلاغت کے مطالعے نے ادبی تنقید کا ایک نیا راستہ کھول دیا تھا، جس کے نتیجہ میں ادبی تنقید کا ایک قابل ذکر سرمایہ سامنے آتا ہے۔

عہد عباسی میں تنقید کا ایک نیا رنگ سامنے آتا ہے کہ اسی عہد میں پہلی مرتبہ دو شاعروں کے درمیان موازنہ ومقارنہ کرنے کا چلن سامنے آیا جیسے آمدی کی کتاب ''الموازنة بين البحتري وأبي تمام'' وغیرہ۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ دو شعرا کے درمیان مقارنہ وموازنہ کے کچھ نمونے عہد جاہلی میں پائے جاتے ہیں، لیکن چونکہ وہ نتائج کسی قواعد وضوابط پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ صرف عربی الفاظ کے بہتر استعمال اور فیصلہ کرنے والے کے ادبی ذوق پر مشتمل ہوتے تھے، لہذا ان کا مقابلہ وموازنہ عہد عباسی کے ''ادب مقارن'' سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔

فن تنقید پر قلم اٹھانے والوں میں محمد بن سلام جمحی (۲۳۲ھ) مؤلف ''طبقات فحول الشعراء'' اور جاحظ (۲۵۵ھ) مؤلف ''البيان والتبيين'' کے علاوہ ابن قتیبہ دینوری (۲۷۶ھ) مؤلف ''الشعر والشعراء'' ابو العباس محمد بن یزید مبرد (۲۸۶ھ) مؤلف ''الكامل''، ثعلب (۲۹۱ھ) مؤلف ''قواعد الشعر''، ابن معتز (۲۹۶ھ) مؤلف ''كتاب البديع'' اور ''طبقات ابن المعتز''، ابن طباطبا (۳۲۲ھ) مؤلف ''عيار الشعراء''، قدامہ بن جعفر (۳۳۷ھ) مؤلف ''نقد الشعر''، ابو الفرج اصفہانی (۳۵۶ھ) مؤلف ''كتاب الأغاني''، حسن بن بشر آمدی (۳۷۰ھ) مؤلف ''كتاب الموازنة بين البحتري وأبي تمام'' یا ''كتاب الموازنة بين الطائيين''، ابو عبید اللہ مرزبانی محمد بن عمران (۳۸۴ھ) مؤلف ''الموشح'' قاضی علی بن عبد العزیز جرجانی مؤلف ''الوساطة بين المتنبي وخصومه''، ابو ہلال عسکری (۳۹۵ھ) مؤلف ''كتاب الصناعتين''، ابن فارس (۳۹۵ھ) مؤلف ''ذم الخطأ في الشعر''، ابو منصور ثعالبی (۴۲۹ھ) مؤلف ''يتيمة الدهر''، ابن سنان خفاجی (۴۶۶ھ) مؤلف ''سر الفصاحة''، عبد القاہر جرجانی (۴۷۱ھ) مؤلف ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة''، اسامہ بن منقذ (۵۸۴ھ) مؤلف ''البديع في نقد الشعر'' اور ضیاء الدین ابن الأثیر (۶۳۷ھ) مؤلف ''المثل السائر'' وغیرہ جیسے باکمال اشخاص شامل ہیں۔

15.5 نمائندہ نثر نگار اور نمونہ کلام

عہد عباسی میں نثر نگاران نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور عربی سرمایہ علم وادب میں کافی اہم، معتبر اور گرانقدر سرمایہ کا اضافہ کیا ہے۔ آئندہ سطور میں اس دور کے نمائندہ نثر نگاروں کی سوانحی جھلک، ان کے اسلوب اور فکری وفنی کاوشوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جا رہا ہے۔

15.5.1 ابن المقفع (۱۰۶-۱۴۲ھ)

یہ فارسی الاصل تھا اس کا نام روزبہ تھا، اس کا باپ داذویہ ایران سے بصرہ آ گیا تھا اور حجاج بن یوسف کے زمانہ میں لگان وصول کرنے

کے محکمہ میں ملازم تھا۔ کچھ مالی خرد برد کرنے کے جرم میں حجاج نے اسے اتنا مارا کہ اس کا ہاتھ خشک ہوگیا لہٰذا اسے مقفع کے لقب سے پکارا جانے لگا اور اس کا بیٹا ابن المقفع کہلایا۔ باپ تو مجوسی رہا لیکن بیٹے کی تربیت بچپن ہی سے اسلامی طریقہ پر ہوئی اور نوجوانی ہی میں اس نے فارسی اور عربی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ خلیفہ منصور کے چچا عیسیٰ بن علی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا۔

اس کے قتل کے سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسے زندیقیت کی وجہ سے قتل کیا گیا، جب کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کو قرآن کا مقابلہ کرنے اور زندیقیوں کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ اسی طرح اس پر الحاد کا الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ محض دنیوی نفع کی خاطر مسلمان ہوا تھا چنانچہ ایک مرتبہ جب مجوسیوں کے آتش کدہ کے پاس سے گذرا تو اس نے یہ دو اشعار پڑھے تھے:

یا بیت عاتكة الذی أتعزل حذرالعدی، وبک الفؤاد مؤكل

إنی لأمنحک الصدود وإننی قسما إلیک، مع الصدود لأمیل

(اے عاتکہ کا گھر جس سے میں دشمنوں کے ڈر سے کنارہ کشی کر رہا ہوں مگر میرا دل تیرے ہی حوالہ ہے۔ تجھ سے بظاہر میں بے رخی کا اظہار کر رہا ہوں لیکن اس (بظاہر) اعراض کے (بباطن) میں تیری طرف مائل ہوں)۔

بعض حضرات کا خیال ہے اس کے قتل کی وجہ عیسیٰ بن علی کے بھائی اور منصور کے چچا عبداللہ بن علی کے سلسلہ میں امان نامہ تحریر کرنے میں خلیفہ کے لیے جس طرح کے سخت الفاظ کا استعمال کیا تھا وہی اس کی موت کا سبب بنا۔ خلیفہ کے اشارے پر سفیان بن معاویہ نے جو ابن المقفع کا دشمن تھا اس کے اعضا وجوارح کاٹ کر دہکتے ہوئے تنور کی نذر کر دیا۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس کے قتل کی صحیح وجہ یہی ہے۔ یہ واقعہ ۱۴۲ھ، ۱۴۳ یا ۱۴۵ ہجری کا ہے۔ ابن المقفع کی عمر اس وقت ۳۶ سال تھی۔

ابن المقفع عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے خوب واقف تھا اپنی ذکاوت وذہانت اور وسعت معلومات کی بنا پر اس دور کی عربی اسلامی، فارسی، ہندی اور یونانی ثقافت کا جامع تھا۔ اصلاح معاشرت کے نقطۂ نظر سے جس چیز کو اس نے مفید سمجھا، پہلوی اور دیگر زبانوں سے عربی میں منتقل کر دیا۔ پہلوی زبان سے ترجمہ کی کتابیں اخلاقی تعلیمات کے لیے مشہور ہیں جیسے **الادب الصغیر، الأدب الكبیر، الیتیمة، رسالة الصحابة** کا شمار اس کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ارسطو کی کتاب **المقولات** اور ہندی ادب سے ترجمہ شدہ کتاب **کلیلة ودمنة** بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

ابن المقفع کا شمار اپنے دور کے عظیم انشا پردازوں میں ہوتا ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے عربی زبان کے اصل مقومات کو باقی رکھتے ہوئے دیگر زبانوں کے تخیل وتصور اور عربی ذوق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ وہ نہایت ذکی اور دانا شخص تھا۔ اس کا کلام پر شکوہ، سنجیدہ اور انتہائی آسان اسلوب پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے بلاغت کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ ''بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ جب اسے جاہل سنے تو یہ سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کا کلام کہہ سکتا ہے''۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ ''سوقیانہ الفاظ سے دامن بچا کر سہل الفاظ کا استعمال کرو''۔

ابن المقفع کا اسلوب فصاحت وبلاغت، سہل پسندی اور وضاحت پر قائم ہے۔ اس اسلوب کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں الفاظ سے معانی جھلکتے تھے، اس کے یہاں نامانوس اور غریب الفاظ کے استعمال سے اجتناب پایا جاتا ہے، عمدہ الفاظ کا انتخاب، ایجاز واختصار اس کی تخلیقات

کوممتاز بناتی ہیں۔ اس کے یہاں قصوں اور کہانیوں کو اہم درجہ حاصل ہے۔ یہ قصے کبھی جانوروں اور کبھی انسانوں کی زبان میں بیان کیے جاتے ہیں۔ قصے کہانی یا ضرب الامثال پیش کرنے کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ باتیں قاری کو ذہن نشین ہو جائیں۔ افہام وتفہیم کے معاملہ میں وہ قاری کو کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا ہے۔ لغو اور فضولیات سے پرہیز کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ قاری اس کی باتوں سے متاثر ہو۔

الحاد و زندیقیت کے الزامات کے باوجود ابن المقفع لہو ولعب اور برائیوں سے دور رہتا تھا۔ وہ اپنے معاصرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے سوال کیا کہ: ''من أدبک'' (تم کو ادب کس نے سکھایا) اس نے جواب دیا ''نفسی، إذا رأیت من غیری حسنا أتیته وإن رأیت قبیحا أبیته'' (مجھے میرے نفس نے ادب سکھایا ہے، جب میں کسی کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو خود بھی اسے کرتا ہوں اور جب برا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس سے پرہیز کرتا ہوں)۔

فن ترجمہ میں ''کلیلة و دمنة'' اس کا شاہ کار ہے۔ اس ہندی تصنیف کا ترجمہ جس خوش اسلوبی اور مہارت کے ساتھ اس نے کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے، صدیاں گذر گئیں لیکن اس کتاب کی اہمیت اور معنویت ہیں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

اس کی نثر کا نمونہ:

'' لاتترکنَّ مباشرة جسیم أمرک، فیعود شأنک صغیرا ولا تلزم نفسک مباشرة الصغیر فیصیر الکبیر ضائعا۔ واعلم أن رأیک لایتسع لکل شئی ففرّغه للمهم، وأن لیلک ونهارک لایستوعبان حاجتک وإن دأبت فیهما وانه لیس إلی أدائها سبیل مع حاجة جسدک إلی نصیبه من الدعة فأحسن قسمتهما بین دعتک وعملک، واعلم إنک ماشغلت من رأیک في غیر المهم أزری بالمهم وماشغلت من لیلک ونهارک في غیر الحاجة أزری بک في الحاجة''

(بڑے کام کی انجام دہی سے گریز نہ کرو ورنہ تمہاری شان کم تر ہو جائے گی اور چھوٹے کام میں برابر نہ لگے رہو ورنہ بڑا کام ضائع ہو جائے گا اور جان لو کہ تمہاری عقل ہر چیز کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس لیے اسے اہم کاموں کے لیے خالی رکھو، اور رات و دن تمہاری ضرورت کو محیط نہیں ہو سکتے خواہ تم مسلسل کام کرو، اور ضرورت کی تکمیل کے لیے جسم کو آرام کی بھی حاجت ہوگی، اس لیے رات و دن کے کام اور آرام کی مناسب تقسیم کر لو۔ اور یاد رکھو اگر عقل کو غیر اہم چیزوں میں مشغول رکھو گے تو اس سے اہم چیز کو نقصان پہنچے گا اور جس وقت کو بلاضرورت گذارو گے ضرورت میں اس کا عیب تم کو لاحق ہوگا)

''ینبغی للعاقل أن لایغفل عن التماس مافي نفس أهله وولده وإخوانه و صدیقه عند کل أمر وفي کل لحظة وکلمة وعند القیام والقعود وعلی کل حال فان ذلک کله یشهد علی مافي القلوب''

مشہور اموی انشا پرداز عبدالحمید یحییٰ کاتب کی صحبت، عباسی دور میں نشوونما، فارسی ادب کا گہرا مطالعہ، ہندی اور یونانی ادب سے واقفیت اور عربی نثر ونظم کے وسیع مطالعہ نے ابن المقفع کے اسلوب کو نکھارنے میں مدد کی اور اس کا اسلوب ''السهل الممتنع'' کہلایا۔ ابن المقفع پہلا ادیب ہے کہ جس نے ایرانی، ہندی اور یونانی حکمت سے عربی زبان وادب کو آشنا کیا، اخلاقیات اور سیاست کے موضوع پر قلم اٹھایا

اوراس انداز کا سب سے پہلا مترجم ہے۔اس کا اسلوب جاحظ کی آمد تک مقبول عام رہا۔افسوس ہے کہ یہ وہبی صلاحیتوں والا ادیب صرف چھتیس سال کی عمر میں ہم سے چھین لیا گیا۔

15.5.2 سہل بن ہارون (م ۲۱۵ھ)

یہ بھی ابن المقفع کے مانند فارسی الاصل تھا۔ابن الندیم کے قول کے مطابق بصرہ، واسط اور اہواز کے درمیان واقع ''دستمیان'' میں پیدا ہوا۔بعض لوگوں نے اس کے گاؤں کا نام ''میسان'' لکھا ہے اور بعض کے خیال کے مطابق نیشاپور میں پیدا ہوا۔تحصیل علم کے لیے بصرہ آیا پھر بغداد پہنچا۔یحییٰ برمکی کا تقرب حاصل کر کے انشا وترسیل کے محکمہ سے وابستہ ہو گیا، خلیفہ ہارون نے اسے ''دار الحکمة'' کا نگراں مقرر کیا تھا۔ ۱۸۷ء میں برامکہ کے زوال کے بعد فضل بن سہل کے ذریعہ مامون تک رسائی حاصل کی، جس کی لڑکی ''بوران'' مامون کے نکاح میں تھی۔ جب مامون نے '' دارالحکمة'' کو ایک بڑی اکیڈمی کی شکل دی تو اسے قبرص سے آنے والی فلسفہ کی کتابوں کے ترجمہ کا نگراں بنا دیا۔ اور مامون کے زمانہ میں علما اور متکلمین پر مشتمل جو علمی مجالس منعقد ہوتی تھی اس میں سہل پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ دار الحکمة ہی کی ملازمت کے دوران ۲۱۵ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

سہل بن ہارون کو نظم ونثر دونوں پر قدرت حاصل تھی اور اپنے زمانہ کے دیگر مروجہ علوم میں دستگاہ تھی۔ وہ اپنے زمانہ میں حکمت وبلاغت کے لیے مشہور تھا۔ جاحظ نے اس کی قادرالکلامی، خطابت، فصاحت وبلاغت اور ادبی مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ سہل سے ملتا رہتا تھا اور اس نے اس کے نوادرات ولطائف بھی نقل کیے ہیں۔ اس کی اصل شہرت رسائل نگاری کی بنا پر ہوئی۔ اس کے متعدد رسائل کا تذکرہ ملتا ہے جس میں بخل وغیرہ کے بارے میں اس نے خامہ فرسائی کی ہے۔ روایات میں سہل بن ہارون کی ذکاوت وذہانت اور ظریفانہ مزاج کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے اسلوب میں اور ''کتاب البخلاء'' میں جاحظ کے اسلوب میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ جاحظ کا بیان ہے کہ جب وہ شروع میں کوئی کتاب لکھتا تھا تو لوگ اس کی پذیرائی نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ اس سے کم تر درجہ کی کتاب لکھ کر سہل بن ہارون یا دوسرے مشہور مولفین کی طرف منسوب کر دیتا تھا تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

سہل بن ہارون کی بیش تر تحریریں ضائع ہو گئی ہیں۔ ''کلیلة ودمنة'' کے طرز پر اس نے دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ایک کا نام '' ثعالبة وعفراء'' اور دوسری کا نام ''النمر والثعلب'' ہے۔ مسعودی نے اول الذکر کتاب کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ حسن ترتیب کے لحاظ سے کلیلة ودمنة سے فائق ہے۔ جدید دور کے ایک محقق عبدالقادر مہیری کو کتاب ''النمر والثعلب'' کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا، انھوں نے تیونس یونیورسٹی کے مجلہ میں اس کتاب کے اقتباسات اور اس پر ایک مقدمہ شائع کیا ہے۔ اس قصہ کا مرکزی کردار تین جانوروں پر مشتمل ہے، ایک لومڑی، دوسرا بھیڑیا اور تیسرا چیتا۔ ان کے مابین پیش آنے والے واقعات کو سہل نے باریک بینی کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بادشاہوں اور حاکموں کو حیوانات کی زبانی نصیحت کی جائے اور عدل وانصاف کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی جائے۔ اسی طرح بعض کتابوں میں انسانوں کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے مثلاً المخزومي والهذلية اور الوافق والعذراء۔

جاحظ نے کتاب البخلاء کے مقدمہ میں سہل کا ایک طویل رسالہ نقل کیا ہے جس میں سخاوت کے مقابلہ میں بخل تعریف کی گئی ہے۔

اس رسالہ میں اس نے کلام نبی ﷺ اور صحابہ وتابعین، قدیم اقوال وامثال سے منقول حکمت کو ذکر کر کے استدلال کیا ہے۔ رسالہ کے مضامین سے اس زمانہ کے کلامی جدل ومناظرہ کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جاحظ اور سہل بن ہارون کے اسلوب میں اس قدر مماثلت ہے کہ اگر جاحظ خود اس رسالہ کو سہل کی جانب منسوب نہ کرتا تو اسے جاحظ ہی کی تحریر سمجھا جاتا۔ سہل کے مذکورہ رسالہ سے کچھ نمونے:

"عبتموني حين زعمتِ أني أقدم المال على العلم، لأن المال يقاد به العلم، وبه تقوم النفوس قبل أن تعرف فضل العلم فهو أصل والأصل أحق بالتفضيل من الفرع... وقلتم: كيف تقول هذا وقد قيل لرئيس الحكماء ومقدم الأدباء: أفضل العلماء أم الأغنياء؟ قال: بل العلماء، قيل: فما بال العلماء يأتون باب الأغنياء أكثر مماياتي الأغنياء أبواب العلماء قال لمعرفة العلماء بفضل الغنى ولجهل الأغنياء بفضل العلم..."

(مال کو علم پر مقدم کرنے کی وجہ سے تم لوگ مجھ سے ناراض ہو مگر درحقیقت مال کے ذریعہ علم کی قیادت اور نفوس کی درستگی ہوتی ہے خواہ وہ علم کی فضیلت سے واقف نہ ہوں اس طرح مال اصل ہے اور اصل ہی کو فضیلت حاصل ہوتی ہے بہ نسبت شاخ کے...... تم یہ کہتے ہو کہ عقل مندوں کے سرداروں اور ادیبوں کے پیش رو اشخاص سے سوال کیا گیا کہ: علما افضل ہیں یا مالدار؟ توانھوں نے جواب دیا کہ علما کہا گیا کہ علما مالداروں کے دروازوں پر زیادہ جاتے ہیں جبکہ مالدار علما کے دروازہ پر کم، جواب ملا کہ علما کو مالداری کی فضیلت معلوم ہے اور مال دار علم کی فضیلت سے ناواقف ہیں......)

اس کے ایک خط کا نمونہ:

"بسم الله الرحمن الرحيم۔ أصلح الله أمركم، وجمع شملكم وعلمكم الخير وجعلكم من أهله، قال الأحنف بن قيس: يامعشر بنى تميم لا تسرعوا إلى إلفتنة، فان أسرع الناس ألى القتال أقلّهم حياء من الفرار، وقد كانوا يقولون إذا أردت أن ترى العيوب جمة فتأمل عيابا، فإنه إنما يعيب بفضل مافيه من العيب، وأول العيب أن تعيب ماليس بعيب، وماأردنا بماقلنا إلا هدايتكم وتقويمكم وإصلاح فسادكم، وإبقاء النعمة عليكم، ولئن اخطأنا سبيل إرشادكم، فما أخطانا سبيل حسن النية فيما بيننا وبينكم..."

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تمہاری اصلاح کرے، تمہارے اندر اتحاد پیدا کرے، تمہیں خیر کی تعلیم دے اور اہل خیر بنائے۔ احنف بن قیس نے بنوتمیم سے کہا کہ تم فتنہ کی طرف سبقت مت کرو، جو لوگ کشت وخون کی طرف سبقت کرتے ہیں وہ راہ فرار اختیار کرنے میں کم شرمندگی کا احساس کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر لوگوں کی خامیوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو عیب جوئی کرنے والے کو دیکھو کیونکہ وہ اپنے عیب کی روشنی میں دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے، سب سے پہلا عیب یہ ہے کہ وہ ایسی چیز کو عیب بتاتا ہے جو عیب نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس سے تمہاری اصلاح اور تمہاری نعمتوں کا دوام مقصود ہے، ہوسکتا ہے کہ ہم تمہیں صحیح راہ دکھانے میں بھٹک جائیں لیکن تمہارے لیے ہماری نیت میں کھوٹ نہیں ہے......)

"سہل بن ہارون کی دیگر تحریروں میں فکری ہم آہنگی اور صوتی تنوع بغیر کسی تکلف کے بیک وقت پائی جاتی ہے۔ الفاظ ومعانی کے

انتخاب نے اسے صف اول کے ادیبوں میں لاکھڑا کر دیا تھا اور یہ کسی حد تک درست کہا گیا ہے کہ سہل بن ہارون وہ بیج تھا جس کا درخت جاحظ کی شکل میں منظر عام پر آیا''۔

15.5.3 ابراہیم بن عباس بن محمد صولی (۱۷۶-۲۴۳)

صولی اپنے زمانہ کا مشہور ادیب تھا۔ خراسانی النسل تھا اور اس کا دادا ''اصول'' مجوسی تھا۔ اسی کی طرف نسبت کی وجہ سے وہ صولی کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ حجاج کے جانب سے خراسان میں متعین گورنر یزید بن مہلب کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ اس کے لڑکے عباس کے دو بیٹے تھے بڑا عبداللہ اور چھوٹا ابراہیم۔ ان کی ماں مشہور شاعر عباس بن احنف بن قیس کی بہن تھیں۔ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ علما و شعرا کے حلقہ میں شریک ہوتا تھا جس سے اس کی زبان پختہ ہوئی اور شاعری میں نکھار آیا۔

ابوالقاسم حمزہ بن یوسف نے ''تاریخ جرجان'' میں لکھا ہے کہ ''ابراہیم صولی جرجانی الاصل ہے اور صول جرجان کا ایک علاقہ ہے۔ یہ اپنے زمانہ کا مشہور شاعر اور انشا پرداز تھا۔ ابراہیم اور اس کے بھائی عبداللہ کا تعلق ذوالریاستین فضل بن سہل سے ہوا جس نے ابراہیم کو سرکاری امور کے شعبہ میں ملازمت دے دی اور وہ یہاں مختلف عہدوں پر وفات تک کام کرتا رہا۔ خلیفہ واثق کے زمانہ میں کچھ دنوں کے لیے اہواز کا گورنر بھی رہا۔ اس کی شاعرانہ صلاحیت اور انشا پردازی کا اعتراف معاصرین اور متاخرین نے کیا ہے۔ وہ شعر کہنے کے بعد اس پر مسلسل نظر ثانی کرتا رہتا تھا اور معمولی و درمیانہ درجہ کے اشعار کو قلم زد کر دیتا تھا حتی کہ کبھی کبھی ایک یا دو اشعار باقی رہ جاتے تھے۔ اس کی شاعری کے بارے میں مشہور شاعر دعبل بن علی خزاعی کا کہنا تھا کہ اگر ابراہیم بن عباس شاعری کو ذریعہ بنالیتا تو ہمیں کچھ اور کرنا پڑتا۔ ابن الجرّاح کا بیان ہے کہ اپنے ہم عصر انشا پردازوں میں سب سے بڑا شاعر تھا، اس کی زبان میں رقت اور شیرینی تھی اور احوال زمانہ کے منظر کشی میں اس کا کوئی مثیل نہ تھا۔ اسی طرح انشا پردازی میں وہ عبارت پر توجہ دیتا تھا۔ انتہائی سوچ سمجھ کر ایسے عمدہ الفاظ کا انتخاب کرتا تھا جو دقیق معانی پر مشتمل ہوتے تھے، اس کے جملوں میں باہمی ربط کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ خود اس کا کہنا تھا کہ ''میں نے اپنی تحریروں میں صرف انہیں چیزوں کو پیش کیا ہے جن کی طرف میرا دل مائل ہوا اور جن سے میرے سینہ میں ایک جذبہ موجزن ہوا۔

خلیفہ متوکل کے زمانہ میں باغی اسماعیل بن اسحق کو شمالی آرمینیا میں بغاوت اور آتش زنی کے بعد اس کے قتل کو ایک مکتوب میں جس طرح بیان کرتا ہے وہ اس کی فصاحت و بلاغت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس نے دشمنان خدا کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے اور عبارت میں صنعت طباق کا مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے جیسے **رضاع** کے ساتھ **فطام**، **مرّ** کے ساتھ **حلو**، **ذل** کے ساتھ **عزّ** اور **حسرت** کے ساتھ **مسرت** وغیرہ۔

صولی کے مکتوب میں منظر نگاری کا فن بھی واضح طور پر سامنے آتا ہے مثلاً نافرمانی کو اس نے ایسی ماں قرار دیا ہے جو اپنی اولاد یعنی باغیوں اور سرکشوں کی پرورش کرتی ہے اور نافرمانی اختیار کرنے کے لیے سبز باغ دکھاتی ہے لیکن سب کا انجام برا ہوتا ہے اور اس فتنہ کو اس نے جہنم قرار دیا ہے جس کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہر ایک کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں، باغی کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے اور وہ درندوں کی غذا بن جاتا ہے یہ تو دنیا کا معاملہ ہے جبکہ آخرت میں وہ جہنم کا ایندھن بنتا ہے۔

صولی کو مختصر نویسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ فارسی اثرات کی وجہ سے انشا پرداز اطناب کی طرف مائل ہو رہے تھے، جو بات پہلے

دو چار جملوں میں کہہ دی جاتی تھی اس کے لیے اب طویل عبارتیں لکھی جانے لگی تھیں۔عربی زبان نے فارسی کے بہت سے اسالیب کو بھی اختیار کر لیا تھا مثلاً مرسل الیہ کو بڑے بڑے القاب لکھنا، مخاطب سے تکلف اور ادب سے گفتگو کرنا، ایک مطلب کو بہت سے الفاظ اور مترادف جملوں میں ادا کرنا۔اس خدشہ کا احساس کرتے ہوئے کہ پرنویسی عربی زبان میں فساد اور بگاڑ نہ پیدا کر دے بعض ادیب اور انشا پرداز لوگوں کو مختصر نویسی کی دعوت دیتے تھے۔اس کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں جعفر بن یحییٰ کا قول تھا:"إذا استطعتم ان تكون كتبكم كالتوقيعات فافعلوا" (اگر تم اپنے خطوط کو مختصر نوٹ کی طرح لکھ سکتے ہو تو ایسا ہی کرو)۔صولی کو چونکہ انشا پردازی پر پوری قدرت تھی اس لیے اس نے طویل اور مختصر دونوں طرح کے رسائل میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔اہل حمص کے ۲۴۰ھ میں متوکل کے خلاف بغاوت کرنے پر جو خط اس نے لکھا ہے اس سے اس کی ایجاز نویسی پر مکمل قدرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

أما بعد فإن امير ألمؤمنين يرى من حق الله عليه، مما قوم به من اود، وعدل به من زيغ، ولم به من منتشر، استعمال ثلاث، يقدم بعضهن على بعض، أولاهن مايتقدم به من تنبيه وتوقيف، ثم مايستظهر به من تحذير وتخويف ثم التي لايقع جسم الداء بغيرها:

اَنا ة فإن لم تغن عقب بعدها وعيدا، فإن لم يغن أغنت عزائمه

(امابعد، امیر المؤمنین اپنے اوپر اللہ کا حق سمجھتے ہوئے ٹیڑھے کو سیدھا کرنے، کجی کو درست کرنے اور منتشر کو جمع کرنے میں تین طریقے اختیار کرتا ہے۔کسی کو پہلے اور کسی کو بعد۔سب سے پہلے وہ متنبہ اور خبردار کرتا ہے، پھر ڈراتے اور دھمکاتے ہیں اور اس کے بعد مرض کو ختم کرنے کے لیے آخری تدبیر استعمال کرتے ہیں۔شاعر کہتا ہے: پہلے بردباری سے کام لیتا ہے، اس سے فائدہ نہ ہو تو دھمکی دیتا ہے اور اگر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اس کا پختہ ارادہ کام دیتا ہے۔

متوکل اس خط سے بہت خوش ہوا اور اپنے وزیر عبداللہ بن یحییٰ بن خاقان کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ سن رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ امیر المومنین ابراہیم میں ایک خوبی ہے جسے اللہ نے آپ کے لیے چھپا رکھا تھا اور آپ کی حکومت کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ کسی مکتوب میں عباسی خلفا کے متعلق استعمال ہونے والا یہ پہلا شعر ہے۔

ابن الزیات سے عفو کا طالب ہو کر یہ لکھتا ہے:

"كتبت وقد بلغت المدية المحزّ وعدت الأيام عليّ بعد عداوى بک عليها وكان أكثر خوفي أن تسكن في وقت حركتها وتكف عندأذاتها، حضرت اضرّ عليّ منها، فكف الصديق عن نصرتى خوفامنک وبادر إلى العدو تقربا إليک"

(میں یہ مکتوب ارسال کر رہا ہوں درآں حالیکہ معاملات دگرگوں ہو چکے ہیں اور آپ کی ناراضگی کے بعد زمانہ میرا دشمن ہو گیا ہے، میرا گمان یہ تھا آپ زمانہ کے حرکت میں آنے کے بعد خاموش ہو جائیں گے اور زمانہ کے تکلیف پہنچاتے وقت ہاتھ روک لیں گے لیکن آپ میرے لیے اس سے زیادہ ضرر رساں ہو گئے، لہٰذا دوست آپ کے ڈر سے میری مدد سے رک گئے اور دشمن آپ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے)۔

مسعودی نے ابراہیم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:"مثل اصحاب السلطان مثل قوم علوا اجبلاثم وقعوا منه، فكان اقربهم الى التلف

العبدهم في الارتقاء" (بادشاہ کے مصاحبوں کا حال پہاڑ پر چڑھ کر گرنے والوں کی طرح ہے جو زیادہ اوپر جائے گا گرنے میں اسے زیادہ نقصان کا سامنا کرنا ہوگا)۔

اپنے مختصر رسائل میں ابراہیم کو مافی الضمیر ادا کرنے پر قدرت کاملہ حاصل تھی اور اس کے ان رسائل کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی خط کے بجائے صرف امثال وحکم پر مشتمل یہ عبارت ہے جن میں مہارت کے ساتھ اپنے مطمح نظر کی وضاحت کردی گئی ہے۔ وہ جس پایہ کا انشا پرداز تھا اسی پایہ کا شاعر بھی تھا، اپنے مکاتیب میں جگہ جگہ وہ اپنے اشعار کا استعمال کرتا تھا جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ شعر کہنے کے بعد وہ اس میں کاٹ چھانٹ کرتا رہتا تھا اور اکثر اوقات بیش تر حصہ کو قلم زد کر دیا کرتا تھا۔ گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولكن الجواد أباهشام وفيّ العهد مأمون المغيب
بطيئ عندما استغيث عنه وطلاّع عليك مع الخطوب

اپنے بھائی عبداللہ بن عباس صولی کے متعلق کہتا ہے:

ولكن عبدالله لماحوى الغنى		وصار له من بين إخوانه مال
رأى خلّته منهم تسدُّ بماله		فساهمهم حتى استوت بهم الحال

حسن بن وہب کی مخمور آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے:

عيناك قد حكتامبيتك كيف كنت وكيف كانا
ولرب عين قدأرتك مبيت صاحبها عيانا

ابراہیم بن عباس صولی کی تصانیف ابن ندیم کے مطابق درج ذیل ہیں: کتاب دیوان الرسائل، کتاب دیوان الشعر، کتاب الدولۃ، کتاب الطبیخ اور کتاب العطر ہیں۔ اس کی وفات ماہ شعبان ۲۴۳ھ میں سامرّا میں ہوئی۔

15.5.4 جاحظ (۱۵۹ھ-۲۵۵ھ)

ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب کنانی کی پیدائش راجح قول کے مطابق ۱۵۹ء میں ہوئی۔ اس کی پیدائش کے سال کے متعلق مؤرخین تاریخ ادب عربی کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے لیکن تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ اس کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی تھی۔ جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں نشوونما ہوئی۔ ابتدائی زندگی کے متعلق بہت زیادہ تفصیلات کا علم نہیں ہوتا ہے۔ کتاب الحیوان کے دوسرے حصہ میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ مکتب میں اس زمانہ کے مروّجہ علوم حاصل کرنے جاتا تھا۔ پھر مسجد میں علما کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ۔ بصرہ کے "مربد" نامی بازار میں فصحائے عرب سے لغت وشعر کا علم حاصل کرنے جایا کرتا تھا۔ تنگدستی کی وجہ سے اسے دریائے سیحون کے پاس مچھلی اور روٹی فروخت کرنی پڑی مگر اس کے باوجود حصول علم میں منہمک رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "اس کے ہاتھوں میں جو بھی کتاب آتی تھی وہ اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتا تھا۔ ابن ندیم کی روایت کے مطابق وہ کتب فروشوں کی دکانوں کو رات بھر کے لیے کرایہ پر لیتا تھا اور وہاں پوری رات کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔

چونکہ وہ بے ڈول جسم، بدشکل اور ابھری ہوئی بدوضع آنکھوں والا شخص تھا لہٰذا اس کا لقب "جاحظ" پڑ گیا۔ اس کی بدصورتی کے متعلق

بہت سے قصے مشہور ہیں اور بہت سے مواقع پراس کو اپنی بدصورتی کی وجہ سے خفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی غیر معمولی شہرت اور قابلیت کا چرچا سن کر خلیفہ متوکل نے چاہا کہ اسے اپنے لڑکے کا اتالیق بنائے، چنانچہ جب جاحظ خلیفہ کے یہاں ''سرّ من رای'' پہنچا تو اس نے اس کی شکل کو دیکھ کر دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔

جاحظ مذہباً معتزلی تھا اور ابراہیم نظّام کا شاگرد تھا اور اس سے بہت متاثر تھا۔ معتزلہ کا ایک فرقہ جاحظ کی نسبت سے '' جاحظیہ'' مشہور ہوا۔ نظّام کے علاوہ اس نے بشر بن معتمر، ثمامہ بن اسرش اور ابو ہذیل علاف جیسے معتزلیوں کی کتاب الحیوان میں جگہ جگہ تعریف کی ہے۔ اس کے عقائد اور مذہبی خیالات کی جھلکیاں اس کی تصانیف میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

جاحظ بلاشبہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ادیب تھا جس کا اسلوب واضح، طرز استدلال مضبوط اور معنی آفرینی کی قوت لامحدود تھی۔ نثر نگاری میں وہ ایک نئے طرز کا موجد بھی تھا اور خاتم بھی۔ معلومات نثر و نظم کے مختلف اصناف پراس کو عبور حاصل تھا۔ جدت پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی عبارت فصاحت و بلاغت اور سلاست کی حامل ہے۔ نثر نویسی میں علمی مباحث اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار میں اس کا قلم جو جو ہر دکھاتا ہے اس کی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ ظرافت اور مزاح کے میدان میں اس کی مہارت قابل دید ہے۔ البتہ نظم کے سلسلہ میں بعض حضرات کی رائے ہے کہ وہ عامیانہ درجہ کی ہیں۔ لیکن احمد امین کے بقول'' جاحظ کی تمام نثری تالیفات اگر ہمارے سامنے ہوتیں تو ایک دائرہ معارف کا وجود سامنے آتا۔ اس کے کہے ہوئے محفوظ چند اشعار سے یہ فیصلہ کر لینا کہ اس کی شاعری معمولی درجہ کی تھی بہرحال انصاف نہیں ہے''۔

اس کے یہاں حکایتی نثر کے نمونے بھی ملتے ہیں، جسے ہم افسانہ یا ناول سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی تحریروں میں اس نے بڑی مہارت کے ساتھ شخصیات اور ان کے طبعی احوال و عادات کی عکاسی کی ہے۔ کتاب الحیوان میں ''قاضی اور مکھی'' کی جو حکایت ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح جاحظ کو جسمانی حرکات اور انسانی نفس کے احساسات کی ترجمانی پر قدرت حاصل تھی۔ اس حکایت کے پہلے حصہ میں قاضی عبداللہ ابن سوّار کے وقار، سنجیدگی اور نفس پر قدرت کا ذکر ہے۔ حکایت کے دوسرے حصہ میں اس مکھی کا تذکرہ ہے جو قاضی کے جسم پر جگہ جگہ بیٹھ کر اسے پریشان کر رہی تھی اور تیسرے حصہ میں حاضرین کے مشاہدہ کا ذکر ہے کہ قاضی اس چھوٹے سے جانور کی وجہ سے کس طرح اپنی معتاد ہیئت کو چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

جاحظ نے کوئی ایسا موضوع نہیں چھوڑا جس پر اس نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ اس نے نباتات، اشجار، حیوانات، انسان، زندگی و آخرت، طنز و مزاح، ترکوں اور سوڈانیوں، اساتذہ، غلاموں، باندیوں، عشق و محبت، عورتوں و بچوں، نبیذ و شراب، عباسیوں، زیدیوں، نصاریٰ کی تردید، اثبات نبوت، نظم قرآن، فصاحت و بلاغت، ڈاکوؤں، چوروں اور بخیلوں کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ اس نے متعدد چیزوں کی تعریف میں مضامین لکھے اور پھر انہیں چیزوں کی برائی میں کتابیں لکھی ہیں اور کمال یہ ہے کہ دونوں کو پڑھنے کے بعد اس کی تحریروں میں تضاد نظر نہیں آتا ہے۔ اس نے رسالة فی مدح الکتاب لکھا تو رسالة فی ذمّ الکتاب بھی لکھ دیا۔ مغنیہ عورتوں کی تعریف میں جہاں رسالة فی مدح القیان لکھا تو ان کی برائی میں رسالة فی ذم القیان لکھ دیا۔ دونوں جگہ اس نے ایسے ایسے دلائل پیش کیے ہیں کہ ان متضاد کتابوں کو پڑھنے کے بعد کسی بھی

جگہ کوئی بات خلاف واقعہ نظر نہیں آتی ہے، یہی اس کا کمال ہے۔

جاحظ کے یہاں لطائف ونوادر کی کثرت ہے اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کی دلچسپی نفس مضمون میں برقرار رہے۔ پوری کتاب البخلاء لطائف ونوادر سے بھری ہوئی ہے۔اس کتاب میں اس نے معاشرہ کے مختلف لوگوں کے احوال ورجحانات،کھانے پینے کے طور وطریقوں اور سخاوت اور بخل کی فضیلت کو بیان کیا ہے۔اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہم کو جاحظ کے بخیلوں سے نفرت نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک طرح کی انسیت کا احساس ہوتا ہے اسی وجہ سے کتاب کے بخیل "طیاب البخلاء" کہے جاتے ہیں۔ لطائف ونوادر پر دوسری کتاب "نوادر المعلمین" ہے جس میں معلمین کی حماقتوں اور کم عقلوں کا تذکرہ ہے۔ تیسری کتاب "النوکی والحمقی" ہے۔ وہ ظرافت پسندی میں خود اپنی ذات اور شکل کو بھی نشانہ بنالیتا ہے، چنانچہ اس کا بیان ہے کہ" مجھے ایک عورت نے جس طرح شرم سار کیا ویسی خفت مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ وہ مجھے ایک سنار کے پاس لے گئی اور'کمثل ھذا'(اس طرح) کہہ کر غائب ہوگئی، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے سنار سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ یہ عورت شیطان کی تصویر بنوانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے شیطان کو دیکھا نہیں، اس کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں۔اب اس نے بطور نمونہ تمہیں لاکر پیش کردیا"۔

جاحظ نے "کتاب الحیوان"لکھ کر ابن الزیات کے سامنے پیش کیا تو اس نے اسے پانچ ہزار دینار عطا کیے۔قاضی ابن ابی داود نے کتاب "البیان والتبیین" پر پانچ ہزار دینار دیا، ابراہیم بن عباس الصولی نے "کتاب الزرع والنمل" پر پانچ ہزار دینار عطا کیے، وزیر فتح بن خاقان کے لیے "فضائل الترک" نامی رسالہ مرتب کیا تو اس نے حکومت کے خزانہ سے باقاعدہ وظیفہ جاری کروادیا۔

جاحظ کی کتابوں کے سلسلہ میں ابوعبداللہ بن حمود زبیدی اندلسی کا کہنا تھا "رضیت فی الجنة بکتب الجاحظ عوضا عن نعیمھا"(میں جنت میں جنت کی نعمتوں کے عوض جاحظ کی کتابوں سے راضی ہوجاؤں گا)۔یاقوت حموی، ابوعبدالرحمن انباری، ابن العمید ،مسعودی، ابومنصور ازہری، ابن قتیبہ اور ابن خلدون وغیرہ قدما میں اور سعد زغلول، احمد امین، شوقی ضیف، احمد حسن زیات، جرجی زیدان وغیرہ جدید دور کے ادبا میں اور گولڈزیہر، نکلسن، اورہٹی وغیرہ مستشرقین میں اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

اس کی مولفات کی تعداد دوسو سے زیادہ بتائی جاتی ہے جن میں کتاب الحیوان، کتاب البیان والتبیین، کتاب البخلاء، المحاسن والاضداد، اخلاق الملوک، رسائل الجاحظ اور العجائب و الغرائب ادب کی مشہور اور اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ادب میں اس کا نمایاں اسلوب اور اس کی گراں قدر تصانیف اس کے نام کو باقی رکھنے ،اس کے ادب کو مرجع خلائق بنانے اور اس کی تقلید کو قابل فخر بنانے کے لیے کافی ہیں۔

کتاب الحیوان کا آغاز اس عبارت سے کرتا ہے:

"جنبک اللہ الشبھة وعصمک من الحیرة وجعل بینک وبین المعرفة نسبا وبین الصدق سببا، وحبب إلیک التثبت وزین في عینک الإنصاف وأذاقک حلاوة التقویٰ وأشعر قلبک عزّ الحق وأودع صدرک برد الیقین وطرد عنک ذلّ الیأس وعرفک مافي الباطل من الذلة ومافي الجھل من القلة"۔

(اللہ تمہیں شک وشبہ سے بچائے اور سرگردانی سے محفوظ رکھے، تمہارے اور علم ومعرفت وراست بازی کے درمیان تعلق بنائے، معاملات میں چھان بین کو تمہارے پاس محبوب بنائے، تمہاری نگاہوں میں انصاف کو مزین کرے، دل کو تقویٰ کی شیرینی سے آشنا کرے اور حق کی قدر ومنزلت کا تمہارے دل میں احساس پیدا کرے، تمہارے دل کو یقین کا سکون واطمینان بخشے، ناامیدی کی ذلت کو دور کرے، باطل کی ذلت اور جہالت کے نقص کا تم کو ادارک بخشے)

کتاب البخلاء سے نثر کا نمونہ:

"قال: في قولهم بخيل تثبيت لإقامة المال في ملكه، وفي قولهم سخي أخبار عن خروج المال من ملكه۔ ورسم البخيل اسم فيه حفظ وذم واسم السخى فيه تضيع وحمد، والمال زاهر نافع مكرم لأهله معز والحمد، وسخرية..."۔

(اس نے جواب دیا کہ لوگوں کے "بخیل" کہنے میں مال کو اس کی ملکیت میں ثابت کرنا ہے اور سخی کہنے میں اس بات کی اطلاع ہے کہ مال اس کی ملکیت سے نکل گیا۔ بخیل نام حفاظت اور برائی ہے، سخی نام میں بربادی اور تعریف ہے۔ مال نفع بخش اور عزت دینے والا ہوتا ہے جبکہ تعریف ہوا اور مذاق ہے)۔

15.5.5 ابن قتیبہ (۲۱۳-۲۷۶ھ)

ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ کوفہ میں پیدا ہوا، عرصہ تک بغداد میں مقیم رہا، دینور میں منصب قضاء پر فائز ہوا تو اس کی نسبت سے دینوری کہلایا۔ مکتب کی تعلیم کے دوران قرآن، حدیث، اشعار، فقہ، نحو کی تعلیم حاصل کی پھر اجداد کی مساجد کے حلقہ درس میں شریک ہو کر لغوی اور شرعی علوم کی تکمیل کی۔ اس کے مشہور اساتذہ میں اصمعی، ابوحاتم، ابوعبید، ابن الاعرابی اور ابوعمر شیبانی وغیرہ ہیں۔ فارسی اور دیگر زبانوں سے جن کتابوں کا ترجمہ ہوا تھا ان سے بھی استفادہ کیا۔ لغت، نحو اور علوم اسلامیہ کا زبردست عالم تھا اور فقہا کے درمیان اسے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، حقیقت نگاری اور صدق روایت میں اپنی نظیر آپ تھا۔ اپنی رائے کے بے باکانہ اظہار میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ وہ پہلا ادیب ہے کہ جس نے ادبی تنقید کی جانب توجہ دی، شاعری پر مبسوط ومدلل بحث کے ساتھ شعرا کے مختلف درجات متعین کیے۔ شاعر کی عظمت کے لیے اس نے زمانہ اور وقت کے اصول کو مہمل قرار دیا اور یہ بتایا کہ قدیم شاعر محض قدیم ہونے کی وجہ سے عظیم نہیں قرار دیا جا سکتا اور جدید محض بعد میں آنے کی وجہ سے کم تر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ خود تو کسی قدر روایت پرست تھا لیکن اس نے روایت پرستی اور معتدل تجدیدی رجحان کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابن قتیبہ سنی المسلک تھا۔ جاحظ کی تصانیف کا اس نے بغور مطالعہ کیا اور جاحظ کے مسلک اعتزال پر سخت حملے کیے۔ مروجہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ادیبانہ حیثیت بھی معروف اور مسلم ہے۔ لغوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ادیب تھا جو وسیع المطالعہ تھا، ادب کے تمام علوم پر دستگاہ تھی، شعر اور اخبار عرب کا راوی تھا اور اسے مختلف علوم وفنون میں اولیت کا شرف حاصل تھا۔

ابن قتیبہ کا اسلوب عمدہ ہے، الفاظ کے انتخاب میں بلند معانی کا خیال رکھا گیا ہے، عبارتیں واضح اور صاف ہوتی ہیں، تعبیر پر ایسی قدرت ہے کہ وہ جو کہنا چاہتا ہے الفاظ اس کے سامنے دست بستہ نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں ابن قتیبہ جاحظ سے مشابہ نظر آتا ہے۔

بعض مقامات پر اتنی گہری مشابہت ہے کہ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ ابن قتیبہ کی عبارت ہے تو فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔ چھوٹے چھوٹے جملے، الفاظ و معانی میں ہم آہنگی اور الفاظ کا باہم ربط وغیرہ ایسی صفات ہیں جو دونوں کے یہاں یکساں طور پر ملتی ہیں۔ جاحظ ایک موضوع پر لکھتے لکھتے درمیان میں دوسرے موضوع کو چھیڑ دیتا ہے (استطراد) لیکن ابن قتیبہ کے یہاں یہ چیز نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس نے اپنی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث'' میں استطراد پر نکتہ چینی کی ہے۔

ابن قتیبہ کا جاحظ کے ساتھ موازنہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ عربی ادب میں جاحظ کا جو مقام ہے ابن قتیبہ کو وہ مقام حاصل نہیں۔ جاحظ اپنی عبارتوں میں معاشرہ کے مختلف طبقات اور انسانی نفسیات کی جس طرح عکاسی کرتا ہے اس طرح کی عکاسی ابن قتیبہ کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ تاہم ابن قتیبہ کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ عربی نثر کو اس نے ایک عمدہ اور واضح اسلوب دیا اور ایسی تصانیف چھوڑیں جو علوم وفنون کو نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل تصانیف زیادہ مشہور ہیں:

۱-عیون الاخبار: اس میں دس ابواب ہیں: کتاب السلطان، کتاب الحرب، کتاب السؤود، کتاب الطبائع و الاخلاق، کتاب العلم باخبار العلم و العلماء، کتاب الزهد، کتاب الاخوان، کتاب الحوائج، کتاب الطعا اور کتاب النساء۔

۲-کتاب المعارف: یہ کتاب عام تاریخی کتاب ہے جس کو اس نے زمانہ کے مورخین کے طریقہ پر لکھا ہے۔ اس کتاب میں تاریخ تخلیق عالم، انبیا، انساب عرب، سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ ﷺ کے غزوات، صحابہ، تابعین، قرا کرام، راویان اشعار، شرفا اور معذور لوگوں کے ذکر کے ساتھ نادر واقعات، مختلف مذاہب، عرب وعجم کے بادشاہوں کا تذکرہ ہے۔

۳-کتاب ''الشعر و الشعراء'': جسے بعض لوگ طبقات الشعراء، کتاب الشعراء یا اخبار الشعراء کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ ایک کتاب کے مختلف نام ہیں۔ یہ کتاب مشہور شعرا کے حالات اور ان کے نمونہ کلام اور اس پر بحث سے متعلق ہے۔ اس میں دورِ جاہلیت، صدر اسلام اور مصنف کے زمانہ تک کے مشہور شعرا کا تذکرہ ہے۔ ادب میں اس کا شمار امہات الکتب میں ہوتا ہے۔

۴-ادب الکاتب: یہ چار حصوں پر مشتمل ہے: کتاب المعرفة، کتاب تقویم اللسان، کتاب تقویم الید اور کتاب الابنیة۔ یہ کتاب جہاں ہمیں زبان وادب کے اسرار ورموز سے روشناس کراتی ہے وہیں تہذیب وثقافت اور انسان دوستی کی تعلیم دیتی ہے۔ خورشید احمد فارق کے بقول: ''مصنف نے خاص طور پر عربی سے مشتق ہونے والے لفظوں کے صوتی وحرکاتی فرق پر مشتمل معنوی فرق، مختلف ابواب سے مشتق الفاظ کے معنوی اتفاق، مذکر شکل کے مونث الفاظ اور خط وکتابت میں کام آنے والے عام معلوماتی الفاظ اور لسانیات کی بہت سی باریکیوں کا ذکر کیا ہے''۔

۵-الإمامة و السیاسة: یہ حضور ﷺ کی وفات سے لے کر امین اور مامون کے زمانہ خلافت تک کی تاریخ ہے جس میں خلافت کی شرطوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ کتاب الشراب و الاشربة ہے جس میں حرام اور حلال مشروبات کے سلسلہ میں علما کے اختلاف کا تذکرہ ہے۔ کتاب التسویة بین العرب و العجم وتفضیل العرب ہے جو ''شعوبیت'' یعنی عرب دشمنی کی تردید میں ہے۔ اس نے اپنی کتاب عیون الاخبار جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے اور اس کتاب کے ذریعہ شعوبیت کی تحریک کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ تاویل مختلف الحدیث، غریب

الحدیث اوراصلاح ابی عبید فی غریب الحدیث ابن قتیبہ کے محدث ہونے پردلالت کرتی ہیں۔ تاویل مشکل القرآن اورغریب القرآن میں وہ ایک مفسر نظر آتا ہے۔ الاختلاف في اللفظ والرد على الجمهية والمشبهة میں وہ ایک فلسفی اور متکلم اور کتاب المعارف میں ایک مورخ نظر آتا ہے۔ یہ ایک شخص ہے جو مختلف جہات میں قیادت کرتے ہوئے علوم وفنون کی نئی راہیں دکھارہا ہے۔ درج ذیل عبارت میں جاحظ کے کلام کے ساتھ اس کی مشابہت دیکھی جاسکتی ہے۔

”وهذه عيون الأخبار نظمتها لمغفل التأدب تبصرة، ولأهل العلم تذكرة، ولسائس الناس ومسوسهم مؤدبا، وللملوك مستراحاً، وصنفتها أبوابا، وقرنت الباب بشكله، الخبر بمثله، والكلمة بأختها، ليسهل على علمها وعلى الدارس حفظها، وعلى الناشر طلبها، وهي لقاح عقول العلماء ونتاج أفكار الحكماء وزبدة المخض وحلية الأدب وثمار طول النظر، والمتخير من كلام البلغاء، وفطن الشعراء وسير الملوك وآثار السلف“۔

(میں نے عیون الاخبار کی تالیف اس لیے کی کہ ادب سے غافل کی آنکھ کھول دے، اہل علم کے لیے یاد دہانی کرنے والا بنے، حاکم ومحکوم کو ادب سکھائے بادشاہوں کے لیے راحت ہو، اسے مختلف ابواب میں مدون کیا ہے۔ تمام ابواب میں مناسبت واقعات میں ہم آہنگی اورالفاظ میں مماثلت ہے تاکہ سیکھنے والے کو آسانی ہو، قاری اسے یاد کرسکے، خواہش مند حاصل کرسکے، اس میں علما کی عقلوں کا جوہر، دانشوروں کے افکار کا ماحصل ، دودھ کا مکھن، ادب کا زیور اورطویل غوروفکر کا ثمرہ ہے، اس میں بلیغ لوگوں کے کلام، شاعروں کی سمجھداری، بادشاہوں کی سیرت بادشاہوں کے احوال اورسلف کے آثار کا انتخاب ہے)

الشعراء والشعراء میں وہ یہ کہتا ہے:

”ولم أسلك فيما ذكرته من شعر كل شاعر مختارا له سبيل من قلّد أو استحسن باستحسان غيره، ولا نظرت إلى المتقدم منهم بعين الجلالة لتقدمه، وإلى المتأخر منهم بعين الاحتقار لتأخره بل نظرت بعين العدل على الفريقين وأعطيت كلاّ حظه ووفرت عليه حقه...“۔

(میں نے جن شاعروں اوران کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اس میں محض تقلیدی رنگ نہیں ہے اورنہ ہی دوسروں کے اچھا کہنے سے ان کو اچھا سمجھا ہے۔ نہ ہی میں نے قدیم شاعروں کو ان کی قدامت کی وجہ سے بڑا سمجھا اورنہ بعد میں آنے والوں کو بعد میں آنے کی وجہ سے کم تر سمجھا ہے بلکہ دونوں فریقوں کو انصاف کی نگاہ سے دیکھا اور ہرایک کو اس کا حق اور پورا پورا حصہ دیا ہے)

ابن قتیبہ عباسی دورکا وہ نابغہ روزگار ہے جس نے مختلف علوم وفنون پرخامہ فرسائی کرکے اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایسا نقش تابندہ چھوڑا ہے جوعلم وادب کی دنیا میں مشعل راہ ہے۔ جتنی محنت وجفاکشی سے اس نے علم حاصل کیا تھا اتنی ہی امانت اور دیانت کے ساتھ اپنی انشا پردازی سے عوام کومستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ دینور سے بغداد واپس آکر وہ تدریس وتعلیم میں اپنی وفات ۲۷٦ھ تک مصروف رہا تھا۔

15.5.6 ابن العمید (م ۳٦۰ھ)

اس کے سال پیدائش کا تذکرہ کتب مراجع میں نہیں ملتا ہے۔ اس کا نام محمد بن حسین اورکنیت ابوالفضل ہے ابن العمید کے لقب سے مشہور ہوا

۔رکن الدولہ حسن بن بویہ کا وزیر اور خراسان کے مشہور علما میں سے تھا۔ بنو بویہ کی حکومت ۳۳۴ھ سے ۴۴۷ھ تک رہی۔ فارس اور خراسان وغیرہ ان کے زیر نگیں تھے۔ بنو بویہ کے بیش تر خلفا علم ادب کے شیدائی تھے۔ اسی طرح ان کے وزرا، گورنر اور قاضی بھی بڑے عالم وادیب ہوئے جیسے رکن الدولہ صاحب ہمدان واصفہان کا وزیر ابن العمید ، بہاء الدین عضد الدولہ صاحب عراق واہواز کا وزیر سابور بن اردشیر، معزالدولہ بن بویہ کا وزیر حسن بن مہلبی ، موید الدولہ بن رکن الدین کا وزیر صاحب بن عباد اپنے علم وفضل کے وجہ سے مشہور ہوئے۔

ابن العمید کا باپ سامانیوں کے دربار میں دیوان الرسائل سے وابستہ تھا اور اس نے اپنے لڑکے کو سامانیوں کے بجائے بویہیوں کے دیوان سے وابستہ کیا۔ ابن العمید ترقی کرتے کرتے ۳۲۸ھ میں وزیر بن گیا اور اپنی وفات ۳۶۰ تک اس منصب پر برقرار رہا۔ادب اور مراسلہ نگاری کے علاوہ فلسفہ اور علم نجوم سے اسے گہری دل چسپی تھی اور اپنے زمانے کے دیگر مرّوجہ علوم وفنون میں بھی اسے دسترس حاصل تھی۔ ابن مسکویہ کے بیان کے مطابق لغت، نحو، عروض، بلاغت، مشکلات القرآن، اختلاف الفقہا، منطق وفلسفہ اور الہیات میں اسے درک حاصل تھا۔ اس کی علمی مہارتوں کے پیش نظر اسے ’’استاذ‘‘ کے لقب سے پکارا جانے لگا اور انشا پردازی میں ’’جاحظ ثانی‘‘ کہلایا۔ اسی کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ ’’انشا پردازی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہوگئی‘‘۔ بقول احمد حسن زیات بغداد شام اور مصر کے شعرا وعلما اس کے پاس جوق درجوق مدد مانگنے کے لیے آنے لگے، اس طرح وہ، صاحب بن عباد اور وزیر مہلبی اس زمانہ کی علمی تحریک کی روح اور ادبی دائرہ کے محور بن گئے۔خود متنبی اپنے عالی مرتبت ہونے کے باوجود اس کی تعظیم کرتا اور اس سے خائف رہتا تھا۔ اس کی شان میں متنبی کے بہت سے مدحیہ قصائد ہیں، جن میں سے وہ قصیدہ بھی جس کا مطلع یہ ہے:

باد ھواک صبرت ام لم تصبر　　　وبکاک إن لم یجر دمعک أو جری

(توصبر کرے یا بے صبری سے کام لے بہر حال تیرا عشق آشکارا ہوکر رہے گا اور خواہ تو آنسو بہائے یا نہ بہائے تیرا رونا ظاہر ہوجائے گا)

علوم مرّوجہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ فنون حرب میں بھی اسے قائدانہ مقام حاصل تھا اور اپنی حکومت کے لیے اس نے قابل ذکر کامیابیاں حاصل کیں۔تمام سوانح نگار اس بات کے معترف ہیں کہ وہ انتہائی فصیح وبلیغ شخص تھا۔ زیر تبصرہ دور میں اس نے انشا پردازی کو ایک ایسا اسلوب عطا کیا کہ آنے والے ادبا اس کی تقلید کرتے رہے۔ اور بلا اختلاف یہ اس دور کے انشا پردازوں کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کا دور تکلف وباریک بینی کا زمانہ تھا اور اس دور میں سجع کا اہتمام اور اسی کے ساتھ محسنات بدیعہ مثلاً استعارہ، جناس اور طباق کا استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اس کی طبیعت نے ایک ایسے جدید اسلوب وضع کرنے کی طرف رہنمائی کی جس کے فقرے متناسب وموزوں، عبارت خوش نما، نظم وترتیب میں ندرت اور معانی میں جدّت پائی جاتی تھی۔ ابن العمید چونکہ شاعر بھی تھا لہٰذا اس نے نثر نگاری میں تکلفات، تزئین صنعت گری اور متنوع اسالیب کو داخل کیا۔اس کی شاعرانہ طبیعت نے نثر کو بھی اتنی نزاکت بخشی کہ دونوں میں صرف وزن کا فرق باقی رہا۔

رکن الدولہ کی نافرمانی کرنے پر ابن بلکا کو اس نے جو خط لکھا اس کی چند سطریں بطور اقتباس پیش کی جارہی ہیں جن سے سجع اور دیگر صنعتوں کے استعمال کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

’’وزعمت أنک في طرف من الطاعة بعد أن کنت متوسطها، وإذا کنت کذلک فقد عرفت حالیها، وحلبت شطریها، فنشدتک اللہ لما صدقت عما سألتک کیف وجدت ما زلت عنه وکیف تجد ما صرت إلیه؟ألم تکن

من الأول في ظل ظليل ونسيم عليل وريح بليل وهواء غذي وماء روي ومهاد وطي وكن كنين ومكان مكين وحصن حصين، يقيك المتالف ويؤمنك المخاوف ويكنفك من نوائب الزمان ويحفظك من طوارق الحدثان، عززت به بعد الذلة وكثرت بعد القلة وارتفعت بعد الضيعة وأيسرت بعد العسرة...''۔

(تمہارا خیال ہے کہ تم فرمان برداری کے وسط میں چلنے کے بعد اب اس کے ایک کنارے پر آ گئے ہو، اگر واقعتا تمہارا یہی حال ہے تو تم فرماں برداری کی دونوں حالتوں کو جان گئے، اور اس کے نفع نقصان کو پہچان گئے ہو، تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا صحیح جواب دینا۔ تم نے جس چیز کو چھوڑا اسے کیسا پایا اور اس وقت جس حال میں ہو اسے کیسا پاتے ہو؟ کیا پہلی صورت میں تم گھنے سائے، ہوا کے ٹھنڈے اور نمناک جھونکے، سیراب کرنے والے پانی، نرم وآرام بستر، محفوظ ومامون رہائش، بلند ومضبوط قلعہ میں نہ تھے۔ جس کے باعث ذلت سے عزت، قلت سے کثرت، پستی سے بلندی، تنگی سے فراخی اور ناداری سے مالداری پائی......)۔

ابن العمید کی شاعری میں حسن وجمال غالب ہے۔ اپنے کسی دوست کے سلسلہ میں اس نے حسب ذیل اشعار کہے تھے:

قد ذبت غير حشاشة وذماء مابين حرّ هوى وحرّ هواء

لاأستفيق من الغرام ولاأرى خلوامن الأشجان والبرحاء

(میں محبت کی سوزش اور ہوا کی تپش کے درمیان گھل گیا ہوں اور اب اس ناتواں روح اور آخری سانسوں کے سوا مجھ میں کچھ باقی نہیں رہا۔ میں عشق ومحبت کی مستی سے کبھی ہوش میں نہیں آتا ہوں نہ رنج وغم اور تکلیف نے کوئی جگہ خالی پاتا ہوں)۔

باوجودیکہ ابن العمید ایک بہت بڑے عہدے پر فائز تھا لیکن اسے اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ قسم قسم کی بیماریاں اس کے ساتھ لگی رہیں تا آنکہ ماہ صفر ۳۶۰ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں کردی باغی حسنویہ سے لڑنے کے لیے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے نکلا تھا لیکن راستے میں ہی انتقال کر گیا۔ اس کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

15.5.7 صاحب بن عباد (۳۲۶-۳۸۵ھ)

ابوالقاسم اسماعیل الصاحب بن عباد (کافی الکفاۃ) صوبہ قزوین وابہر کے درمیان طالقان نامی گاؤں میں ۳۲۶ھ میں پیدا ہوا۔ ابن فارس لغوی سے بغداد میں علم حاصل کیا پھر اپنے وطن واپس آ کر ابوالفضل بن العمید کی شاگردی اور مصاحبت اختیار کی۔ بعد ازاں وہ عضد الدولہ کے بھائی موید الدولہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس کے ساتھ قیام کرنے، طویل عرصہ تک اس کی صحبت میں رہنے اور اس سے انتہائی تقرب کی بنا پر ''صاحب'' کہلایا۔ کچھ عرصہ بعد موید الدولہ بن بویہ نے اس کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ جب فخر الدولہ اپنے بھائی موید الدولہ کے بعد بادشاہ بنا تو صاحب بن عباد نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جس پر فخر الدولہ نے کہا ''اس حکومت کی وزارت پر تمہارا ایسا ہی موروثی حق ہے جیسا ہمارا حکومت میں، لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے حق کی حفاظت کرے''۔ فخر الدولہ کے وزیر کے حیثیت سے وہ اپنی وفات ۳۸۵ھ تک کام کرتا رہا۔

آل سامان کے مشہور حکمراں سلطان بن نوح بن منصور نے اس کی شہرت کا حال سن کر اسے اپنے پاس بلانا چاہا تو اس نے معذرت کر دی۔ اس نے اپنے نہ آسکنے کی جو وجوہات لکھیں تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اسے اپنے کتب خانہ کو منتقل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ اس کے لیے کم از کم چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوگی۔ اسے کتابیں جمع کرنے اور علما کی سرپرستی کا شوق تھا۔ وزیر کی حیثیت سے اسے

اتنی شہرت نہیں حاصل ہوئی جتنی ایک زبردست ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کی سیاست وشجاعت قابل ذکر تھی اور بلند مقامی کا یہ عالم تھا کہ جسے اس کے یہاں شرف باریابی حاصل ہوجاتی وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا تھا۔ اس کی مجالس ادیبوں، شاعروں، راویوں اور طالبان علم سے کبھی خالی نہیں رہتی تھی، تمام عمر وہ سب کا مخدوم اور منظور نظر رہا۔ اس کے انتقال پر ''ری'' کے دروازے اس کے ماتم میں بند کردیے گئے اور لوگ اس کے قصر کے دروازے پر جنازہ کے انتظار میں کھڑے رہے، فخر الدولہ اور دیگر ارکان حکومت غیر سرکاری لباس میں شریک جنازہ تھے، اس کی تدفین اصفہان میں ہوئی۔

رسالہ نگاری میں اس نے اپنے استاذ ابن العمید کی تقلید کی ہے۔ الفاظ کے انتخاب، معانی کے اہتمام، سجع کے التزام اور فقروں میں ربط اس کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ احمد حسن زیات کے قول کے مطابق ''اس کا مرتبہ بدیع کے بعد اور خوارزمی سے پہلے ہے۔ شاعری کرنے میں اسے ذوق سلیم اور شاعری پر کھنے میں اسے صحیح تنقیدی نظر ملی تھی۔ وزرات کی ذمہ داریوں اور رئیسانہ ٹھاٹ اسے تصنیف وتالیف سے باز نہ رکھ سکی۔ اس نے لغت میں المحیط کی سات جلدیں، کتاب الامالۃ اور الکشف عن مساوی المتنبی وغیرہ تصنیف کیں، مگر اس کی سب سے بڑی اور اہم خدمت ادیبوں کی حوصلہ افزائی، علما کو سرگرم عمل بنانا اور شمع ادب کو فروزاں کرنا ہے''۔

''اس کی سجع بندی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیرینی اور حلاوت ہے۔ وہ معاصر انشا پردازوں میں سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ نغمگی پر حامل تراکیب کا استعمال کرتا تھا، یوں تو وہ چھوٹے چھوٹے مسجع جملوں کا اہتمام کرتا تھا لیکن اگر جملے طویل ہوجاتے تھے تو وہ اس میں مستعمل الفاظ میں توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا...... اس کی سجع بندی کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ اس نے اپنی سجع بندی کو ایسی نثری شاعری کا روپ عطا کیا کہ جس سے قاری اور سامع دونوں محظوظ ہوتے ہیں''۔

اس کے رسائل شائع ہوچکے ہیں اور یہ بیس ابواب پر مشتمل ہیں۔ ان رسائل کو ایک خاص سیاسی ومعاشرتی اہمیت حاصل ہے۔ بویہی حکومت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ رسائل دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور ادبی لحاظ سے ان کا مقام اہم ہے

جب قاضی ابوبشر اس سے ملنے ''ری'' کے دروازہ پر پہنچا اس نے یہ خط لکھا:

تحدثت الركاب بسيرأروى　　　الى بلد حططت به خيامي

فكدت أطير من شوق إليها　　　بقادمة كقادمة الحمام

(قافلہ نے سیراب ترین شخص کے اس شہر میں آنے کی خبر دی جہاں میرا قیام ہے تو میں فرط شوق سے اس کی طرف اڑ کر پہنچنا چاہتا تھا کہ جیسے کبوتر اڑتا ہے)۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

''أحق ما قيل أمر القادم، أم ظن كامأني الحالم، لا والله بل هو درك العيان وأنه نيل المنى سيّان، فمرحبا أيها القاضي براحلتك ورحلك، بل أهلا بك وبكافة أهلك، ويا سرعة ما فاح نسيم مسراك! ووجدنا ريح يوسف من ريّاك! فحث المطى تزل غلّتي بسقياك، وتزح علتي بلقياك، وقص عليّ يوم الوصول لنجعله عيدا مشرّفا، ونتخذه موسما ومعرّفا، ردّ

الغلام، أسرع من رجع الکلام فقد أمرته ان یطیر علی جناح نسر، و أن یترک الصبا في عقال و أسر ''۔

سقی اللّٰه دارات مررت بأرضھا   فأدّتک نحوی یازیاد بن عامر

أصائل قرب أرتجی أن أنالھا   بلقیاک قد زحزمن درّ الھواجر

(کیا واقعتاً آنے والے کے متعلق جو خبر ملی ہے وہ درست ہے، یا سونے والے خواب کی طرح محض خیال وگمان ہے، نہیں بخدا یہ آنکھوں دیکھی جیسی بات کی طرح ہے اور دراصل وہ (آنے والا) اور مراد کو پالینا برابر ہیں۔ میں آپ کی سواری اور پالان کو مرحبا کہتا ہوں۔ نہیں بلکہ آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔کس قدر تیزی سے آپ کے آمد کی خبر پھیلی ہے جس طرح یوسف کی خوشبو مہکی تھی، آپ سواری کو تیز چلایئے اور میری پیاس کو اپنی آمد سے بجھایئے، اپنی آمد سے میری بیماری کا ازالہ فرمایئے اور اپنی آمد کے دن سے باخبر کیجیے تاکہ ہم اس دن کو یوم عید بنادیں۔صدائے بازگشت کے پلٹنے سے قبل خادم کو واپس بھیج دیں، میں نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ شاہین کے پروں پر سوار ہو کر واپس آئے اور بادصبا کو اپنے پیچھے قیدوبند میں چھوڑ آئے۔اے زیاد بن عامر جن آبادیوں سے تو گذرا اور جن علاقوں نے تجھے میرے طرف رہنمائی کی اللہ ان کو سیراب کرے۔آپ کی ملاقات کے تصور سے میں جن ٹھنڈی سہ پہر کا منتظر ہوں ان کے تصور ہی نے دوپہر کی تپش کو دور کردیا ہے)۔

15.5.8 بدیع الزماں ہمدانی (۳۵۸ھ-۳۹۸ھ)

ابوالفضل احمد بن الحسین المعروف بہ بدیع الزماں، ۳۵۸ھ میں ہمدان میں پیدا ہوا اور وہیں کے مشہور علما سے کسب فیض کیا۔ کتاب **المجمل** کے مولف احمد بن فارس کا حلقہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بدیع الزماں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا علم حاصل کیا۔ ہمدان چھوڑ کر صاحب بن عباد کے متوسلین میں شامل ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد جرجان کے حکمراں محمد بن مقصود کی خدمت کے لیے خود کو وقف کردیا۔آخر میں اس نے ہرات میں مستقل طور پر قیام کو پسند کیا اور خوشحالی کی زندگی گذاری۔لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں ۳۹۸ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔اس کی موت کا سبب بیان کرنے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ زہر خورانی اس کی موت کا سبب بنی جبکہ بعض دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کو سکتہ ہوا اور مردہ سمجھ کر اس کو جلد ہی دفن کردیا گیا، قبر میں ہوش آیا تو اس نے آوازیں دیں جب قبر کھودی گئی تو اس کو ڈاڑھی پکڑے ہوئے مرا ہوا پایا گیا۔

یہ انتہائی ذکی وذہین شخص تھا۔ثعالبی کا بیان ہے کہ'' وہ عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا۔اس کے سامنے اگر کوئی ایسا قصیدہ پڑھا جاتا جسے اس نے کبھی سنا نہ ہو اور وہ چاہے پچاس اشعار پر کیوں نہ مشتمل ہو تو وہ اسے ازبر ہوجاتا تھا اور شروع سے آخر تک اس طرح سنادیتا تھا کہ نہ تو کوئی لفظ ادھر سے ادھر ہوتا اور نہ ہی کسی شعر کے مفہوم میں کوئی خلل پیدا ہوتا۔اسی طرح غیر معروف کتابوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس میں جو کچھ ہوتا انہیں بعینہ سنادیتا تھا''۔صاحب بن عباد اس کی لیاقت سے متاثر تھا، وہ اس کے سامنے فارسی زبان کا شعر پڑھتا تھا اور بدیع الزماں فوراً عربی کے قالب میں اس کو ڈھال دیتا تھا، جس طرح قوت حافظہ میں اسے شہرت تھی اسی طرح بدیہہ گوئی میں وہ ممتاز تھا۔اس کے خطوط ورسائل کی تعداد تقریباً دوسوتیس ہے۔ان میں سے بیش تر خطوط ذاتی قسم کے ہیں اور کچھ ادبی مسائل کے بارے میں۔اس کی نثر نگاری منثور

شاعری کی مانند ہے۔ اس میں تکلف اورآورد نام کو نہیں ہے۔ الفاظ پرشکوہ، حسین معانی، جمال اسلوب اورنزاکت تخیل کا مجموعہ ہے۔ اس نے شاعری بھی کی لیکن اس کی شاعری اس کے نثر کے درجہ تک نہیں پہنچ سکی، بہ یک وقت عمدہ شاعری اور عمدہ نثر نگاری بہت کم ایک شخص میں یکجا ہوتی ہیں۔ بدیع الزماں اپنے اسلوب کی زیبائش وآرائش میں اس قدر آگے جاچکا تھا کہ اس کا اہتمام کرنے والے دیگر لوگ اس کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ اسلوب کی تزئین کاری کے ساتھ صنائع اور بدائع کا استعمال کرکے جملے کی بندشوں کو اور بہتر بناتا تھا۔ اس کے یہاں مراعاۃ النظیر کا کثرت سے استعمال پایا جاتا ہے مثلاً ایک بچے کی پیدائش پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھتا ہے ''حبذا الأصل و فرعه، و بورک الغیث و صوبه، و انبع الأرض و نوره و حبذ اسماء أطلعت فرقدا و غابة أبرزت أسدا'' (اصل اورشاخ دونوں قابل تعریف ہیں، بارش اور بادل دونوں قابل مبارکباد ہیں، باغ اور اس کی کلی ثمرآور ہوئی اور قابل تعریف ہے وہ آسمان جس نے فرقد ستارے کو طلوع کیا اسی طرح قابل تعریف ہے وہ جنگل جس نے کسی شیر کو ظاہر کیا)

اس کے رسائل سلاست وبلاغت کا نمونہ ہیں اور ان رسائل کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ نگاری کا جوہر اس کے اکثر خطوط میں پایا جاتا ہے اور اسی عنصر نے آگے چل کر ایک نئے فن یعنی ''مقامات نویسی'' کی بنیاد ڈالی جو چھوٹی چھوٹی حکایات پر مشتمل ہوتی ہیں جو اس کے ہیرو ابوالفتح اسکندری اور راوی عیسیٰ بن ہشام کے درمیان واقع ہوتی ہیں۔ ناقدین ادب کا خیال ہے کہ اس کے ذہن میں قصہ نگاری کا واضح تصور نہیں تھا بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ ابوالفتح اسکندری اور عیسیٰ بن ہشام کے درمیان مکالمہ کے ذریعہ مسجع ادبی عبارتوں کا ذخیرہ جمع کردیا جائے جسے نوجوان یاد کریں اور ان کے اندر ادبی ذوق پیدا ہو۔ یہی مقصد اس کے بعد ابوالقاسم حریری کے پیش نظر تھا اور اسی کو عمدہ اور بلیغ نثر تصور کیا گیا...... بدیع کے مقامات کا ایک اثر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کے ''ابلیسی مقامہ'' سے متاثر ہوکر ابن شہید اندلسی اور ابوالعلاء معرّی نے عالم مابعد الطبیعات کا اپنا سفرنامہ لکھا اور اس عالم کے حالات کو قوت متخیلہ کے مدد سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔

بدیع الزماں نے چالیس مقامے نیشاپور میں قیام کے دوران املا کرائے، پھر امیر سجستان کے یہاں مہمان رہ کر پانچ مقامات کا اضافہ کیا اور بعد میں کسی اور موقع پر اس نے چھ مقامات کا اضافہ کیا۔ اس کے مقامات کا موضوع جداگانہ نہیں ہے بلکہ سب کا موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے ''ادبی انداز کی گداگری''۔ اس نے اپنے زمانہ میں پائے جانے والے پیشہ ور گداگرادیبوں کے حیلے اور بہانوں کو ان ''مقامات'' میں یکجا کردیا ہے۔ اپنے مقامات میں وہ وصف نگاری اور تصویر کشی کا اہتمام کرتا ہے اور جس چیز کی عکاسی کرتا ہے اس کے بارے میں متعدد جملوں کا استعمال کرتا ہے تاکہ نوجوان ادیب اس میں سے اپنی پسند کے جملے کا انتخاب کرسکے۔ ابن القفطی کا یہ قول کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ''انشا پردازی کی مشق اور نظم ونثر کے مختلف اسالیب سے واقفیت کے سوا مقامات سے کوئی اور شے کی کشید نہیں کی جاسکتی''۔

بقول ڈاکٹر شوقی ضیف'' نادر اور پیچیدہ الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ بدیع الزماں نے اپنے مقامات میں کثرت سے شعر کی تضمین، قرآن کی آیات اور ضرب الامثال کو اپنی عبارتوں میں استعمال کیا ہے، یہ سارے مظاہر تکلف وتصنع کرنے والے ادبا کے یہاں واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس نے صنعت تجنیس کو اپنے مقامات میں ایک اہم عنصر بنا کر پیش کیا...... اور اس صنعت میں افراط نے اس کو تجنیس ناقص اور تجنیس معکوس کے استعمال پر مجبور کردیا...... خلاصہ کلام یہ کہ وہ ایک ایسے مرحلہ کا ادیب تھا جس میں نثر نگاری فن تصنیع یعنی اسلوب کی

تزئین وآرائش کے اہتمام کے رجحان سے نکل کر اسلوب میں تکلف وتصنع کے اہتمام کے مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی......''۔

اس کی نثر کا نمونہ:

"یعزّ علّی (اطال اللہ بقاء الرئیس) ان ینوب فی خدمته قلمی عن قدمی ویسعد برویته رسولی دون وصولی، ویرد مشرعة الانس به کتابی، قبل رکابی، ولکن ما الحیلة۔ والعوائق جمة۔

وعلی ان اسعی ولیس   علّی ادراک النجاح

وقد حضرت داره وقبلت جداره ومابی حسب الجدران ولکن شغفاً بالقطان ولا عش الحیطان، ولکن شوقا الی السکان"۔

(مجھے یہ بات گراں گذر رہی ہے کہ میرے قدموں کے بجائے میرا قلم رئیس کی خدمت میں میری نیابت کرے، میرے بجائے پیغام ان کی دید سے مشرف ہو، میرے بجائے میری تحریر ان کی انسیت کے مقام پر اترے لیکن کیا کیا جائے رکاوٹیں ڈھیروں ہیں اور ان تک پہنچنے کی کوئی تدبیر نہیں (شاعر) کہتا ہے میرے لیے کوشش کرنا ضروری ہے اس کوشش میں کامیابی کا حصول ضروری نہیں۔ میں ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوا اس کی دیواروں کو بوسہ دیا دراصل مجھے دیواروں سے الفت نہیں بلکہ مکینوں کی محبت اور شوق میں ایسا کیا ہے)۔

المقامات المضریه کی عبارت ملاحظہ ہو:

" یاغلام الخوان فقد طال الزمان، والقصاع فقد طال المصاع، والطعام، فقد کثر الکلام۔ فأتی الغلام بالخوان، قلبه التاجر علی المکان ونقره بالبنان و عجمه بالاسنان، وقال: عمرّ اللہ بغداد فما أجود متاعها وأظرف صنّاعها تأمل باللہ هذا الخوان وانظر الی عرض متنه وخفة وزنه وصلابة عوده وحسن شکله، فقلت: هذا الشکل فمتی الأکل؟ فقال: الآن"۔

(اے غلام خوان لاؤ کافی وقت گذر گیا، برتن لاؤ کافی بحث ومباحثہ ہوگیا، کھانا حاضر کرو باتیں بہت ہوگئیں۔ پس غلام ایک خوان لے آیا، اس تاجر نے اسی جگہ اسے الٹ پلٹ کیا، انگلیوں سے بجایا اور دانتوں سے اس کو دبایا اور کہنے لگا کہ اللہ بغداد کو آباد رکھے وہاں کا سامان کتنا عمدہ ہے اور وہاں کے کاریگر کتنے بہترین ہیں، بخدا اس خوان کو دیکھو، اس کی وسعت، اس کے وزن کا ہلکا پن، لکڑی کی مضبوطی اور خوبصورتی کو دیکھو، میں نے کہا کہ یہ شکل وصورت تو ٹھیک ہے کھانا کب (نصیب) ہوگا؟ اس نے جواب دیا: بس ابھی'')۔

اشعار کا نمونہ:

إسمع نصیحة ناصح   جمع النصیحته والمقه

إیاک وإحذرأن تکون   من الثقات علی ثقه

(خیر خواہ کی نصیحت سنو جس نے خیر خواہی اور نصیحت کو اکٹھا کر دیا ہے اور خبردار قابل بھروسہ لوگوں پر بھی بھروسہ کرنے سے بچتے رہنا)

ابو القاسم ناصر الدولہ سخاوت سے متعلق اشعار:

وکان أمطار الربیع الی ندی کفیک تُعزی

يا أيهاالملك الذى بعساكر الآمال يغزى

خلقت يداك على العدى سيفا وللعافين كنزا

لازلت ياكنف الامير لنامن الاحداث حرزا

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فصل بہار کی بارشیں آپ کے ہاتھوں کی سخاوت کی طرف منسوب ہیں۔اے وہ بادشاہ کہ جس پر آرزؤں کے لشکر سے چڑھائی کی جاتی ہے آپ کے ہاتھ دشمنوں کے لیےتلوار مانگنے والوں کے لیےخزانہ ہیں، اے بادشاہ! تو ہمیشہ ہمارے لیے ہمیشہ حوادث زمانہ سے بچاؤ کا سبب بنا رہے)۔

اس کی باقیات میں ''مقامات'' کے علاوہ ایک دیوان شعراور مجموعہ رسائل ہیں جو بے حد مقبول ہوئے۔ان رسائل میں مدح،شکر، معذرت خواہی،تعزیت،ہجو،عتاب طلب جوداور شفقت کی امید جیسے موضوعات شامل ہیں۔کچھ رسائل حکام، وزراء،شیوخ،ادبا اوراہل عیال کے نام سے بھی ہیں۔

15.5.9 قاضی فاضل (۵۲۹-۵۹۶ھ)

قاضی فاضل کا شمار عباسی دور کے چوتھے طبقہ کے سردار کے طور پر ہوتا ہے، ابن العمید کے زمانہ سے صنائع وبدائع ،سجع بندی اور مضمون میں زیبائش وآرائش کا سلسلہ شروع ہوا تھا، قاضی فاضل کا دور آتے آتے اس میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا۔قاضی فاضل نے مندرجہ بالا عناصر کے علاوہ توریہ اورتجنیس کا بے حد استعمال رائج کیا۔یہ اسلوب ابن خلدون (م-۸۰۸ھ) کی آمد تک مقبول عام رہا یہاں تک ابن خلدون کا اثر اور نئے زمانہ کے تقاضوں نے اس اسلوب کا بڑی حدتک خاتمہ کر دیا۔

ابوعلی عبدلرحیم بیسانی عسقلانی کی ولادت ۵۲۹ھ میں عسقلان میں ہوئی۔ان کے والد چونکہ فاطمیوں کے زمانہ میں بیسان کا قاضی تھے لہٰذا اس نسبت سے انھیں بیسانی بھی کہا جاتا ہے۔ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد بہاء الدین علی سے حاصل کی، رسائل نگاری اور دفتری انشاء میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مصر آیا اوراسکندریہ کے قاضی ابن حدید کے دفتر میں ملازم ہوگیا۔موفق بن خلال اورابن قادوس کی شاگردی میں رہا۔جلد ہی وہ اپنے فضل وکمال کی وجہ سے مشہور ہوگیا، قاہرہ میں ملک ظافر کے دفتر میں ملازمت حاصل کی۔حکومت ایوبیہ کے قیام کے بعد صلاح الدین بن ایوب نے اسے وزیر بنالیا پھرصلاح الدین کے لڑکے''عزیز'' اوراس کے بھائی ''ملک افضل'' کا وزیر رہا۔ **مسالک الابصار** کے مصنف ابن فضل اللہ عمری کے قول کے مطابق ''قاضی فاضل،صلاح الدین کی حکومت کا انشا پرداز، وزیر، حاکم اورمشیر سب کچھ تھا، وہی اس کے وفود تیار کرتا تھا......''۔

اس کے عہدے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مختلف صوبوں کے انشا پردازوں سے راہ ورسم رکھے اوروہاں سے حاصل شدہ اطلاعات کو بادشاہ تک پہنچائے، مصر شام اورعراق کی انشا پردازی کے طریقوں سے واقفیت نے اسے ایک نئے طرز کے ایجاد کرنے پر ترغیب دی۔اس کے یہاں تکلف وتصنع کے عناصر کا خاص اہتمام ہے، اس کے جملے طویل ہوا کرتے تھے تاکہ وہ صنعت تجنیس اور مراعاۃ النظیر کا استعمال کر سکے۔کہا جاتا ہے کہ کثرت سے توریہ کی صنعت تحریک اسی کے زمانہ سے رائج ہوئی۔قاضی فاضل کو جوادبی وفنی مہارت حاصل تھی اس میں

اس تکلف وتصنع والے اسلوب میں مضمون اورعبارتوں میں ثقل کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن بعد میں آنے والے انشا پردازوں کی محض تقلید نے شکل بگاڑ دی۔ اس کا ڈھانچہ تو عربی تھا مگر اس میں عربی روح کا فقدان نظر آتا تھا۔ قاضی فاضل ایوبی دور کا فصیح وبلیغ ادیب ہے۔ جن اصطلاحات کو وہ اپنی تحریروں میں استعمال کرتا تھا وہی بعد میں آنے والے سبھی مصری ادبا کے فن کی اساس وبنیاد ہیں یہاں تک کہ نویری نے یہ کہہ دیا کہ قاضی فاضل کے بعد جتنے فاضل آئے سب کے سب فاضل (زائد) تھے۔

نمونۂ کلام:

"الحمد لله الذی صدق وعده وأورثه الارض وحده، وجدد علاه واعلی جده واسعد نجحه وانجح سعده ووعده نجمه وانجم وعده واورده واصفی ورده"۔

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی فاضل تجنیس تام اور تجنیس غیر تام کا استعمال کرتا ہے۔ یہی وہ انداز ہے کہ ابن العمید کی تقلید کرنے والوں کی آخری صف میں حریری نے اختیار کیا تھا اور یہی طریقہ آگے چل کر فاضلیہ طریقہ کہلایا جس میں قصداً بدیع کا استعمال، صنعت میں مبالغہ، لفظی زیبائش وآرائش پر زیادہ زور اور معانی پر کم توجہ ہوتی ہے۔

اپنے بھائی عبدالکریم جو میر علم الدین النحاس کی ایذاء رسانی کا سبب بنا تھا، کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے:

"وبالله أقسم لئن لم تداو ماجرحت وتستدرک مافعلت وتمح ماأثبت وتستانف ضد القبیح الذی کتبت به وشافهت، وتعتذر بالجمیل فیما قاطعت الله به وبارزت، لیکونن الحدیث منی بغیر الکتب ولازیلن السبب الذی قدرت به علی مضرة الاصحاب، وما اشد معرفتی بان الطباع لا تتغیر وبانک ستحوجنی بعد هذا الکتاب الی مالا یتاخر وبالجملة فاستدرک بفعلک لا بایمانک لی وتنصلک الّی..."۔

(خدا کی قسم اگر تم نے اس زخم کا علاج نہ کیا جو تم نے لگایا ہے، اس فعل کو درست نہ کیا جو تم سے صادر ہوا ہے، اس چیز کو نہ مٹایا جس کو تم نے ثابت کیا ہے، اس برائی سے جو تم نے کی ہے اور جس کے بارے میں میں نے تم کو لکھا ہے اور گفتگو کی ہے اور حسن معذرت کا اظہار نہ کیا اس بارے میں جس میں تم نے حقوق اللہ کو ختم کیا ہے تو اب گفتگو میری طرف سے خط کے بغیر ہوگی اور میں لازمی طور پر اس سبب کو ختم کردوں گا جس کی بنا پر تم دوسروں کو نقصان پہنچانے پر قادر ہوئے ہو۔ مجھے پکا یقین ہے فطرتیں نہیں بدلتی ہیں اور تم اس خط کے بعد مجھے کسی تاخیر سے زیر بار نہ کروگے، حاصل کلام یہ کہ تم اپنے عمل سے درستگی کرو نہ کہ میرے ساتھ وفاداری کا اظہار کرکے اور میرے پاس اپنی برأت کا اظہار کرکے۔ ۵۹۶ھ میں قاہرہ میں اس کی وفات ہوئی۔

15.5.10 ضیاء الدین ابن الاثیر

ضیاء الدین ابو الفتح نصر اللہ بن محمد شیبانی شمالی عراق کے ابن عمر نامی جزیرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ علوم شرعیہ اور علوم لغویہ کے لیے مشہور تھا۔ اس کا بڑا بھائی مجد الدین ابو السعادات مبارک بن محمد (م ۶۰۶ھ) قرآن وحدیث اور عربی نحو وصرف میں ماہر تھا۔ اس کی تصانیف میں **"جامع الاصول فی احادیث الرسول"** **"النهایة فی غریب الحدیث"** اور کتاب **"الانصاف فی الجمع بین الکشف والکشاف"** زیادہ مشہور ہیں۔ دوسرا بھائی عز الدین ابو الحسن علی بن محمد (م ۶۳۰) ہے اس کی مشہور ترین کتابوں میں **"الکامل فی التاریخ"**،

"أسد الغابة فی معرفة الصحابة" اور سمعانی کی کتاب الانساب کا خلاصہ "لباب لب الباب فی معرفة الانساب" ہیں۔

ابتدائی تعلیم وتربیت اور حفظ قرآن کے بعد ضیاء الدین اپنے والد کے ساتھ ۵۷۹ھ میں موصل آ گیا جہاں علما کی مجالس میں شریک ہو کر اس نے علوم اسلامیہ، علوم لغویہ اور علوم بلاغیہ کا درس لیا۔ درسیات کی تکمیل کے بعد ۵۸۷ھ میں وہ قاضی فاضل کی وساطت سے صلاح الدین ایوبی تک پہنچا اور تقریباً چار ماہ تک اس کے پاس رہا۔ صلاح الدین کے لڑکے نورالدین نے اپنے والد سے ضیاء الدین کو حاصل کر کے اسے اپنا وزیر ومشیر بنالیا۔ صلاح الدین کی وفات کے بعد دمشق کی حکومت نورالدین کو ملی تو اس نے ضیاء الدین کو وہاں کے انتظامی امور کی ذمہ داری دے دی۔ دمشق والوں کے ساتھ اس کا جو سلوک رہا اس کی وجہ سے لوگ اس کے قتل کے درپے ہو گئے اور نورالدین کے ہاتھ سے دمشق نکل گیا تو ضیاء الدین ایک مقفل صندوق میں چھپ کر بڑی مشکل سے مصر پہنچا اور اس وقت تک روپوش رہا جب تک نورالدین مصر کا سلطان نہ بن گیا۔ نورالدین ایک سال تک مصر میں رہا۔ جب اسے دریائے فرات کے قریب 'سُمَیاط' کا حاکم بنادیا گیا تو ضیاء الدین بھی اس کے ساتھ وہال آ گیا۔ یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ۶۰۷ھ میں حاکم حلب سلطان ظاہر کے پاس چلا گیا۔ پھر وہاں سے ۶۱۱ھ میں اربل اور سنجار کا سفر اختیار کیا لیکن یہاں سکون نہ ملا تو ۶۱۸ھ میں ناصرالدین محمود حاکم موصل کے دیوان انشاء کا صدر نشین بنا۔ ۶۳۷ھ میں بعض اہم کام کی انجام دہی کے لیے ناصرالدین محمود نے اسے بغداد بھیجا جہاں اسی سال اس کی وفات ہوگئی۔

ضیاء الدین کو اپنی تحریروں کے عمدہ اسلوب کی وجہ سے اپنے ہم عصروں پر سبقت حاصل تھی۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز کے طور پر مشہور ہوا۔

اس کی تصانیف درجہ ذیل ہیں:

۱۔ "المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر": محسنات لفظیہ، محسنات بدیعیہ اور محسنات معنویہ میں نہایت مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اپنی کتاب میں اس نے ان امور کی نشان دہی کی ہے جن کی انشا پردازوں کو ضرورت ہوتی ہے مثلاً لغوی وبلاغی علوم، اشعار عرب، امثال عرب، قرآن وحدیث سے استشہاد، احکام خلافت وریاست اور اس سے متعلق فقہی امور ومسائل۔

۲۔ "الوشی المرقوم فی حل المنظوم": اس کتاب میں ضیاء الدین نے دو فصلوں میں اس بات کو بیان کیا ہے کہ رسائل نویسی میں آیات قرانیہ اور احادیث نبویہ سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ "المعانی المخترعة فی صناعة الانشاء"۔

۴۔ ایک مجموعہ اشعار اس نے ترتیب دیا ہے جس میں ابوتمام، بحتری، دیک الجن اور متنبی کے اشعار ہیں۔

۵۔ "دیوان الترسل": اس کے رسائل کا مجموعہ کئی جلدوں میں ہے۔ "المثل السائر" میں خود اس نے ذکر کیا ہے کہ میرے رسائل کئی جلدوں میں ہیں۔

۶۔ "المختار من دیوان الترسل": ایک جلد میں ہے۔

۷۔ "الجامع الکبیر فی صناعة المنظوم والمنثور": اس کتاب کے مخطوطے کے دو نسخے **دارلکتب المصریة** میں محفوظ ہیں۔ ایک مخطوطہ ۱۲۰۵ھ کا ہے اور دوسرا ۱۳۱۴ھ"۔

مندرجہ بالا تمام کتابوں سے ہمیں شاہی فرامین نویسی میں ضیاء الدین کے خصوصیات کا علم ہوتا ہے ۔اس کی توجہ سجع ،صور بیانیہ اورمحسنات بدیع پر نمایاں ہیں ۔ وہ قرآن وحدیث کے اقتباسات اوراشعار کونثر کے قالب میں ڈھالتا ہے اوراپنی تحریروں سے اس کی مثالیں پیش کرتا ہے۔

ایک مکتوب میں آیات قرانیہ سے اقتباس کر کے جنگ کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے:

”وعقد العجاج شفقا فانعقد، وارانا کیف رفع السماء بغیر عمد غیر انها سماء بنیت بسنابک الجیاد، وزینت بنجوم الصعاد، ففیها مایوعد من المنایا لا مایوعد من الارزاق ومنها تقذف شیاطین الحرب لا شیاطین الاستراق“۔

(غبار نے شفق بنا کر ہمیں دکھایا کہ بغیر ستون کس طرح آسمان بلند ہے، البتہ یہ آسمان گھوڑوں کی کھروں سے بنایا گیا ہے، اوراسے نیزوں کے ستاروں سے مزین کیا گیا ہے، اس میں موت کے وعدے ہیں، رزق کے نہیں، ان سے جنگ کر کے شیاطین کو مارا جاتا ہے، کان لگا کر سننے والوں کو نہیں)۔

اس کے ایک خط کا نمونہ جو اس نے الملک الافضل (نورالدین) کی طرف سے اس کے چچا الملک العادل کو لکھا تھا:

”ندمت علی أمر مضی لم یشر به نصیح ولم یجمع قواه نظام رب وثوق یقود الی الندم، وتودد یدعوالی التهم، وقد یدل الحلم علی صاحبه، ویُطمع فی جانبه، ولولا ذلک لما رستلین عودی فعُجم، واستضعف رکنی فُهدم، ولا شکوما اشکوه الا الی عمی، وصنو أبی الذی نفره نفری، وهو الذی قلب فُواقی علی وتری، وعلمنی التظلم من الایام وأرانی ضوء النهار بعین الاظلام، ولقد أضاع فیّ احسانه وخالف فی قطع رحمی سنة الله وکتابه، وجعل ایامی منه کیوم البعث الذی یتناکر الناس فی انسابه وأسبابه“۔

ضیاء الدین ابن الاثیر کے ہم عصر مؤرخوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے زمانہ وزارت میں حکومت کے کارندوں سے بھی اچھی طرح پیش نہیں آتا تھا اورحکومت کے معاملات میں اس کی وجہ سے خرابی پیدا ہوجاتی تھی ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے وہ الملک الافضل اوراس کے بھائی الملک العزیز کے درمیان نزاع کا سبب تھا۔ جب بھی الملک الافضل اپنے بھائی سے صلح صفائی کرنا چاہتا تھا، ابن الاثیر آڑے آکر دونوں میں منافرت کو مزید بڑھا دیتا تھا۔ پھر اس نے اپنے محسن قاضی فاضل کو جس نے اسے بادشاہ سے ملایا تھا اپنے سلوک سے سخت ناراض کردیا تھا اوردمشق سے مصر بھجوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بہر حال اس طبقہ کے ادیبوں میں توریہ اورتجنیس کے غلو نے انشاپردازی کو تکلفات اورتصنع کا مجموعہ بنادیا۔ یہ اسلوب تحریر اگر رسائل نویسی ،شاہی فرامین اورعہد ناموں تک محدود رہتا تھا تو ٹھیک تھا لیکن بعد میں آنے والوں نے تو کتابوں کی تصنیف اورعلوم کی تدوین میں اسی اسلوب کو اپنا لیا مثلاً ”تاریخ العتبی“ اور”الفتح القدسی“ وغیرہ۔ جہاں تک ابن الاثیر کا مرتبہ ہے تو بجا طور پر وہ عمدہ اورماہر انشاپردازوں میں تھا۔عراق میں اس کے بعد اس درجہ کا کوئی دوسرا رسائل نگار نہیں پیدا ہوا۔

15.6 اکتسابی نتائج

بلاشبہ عباسی دورعلوم وفنون کی ترقی کا سنہرا دور تھا۔ اس دور کی اہمیت اس سے بڑھ کر اورکیا ہوسکتی ہے کہ بیش تر فنون کے ماخذ اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ترجمہ کے ذریعہ دیگر علوم عربی زبان میں منتقل ہوئے۔ طب، کیمیا، علم نجوم، فلسفہ، ادب، تفسیر، علم حدیث، فقہی ادب، تاریخی ادب،

ریاضی، ہندسہ، موسیقی، علم کلام، ہیئت اور فلکیات پر تصانیف کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اس عہد کو اسلام کا زریں عہد کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا بقول احمد حسن زیات ''مسلمان تمدن وتہذیب اور عمران واقتدار کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل یا اس کے بعد پھر کبھی اس بلندی پر نہ پہنچے۔ فنون اسلامیہ اس دور میں پھلے پھولے، آداب عربیہ نے نشوونما پائی، غیر ملکی علوم کے ترجمے ہوئے، عقل عربی پختہ ہوئی اور اس نے غور وفکر، بحث وتمحیص کے لیے ایک وسیع جولان گاہ پائی...... تا آنکہ ہلاکو خاں نے ۶۵۶ھ میں اس حکومت کا تختہ الٹ دیا اور حکومت کے زوال کے ساتھ اس کے تمدن وادب میں بھی انحطاط ہوتا گیا اور بالآخر حکومت کے خاتمہ پر ان کے آداب وتمدن کا بھی خاتمہ ہوگیا''۔

عہد عباسی میں عربی نثر نگاری کو کافی فروغ ہوا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ علوم وفنون کے دائرہ میں وسعت کا پیدا ہونا تھا کہ علمی موضوعات کا احاطہ شعری قالب میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس عہد میں جتنی ترقی نثر کی ہوئی اتنی ترقی عربی ادب کی تاریخ میں عصر جدید کو چھوڑ کر کسی اور عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ اس عہد میں جہاں ایک طرف نثر میں خالص ادبی موضوعات جیسے سفرنامے اور تنقید وغیرہ پروان چڑھے تو دوسری طرف لسانی علوم جیسے نحو ولغت جیسے علوم وفنون نے ترقی کے منازل طے کیے۔ ان علوم وفنون کے ساتھ ساتھ سماجی علوم جیسے تاریخ وجغرافیہ، سائنسی علوم جیسے کیمیا اور طبیعیات وغیرہ کے موضوع پر عہد عباسی کے علماء نے گرانقدر تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کتب نے جہاں ایک طرف عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہیں عربی زبان کے دامن کو اس قدر وسیع کر دیا کہ اس میں کسی بھی قسم کے موضوع کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔

15.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

۱- عہد عباسی میں نثر نگاری کے ارتقائی مراحل پر روشنی ڈالیے۔

۲- عہد عباسی میں فن خطابت کے ارتقاء پر ایک نوٹ لکھیے۔

۳- عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب وعوامل اور اس کے امتیازات وخصائص بیان کیجیے۔

۴- عہد عباسی کے نثر نگاران کے کتنے طبقات پائے جاتے تھے؟

۵- عہد عباسی کے اصناف نثر جائزہ لیجیے۔

15.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

-تاريخ الأدب العربي (العصر العباسي)	ڈاکٹر شوقی ضیف
-الجامع في تاريخ الأدب العربي	حنا فاخوری
-تاريخ الأدب العربي	احمد حسن زیات
-ضحى الاسلام، جلدسوم	احمد امین
-عربی نثر فنی کا ارتقا	شوقی ضیف ترجمہ شمس کمال انجم
-تاریخ ادب عربی حصہ سوم	مقتدی حسن ازہری

اکائی 16 عصر عباسی میں شاعری

اکائی کے اجزا

16.1 مقصد

16.2 تمہید

16.3 عصر عباسی کی شاعری

16.3.1 عہد عباسی کے شعرا کا اصطلاحی لقب

16.3.2 عہد عباسی میں شاعری کے مراکز

16.4 عصر عباسی کی شاعری کے موضوعات

16.5 عصر عباسی کے شعرا کی موضوعاتی تقسیم

16.6 عصر عباسی کی شاعری کے امتیازات وخصوصیات

16.7 عصر عباسی کی شاعری کے ممتاز شعرا

16.7.1 بشار بن برد

16.7.1.1 شاعری

16.7.2 ابونواس

16.7.2.1 شاعری

16.7.3 ابوالعتاہیہ

16.7.3.1 شاعری

16.7.4 ابوتمام

16.7.4.1 کتاب الحماسة

16.7.4.2 شاعری

16 .7.5 بحتری

16.7.5.1 شاعری

16.7.6 متنبی

16.7.6.1 شاعری کا آغاز

16.7.7 ابوالعلاء معری

16.7.7.1 تصانیف

16.7.7.2 شاعری

16.8 اکتسابی نتائج

16.9 نمونے کے امتحانی سوالات

16.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

16.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عہد عباسی میں عربی شاعری کا کیا مقام ومرتبہ تھا۔اس عہد کی شاعری میں کیا نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔کن کن اصناف سخن پر شعرا داد وتحسین وصول کررہے تھے اور عہد عباسی کی شاعری کے نمایاں امتیازات اور خصائص کیا تھیں۔اس عہد کے شعرا میں کن شعرا کو زیادہ مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی اور ان کی شہرت کے اسباب کیا تھے۔

16.2 تمہید

عصر عباسی، تاریخ ادب عربی کا زریں دور ہے۔اس عہد میں عربی شاعری میں نمایاں ترین تبدیلیاں ہوئیں۔شاعری صحرا و بیابان سے نکل باغات اور محلات کے اردگرد گھومنے لگی۔نت نئے موضوعات پر شعرا نے طبع آزمائی کرنی شروع کردی۔فلسفیانہ افکار وآرا کے نمایاں اثرات شاعری پر مرتب ہوئے بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاعری کے بجائے کوئی فلسفہ کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔

16.3 عصر عباسی کی شاعری

عصر اموی میں شاعری اپنے قدیم اسلوب پر گامزن رہی تاہم اس کے موضوعات میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے جیسے غزل نے بحیثیت صنف اسی عہد میں اپنے بال و پر نکالے، سیاسی شاعری کے خد وخال نمایاں ہونے لگے تھے لیکن اسلوب میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ اس عہد کے بڑے بڑے شعرا قدیم اسلوب کی پیروی کو ہی اعلی شاعری کا پیمانہ سمجھتے تھے۔قدیم جاہلی شاعری کی اتباع اور پیروی ہی معیار ومرتبہ کی کسوٹی قرار دی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اولین ناقدین نے عصر عباسی کی ابتدائی شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

عہد عباسی کی شاعری کے فروغ اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کی اہم وجہ یہ تھی کہ انشا پردازوں کے مقابلہ میں شعرا کو خلفا، حکما اور امرا کی خلوتوں میں رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا کہ وہ اپنی مبالغہ آمیز مدحیہ شاعری سے ان کے دربار کا اہم حصہ بن جاتے تھے۔عباسی شعرا نے شاعری کے میدان میں مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور مختلف قسم کے شہ پاروں سے عربی شاعری کے دامن کو مالا مال کردیا۔انھیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار وبیان کا جتنا موقع اس عہد میں ملا وہ کسی اور دور میں میسر نہیں آسکا لہذا وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے فکر وفن کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے لگے

عصر اموی کے اواخر اور عہد عباسی کے ابتدائی دور میں جب تحریک موالی کا آغاز ہوا اور انھوں نے قدیم طرز سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں شاعری کا آغاز کیا تو اس عہد کے علما اور ناقدین ادب نے ان کے طرز کو ناپسندیدہ قرار دیا جس کی وجہ سے وہ قدیم جاہلی اسلوب کی پیروی کرنے پر مجبور ہوگئے لیکن انھوں نے غیر محسوس انداز میں اسلوب میں تبدیلی کا آغاز کردیا تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے عربی شاعری کی ماہیت اور موضوعات کو تبدیل کردیا تھا۔

عہد عباسی کے ابتدائی دور کے شعرا میں کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جنہیں عہد اموی کا آخری زمانہ ملا۔ایسے شعرا کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم اسلوب کو ہی مکمل طور پر اختیار کرلیا تھا اور روایتی انداز میں اپنی شاعری کے جلوے

بکھیرتے رہے تھے۔ انھوں نے نئے انداز بیان اور اسلوب شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا جیسے مروان بن ابی حفصہ (105-182ھ 723-798ء) ۔مروان بن حفصہ نے خاص طور سے اموی اسلوب شاعری کو اپنایا ۔اسے شاعری کے میدان میں جریر وفرزدق کے مکتب شاعری کا نمائندہ شاعر قرار دیا جاتا ہے۔زہیر بن ابی سلمی کی طرح وہ اپنے قصائد کی سال بھر نوک و پلک درست کرتا رہتا تھا اور مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی اسے لوگوں کے سامنے پیش کرتا تھا۔

دوسرا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی شاعری کو بدوی انداز فکر میں پیش کیا جیسے ابن ہرمہ (80-176ھ) اور حسین بن مطیر (وفات 170ھ/ 786ء) وغیرہ۔اول الذکر کے بارے میں مشہور ناقد اصمعی کا قول ہے کہ اس کی وفات کے ساتھ ہی اصل عربی شاعری کا خاتمہ ہوگیا۔ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ آخری شاعر ہیں جن کے اشعار سے لغوی استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم کی حفاظت کرتے ہوئے جدید اسلوب کو اختیار کیا اور اپنی شاعری میں قدیم و جدید اسلوب کو یکجا کر دیا جیسے بشار بن برد اور ابونواس وغیرہ ۔شعرا کی اس جماعت نے شاعری کے دونوں انداز و اسلوب میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا۔

عہد عباسی کے ابتدائی دور کے ان شعرا کے خاتمہ کے بعد شعرا کی ایک نئی جماعت منظر عام پر آئی جو خالص جدید طرز و اسلوب کے ذریعے عربی شاعری کے نئے آفاق سے دنیا کو روشناس کرائی۔

جدید طرز اسلوب کے قائل شعرا میں کچھ- جیسے بشار اور ابونواس- نے اعتدال کا دامن تھامے رکھا اور قدیم اسلوب کی افادیت کے ساتھ ساتھ جدید طرز نگارش کو بھی ضروری سمجھا جب کہ کچھ نے غلو کی راہ اختیار کرتے ہوئے قدیم اسلوب کو بالکل ہی ترک کرنے اور صرف جدید اسلوب اختیار کرنے پر زور دیا۔

عصر عباسی کی شاعری میں ہونے والی یہ تبدیلی صرف قصیدہ کی شکل اور مطلع کی تبدیلی ہی نہیں تھی بلکہ اس طرز اسلوب کے متبعین شعرا نے بحور و قوافی میں بھی تبدیلی کرتے ہوئے اس کی موسیقیت میں اضافہ کر دیا۔انھوں نے جدید تہذیب و ثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے نت نئے تجربات کیے جنھیں اتفاق سے دوام حاصل نہ ہوسکا۔انھوں نے مقطعات، مخمسات اور مسمطات جیسے اسلوب سے عربی شاعری کو روشناس کیا۔مزید یہ کہ انھوں نے معانی میں جدت پیدا کی، الفاظ اور تراکیب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں جس نے آگے چل کر علم بدیع کی بنیاد رکھ دی۔

عہد عباسی کی شاعری اپنے مقاصد، موضوعات، مضامین، خیالات، لفظیات اور اسلوب کے حوالہ سے ماقبل کی عربی شاعری سے جداگانہ نظر آتی ہے۔اس عہد کی شاعری کے اہم مقاصد عصبیت اور نسبی مفاخرت کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کی سیاسی، دینی اور مذہبی نقطۂ نظر کو فروغ دینا اور کسب معاش کا اہم ذریعہ بنانا وغیرہ ہیں۔اس عہد کی شاعری کے موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں تھیں جن کا تفصیلی ذکر آگے کیا جائے گا۔

لفظیات اور اسلوب کے حوالہ سے اس عہد کی شاعری میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں تھیں جیسے نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کم کیا جانے لگا، بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کا استعمال بتدریج کم کیا ہونے لگا، عجمی الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔شاعری کے اسلوب بیان میں نفاست اور باریکی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحت کلام کا خیال رکھتے ہوئے صنعت 'بدائع' اور اس کی مختلف

انواع کو کثرت سے برتا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بحروں کو بکثرت استعمال کیا گیا۔ دیگر نئے اوزان و بحور جیسے مستطیل وممتد کا اضافہ ہوا۔ شاعری کی اقسام میں جہاں ایک طرف موشح، زجل، دوبیت، موالیا کا اضافہ ہوا تو دوسری طرف قوافی میں مسمط اور مزدوج کو فروغ ہوا۔

قصائد کی ابتدا کھنڈرات کے بجائے محلات و باغات اور شراب وغیرہ سے کرنا، مدح اور ہجو میں مبالغہ آمیزی، تشبیہ و استعارہ کا بکثرت استعمال، قصیدہ کے مختلف اجزا میں تناسب وموزونیت کا پایا جانا اور بندش میں ترتیب کی رعایت کا خیال رکھنا وغیرہ کو اس عہد کے اسلوب شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عصر عباسی میں شاعری کو فروغ دینے میں جہاں خالص عرب افراد نے اپنا اپنا کردار بخوبی انجام دیا تھا وہیں اس کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں اہل عجم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد عباسی کی شاعری اہل عجم کی ہی مرہون منت ہے کہ اس عہد کے نمایاں ترین شعرا کا تعلق دیار عجم سے تھا اور انھوں نے عربی شاعری کے طرز و اسلوب، مضامین وموضوعات، معانی وخیالات اور اوزان و بحور وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کرتے ہوئے عربی شاعری کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا تھا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعری کے عمدہ ترین شہ پاروں سے عربی شاعری کے دامن کو بھر دیا تھا۔

16.3.1 عہد عباسی کے شعرا کا اصطلاحی لقب

عہد عباسی کے شعرا کو ''الشعراء المولدون'' اور ''الشعراء المحدثون'' کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ اول الذکر اصطلاح ولقب سے مراد وہ شعرا لیے جاتے ہیں جنھوں نے عباسی خلافت کا ابتدائی زمانہ پایا تھا۔ شعرائے مولدین کا لقب عام طور سے دوسری صدی ہجری کے شعرا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ثانی الذکر اصطلاح ولقب کا اطلاق عام طور پر ان شعرا پر کیا جاتا ہے جن کی ولادت تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد ہوئی تھی اور انھوں نے طبقہ مولدین کے بعد شاعری کے رنگ و آہنگ میں نمایاں تبدیلیاں کی تھیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بعض ناقدین ادب دونوں مصطلحات میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتے ہیں جیسے ابن المعتز نے اپنے زمانہ تک یعنی تیسری صدی کے جملہ عباسی شعرا کو 'شعرائے محدثین' قرار دیا ہے۔ اسی طرح دیگر ناقدین ادب تمام عباسی شعرا کو 'شعرائے مولدین' میں شمار کرتے ہیں۔

ان دونوں طبقوں یعنی 'الشعراء المولدون' اور ''الشعراء المحدثون'' کے لیے عام طور ''الشعراء المبدعون'' کی اصطلاح کا استعمال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے اسلوب اور اس کی مختلف اصناف میں نت نئے رنگوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس طبقہ کا سرخیل بشار بن برد کو قرار دیا جاتا ہے کہ اسے ''الشعراء المولدون' اور ''الشعراء المحدثون'' دونوں طبقات میں شمار کیا جاتا ہے۔

16.3.2 عہد عباسی میں شاعری کے مراکز

عہد عباسی کی شاعری کے حوالہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں شاعری کے مختلف مراکز تھے۔ ابتدائی سو سال میں صرف بغداد ہی شاعروں کی آماجگاہ تھا اور وہیں کی فضاؤں میں مسحور کن شاعری کے نغمے گونج رہے تھے لیکن جوں جوں

مرکزی خلافت میں کمزوری آتی گئی توں توں عربی شاعری کو مختلف پناہ گاہیں ملتی گئیں اور اس کے مختلف مراکز سامنے آتے چلے گئے اور وہ بغداد سے نکل کر ایران، شام، مصر اور مغرب میں اپنے جلوے بکھیرنے لگی۔ مرکزی خلافت کے عہد انتشار میں عربی شاعری کو بنو بویہ اور آل حمدان جیسے قدرداں میسر آگئے تھے جنھوں نے شعرا کو دل کھول کر انعامات واکرامات سے نوازا جس کی وجہ سے عربی شاعری دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ عہد انتشار میں امرا، رؤسا اور حکما، عباسی خلفا کی نیابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان کا دربار اور نجی مجلسیں شعرا کی آماجگاہ بن گئیں تھیں جہاں ان پر دادودہش کی بارش کی جاتی تھی اور انہیں گرانقدر انعامات واکرامات سے نوازا جاتا تھا۔ ثعالبی نے اپنی کتاب "یتیمة الدھر" میں شعرا کی ایک طویل فہرست دی ہے جس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی انتشار نے عربی شاعری کے فروغ میں کس قدر اہم کردار ادا کیا تھا۔

16.4 عصر عباسی کی شاعری کے موضوعات

عصر عباسی میں شاعری اپنے نئے پیراہن میں نظر آتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ قدیم وجدید کا ایک ایسا خوبصورت وحسین سنگم پیش کرتی ہے جس کا نمونہ کسی اور دور میں نہیں ملتا ہے۔ قدیم موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات پر بھی اظہار سخن کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس عہد کے قدیم موضوعات میں مدح، رثا، ہجو، وصف نگاری، فخر ومباہات، عتاب کے موضوعات پر زیادہ شعری سرمایہ ملتا ہے۔ حالات کے تقاضے اور ماحول کی تبدیلی کے نتیجے میں ان قدیم اصناف سخن میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں تھیں۔

شاعر اپنے زمانے کے تقاضوں اور ماحول اور حالات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔ کسی بھی ماحول میں ہونے والی نت نئی تبدیلیاں شعرا پر اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ ان سے بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر ہو کر ان کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اصول وضابطہ سے عباسی عہد کے شعرا بھی بے نیاز نہیں رہے اور انھوں نے حالات سے متاثر ہو کر کچھ نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا جیسے زہد وتصوف اور غزل وغلمان وغیرہ۔ ان نئے موضوعات میں سیاسی شاعری، مذہبی شاعری وغیرہ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی مدح کے ضمن میں، کبھی ہجو کی شکل میں اور کبھی موازنہ ومقابلہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان جدید موضوعات کے بالمقابل عباسی شعرا نے قدیم موضوعات اور مروجہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے تاہم ان کے اس فضل وبرتری کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انھوں نے ان قدیم موضوعات میں سے بعض موضوعات کے دائرہ کو مزید وسعت بخشی تھی جیسے وصف نگاری میں عام طور پر صحرا وبیابان، جانور، محبوبہ اور ان جیسے موضوعات کو مدنظر رکھا جاتا تھا لیکن عہد عباسی میں وصف نگاری کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا کہ عالی شان محلات اور اس کے لوازمات کو شعری قالب میں ڈھالا جانے لگا، شراب اور گانے کی مجلسوں کا نقشہ لفظوں میں کھینچا جانے لگا، مغنیوں اور مغنیات کا سراپا بیان کیا جانے لگا، شراب اور اس کے برتن، ساقی اور دیگر لوازمات کی تصویر کشی الفاظ کی مدد سے کی جانے لگی۔ دل فریب اور خوش منظر باغات، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کا نقشہ الفاظ میں کچھ اس طرح کھینچا جانے لگا کہ پڑھنے والا خود کو وہیں پاتا۔

عصر عباسی کی مدحیہ شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ مدحیہ قصائد کے روپ میں سیاسی اور مذہبی شاعری کی جانے لگی تھی کہ شعرا اپنے سیاسی، دینی اور مذہبی رجحانات کو مدحیہ قصائد میں پیش کر کے خلیفۂ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کافی

حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے کہ اس کے نتیجے میں انھیں انعامات واکرامات سے نواز دیا جاتا تھا۔

عصر عباسی کی ہجویہ اور رثائیہ شاعری کا حال بھی تقریبا عصر اموی کی مدحیہ شاعری کی طرح تھا کہ شعرا اپنے قصائد میں خلیفۂ وقت، امرائے دربار اور صاحب اثرورسوخ حضرات کی چشم ابرو کا خیال رکھنے لگے تھے تا کہ وہ ان سے خوش رہیں اور انھیں داد ودہش اور مال ودولت سے نوازدیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عصر عباسی میں ہجو کے مقابلہ میں مرثیہ کا دامن زیادہ وسیع ہوا تھا کہ اس کی ایک بالکل نئی شکل "رثاء المدن" (شہروں کے نوحے) کا ظہور ہوا جس نے آگے چل کر ایک صنف کی حیثیت اختیار کرلی تھی، خاص طور سے فارسی شاعری میں۔ مرثیہ کی اس مخصوص قسم میں متعدد شہروں کی بربادی و بیابانی پر نوحہ پڑھا گیا خاص طور سے بغداد کی بربادی کا ذکر اتنے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے اسے پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے اور آنکھیں پرنم ہوجاتی ہیں۔

عصر عباسی کی شاعری کے بالکل نئے موضوعات میں سے ایک طرف زہدیہ اور صوفیانہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے تو دوسری طرف غزل غلمان اور وصف شراب جیسے موضوعات بھی پروان چڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان جیسے موضوعات میں فسق وفجور، فحاشی اور بدکاری کا اعتراف برملا کیا جانے لگا۔ شاعری کے یہ دونوں رنگ بالکل متضاد کیفیت کے حامل ہونے کے باوجود عصر عباسی کے سماجی، ثقافتی ماحول کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری کے بالکل نئے موضاعات میں "الطردیات" (شکاریات) کا بھی شمار ہوتا ہے جس میں شکار کے سفر کا نقشہ کھینچا جاتا ہے، شکار کرنے کے مختلف طریقوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔ شکاری جانوروں اور شکار کیے جانے والے جانوروں کے اوصاف کو الفاظ کے قالب میں یوں ڈھال دیا جاتا ہے کہ قاری خود کو اس کا ایک جز سمجھنے لگتا ہے۔

مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے تقاضوں کے مطابق اور اس وقت کے ماحول وحالات سے متاثر ہو کر شعرا نے اپنی شاعری کے محور نگاہ کو تبدیل کرلیا تھا اور ان کی شاعری صحرا کی بے پایاں وسعت، فطری مناظر، کھنڈرات، مٹی کے مکانات اور خیموں کی تصویر کشی کرنے کے بجائے شہری زندگی کی رونق اور لوازمات، محلات وباغات، لہو وطرب اور دوستوں کے ساتھ راگ ورنگ کی محفلوں کی عکاسی کرنے لگی تھی۔ شاعری کے قدیم موضوعات جیسے مدح وفخر وغیرہ میں کچھ نئے موضوعات جیسے زہدیہ شاعری اور وصف غلمان وغیرہ کا اضافہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مزاح اور ظرافت کے کچھ نمونے بھی اس عہد میں ملتے ہیں۔

16.5 عصر عباسی کے شعرا کی موضوعاتی تقسیم

عصر عباسی کا زمانہ پانچ سو سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں نہ صرف قدیم اصناف سخن پر داد وتحسین کے حصول کے ساتھ ساتھ ان میں نت نئی تبدیلیاں کی گئیں بلکہ کچھ بالکل نئے اور جدید موضوعات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔ عصر عباسی میں عربی شاعری اپنے نئے رنگ وروپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے حسن وجمال کے جلوے بکھیرتے ہوئے نظر آتی ہے جس کی وجہ سے عہد عباسی کے شعرا کو حسب ذیل مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

☆ شعراء البداوۃ: اس طبقہ سے مراد وہ شعرا ہیں جو جزیرۂ عرب خاص طور سے نجد وحجاز سے تعلق رکھتے تھے لیکن بصرہ، کوفہ اور

بغداد میں جا بسے تھے۔ان شہروں میں بود و باش اختیار کرنے کے باوجود ان کی زندگی بدویانہ طرز پر گذرتی تھی اور اپنی شاعری میں مانوس بدوی الفاظ اور تعبیرات وغیرہ کا استعمال کرتے تھے۔اس طبقہ کے مشہور شعرا میں ابن میادہ،ابن ہرمہ اور حسین بن مطیر کا شمار ہوتا ہے۔

☆ الشعراء المجددون:اس طبقہ میں ان شعرا کا شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے عربی شاعری کے ظاہری خدوخال اور طرز واسلوب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کی تھیں جن کی وجہ سے عربی شاعری کا ایک نیا رنگ وآہنگ سامنے آیا۔اس طبقہ کے مشہور شعرا میں بشار بن برد اور ابونواس کا شمار ہوتا ہے۔

☆ الشعراء المفتنون:اس طبقہ کے مشہور شعرا میں ابوالشیص ،ابراہیم موصلی ،اسحاق بن ابراہیم موصلی،ربیعۃ الرقی،اشجع سلمی،حسین بن ضحاک کا شمار ہوتا ہے۔

☆شعراء الصنعة:اس طبقہ کے ممتاز شعرا میں مسلم بن ولید ملقب بہ **صريع الغواني**،ابوتمام،ابن المعتز جیسے شعرا شامل ہیں۔

☆الشعراء المحافظون:اس طبقہ سے مراد وہ شعرا لیے جاتے ہیں جنھوں قدیم اسلوب شاعری کو زندگی بھر برتا اور پنی شاعری کو زمانہ اور ماحول سے مکمل طور محفوظ رکھا۔اس طبقہ کا نمائندہ شاعر صرف بحتری کو قرار دیا جاتا ہے۔

☆ الشعراء المبدعون:اس طبقہ کے اہم شعرا میں ابن الرومی جیسے شعرا شامل ہیں۔

☆ شعراء المذاهب والوجدان والفكر:شعرا کا یہ طبقہ مختلف رجحانات ومیلانات کو اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے۔دراصل یہ طبقہ ،مختلف خیالات، رجحانات ومیلانات رکھنے والے شعرا کی ایک بڑی اکائی ہے جسے حسب ذیل طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

☆شعراء العباسية:اس طبقہ سے وہ شعرا مراد لیے جاتے ہیں جو حکومت عباسیہ کے مختلف مناصب پر فائز تھے جیسے مروان بن حفصہ،علی بن جبلہ اور علی بن جہم۔

☆شعراء الشيعة:اس طبقہ میں وہ شعرا شامل کیے جاتے ہیں جو آل بیت میں سے حضرت علی اور ان کی اولاد کو خلافت وحکومت کا مستحق اور آل عباس کو ان کا حق غصب کرنے والا سمجھتے تھے جیسے سید حمیری اور دعبل بن علی خزاعی۔

☆شعراء العشق:عشق ومحبت کے مارے ہوئے شعرا میں عباس بن احنف،عکاشہ العمّی ،ابوبکر محمد بن داؤد اصفہانی کا نام لیا جاتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں صرف عشق ومحبت کے نغمے گائے ہیں۔

☆شعراء الزهد والحكمة والمواعظ:عصر عباسی میں پروان چڑھنے والی اس جدید صنف کے نمائندہ شعرا میں صالح بن عبدالقدوس،احمد بن معذل،ابوالعتاہیہ،ابونواس اور محمود وراق کا شمار ہوتا ہے۔

☆شعراء علماء:عصر عباسی کی فضاؤں میں شاعری یوں رچ بس گئی تھی کہ اس زمانہ کے جید علما بھی اس کی زلف کے پرستار نظر آتے ہیں۔اس عہد کے جن علما وفضلا نے اس میدان میں اپنے نمونے بطور یادگار چھوڑے ہیں ان میں عتابی ،ابوالعباس ناشئ اکبر،ابن داؤد ظاہری اور یحییٰ بن علی بن یحییٰ منجم کا بطور خاص ذکر کیا جا سکتا ہے۔

☆شعراء الطبع والزندقة:اس طبقہ کی نمائندگی کرنے والے شعرا میں مطیع بن ایاس، والبہ بن حباب اور یحییٰ بن زیاد جیسے شعرا شامل ہیں۔ان شعرا نے ساری زندگی صرف فسق وفجور اور اخلاق وکردار کو خراب کرنے والے موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔اسی

طبقہ میں ابوالعتاہیہ اور ابونواس کا شمار بھی کیا جاتا ہے لیکن چونکہ انھوں نے آخری زندگی میں توبہ کرلی تھی اس لیے خواتیم کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا ذکر اس طبقہ کی بجائے دیگر طبقات میں کیا جاتا ہے۔

شعرا کی مذکورہ بالا موضوعاتی تقسیم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کے کیا رنگ وروپ تھے۔اسی طرح یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عربی شاعری کے دیگر ادوار کی طرح اس عہد میں شعرا کا ایک مخصوص طبقہ نہیں تھا جو صرف شاعری کرتا تھا بلکہ اس عہد کے شعرا میں شعرا کے مخصوص طبقہ کے ساتھ سماج کے مختلف طبقات جیسے عباسی خلفا، امرا، وزرا وغیرہ بھی اپنے اپنے جذبات وخیالات کو شعری قالب میں ڈھال رہے تھے لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عصر عباسی کی شاعری کو فروغ دینے میں سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس عہد کی شاعری کو فروغ دینے میں عباسی خلفا میں سے ہارون رشید، مامون، مہدی اور واثق نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے شانہ بہ شانہ عباسی وزرا- جیسے قاضی احمد بن داؤد-اور دیگر امرا وقائدین وعمائدین سلطنت- جیسے ابودلف عجلی-بھی چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

16.6 عصر عباسی کی شاعری کے امتیازات وخصوصیات

عہد عباسی کی شاعری دیگر ادوار کی شاعری سے مختلف حیثیتوں سے ممتاز ومنفرد نظر آتی ہے۔اس عہد کی شاعری کے امتیازات وخصائص کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

☆ عربی-عجمی عصبیت کا فروغ جسے شعوبیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

☆ شاعری میں سیاسی، مذہبی اور دینی عناصر کا شامل ہونا۔

☆ مدح، ہجو اور مرثیہ کے آفاق میں وسعت پیدا ہونا، خاص طور ''رثاء المدن'' (شہروں کے نوحے) کا ظہور۔

☆ عربی شاعری کے مروجہ اصناف جیسے مدح، وصف، ہجو اور مرثیہ وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں جیسے مدح وہجو میں مبالغہ آمیزی اور وصف کے موضوعات میں تبدیلی جیسے کھنڈرات کی بجائے باغات ومحلات وغیرہ کی تصویرکشی۔

☆ فحاشی وبدگوئی کی ابتدا۔

☆ غزل حقیقی کے ساتھ ساتھ غزل غلمان/ امرد پرستی کا آغاز۔

☆ شاعری میں فلسفیانہ افکار وخیالات اور حکمت ودانائی کی آمیزش کی ابتدا۔

☆ مختلف نئی اصناف کا ظہور جیسے خمریات، زہدیات، طردیات اور غزل غلمان/ امرد پرستی وغیرہ۔

☆ حکایتوں کو نظم کے قالب میں پیش کرنا۔

☆ علمی اور دینی مباحث کو شعری قالب میں ڈھالنا۔

☆ شاعری کے موضوعات ومضامین، افکار وخیالات ومعانی اور اسلوب میں تبدیلی۔

☆ خیالات اور تصورات کے اظہار میں تخیل (Imagination) کا سہارا لینا۔

☆ بدائع وصنائع کا کثرت سے استعمال۔

☆ مروجہ بحروں میں چھوٹی بحروں کا بکثرت استعمال اور کچھ نئی بحروں- جیسے مستطیل اور ممتد- اور قوافی- جیسے مسمط اور مزدوج- کے استعمال کرنے کا آغاز۔

☆ غیر مانوس اور بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے اجتناب۔

☆ بدویانہ زندگی کے بجائے شہری زندگی کی تصویر کشی۔

☆ قصیدہ کے اجزا میں تناسب اور موزونیت کے ساتھ ساتھ افکار وخیالات میں ربط کا پایا جانا۔

☆ شاعری کا کسب معاش کا اہم ذریعہ بننا۔

16.7 عصر عباسی کے ممتاز شعرا

16.7.1 بشار بن برد

عصر عباسی کے مشہور ترین شعرا میں بشار بن برد کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے وطن اصلی کے تئیں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ مشرقی ایران کے رہنے والا تھے۔ دوسرے قول کے مطابق ان کا خاندان طخارستان اور تیسرے قول کے مطابق خراسان کے رہنے والے تھے۔ مہلب بن ابی صفرہ نے ان کے والد کو ایک مہم کے دوران گرفتار کرکے بصرہ منتقل کردیا تھا جہاں وہ اینٹیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ بنو عقیل بن کعب کی ایک معزز عورت نے انہیں آزاد کردیا۔ ان کی صحیح تاریخ ولادت کا بیان کہیں نہیں ملتا ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ان کی ولادت 95ھ/ 714ء یا 96ھ/ 715ء میں بمقام بصرہ ہوئی تھی۔ ابتدائی زندگی اور بچپن کے حالات کا ذکر مصادر میں نہیں ملتا۔ موجود معلومات کے مطابق وہ بنو عقیل کے آزاد کردہ غلام (مولی) تھے اور ان سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے۔ وہیں عربی زبان سیکھی جس کی صحت وفصاحت پر وہ زندگی بھر ناز کرتے رہے۔ وہ حد درجہ تک بدصورت وبدشکل اور نابینا ہونے کے باوجود صاحب اقتدار حضرات کے منظور نظر تھے کہ انھیں اپنی تعلیوں اور فقرے بازیوں سے کسی کو بھی مرعوب کرنے کا ڈھنگ اچھی طرح سے آتا تھا۔

بشار بن برد کے اندر شاعری کا فطری مادہ پایا جاتا تھا کہ صرف دس سال کی عمر میں انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کردیا تھا۔ بصرہ کے علمی وادبی ماحول نے ان کی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ بصرہ ''مربد'' (کاروان سرائے) اس وقت نوجوان اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کی نہ صرف آماجگاہ بنا ہوا تھا بلکہ اس نے ایک ''دبستان'' کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ''مربد'' کی علمی وادبی فضا میں وہ پروان چڑھا اور اس وقت کی شعری روایات میں اپنے آپ کو ڈھال کر عربی شعر وادب کے ذخیرہ میں عمدہ اور بہتر اشعار کا اضافہ کیا۔

اموی دور کے ان کے ممدوحین میں سے ابن ہبیرہ، مسلم بن قتیبہ اور اموی خلافت کے آخری جانشین مروان وغیرہ شامل ہیں۔ عباسی خلافت وحکومت کے قیام کے وقت وہ صرف سینتیس (37) برس کے تھے۔ عصر عباسی میں ان کے ممدوحین میں بصرہ اور دیگر مقامات کے گورنرس - جیسے سلیمان عبسی اور اس کے بیٹے، عقبہ بن سلم اور اس کے بیٹے نافع - کا شمار ہوتا ہے۔

بشار بن برد، خلیفہ منصور کا منظور نظر شاعر تھا۔ شاعر کا خلیفۂ وقت سے کیا تعلق تھا اس کا اندازہ اس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کے قافلۂ حج میں شامل تھے۔ انھوں نے خلیفہ منصور کی مدح میں کئی ایک قصائد لکھے ہیں لیکن آگے چل کر ان کے تعلقات خلیفہ سے کافی کشیدہ ہوگئے

تھے۔خلیفہ منصور کے علاوہ انھوں نے خلیفہ مہدی کی شان میں بھی قصائد کہے ہیں لیکن ایک سازش کے نتیجہ میں وہ خلیفہ کی نگاہوں میں معتوب قرار پاتے ہیں اور انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ان کا خاندان چونکہ مشرقی ایران کا رہنے والا تھالہذا ان کے اندر شعوبیت کے میلانات پائے جاتے تھے۔اپنے اسی شعوبی میلانات کی وجہ سے وہ قدیم ایران کی شان وشوکت اور عظمت کا ذکر اپنی شاعری میں جا بجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے بعض افکار وخیالات میں الحاد کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

بشار بن برد کی وفات 168ھ/784ء میں ہوئی۔متفقہ رائے کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی۔صفدی کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر 99 سال تھی، جبکہ ایک دوسرے قول کے مطابق وفات کے وقت وہ اپنی عمر کے ساتویں دہائی میں تھے۔مؤخر الذکر قول کی تردید خود ان کے اشعار سے ہوتی ہے:

وحسبک أني منذ ستين حجة   أكيد عفاريت العدى وأكاد

عہد عباسی کے دیگر شعرا کے مقابلہ میں بشار بن برد اس لحاظ سے ممتاز وبرتر قرار دیے جاسکتے ہیں کہ وہ قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقرر وخطیب، انشا پرداز اور ناقد بھی تھے لیکن بحیثیت شاعر انھیں زیادہ شہرت ومقبولیت ملی تھی۔وہ نہایت زود گو شاعر تھے۔خود ان کے اپنے قول کے مطابق انھوں نے 12 ہزار قصائد کہے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ سب کے سب محفوظ نہ رہ سکے۔چونکہ وہ نابینا تھا لہذا اپنا کلام پیش کرنے کے لیے انھیں راویوں پر اعتماد اور بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ان کے چار مشہور راوی بیان کیے جاتے ہیں جن میں خلف الاحمر کا نام بھی شامل ہے۔یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلف الاحمر نے بھی ان کا دیوان جمع کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جس کے نتیجہ میں ان کی شاعری کا اکثر حصہ ناپید ہوگیا۔

تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں مرتب کیے جانے والے شعری مجموعوں اور تراجم کی کتابوں میں ہی ان کے کلام کا ایک مختصر حصہ محفوظ ہوسکا ہے جیسے احمد بن طاہر طیفور کا مرتب کردہ انتخاب ''اختیار شعر بشار'' میں ان کی شاعری کا صرف ایک حصہ ہی محفوظ ہوسکا ہے۔فصاحت وبلاغت اور مضامین کے تنوع کے باوجود ان کے دیوان کا باقی ماندہ حصہ بھی کافی عرصہ تک غیر مطبوعہ رہا'اس کے علاوہ ''خالدیین'' کے منتخب کردہ ان کے دیوان کو 1935ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے استاد بدرالدین علوی نے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا تھا۔خالدیین کے منتخب کردہ دیوان کا نام ''المختار من شعر بشار'' ہے جس کی شرح اسمعیل بن احمد تجیبی نے لکھی ہے۔عصر حاضر میں جناب محمد طاہر بن عاشور نے ان کا دیوان مرتب کیا ہے جسے وزارۃ الثقافیۃ الجزائریۃ، جزائر نے 1607ء میں شائع کیا ہے۔

16.7.1.1 شاعری

بشار بن برد کی شاعری میں عہد اموی کے خاتمے اور عہد عباسی کے آغاز کے وقت پائے جانے والے شاعرانہ مذاق وماحول کے نمایاں اثرات ملتے ہیں کہ ایک طرف وہ قدیم شعرا کی تتبع کرتے ہوئے اپنے رسمی قصیدے کہتے ہیں جس میں تشبیب، گریز، مدح اور مقصد کے عناصر پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف وہ جدید ماحول اور حالات سے متاثر ہوتے ہوئے قدیم شعرا کے اسلوب کو خیرآباد کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور ایک نئے رنگ وآہنگ کے شاعر بن کر ابھرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ عہد عباسی کی جدید شاعری کے بانی اور مولدین شعرا کے امام قرار پاتے ہیں۔

دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط کی عبوری شاعری میں، بشار بن برد کی اہمیت اور مقام ومرتبہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے جہاں قدیم روایات دم توڑتی ہوئی اور جدید روایات منظر عام پر جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بشار بن برد کی نمایاں خصوصیت، بدوی عرب شاعروں کی وہ روایات ہیں جو انہیں ورثے میں ملی تھیں اور انھوں نے ایک زمانہ تک اس کی حفاظت اور پیروی بھی کی تھی لیکن ماحول وحالات کی تبدیلی سے متاثر ہوتے ہوئے انھوں نے دھیرے دھیرے ان روایات کو خیر آباد کہہ کر نئی روایات کی طرح رکھی جس کی وجہ سے انھیں عہد عباسی کے شعرا میں نہ صرف ایک نمایاں مقام ومرتبہ حاصل ہوا بلکہ انھیں عہد عباسی کی جدید شاعری کا بانی ومبانی بھی قرار دیا گیا۔

ان کی شاعری کے اہم موضوعات میں مدح، مرثیہ اور ہجو شامل ہیں تاہم بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ان کے مراثی نے انھیں شہرت دوام بخش دی ہے۔ بشار بن برد کی شاعری میں مختلف اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے خمریات کے موضوع پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان پر عاشقانہ رنگ زیادہ غالب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی حقیقی اور فرضی محبوباؤں کے ساتھ اپنے عشق کا ذکر بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری میں زبان وبیان کے استعمال میں کافی جرأت سے کام لیتے ہوئے انھیں اس طرح شعری قالب میں ڈھالا ہے کہ پڑھنے والا کافی لطف اندوز ہوتا ہے۔

بشار کے کلام میں بلند قسم کی فکری نظموں کے نمونے بھی ملتے ہیں جن میں وہ اپنے سوقیانہ پن سے پرہیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بسا اوقات بڑی بصیرت افروز باتوں کو شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں جو ان کی شاعری میں حکمت کے موتیوں کی طرح جابجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک طرف جہاں خواص میں ان کے اشعار کی دھوم مچی ہوئی تھی کہ متعدد ناقدین ادب - جیسے ابوعبیدہ، اصمعی، خلف الاحمر، جاحظ وغیرہ - نے انھیں اپنے عہد کا نمایاں ترین شاعر قرار دیا ہے وہیں عوام میں بھی خصوصا نوجوانوں اور عورتوں میں بہت زیادہ مقبول تھے اور میلوں ٹھیلوں میں ان کا قصائد ترنم کے ساتھ گا گا کر پڑھے جاتے تھے۔

بشار بن برد کے شاعرانہ کمالات اور عربی شاعری میں اس مقام ومرتبہ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد آنے والی نسل کے کئی ایک شعرا کو اپنے طرز بیان اور شاعرانہ اسلوب سے بہت زیادہ متاثر کیا تھا جن میں سے نمایاں طور پر ابونواس، ابوالعتاہیہ، عباس بن احنف اور سلم الخاسر کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔

16.7.2 ابونواس

ابونواس کا شمار عہد عباسی کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انھیں عظیم جاہلی شاعر امرؤ القیس کا مد مقابل قرار دیا جاتا ہے کہ جو مقام متقدمین شعرا (الشعراء المتقدمون) میں امرؤالقیس کو حاصل تھا وہی مقام ابونواس کا جدید شعرا (الشعراء المُحدَثون) کے درمیان تھا۔ اگر ان کا کوئی مد مقابل قرار دیا جاسکتا ہے وہ بشار بن برد ہیں۔ بعض مؤرخین ادب - جیسے کلثوم العتابی - نے انھیں امرؤالقیس سے بھی بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وہ عہد جاہلیت میں ہوتا تو اس کے مقابلہ میں کسی اور کو پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ابونواس کا نام حسن بن ہانی ہے۔ ان کی ولادت اہواز اور نشوونما بصرہ میں ہوئی تھی۔ ان کی تاریخ ولادت میں کافی اختلاف پایا جاتا

ہے۔مختلف کتابوں میں ان کی مختلف تاریخ پیدائش درج کی گئی ہیں جن کے مطابق ان کی پیدائش 130 تا 146ھ/ 747 تا 763ء کے درمیان ہوئی۔ان تاریخوں میں ڈاکٹر شوقی ضیف نے سنہ 139 ہجری کو راجح قرار دیا ہے تو پروفیسر محمد زغلول سلام کے مطابق سنہ 141 ہجری ارجح قول ہے۔احمد حسن زیات اور حنا فاخوری نے اس کی تاریخ پیدائش 145ھ 762ء قرار دی ہے تو الأعلام کے مؤلف زرکلی نے 146ھ/ 763ء نقل کی ہے۔تاریخ ولادت کی طرح ان کے والدین کے بارے میں متضاد اقوال ملتے ہیں۔ایک قول کے مطابق ان کے والد عربی النسل تھے اور والدہ فارسی النسل۔دوسرے قول کے مطابق ان کے والدین فارسی النسل تھے۔شوقی ضیف اور حنا فاخوری نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔

ابونواس کے والد کی وفات ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ کے بعد ہی ہوگئی تھی کہ ان کی والدہ جب اسے لے کر بصرہ منتقل ہوئیں تو وہ محض دو سال کے تھے۔بصرہ میں ہی وہ پروان چڑھے۔ان کی والدہ نے اپنی تمام تر پریشانیوں کے باوجود ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ابونواس کو بھی پڑھنے لکھنے کا شوق وذوق تھا لہذا وہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ مساجد میں لگنے والے علمی حلقات میں شریک ہونے لگا جہاں ان کی ذہانت وذکاوت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے استاد یعقوب حضرمی نے انھیں بصرہ کا سب سے بڑا عالم قرار دیا تھا (اذهب فأنت أقرأ أهل البصرة)۔

ابونواس میں شاعری کی فطری صلاحیت موجود تھی لہذا انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی مشق سخن کا آغاز کردیا تھا۔ضرورت معاش نے انھیں ایک کتاب کی دکان پر نوکری کرنے پر مجبور کردیا تھا۔اسی دکان پر اتفاق سے والبہ بن حباب کی اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی جس سے وہ خود بھی ملنے کا مشتاق تھا۔اس ملاقات میں والبہ نے ان کے اندر پوشیدہ جوہر کو بھانپ لیا تھا لہذا اس نے اسے اپنے ساتھ کوفہ چلنے کو کہا۔والبہ کی یہ پیشکش اس کے ذوق کے عین مطابق تھی۔اسے تو گویا اس کا گوہر مقصود مل گیا لہذا وہ فوراً تیار ہو گیا۔والبہ نے اس کے جوہر شاعری کو جلا بخش دی لیکن وہ اپنے استاد کی شخصیت کے بد اثرات سے بھی محفوظ نہ رہ سکا کہ ان میں جو بے راہ روی، بے دینی، مذہب کا مذاق اڑانے کی عادت اور دیگر بری عادتیں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب والبہ اور اس کے ہم نشینوں کی ہم نشینی کا نتیجہ ہیں۔

تکمیل علم اور شاعری کے ایک مقام ومرتبہ پر پہنچنے کے بعد وہ اس وقت کے ادبی مرکز بغداد کے لیے عازم سفر ہوئے۔انھیں اس بات کی امید تھی کہ وہ اپنے مدحیہ قصائد سے دربار خلافت میں ایک مقام حاصل کرلیں گے لیکن ان کی یہ امید کامل طور پر پوری نہ ہوسکی۔تاہم ہرثمہ بن اعین کی کوششوں سے ان کی رسائی ہارون رشید کے دربار میں ہوئی اور انھیں انعام واکرام سے بھی نوازا گیا لیکن ان کی بے راہ روی اور بے باکی ان کی ترقی کے لیے سب سے بڑا روڑا بن گئی کہ ہارون رشید نے بے راہ روی سے باز آنے کے لیے انھیں بار بار تنبیہ کی حتی کہ قید خانہ میں بھی ڈال دیا لیکن وہ اپنی عادتوں سے باز نہیں آئے۔ہارون رشید انھیں بار بار سزا دیتے تھے اور وہ بار بار معافی کا طلب گار ہوتے تھے۔ہارون رشید انھیں اس امید پر معاف کردیتے کہ شاید وہ سدھر جائے لیکن وہ موقع ملتے ہی اپنی سابقہ روش اختیار کرلیتے تھے۔

ہارون رشید کے دربار سے زیادہ پذیرائی انھیں آل برامکہ کے یہاں ملی۔ان کی ہی کوششوں سے ہارون رشید انھیں بار بار معاف کردیا کرتے تھے لیکن جب آل برامکہ پر زوال آیا تو انھیں بھی بغداد چھوڑنا پڑا۔بغداد سے نکل کر انھوں نے فسطاط (مصر) میں قیام کیا اور محکمہ خراج کے نگراں خطیب بن عبدالحمید کی شان میں مدحیہ قصائد کہے اور انعامات واعزازات کے مستحق قرار پائے لیکن بے حیائی کے میلان نے انھیں وہاں بے چین کررکھا تھا لہذا جلد ہی وہ بغداد لوٹ آئے۔جب وہ بغداد پہنچے تو خلیفہ ہارون رشید کا انتقال ہو چکا تھا اور خلافت کا تاج الأمین کے

سر پر سجا ہوا تھا۔انھوں نے الامین کی مدح سرائی کی ۔ الامین کو اس کی ادا بھا گئی اور وہ نے انھیں اپنا ہم پیالہ وہم نوالہ بنا لیا۔ یہ زمانہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ آرام وآشائس کا زمانہ تھا اور وہ اپنی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔

ابونواس کی تاریخ وفات میں تاریخ ولادت کی طرح کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔راجح قول کے مطابق ان کی وفات 198ھ/ 813ء یا199ھ814ء میں ہوئی تھی۔اس سے قبل ذکر کی جانے والی تمام تاریخیں غیر مستند قرار دی جاتی ہیں کہ اس کے دیوان میں عباسی خلیفہ امین کا مرثیہ بھی شامل ہے جن کی وفات198ھ میں ہوئی تھی ۔خلیفہ امین کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ابونواس کی وفات ہوئی تھی۔

16.7.2.1 شاعری

ابونواس کی شاعری عہد عباسی کی سماجی ،سیاسی اور تہذیبی وثقافتی حالات وواقعات کی منھ بولتی تصویر ہے۔ان کی شاعری میں گویا عصر عباسی کا سماج چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے جنھوں نے عربی شاعری کے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ان کا کلام فصاحت وبلاغت سے بھر پور ہوتا تھا،الفاظ اور ان کے نت نئے معانی پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا،ان کے کلام میں عیوب ونقائص کا تقریبا فقدان پایا جاتا تھا۔

ابونواس کی شاعری کے امتیازات میں سے ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے عربی شاعری کو بدوی خدوخال سے نکال کر ''شہری'' قالب میں پیش کیا۔ان کی شاعری کے فضل کا اعتراف کرتے ہوئے جاحظ نے لکھا ہے کہ مجھے ان سے زیادہ لغت کے بارے میں جاننے والا نہیں ملا اور نہ ہی میں ان سے زیادہ فصیح شخص سے واقف ہوں۔امام شافعی علیہ الرحمہ بھی ان کے علم وفضل کا اعتراف کرنے والوں میں شامل ہیں۔امام شافعی علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ اگر ابونواس میں بے حیائی نہ ہوتی تو میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر لیتا۔

ابونواس نے عربی شاعری کی تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شاعری کا سب نمایاں پہلو ''**الخمريات**''(وصف شراب) ہے۔شراب کے وصف میں انھیں کمال ومہارت حاصل تھی۔اسی کمال ومہارت کی بدولت عربی شاعری کے اصناف وانواع میں ایک نئی صنف''خمریات'' کا اضافہ ممکن ہوسکا۔خمریات میں ان کے ماہرانہ اسلوب بیان کا اندازہ اس مثل سے کیا جاسکتا ہے ''**لو سمعه الحسنان لهاجرا إليها وعكفا عليها**''۔

ان کی شاعری کا دوسرا اہم پہلو ''**غزل الغلمان**''(امرد پرستی) ہے۔ابونواس کو اس صنف سخن کا بھی بانی قرار دیا جاتا ہے۔ابونواس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک عورت سے محبت کی تھی۔امرد پرستی کے موضوع پر کہے جانے والے اشعار میں وہ اپنی دل لگی کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔اس صنف نے جہاں ایک طرف غلط روایات کی بنیاد رکھی وہیں دوسری طرف اس سے ابونواس کی قادر الکلامی کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

ان کی شاعری کا تیسرا اہم پہلو''**الطرديات**''(شکاریات) ہے۔شکاریات ان کے دیوان کا ایک حصہ ہے۔عربی شاعری میں اس صنف کو سب سے پہلے متعارف کرانے والے ابونواس ہی ہیں۔اس صنف سخن میں وہ شکاری کتوں،بازوں اور گھوڑوں کے ذکر ساتھ ساتھ ان جانوروں کا ذکر بھی کرتے ہیں جن کا اس زمانہ میں شکار کیا جاتا تھا۔انھوں نے اپنے اشعار میں شکاریات کی جزئیات تک کو بہت ہی عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کی اہمیت تشبیہات کی وجہ سے دوچند ہوجاتی ہے۔

ان کی شاعری کا چوتھا اہم پہلو "الزھدیات" (زاہدانہ شاعری) ہے۔ زندگی کے آخری حصہ میں انھوں نے اس بات کو بہت شدت سے محسوس کیا کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی فسق وفجور، معصیت اور شعائر اسلام کا مذاق اڑانے میں گذاردی۔اس احساس نے ان کے اندر ایک شرمندگی سی پیدا کردی اور وہ اپنے رب سے توبہ کرنے اور اس کی طرف متوجہ ہوکر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے پر مجبور ہو گئے۔انھوں نے اپنے حال دل کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیا جسے بعد میں ''زہدیات'' سے موسوم کردیا گیا۔ چونکہ صنف زہدیات کا بانی ابوالعتاہیہ کو قرار دیا جاتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر شاعری کے عمدہ نمونے چھوڑے ہیں۔اردو دائرۃ المعارف کی روایت کے مطابق جب ابونواس نے اس صنف سخن پر طبع آزمائی کرنے کا آغاز کیا تو ابوالعتاہیہ کو غالبا ایسا محسوس ہوا کہ اس کی برتری ختم ہوجائے گی لہذا اس نے ابونواس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس میدان میں طبع آزمائی نہ کرے لیکن انھوں نے ابوالعتاہیہ کی بات نہیں مانی اور اس صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے حتی کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک خاطرخواہ سرمایہ بطور یادگار چھوڑ دیا۔

16.7.3 ابوالعتاہیہ

ابوالعتاہیہ کا شمار عہد عباسی کے زودگوشعرا میں ہوتا ہے۔ان کا پورا نام ابواسحاق اسماعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان ہے لیکن متعدد شعرا کی طرح وہ بھی اپنی کنیت سے ہی مشہور ومعروف ہے۔ان کی ولادت 130ھ/ 847ء میں بمقام کوفہ- ایک قول کے مطابق عین التمر - میں ہوئی۔ان کے خاندان اور حالات زندگی کے متعلق معلومات نہ کے برابر ملتی ہے۔ان کا خاندان قبیلہ عنزہ بن ربیعہ کا موالی تھا اور حقیر اور معمولی خدمات انجام دیا کرتا تھا۔ابوالعتاہیہ نے اپنی نوجوانی کا آغاز گلی کوچوں میں مٹی کے برتن فروخت کرتے ہوئے کیا تھا جس کی وجہ سے ان کے دل میں زندگی کے تعلق سے بڑی تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ارباب حکومت کے خلاف ان کے دل میں کافی نفرت پائی جاتی ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا کیا ہے۔

ان کی جوانی کے ابتدائی ایام والبہ بن حباب کے اردگرد رہنے والے آوارہ گرد اور آوارہ مزاج شعرا کی صحبت میں گزرے تھے۔اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی غزلیات اور زہدیات کی وجہ سے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ان کی شہرت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب انھوں نے خلیفہ مہدی کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ غیر رسمی انداز میں تھا۔اس کے باوجود خلیفہ کو پسند آیا تھا اور انھوں نے اسے اپنے مقربین میں شامل کرلیا تاہم وہ جلد ہی ان کی نظروں میں معتوب بھی ہوگئے کہ انھوں نے عنزہ نامی کنیز سے اپنی محبت اور التفات کا اظہار برسر عام کرنا شروع کردیا لیکن اسے اپنی طرف ملتفت کرنے میں ناکام رہے۔انھوں نے اپنی محبت میں ناکامی کا ذمہ دار خلیفہ مہدی کو ٹھہرایا جس کی وجہ سے خلیفہ نے انھیں سزا دینے کے ساتھ ساتھ جلاوطن بھی کردیا تھا۔ان کی جلاوطنی خلیفہ مہدی کی وفات تک جاری رہی۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ بغداد واپس آئے اور خلیفہ کی مبالغہ آمیز انداز میں مدح کرنی شروع کردی جس کی وجہ سے ہارون رشید ان سے ناراض ہوگئے اور ان کے دوست ابراہیم موصلی کے ساتھ قید میں ڈال دیا لیکن بعد میں اپنے غزلیہ کلام سے انھوں نے خلیفہ کا دل موہ لیا اور ان کے مقربین میں شامل ہوگئے۔ابوالعتاہیہ نے جب غزلیہ کلام چھوڑ کر زہدیہ شاعری کا آغاز کیا تو خلیفہ کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی اور انھیں دوبارہ قید میں ڈال دیا لیکن فضل بن ربیع کی سفارش پر انھیں چھوڑ دیا۔

ابوالعتاہیہ ایک زودگو شاعر تھا جس کی وجہ سے ان کا مکمل دیوان مرتب نہ ہوسکا تاہم ابن عبدالبر نے ان کے زاہدانہ اشعار کو مدون

ومرتب کردیا تھا۔

ابوالعتاہیہ کی وفات کے تعلق سے مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔مشہور قول کے مطابق ان کی وفات 210ھ/825ء میں ہوئی تھی۔دیگر تاریخوں میں 211ھ/826ء، 166ھ، 213ھ/ بیان کی جاتی ہیں۔مؤخرالذکر روایت کی تائید ابوالعتاہیہ کے دوست مخارق کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

16.7.3.1 شاعری

ابوالعتاہیہ میں بشار بن برد کی طرح شاعری کی خداداد صلاحیت تھی تاہم افلاس اور معاشی تنگی کی وجہ انھیں اس بات کا موقعہ نہیں ملا کہ وہ متقدمین کی شاعری اور لسانیات کا درس لیتا۔ان کی یہ محرومی ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی تازگی کا سبب بن گئی تھی۔وہ شاعری کو کسب معاش کا ذریعہ سمجھتے تھے جس کے ذریعہ خوشحالی اور آسودگی حاصل کی جاسکتی تھی۔انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزلیہ شاعری سے کیا اور کافی شہرت حاصل کر لی۔عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے غزلیہ شاعری چھوڑ کر زہدیہ شاعری کا آغاز کردیا اور اس میدان میں اس قدر نام پیدا کرلیا کہ جب بھی زہدیہ شاعری کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس میں سب سے پہلے انھیں کا نام لیا جاتا ہے۔ان کی شاعری کا یہ رنگ عربی شاعری میں ایک نئی صنف کے آغاز کا سبب بن گیا جسے عربی شاعری کی تاریخ میں ''زہدیات'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔تاہم ان کے زاہدانہ اشعار کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے زاہدانہ اشعار بناوٹی ہیں جن میں خلوص کی مقدار کم پائی جاتی ہے۔

اردو دائرۃ المعارف کے مقالہ نگار کے بقول ''بحیثیت شاعر ابوالعتاہیہ کی حیرت انگیز کامیابی کا راز ان کی زبان کی سادگی، قادر الکلام سہولت ادا اور بے ساختہ گوئی میں مضمر ہے''۔وہ عام طور سے اپنے قصیدوں میں سادہ زبان اور چھوٹی چھوٹی بحروں کا استعمال کیا کرتے تھے۔خوش قسمتی سے انھیں اس عہد کے مشہور موسیقی کار ابراہیم موصلی کی صحبت نصیب ہوئی جنھوں نے ان کے اشعار کو موسیقی کے سانچے میں ڈھال دیا جس کی وجہ سے ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

16.7.4 ابوتمام

عہد عباسی کے مشہور شعرا میں ابوتمام کا شمار بھی کیا جاتا ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھیں ان کی شاعری کی بجائے ان کے مرتب کردہ منتخب اشعار نے شہرت دوام بخشی تھی جسے دنیائے ادب میں "کتاب الحماسة" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ابوتمام کا پورا نام حبیب بن اوس طائی ہے۔ان کی ولادت دمشق اور طبریہ کے درمیان واقع ایک قصبہ ''جاسم'' میں ہوئی۔ان کی تاریخ ولادت میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کے بیٹے تمام کی روایت کے مطابق ان کی ولادت 188ھ/804ء میں ہوئی تھی۔دوسری روایت کے مطابق جو خود ابوتمام سے ماخوذ ہے،ان کی ولادت 190ھ/806ء میں ہوئی تھی۔

ابوتمام اپنا سلسلۂ نسب قبیلہ طی سے جوڑتے ہیں جب کہ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ طی سے نہیں تھا بلکہ انھوں نے مذکورہ قبیلہ سے اپنا حسب ونسب ثابت کرنے کے لیے جھوٹا نسب نامہ گھڑا تھا جس کی وجہ سے متعدد ہجویہ قصائد میں ان کا مذاق اڑایا گیا تھا، تاہم یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے کہ ان کا تعلق اس قبیلہ سے تھا کہ نہیں۔ مصادر عربی ادب میں انھیں قبیلہ طی کی طرف منسوب کرتے ہوئے

”الطائي“ اور”الطائی الأكبر“ کہا گیا ہے۔اسی طرح ان پر اس بات کا الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ان کے والد مسلمان نہیں بلکہ عیسائی تھے جن کا نام ثادوس یا تدوس تھا اور وہ دمشق میں ایک شراب کی دوکان کے مالک تھے۔ بعد ازیں ابوتمام نے ان کا نام اوس رکھ دیا تھا۔اس حوالہ سے بھی مؤرخین ادب عربی ابھی تک کسی حتمی رائے پر نہیں پہنچے ہیں۔

ابوتمام کی ابتدائی زندگی کے متعلق معلومات نہ کے برابر ملتی ہیں۔مروجہ معلومات کے مطابق وہ کسی وقت دمشق سے مصر منتقل ہو گئے تھے اور جامع عمرو بن عاص میں سقہ گیری کرنے لگے تھے۔اس مسجد میں سقائی کا انھیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ وہاں کے علمی و ادبی حلقوں سے مستفیض ہوتے رہے حتی کہ وہ خود بھی ایک عالم اور شاعر بن گئے۔ایک روایت کے مطابق انھوں نے سب سے پہلے مصر کے ایک بڑے عہدہ دار۔محصل۔عیاش بن لہیعہ کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا تھا مگر انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور انھیں خالی ہاتھ لوٹنا پڑا نتیجتاً انھوں نے اس کی شان میں ایک ہجویہ قصیدہ لکھ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔

مصر میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد انھوں نے شام میں اپنی قسمت کو آزمایا لیکن یہاں بھی انھیں مایوسی ہی ہاتھ لگی۔شام میں انھوں نے سب سے پہلے ابوالمغیث موسی بن ابراہیم رافقی کی شان میں مدحیہ قصائد کہے لیکن اس کی جانب سے سردمہری اور عدم التفات کی وجہ سے حسب معمول اس کی شان میں بھی ہجویہ قصائد کہے۔اس کے بعد انھوں نے مامون کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن قسمت ان پر ابھی تک مہربان نہیں ہوئی تھی لہذا اس دربار سے بھی انھیں بے نیل ومرام واپس آنا پڑا۔ مامون کے دربار میں ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے بدوی لباس پہن کر اپنا قصیدہ پڑھا تھا۔خلیفہ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ ایک دیہاتی ،شہری طرز پر قصیدہ کہے۔

ابوتمام کا نصیب خلیفہ معتصم کے عہد میں جاگتا ہے کہ انھیں کے عہد میں ابوتمام کو قبول تام اور شہرت وعزت ملی تھی۔خلیفہ معتصم کے دربار میں وہ قاضی القضاۃ احمد بن داؤد کے توسط سے پہنچے تھے۔خلیفہ وقت نے اپنے دربار میں رسائی کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی خوش الحان روای یا قاری بھی ہو کیونکہ ابوتمام کی آواز بہت کرخت تھی جو سننے والوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔

خلیفہ معتصم کے دربار سے وابستگی کے بعد ان کی عزت وشہرت کا دور شروع ہوتا ہے حتی کہ وہ اس عہد کے سب سے نامور قصیدہ گو شاعر قرار پاتے ہیں۔انھوں نے خلیفہ معتصم کے علاوہ دیگر اکابر امرا، رؤسا اور حکما جیسے قاضی القضاۃ احمد بن داؤد، خلیفہ معتصم کے سپہ سالا ابوسعید محمد بن یوسف مروزی، ان کا بیٹا یوسف، ابو دُلف قاسم عجلی، بغداد کے کوتوال اسحاق بن ابراہیم مصعبی اور حسن بن وہب وغیرہ کی شان میں بھی قصائد کہے تھے۔

ابوتمام کے حوالہ سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ امرا اور والیان حکومت کی شان میں قصائد کہنے کے لیے ان کے صوبوں کا سفر کرتے تھے۔ان اسفار میں سے مشہور سفر، سفر نیشاپور ہے جہاں کے والی کا نام عبداللہ بن طاہر تھا۔انعام واکرام کے حوالہ سے والی نیشاپور ابوتمام کے معیار پر کھرا نہ اتر سکا اور نہ ہی وہاں کا سرد موسم انھیں راس آیا لہذا انھوں نے بہت جلد وہاں سے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا لیکن شدید برفباری کی وجہ سے انھیں ہمدان میں رکنا پڑا۔ارشاد خداوندی کے مطابق ہر شر میں خیر کا پہلو شامل رہتا ہے لہذا وہاں ان کا رکنا جو ان کے لیے شدید کوفت کا باعث تھا، دائمی شہرت کا سبب بن گیا اور وہ عمدہ ترین مجموعہ انتخاب منظر عام پر آیا جو علمی وادبی دنیا میں ”کتاب الحماسة“ کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ كتاب الحماسة ابوتمام کا وہ لازوال کارنامہ ہے جس نے انھیں شہرت دوام بخش دی ہے۔اس

انتخاب کی عمدگی اور خوبصورتی پر تمام ناقدین ومؤرخین ادب متفق ہیں۔ اس انتخاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ابوتمام کے شاعرانہ کمالات وامتیازات کو پس پشت ڈال دیا کہ جب کبھی بھی ابوتمام کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں جو خیال سب سے پہلے ابھرتا ہے وہ ان کی شاعری کے بجائے ان کے انتخاب کا ہوتا ہے۔

کتاب الحماسة کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر مجموعۂ انتخاب مرتب کیا تھا جن میں **کتاب الحماسة الصغرى** یا **کتاب الوحشيات** اور **اختيار الشعراء الفحول** وغیرہ شامل ہیں لیکن انھیں **کتاب الحماسة** کی طرح شہرت نصیب نہ ہوسکی۔

ابوتمام کی وفات 231ھ/ 845ء میں ہوئی تھی جب کہ دیگر مؤرخین کے نزدیک ان کی وفات 2 محرم 232ھ/ 29 اگست 846ء میں ہوئی تھی۔

16.7.4.1 شاعری

ابوتمام کا شمار عصر عباسی کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے تاہم ان کی شاعری اور اس کے معیار ومرتبہ کے متعلق ناقدین ادب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابوتمام کا شمار بھی ان چند عرب شعرا میں ہوتا ہے جن کے کلام کی قدر وقیمت اور معیار ومرتبہ کے تعین کا آغاز ان کی زندگی میں ہی کیا جاچکا تھا جس کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد مدتوں تک چلتا رہا۔ ایک گروپ کے مطابق ان کی شاعری کا اکثر حصہ غیر معیاری ہے۔عصر عباسی کے ہی ایک شاعر دعبل کے مطابق ابوتمام کے کلام کا ایک تہائی حصہ سرقہ پر مبنی ہے، ایک تہائی حصہ خراب ہے اور ایک تہائی حصہ اچھا ہے۔اس رائے کے بالمقابل ان کے شاگرد رشید بحتری کی رائے یہ ہے کہ استاد کا بہترین کلام شاگرد کے بہترین کلام سے بہتر، اور شاگرد کا برا کلام، استاد کے برے کلام سے بدتر ہے۔

ابوتمام کے مداحین میں بحتری (م 284ھ/ 898-897ء)، علی بن جہم (م 249ھ)، ابوبکر محمد صُولی مؤلف "**أخبار أبي تمام**"، مَرزُوقی (م 421ھ) اور شریف مرتضی جیسے افراد شامل ہیں تو ان کے مخالفین اور ناقدین کی فہرست میں دعبل، احمد بن عبیداللہ قطربلی اور مَرزُبانی (م 384ء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان دونوں گروپ کے مقابل ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے ابوتمام کی شاعری کا معروضی انداز میں مطالعہ کیا ہے اور اس کے محاسن ومعائب کو اجاگر کیا ہے۔اس گروپ میں مشہور ناقد آمدی (وفات 381ھ) کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا موضوع اور محور ابوتمام کی شاعری کو بنایا تھا اور اپنے مطالعہ کا حاصل "**الموازنة بين الطائيين أبي تمام والبحترى**" کے نام سے پیش کیا تھا۔ آمدی کے علاوہ قاضی ابوالحسن علی جرجانی (م 366ھ/ 977-976ء) نے بھی اپنی کتاب "**الوساطة بين المتنبي وخصومه**" میں ابوتمام کی شاعری کے محاسن ومعائب بیان کیے ہیں۔

ابوتمام کا شمار مبدعین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں صنائع شعری کا وافر حصہ پایا جاتا ہے جسے ان کی شاعری کا بنیادی وصف بھی قرار دیا جاتا ہے اور اسی پر ان کی شہرت مبنی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ افکار وآرا کو پیش کرکے اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی تھی جس سے اس وقت تک کی عربی شاعری کا دامن خالی تھا۔ سید احتشام احمد ندوی نے ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: "ابوتمام کے یہاں یونانی فلسفہ کی عظمت اور گہرائی ہے، فکر کی بلندی ہے، تخیل کی رعنائی ہے مگر یہ کیفیت بحتری کے یہاں مفقود ہے۔ پہلی بار ابوتمام نے شاعری کو فلسفے سے رنگین بنایا ہے، اس کے نئے نئے آفاق دکھائے ہیں۔ ابوتمام نے

عربی شاعری کے بدویانہ انداز کو چھوڑ دیا ہے اور اپنا نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔اس نے فلسفے کے ذریعہ شاعری میں گہرائی پیدا کی ہے جس سے عربی شاعری کا دامن خالی تھا''۔

ابوتمام کی شاعری کی اہمیت وقدر وقیمت کا اندازہ ان کے دیوان کی ترتیب وتدوین سے کیا جاسکتا ہے کہ صولی نے ان کے دیوان کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا تو علی بن حمزہ اصفہانی نے اسے مضامین وموضوعات کے لحاظ سے مرتب کیا تھا۔ان دونوں کے علاوہ دیگر افراد- جیسے سُکری - نے بھی اس کے اشعار کی روایت کی ہے۔

ابوتمام کی شاعری کس قدر پیچیدہ اور مشکل تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دیوان کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں جن کا ذکر حاجی خلیفہ اور اسماعیل پاشا نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے جیسے صولی، مرزوقی، تبریزی اور مُستَوفی وغیرہ کی شرحیں جن میں سے کچھ طبع ہوچکی ہیں اور کچھ ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

16.7.5 بحتری

بحتری کا پورا نام ابوعبیدہ ولید بن عبیداللہ طائی ہے لیکن شعر وادب کی دنیا میں وہ صرف بحتری کے نام سے مشہور ومعروف ہیں۔اس نسبت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ بنوطی کی ایک شاخ ''خانوادۂ بحتر'' سے تھا۔پروفیسر سید احتشام احمد کے قول کے مطابق بحتر ان کے دادا کا نام ہے۔اسی نسبت سے وہ بحتری کہلاتے ہیں۔ان کی پیدائش 166ھ/ 821ء میں بمقام مَنْبج میں ہوئی تھی۔بعض روایات کے مطابق ان کی پیدائش حُرْدُفنہ کے نواح میں ہوئی تھی۔

بحتری کی ابتدائی زندگی پردۂ خفا میں ملفوف ہے۔مصادر سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی سرزمین اور قبیلہ سے رشتہ کو ہمیشہ برقرار رکھا اور اسے کبھی بھی ٹوٹنے نہیں دیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی مدحیہ شاعری کا محور ومرکز ان کا اپنا قبیلہ تھا۔قبیلہ کی مدحیہ شاعری کا دور 226-223ھ/ 841-838ء پر یعنی تقریبا تین سال پر محیط ہے۔قبیلہ کی تعریف وتوصیف کے دوران ہی اسے اپنا اولین مربی -ابوسعید یوسف بن محمد معروف بہ ثغری- ملا جو اتفاق سے ایک طائی سپہ سالار تھا۔اسی کے گھر پر اس کی ملاقات ابوتمام سے ہوئی اور وہ ان کی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو بھانپ کر انھیں مزید اجاگر کرنے میں مصروف ہوگیا۔ابوتمام کی سفارش پر ہی معرۃ النعمان کے مشاہیر نے انھیں اپنا ثنا خواں بنایا تھا اور چار ہزار درہم اس کا وظیفہ مقرر کیا تھا لیکن اس عہد کی شاعری کا کوئی بھی حصہ سوئے اتفاق سے محفوظ نہ رہ سکا۔

معرۃ النعمان کے مشاہیر کے بعد ابوتمام کی ہی کوششوں سے انھیں عراق کے والی مالک بن طوق کے دربار میں رسائی ملی، وہاں سے وہ اپنے استاد کی معیت میں بغداد پہنچے جہاں انھوں نے مشاہیر فضلا خصوصا ابن الاعرابی کے حلقۂ درس سے کسب فیض کیا۔ساتھ ہی ساتھ دربار خلافت میں حاضری کے آداب سیکھنے پر بھی اپنی توجہ مبذول کی تاکہ وہاں تک رسائی آسان ہوسکے۔دربار خلافت میں باریابی کے لیے انھوں نے عباسی امرا اور اصحاب اثر ورسوخ کی مدح سرائی کی لیکن اپنی کوششوں کے باوجود وہ دربار خلافت میں براہ راست باریابی حاصل نہ کرسکے۔ جن عباسی امرا اور اصحاب اثر ورسوخ کی شان میں انھوں نے مدحیہ قصائد لکھے تھے ان میں ابن زیات اور ابونہشل قابل ذکر ہیں۔اول الذکر کے دربار میں جب انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی تو وہ مؤخر الذکر کی مدح سرائی میں مصروف ہوگئے۔یہ اتفاق کی بات ہے کہ ابونہشل کے خاندان ''بنوحُمَید'' کا تعلق قبیلہ بنوطی سے ہی تھا۔ابونہشل کی مدح خوانی کے بعد انھوں نے بغداد سے 230ھ/ 844ء میں رخت سفر باندھ لیا اور

موصل جا پہنچے اور اپنے اولیں مربی سپہ سالار ثغری کے دربار سے دوبارہ وابستہ ہوگئے جو اس وقت موصل میں قیام پذیر تھے۔

خلیفہ متوکل کے مسند خلافت پر براجمان ہونے کے بعد وہ دوبارہ بغداد جا پہنچتے ہیں اور ابن نجم کی سفارش پر ان کی رسائی فتح بن خاقان کے دربار میں ہوجاتی ہے اور فتح بن خاقان کی سفارش پر انھیں دربار خلافت میں باریابی کا شرف حاصل ہوجاتا ہے اور ان کی زندگی کے سب سے تابناک اور خوش گوار دور کا آغاز ہوتا ہے۔ دربار خلافت سے منسلک رہتے ہوئے بحتری نے مختلف امرا اور عمائدین سلطنت کی شان میں مدحیہ قصائد کہے ہیں تاہم ان کے اوقات کا معتد بہ حصہ دربار خلافت میں ہی گذرتا تھا۔ انھوں نے جن امرا کی مدح سرائی کی ہے ان میں سب سے نمایاں نام وزیر فتح بن خاقان کا ہے۔ ان کے طویل تعلقات میں کبھی کبھی سرد مہری آجاتی تھی تاہم مجموعی طور پر ان کے تعلقات بہت بہتر رہے اور انھوں نے فتح بن خاقان کی شاعری میں کئی ایک مدحیہ قصائد کہے۔ ان دونوں کے بہتر اور خوشگوار تعلقات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بحتری نے اپنے منتخب کردہ مجموعہ اشعار ''**كتاب الحماسة**'' کو فتح بن خاقان کے نام معنون کیا تھا۔ فتح بن خاقان کے علاوہ انھوں نے دوسرے وزیر احمد بن خصیب کی شان میں بھی مدحیہ قصائد کہے ہیں لیکن ان کی افتاد طبع کے پیش نظر ان پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انہیں کے اکسانے پر خلیفہ مستعین باللہ نے اسے قتل کرادیا تھا۔

بحتری کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو وقت کے حساب سے اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں اور خلفا کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا اولیں فرض منصبی سمجھتے ہیں چاہے وہ ان کے ذاتی افکار وخیالات سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔ اس خصوصیت کی بنا پر بحتری کو دربار خلافت میں کافی اثر ورسوخ حاصل تھا اور خلفا کے ساتھ ان کے تعلقات نہ صرف بے تکلفانہ تھے بلکہ انھیں اس پر کافی اعتماد بھی تھا۔ وہ ہر حال میں سرکاری حکمت عملی کی تائید کرتے تھے جس کی وجہ سے خلفا کی نگاہوں میں ان کا مقام ومرتبہ بہت زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ سرکاری پالیسی کی وہ ہر حال میں تائید کرتے تھے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کا ذہنی میلان اور رجحان شیعیت کی طرف تھا لیکن اپنے فطری میلانات ورجحانات کو ایک طرف رکھتے ہوئے وہ زندگی بھر عباسیوں کے فضائل اور ان کے حقوق کا برملا اور برسر عام اعلان کرتے رہے۔

دربار خلافت سے اس طویل وابستگی کے زمانے میں کبھی کبھار عدم وابستگی کا وقفہ بھی آتا رہا ہے لیکن اس کی مدت بہت تھوڑی اور مقدار بہت کم ہے۔ اس طویل مدت میں ان پر کئی ایک الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ متوکل علی اللہ اور ان کے وزیر فتح بن خاقان کے قتل میں کسی نہ کسی حد تک ان کا بھی ہاتھ تھا اور اسی وجہ سے وہ ان کے قتل کے بعد اپنے وطن منبج میں جا بسے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ خلیفہ متوکل علی اللہ کے جانشین خلیفہ مستنصر باللہ کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر دربار خلافت میں اپنی دوبارہ آمد کا اندارج کچھ اس طرح سے کراتے ہیں کہ ان پر عائد کردہ الزام بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔

دربار خلافت سے وابستگی کے خاتمہ کے بعد انھوں نے بغداد کو خیرآباد کہہ دیا اور کچھ عرصہ تک وہ خُمارَوَیہ بن طولون کے دربار سے منسلک رہے لیکن زندگی کے آخری مراحل میں وطن کی محبت اور کشش نے انھیں ایک بار پھر منبج کو مسکن بنانے اور قیام پذیر ہونے پر کچھ اس طرح ابھارا کہ وہ امرا وحکمرانوں کے درباروں کو چھوڑ کر وہاں جا بسے اور زندگی کی آخری سانس تک وہیں قیام پذیر رہے یہاں تک کہ سنہ 284ھ/ 898-897ء میں ایک طویل بیماری کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔ بحتری کے دیوان کی ایک شرح عہد عباسی کے مشہور شاعر ابوالعلا

معری نے ''عبث الولید'' کے نام سے لکھی تھی۔

بحتری نے اپنے دیوان کے علاوہ دیگر علمی وادبی سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے جیسے انھوں نے بھی اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے نہ صرف منتخب اشعار کا مجموعہ تیار کیا تھا بلکہ اس کا نام بھی ''كتاب الحماسة'' ہی رکھا تھا لیکن اسے وہ شہرت ومقبولیت نہ مل سکی جو ابوتمام کی ''كتاب الحماسة'' کو ملی تھی۔ بحتری نے اپنی ''كتاب الحماسة'' میں اشعار کو ان کے مطالب کے اعتبار سے مرتب کیا تھا جب کہ ابوتمام نے اپنی ''كتاب الحماسة'' کو اصناف کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔ غالباً اس کی عدم مقبولیت کا ایک سبب اس کی ترتیب بھی ہے۔

''كتاب الحماسة'' کے علاوہ بحتری کی جانب ایک اور کتاب ''معانی الشعر'' یا ''معانی الشعراء'' کو منسوب کیا جاتا ہے جو زمانہ کے دست وبرد کا شکار ہو چکی ہے۔

16.7.5.1 شاعری

بحتری کا شمار عصر عباسی کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ان کی شاعری کے امتیازات وخصوصیات کا ذکر کیا جائے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابوتمام کی طرح بحتری کو بھی اس لحاظ سے خوش قسمت شاعر قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کی قدر وقیمت کا تعین اور اس کا مطالعہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ یہ مطالعہ ان دونوں کے مابین موازنہ پر مشتمل ہے گویا استاد اور شاگرد دونوں اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کی شاعری کے مطالعہ کا آغاز ان کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے مقام ومرتبہ کے تعین میں ناقدین ادب کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جس کی کسی قدر تفصیل ابوتمام کے ترجمہ میں بیان کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف اس بات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استاد وشاگرد کے مقام ومرتبہ کو عصر عباسی کے مشہور ناقدین جیسے آمدی (وفات 381ھ) اور قاضی ابوالحسن علی جرجانی (وفات 366ھ/ 977-976ء) نے بالترتیب اپنی اپنی کتابوں میں ''الموازنة بين الطائيين أبي تمام والبحتري'' اور ''الوساطة بين المتنبي وخصومه'' ان کی شاعری کے محاسن ومعائب بیان کیا ہے۔

بحتری کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں۔ اولین دور میں وہ صرف فخریہ شاعری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن جونہی دربار خلافت/ دربار امرا وعمائدین سلطنت سے منسلک ہوتے ہیں ان کی شاعری قصیدہ خوانی پر سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے مدحیہ قصائد کو قدیم عرب شعرا کی پیروی اور تتبع کرتے ہوئے انھیں تشبیب سے گریز کرتے ہوئے اصل موضوع میں تقسیم کیا ہے۔ تاہم انھوں نے اپنے آخری زمانہ کی شاعری میں اس اسلوب کو ترک کر دیا تھا اور وہ اپنے ممدوحین کی رسمی تصویریں کھینچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے قصائد کی ایک خاص بات محلات شاہی کے اوصاف وخصوصیات کو الفاظ کے قالب میں پیش کرنا ہے جس کی وجہ سے ان کے قصائد کے اسلوب بیان میں ایک خاص قسم کا نکھار اور زور پیدا ہو گیا ہے۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف اس کا بنیادی سبب شاعرانہ تصویر کشی اور جزئیات کا وہ نفیس شعور ہے جس میں بحتری کا کوئی حریف نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کے وصف میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی ہے لیکن سہل اور سادہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے وہ اپنے اشعار میں ایک ترنم اور آہنگ پیدا کر دیتے ہیں جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔

مدح اور وصف کے علاوہ عربی شاعری کے دیگر اصناف سخن میں سے انھوں نے مرثیہ اور ہجو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیہ میں بھی

انھیں کمال حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین شعرا کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں لیکن ہجو کے میدان میں انھیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں ہے کہ ہجو یہ اشعار، ان کی مدح کا ایک ضمنی حصہ ہوتے تھے۔ان کے ہجو یہ اشعار ان شخصیات کے متعلق ہیں جنھوں نے ان کی ناقدری کرتے ہوئے انھیں انعامات واکرامات سے نہیں نوازا تھا۔غالباً اسی وجہ سے بستر مرگ پر انھوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کی تھی کہ ان کے دیوان سے ہجو یہ اشعار کو نکال دیا جائے۔

16.7.6 متنبی

عصر عباسی کے چند نمایاں ترین شعرا میں متنبی کا شمار ہوتا ہے۔عربی شاعری میں متنبی کو وہی مقام ومرتبہ حاصل ہے جو اردو شاعری میں اقبال وغالب کو حاصل ہے۔متنبی کا پورا نام ابوالطیب احمد بن حسین جُعفی کندی ہے لیکن دنیائے ادب میں ''متنبی'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔

متنبی کی پیدائش کوفہ کے ایک محلہ ''کندہ'' میں 303ھ/ 915ء میں ہوئی تھی۔خاندانی حالات اچھے نہیں تھے۔غربت کے سائے میں بچپن کا کچھ حصہ وہیں گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔بچپن سے ہی ان کی ذہانت وذکاوت اور قوی حافظہ کے چرچے عام ہونے لگے تھے اور شاعرانہ مذاق اور مزاج کے مظاہر سامنے آنے لگے تھے۔قرامطہ کی لوٹ مار اور ظلم وزیادتی کی وجہ سے ان کے خاندان کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا اور تقریباً دو سال تک انھیں ''سماوہ'' کے مقام پر قیام کرنا پڑا۔ ہر شر میں خیر کا پہلو شامل ہوتا ہے۔متنبی کے خاندان کی یہ دربدری ان کے لیے رحمت بن گئی کہ انھیں بدوی عربوں کے ساتھ ایک عرصہ تک وقت گزارنے کا موقعہ ملا جس نے ان کو عربی زبان کا وسیع علم حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کردیا تھا۔اس خوش بختی پر وہ تاحیات نازاں وفرحاں رہے۔

متنبی کی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ آئے ہیں کبھی کامیابی اس کے قدم چومتی ہے تو کبھی ناکامی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی معمولی معمولی کامیابیوں سے مطمئن نظر نہیں آتے ہیں اور انھیں اپنے اس نظریہ سے رجوع کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ایک بلند اور اہم مقام حاصل کرلیں گے۔لہٰذا ایک زمانے میں وہ شاعری کو خیر آباد کہہ کر باغی اور سرکش افراد کے ساتھ جا ملتے ہیں۔یہاں بھی ناکامی ان کی راہ دیکھ رہی ہوتی ہے اور قید وبندان کا مقدر ٹھہرتا ہے۔دو سال کی قید وبند سے چھٹکارا معافی کے بعد ملتا ہے اور انھیں اپنے پرانے نظریہ پر دوبارہ واپس آنا پڑتا ہے کہ اپنا مقصد زندگی شاعری کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔اسی بغاوت اور گمرہی کے دور میں ان پر یہ الزام بھی لگ جاتا ہے کہ انھوں نے نبوت کا دعوی کیا تھا۔یہ الزام حالانکہ غلط ہے جس کے شواہد ان کے دیوان میں بھی موجود ہیں لیکن اسی الزام نے ہی انھیں دوام بخش دیا کہ وہ اپنے اصل نام کی بجائے ''متنبی'' کے نام سے مشہور ومعروف ہوگئے۔

بغاوت کے بعد جب انھوں نے شاعری کو دوبارہ ذریعۂ معاش بنایا تب بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔وہ برسوں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے یہاں تک کہ انھیں سیف الدولہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔بغاوت کے بعد کا ان کی شاعری کا دور 325 تا نصف 329ھ/ 937-940ء پر مشتمل ہے۔اس دوران انھوں نے انطاکیہ، دمشق اور حلب وغیرہ کے امرا کی مدح سرائی کیا تھا لیکن بدلے میں انھیں خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملا تھا تاہم ان کی شہرت کا آغاز ہوگیا تھا۔اسی زمانہ میں انھوں نے حاکم دمشق امیر بدر بن عمار خرشنی جیسے افراد کی مدح سرائی بھی کی تھی۔متنبی ان کے دربار سے تقریباً ڈیڑھ برس منسلک رہے اور وہاں کی درباری سازشوں کا شکار ہوگئے۔انھیں وہاں سے راہ فرار

اختیار کرنی پڑی اور بادیۃ الشام میں پناہ لینی پڑی۔اس دوران ان کے دل دماغ میں دوبارہ بغاوت کا جذبہ بیدار ہونے لگا لیکن اتفاق سے امیر بدر خرشنی کو کسی کام سے عراق کوچ کرنا پڑا اور وہ اپنی کمین گاہ سے نکل دوبارہ شعر وسخن کے کام میں مصروف ہو گئے۔

زندگی کے آخری دور میں متنبی کو سیف الدولہ جیسا مربی ملا جن کے دربار سے وابستہ ہونے کے بعد گویا انھیں اپنی منزل مقصود مل گئی کہ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں شعر وسخن کے ذریعہ جس مقام کو حاصل کرنے کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی کی صورت میں سامنے آئی۔وہ اس دربار سے تقریبا نو برس منسلک رہے۔یہی دور ان کی زندگی کا کامیاب ترین دور ہے جس میں انھیں عزت، شہرت، دولت اور ایک اعلی مقام ومرتبہ ملا تھا۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ متنبی اتنے عرصہ تک کسی کے بھی دربار سے منسلک نہیں رہا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے سیف الدولہ کے دربار میں جتنا عرصہ گذارا تھا اس کا چوتھائی حصہ بھی وہ کسی امیر کے ساتھ نہ گذار سکے۔اس طویل رفاقت میں جتنا متنبی کی خوش بختی کا دخل ہے اس سے کہیں زیادہ سیف الدولہ کی نظر کرم، حسن اخلاق اور داد ودہش کا دخل ہے کہ انھوں نے متنبی کے مخالفین کی باتوں کو ایک عرصہ تک قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا توں توں مسلسل شکایتوں اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں سیف الدولہ کے متنبی کے تئیں خیالات میں تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں حتی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے۔یہ بدگمانی اتنی بڑھی کہ متنبی کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان کے حوالہ سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔لہذا وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان بچانے کی خاطر مصر کے شہر فسطاط میں پناہ لینے کو مجبور ہو گئے اور وہاں کے امیر کافور اخشیدی کے دربار سے منسلک ہو گئے جنھوں نے انھیں صیدا کا حاکم بنانے کا وعدہ کیا تھا لیکن انھوں نے اپنے وعدہ کو پورا نہیں کیا تو متنبی کا دل ان سے کھٹا ہو گیا اور وہ کافور اخشیدی کے ساتھ نباہ نہ کر سکے اور بہت جلد ان کی سخت ہجو کر کے وہاں سے بھاگ نکلے اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے عراق جا پہنچے اور بغداد میں قیام پذیر ہو گئے۔دوران قیام انھوں نے وزیر مہلبی کے دربار سے منسلک ہونے اور ان کی نگاہ کرم کو حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس دربار سے وابستہ کچھ مصاحبین- جن میں ابن الحجاج اور کتاب الاغانی کے مصنف ابوالفرج اصفہانی جیسے لوگوں کا نام بھی شامل ہے- کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔

وزیر مہلبی کے دربار سے وابستگی کی کوشش کی ناکامی کے بعد انھیں ارجان نامی علاقہ کے بویہی وزیر ابن العمید کی سرپرستی حاصل ہوگئی اور ان کی مدح میں متنبی نے چند قصائد بھی کہے لیکن جلد ہی وہ شیراز منتقل ہو گئے کہ وہاں کے سلطان عضدالدولہ نے ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔کچھ دن وہ ان کے دربار سے وابستہ رہے اور ان کی مدح میں متعدد قصائد کہے۔نامعلوم اسباب کی بنا پر انھوں نے کچھ دنوں بعد شیراز کو الوداع کہہ دیا اور بغداد کا رخت سفر باندھ لیا لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دیر العاقول نامی مقام پر لٹیروں نے ان پر حملہ کر انھیں اور ان کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا سارا مال ومتاع لوٹ لیا۔اس حادثہ میں ان کے دیوان کے مسودے بھی ضائع ہو گئے۔

16.7.6.1 شاعری کا آغاز

''سماوۃ'' سے واپسی کے بعد متنبی نے شاعری کی طرف مزید توجہ دینی شروع کردی۔اس زمانہ کے چلن اور رواج کے مطابق وہ بھی شاعری کو ذرائع آمدنی کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔لہذا انھوں نے بھی سکہ رائج الوقت کے مطابق ابوالفضل کوفی کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر ان کی

خدمت میں پیش کر دیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ متنبی کے مذہبی اور فلسفیانہ نظریات وخیالات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا تھا۔

متنبی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ دنیا کو اپنی فطری شاعرانہ صلاحیتوں سے زیر کر لیں گے لیکن ان کی خوش فہمی ،خوش فہمی ہی رہی اور حقیقت کا روپ اختیار نہ کر سکی حتی کہ وہ سیف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوگئے جہاں انھیں اپنا گو ہر مقصود مل گیا۔سیف الدولہ کے دربار میں پہنچنے سے پہلے وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو نمایاں کرنے اور اسے ذریعۂ اکتساب بنانے کے لیے ادھر ادھر کے چکر کاٹتے رہے۔سب سے پہلے وہ کوفہ سے رخت سفر باندھ کر بغداد کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھوں نے اپنے ہم وطن محمد بن عبیداللہ علوی کی مدح سرائی کی۔بعدازیں وہ شام روانہ ہوئے جہاں وہ تقریباً دوسال تک قیام پذیر رہے اور ایک غنائی شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔قیام شام کے دوران انھوں نے تومنجی شیوخ ،طرابلس الشام اور لاذ قیہ کے امرا کی شان میں بھی کچھ قصائد کہے تھے۔بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف ''اس زمانے کا کلام عجلت میں لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور خوبی کے لحاظ سے اوسط درجے کا ہے لیکن اس میں بھی اس کے حقیقی ذہانت کے آثار نمایاں ہیں۔ایک مرثیہ اور بعض فی البدیہ اشعار کے سوا باقی سب نوکلاسیکی رنگ کے قصائد ہیں اور ان میں ابوتمام اور البحتری کا اثر غالب ہے''۔

متنبی کی شاعری کا دوسرا مرحلہ، اس شاعری کو قرار دیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی بغاوت کے دوران کی تھی۔اس بغاوت کا منفی پہلو یہ ہے کہ انھیں قید وبند سے گذرنا پڑا۔لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے اس نے انھیں ''متنبی'' کے نام سے شہرت دوام بخش دی۔اس دوران کی شاعری میں خیالات میں بہت بے ساختگی پائی جاتی ہے بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ''ابوالطیب کا وہ کلام جو بغاوت کے دوران میں (ہکذا) یا اس سے ذرا پہلے کا ہے خیالات کی بے ساختگی اور آمد کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔وہ نظم کی اشکال میں بلاتکلف تصرفات کرتا ہے۔اس کا اسلوب بیان پرزور ہے اور یہ اسلوب اس کے سابقہ انداز کے اس کے شخصی کردار کا آئینہ ہے''۔

بغاوت کے بعد کی شاعری کو ان کی شاعری کا تیسرا دور قرار دیا جاتا ہے۔اس دور کے اہم مدوحین میں حاکم دمشق امیر بدر بن عمار خرشنی شامل ہیں۔وہ تقریباً ڈیڑھ برس تک خرشنی کے دربار سے وابستہ اور ان کی مدح میں کئی ایک قصائد کو قلم بند کیے۔اس دور کی شاعری میں کوئی نمایاں بات نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ ان کی شاعری میں ارتقا کا ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔یہی تسلسل انھیں ان کی شاعری کے دوسرے دور سے ممتاز بناتا ہے۔

متنبی کی شاعری کا چوتھا دور سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی یعنی نصف 329ھ/ 940ء سے شروع ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ 337ھ/ 948ء پر ہوتا ہے۔اس کے بعد کے زمانہ سے لے کر اپنی وفات تک کے عرصے میں انھوں نے اپنے چوتھے دور کے طرز پر ہی شاعری کی۔سیف الدولہ سے وابستگی کے بعد متنبی نے جو قصائد کہے تھے وہ ان کی شاعری کا اوج کمال ہے۔انھوں نے اپنے اشعار میں بہترین انداز واسلوب میں سیف الدولہ کے جنگی معرکوں کی تصویر کشی کی ہے جس سے ایک طرف ان کی قوت مشاہدہ اور ان کی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف الفاظ کے استعمال اور اسلوب بیان پر قادر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

متنبی نے سیف الدولہ کے دربار سے اپنے تعلقات کے خاتمہ کے بعد فسطاط کے والی کافور اخشیدی کے دامن میں پناہ لی تھی اور ان کی شان میں قصائد کہے تھے لیکن ان قصائد کی زبان اور اسلوب بیان سے لگتا ہے کہ وہ بدرجۂ مجبوری کافور اخشیدی کی تعریف کر رہا ہے کہ ان کا دل ابھی تک سیف الدولہ کے دربار میں اٹکا ہوا ہے۔کافور اخشیدی کی شان میں کہے گئے بعض قصائد سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی تعریف میں نہیں بلکہ ان کی ہجو میں کہے گئے ہیں۔کافور سے جب اس کا نباہ نہ ہوسکا تو انھوں نے ان کی سخت ہجو کی اور فسطاط سے بھاگ نکلے

اور بویہی وزیر ابن العمید اور شیراز کے حاکم عضد الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور ان کی تعریف میں چند قصائد کہے۔

متنبی کا شمار ان عرب شعرا میں ہوتا ہے جن کے اندر انا، پندار، اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا جذبہ، دوسروں سے برتر ہونے کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متنبی اپنے اشعار میں مختلف مواقع پر اپنی ذات و شخصیت کو بہت زیادہ نمایاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ وہ ذہنی طور پر نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ متقدمین اور متاخرین سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں جس نے ان کے اندر خودنمائی اور پندار کو پیدا کر دیا تھا۔

عربی شاعری پر متنبی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ ''عربی کے سب عرب قصیدہ گو شعرا مختلف اسباب سے المتنبي سے اثر پذیر ہوئے ہیں''۔ ان کے دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جو تا ہنوز متداول ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے فکر وفن کا مطالعہ آج بھی کیا جا رہا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر سب سے وقیع کتاب **مع المتنبی** محمود شاکر کی ہے جو ان کے دسیوں سال کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ ان کی کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے نوبل پرائز کے بعد سب سے وقیع انعام ''فیصل ایوارڈ'' سے نوازا گیا ہے۔

16.7.7 ابوالعلاء معری

عصر عباسی کے نابغۂ روزگار شعرا میں ابوالعلاء معری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کا نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان ہے لیکن وہ اپنی کنیت اور نسبت سے زیادہ مشہور ومعروف ہوئے۔ ان کی پیدائش 363ھ/ 973ء میں معرۃ النعمان کے مقام پر ہوئی۔ مقام پیدائش سے نسبت کی وجہ سے ''معری'' کہلایا۔ چار برس کی عمر میں انھیں چیچک ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی بصارت ضائع ہو گئی۔ اس حادثہ نے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے اور وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ کر لیا لیکن اس حادثہ کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ وہ زبردست حافظے اور یادداشت کے مالک بن گئے جن کے نمایاں اثرات ان کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔

ابوالعلاء معری نے ابتدائی تعلیم وتربیت معرۃ النعمان میں اپنے والد سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے حلب چلے گئے۔ حلب کے اساتذہ میں محمد بن عبداللہ اور یحییٰ بن مِسْعر کا شمار ہوتا ہے۔ اول الذکر سے انھوں نے ادب اور لسانیات کا درس لیا تو مؤخر الذکر سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ مزید علم حاصل کرنے کے لیے انھوں نے انطاکیہ کا رخ کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے اپنی علمی پیاس بجھانے کے بعد طرابلس روانہ ہو گئے اور وہاں سے انطاکیہ کے لیے دوبارہ رخت سفر باندھا اور عیسائی علما سے استفادہ کرتے ہوئے دین مسیحی سے متعلق بہت ساری معلومات حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں ان کا یہ علمی سفر تمام ہوا اور وہ معرۃ النعمان واپس آ گئے۔ اس علمی سفر کے دوران ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چودہ سال تھی۔

معرۃ النعمان میں ان کا گزربسر ایک وقف سے حاصل ہونے والے وظیفے سے ہوتا تھا۔ یہ وظیفہ تیس دینار سالانہ پر مشتمل تھا جس کا نصف حصہ وہ اپنے ملازم کو دے دیا کرتے تھے۔ معرۃ النعمان کے قیام کے دوران انھوں نے کسی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ معرۃ النعمان میں اچھا خاصا عرصہ گذارنے کے بعد 398ھ/ 1008ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بغداد روانہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے صرف عبدالسلام بصری سے تعلیم حاصل کی اور زیادہ تر وقت وہاں کی لائبریریوں میں گذارا۔ اسی سفر کے دوران انھوں نے اپنی منظوم

کتاب "سقط الزند" کی شرح "ضوء السقط" کے نام سے لکھی ۔ بغداد میں ایک سال سات مہینے گذار کر رمضان 400ھ/ اپریل-مئی 1010ء میں واپس معرۃ النعمان آ گئے ۔ بغداد کا یہ سفر ان کی زندگی کا ایک اہم پڑاؤ ہے ۔اس سفر کی خوش گوار یادیں ان کے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ گئیں تھیں جس کا اندازہ ان کے اس قصیدہ سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے وہاں سے رخت سفر باندھتے ہوئے لکھا تھا۔ بغداد سے ان کی واپسی کے بنیادی اسباب ان کی ناداری وافلاس اور والدہ کی علالت کو بتایا جاتا ہے ۔دوران سفر ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔اس حادثہ نے انھیں مزید گوشہ نشیں کر دیا اور وہ اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں اکیلا سمجھنے لگے تھے ۔ بصارت سے محرومی اور تنہائی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو "رھین المحبسین" کہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں کبھی مکمل تنہائی نصیب نہیں ہوئی کہ ان سے شعر گوئی اور ادب کا فن حاصل کرنے کے لیے عالم اسلام کے مختلف مقامات سے افراد آتے جاتے رہتے تھے ۔ بغداد کا یہ سفر ان کی زندگی کا غالبا آخری سفر تھا کہ انھوں نے اپنی باقی زندگی معرۃ النعمان میں ہی گذاری تھی ۔

ابوالعلاء معری نے عصر عباسی کا وہ عہد پایا تھا جو شدید کشمکش اور انتشار کا تھا۔اس کی شان وشوکت میں گھن لگ چکا تھا۔عباسی خلفا صرف نام کے حکمراں رہ گئے تھے کہ عملا سارا اقتدار آل بویہ کے ہاتھ میں تھا جن کی مرضی کے بغیر خلفا کوئی بھی فیصلہ نہیں لے سکتے تھے ۔اسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک قول کے مطابق 417-419ھ/ 1026-1028ء کے درمیان جب صالح بن مرداس نے معرۃ النعمان کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے انھیں ہی صالح بن مرداس کے پاس سفارش کے لیے بھیجا تھا۔صالح بن مرداس نے ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر اپنا محاصرہ اٹھا لیا اور شہر کی ذمہ داریاں بھی انھیں کے حوالہ کر دی تھی ۔اس روایت کی صحت کے حوالہ سے کوئی بھی حتمی بات نہیں کی جا سکتی ہے ۔

عمر کے آخری پڑاؤ میں بھی ان کی ذہنی صلاحیتوں میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی تھی کہ اس دوران لکھے گئے رسائل ،معانی اور ادب کے لحاظ سے ان رسائل سے بہتر ہیں جو انھوں نے پہلے لکھے تھے ۔

ایک طویل عمر گذارنے کے بعد ابوالعلاء معری کی وفات 13 ربیع الاول 449ھ/ 16 مئی 1057ء میں ہوئی ۔ان کی وفات پر ستر سے زائد شعرا نے مرثیے لکھے ۔

16.7.7.1 تصانیف

ابوالعلاء معری کا شمار عصر عباسی کے ان افراد میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنا علمی ورثہ نظم ونثر دونوں میں چھوڑا تھا۔ ابوالعلاء معری کو عہد عباسی کے شعرا میں اس لحاظ سے ممتاز و منفرد قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی تھے۔ان کی مجموعی تصانیف کی تعداد 73 بتائی جاتی ہے جن میں سے اکثر زمانہ کی دست وبرد کا شکار ہو چکی ہیں ۔ یہ کتابیں انھوں نے ابوالحسن علی بن عبداللہ اصفہانی کو املا کرائی تھیں ۔ان کی باقی ماندہ کتابوں میں سقط الزند، اس کی شرح ضوء السقط، الدرعیات اور اللزومیات یا لزوم ما لا یلزم منظوم ہیں ۔

سقط الزند ان کی جوانی کے کلام پر مشتمل ہے جس میں قصائد، مراثی اور دوسرے اصناف سخن پر مشتمل اشعار موجود ہیں ۔اسی دیوان میں ان کا وہ مرثیہ بھی موجود ہے جو انھوں نے اپنے والد کی وفات پر چودہ سال کی عمر میں کہا تھا۔اسی طرح اس میں چند نامعلوم اشخاص کے قصائد بھی پائے جاتے ہیں جن کے متعلق ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ انھوں نے مشقیہ طور پر ان قصائد کو نظم کیا تھا۔

غالبا معری عہد عباسی کے اکلوتے شاعر ہیں جنھوں نے خود ہی اپنے دیوان کی شرح لکھی ۔معری نے سقط الزند کی شرح ضوء السقط کے نام سے لکھی تھی۔

الدرعیات کومعری نے ایک مستقل تصنیف قرار دیا ہے حالانکہ وہ سقط الزند کے آخر میں بھی مع شرح موجود ہے۔اس شعری مجموعہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں معری نے اپنے ان تمام اشعار کوجمع کر دیا ہے جوانھوں نے''درع''(زرہ) کی تعریف وتوصیف میں کہے۔

اللزومیات/لزوم ما لا یلزم کومعری کی اہم تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دیوان کے ہر شعر میں صنعت لزوم مالا یلزم کا التزام کیا گیا ہے یعنی ہر بیت کے قافیہ میں دوحرف روی آئے ہیں۔اس دیوان پر شاعری سے زیادہ فلسفہ کی کسی کتاب کا شائبہ پایا جاتا ہے کہ اس میں شاعر نے فلسفیانہ موضوعات جیسے زمان ومکان، مادہ وروح اور ذات باری وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

ان کی منثور کتابوں میں **کتاب الفصول والغایات، رسائل ابی العلاء(رسالة الغفران،رسالة الملائکة، رسالة الشیاطین، رسالة الإغریض** وغیرہ)، **ملقی السبیل في الوعظ والزھد، شرح دیوان الحماسة، عبث الولید**(عصر عباسی کے مشہور شاعر بحتری کے دیوان کی شرح)وغیرہ شامل ہیں۔

16.7.7.2 شاعری

ابوالعلاءمعری نے تقریبا تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے دیوان میں مدحیہ قصائد،مراثی اور دیگر اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف''اس کا جوانی کا کلام بلحاظ موضوع تو سادہ ہے لیکن بلحاظ اسلوب پر تکلف۔بعد کے کلام میں نادر کلمات زیادہ ملتے ہیں اوراس اعتبار سے دیکھیے تو دور جاہلیت کے اشعار اوران میں زیادہ فرق نہیں ہے..........مدحیہ قصائد میں متنبی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔مرثیوں میں وہ اپنے دکھ اور مصائب کا حال بیان کرتا ہے لیکن چونکہ اسے یوم آخرت پر ایمان نہیں تھا یا اس کے بارے میں شکوک وشبہات تھے،اس لیے یہ دکھ اور درد اور بھی بڑھ جاتا ہے''۔**اللزومیات/لزوم ما لا یلزم** میں وہ ایک''بے باک مفکر اور بلند اخلاق معلم'' کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔اس دیوان میں ان کی شاعری کا ایک خاص رنگ نظر آتا ہے کہ وہ اس میں ایک شاعر سے زیادہ ایک فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔اس دیوان میں انھوں نے فلسفیانہ موضوعات کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔**الدرعیات** سے فن وصف نگاری میں ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے صرف زرہ (درع) کے وصف میں کہے جانے والے متعدد اشعار کوجمع کر دیا ہے۔

16.8 اکتسابی نتائج

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گونا گوں صفات،امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد وممتاز نظر آتی ہے۔عہد عباسی کو کئی ایک تہذیبوں اور ثقافتوں کا نقطۂ اتصال قرار دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی تہذیب وثقافت کوفروغ حاصل ہوا تھا جس میں اسلامی تہذیب وتمدن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے۔عہد عباسی کے سیاسی،سماجی،ثقافتی اور علمی وادبی ماحول نے ایک ایسی فضا تیار کر دی تھی جو کسی اور اسلامی دور میں نظر نہیں آتی ہے۔اسی مخصوص فضا میں عربی شاعری اپنے نئے رنگ وروپ میں پروان چڑھتی ہے اور ایسے بیش بہا نمونے پیش کرتی ہے جس سے عربی شاعری کا دامن مزید وسیع ہوجاتا ہے اور اس کی قدر وقیمت میں

گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔

عصر عباسی کی شاعری، عربی شاعری کے دیگر تمام ادوار سے اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں قدما کے طرز اسلوب و بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے شعرا نے ایک نیا طرز واسلوب اختیار کیا تھا کہ وہ محبوبہ کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ وڈھنگ سے کرتے ہیں۔قدیم اصناف سخن - جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ - کے دائرۂ کار میں وسعت کے ساتھ ساتھ شاعری کے چند جدید موضوعات -غزل غلمان، زہدیات، طردیات اور خمریات وغیرہ- منظر عام پر آتے ہیں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے موضوعات شاعری میں مجموعی طور پر کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں بھی قدیم اسلوب وانداز میں شاعری کرنے والے شعرا موجود تھے جن کی شاعری پر جدید ماحول اور حالات کے اثرات مرتب ہی نہیں ہوئے تھے یا برائے نام مرتب ہوئے تھے۔

عہد عباسی کی شاعری پر جب ایک طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کو فروغ دینے میں شعرا کے ساتھ ساتھ سماج کے مختلف طبقات جیسے عباسی خلفا، وزرا، امرا اور وعمائدین سلطنت، نثر نگاران اور علمائے دین وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا کہ ایک طرف جہاں عباسی خلفا، وزرا، امرا اور وعمائدین سلطنت نے شعرا کی سرپرستی کی تھی تو دوسری طرف انھوں نے خود بھی داد سخن حاصل کی تھی اور شاعری کے عمدہ نمونے بطور یادگار چھوڑے تھے۔

عہد عباسی میں شاعری کے بہت زیادہ فروغ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس عہد میں شاعری کسب معاش، عزت وشہرت اور مال ودولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گئی تھی۔اسی طرح مملکت عباسیہ میں شاعری کے اہم مراکز میں بغداد کے علاوہ دیگر مقامات بھی پائے جاتے تھے جہاں کے امرا اور حکمرانوں کے دربار میں شعروشاعری کی سرپرستی کی جاتی تھی نتیجتاً شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلہ میں زیادہ بڑا اور وسیع میدان ملا اور انھوں نے اپنی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اچھے انداز واسلوب میں پیش کیا۔

عہد عباسی کے شعرا کو تین بڑے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا طبقہ ان شعرا کا ہے جنھوں نے عہد اموی کا آخری اور عہد عباسی کا اولین دور پایا تھا۔ان شعرا نے عہد عباسی کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔اس طبقہ کے اہم نمائندہ شاعر بشار بن برد اور اور ابونواس ہیں۔دوسرا طبقہ شعرائے مولدین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ تیسری صدی میں گذرا تھا۔انھوں نے اپنے پیش روشعرا کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے عربی شاعری کو نئے رنگ وآہنگ سے نوازا تھا۔اس طبقہ کے نمائندہ شعرا میں ابوتمام اور بحتری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔تیسرا طبقہ شعرائے محدثین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چوتھی صدی میں گذرا تھا۔انھوں نے بھی عربی شاعری کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔اس طبقہ کے اہم شعرا میں متنبی اور ابوالعلاء معری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا شعرا کو موضوعاتی اور فنی لحاظ سے **شعراء البداوة، الشعراء المجددون، الشعراء المفتنون، شعراء الصنعة، الشعراء المحافظون، الشعراء المبدعون** اور **شعراء المذاهب والوجدان والفكر** کے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مؤخر الذکر طبقہ شعرا کی ایک بڑی اکائی پر مشتمل ہے جسے ان کے نظریات، خیالات وافکار کے لحاظ سے **شعراء العباسية، شعراء**

الشيعة، شعراء العشق، شعراء الزهد والحكمة والمواعظ، شعراء علمائ اورشعراء الطبع والزندقة میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

16.9 نمونے کے امتحانی سوالات

1 عصر عباسی کی شاعری کے امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

2 عصر عباسی میں صنف سخن ''زہدیات'' پر روشنی ڈالیے۔

3 عصر عباسی کی شاعری کے موضوعات پر مدلل بحث کیجیے۔

4 مشہور عباسی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے کسی ایک کی حالات زندگی تحریر کیجیے۔

5 متنبی کی شاعری کے امتیازی خصوصیات لکھیے۔

6 عصر عباسی کی شاعری میں زہدیات، خمریات اور طردیات کو بیان کیجیے۔

16.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

1-تاريخ الأدب العربي (العصر العباسي الأول) شوقی ضیف

2-تاريخ الأدب العربي (العصر العباسي الثاني) شوقی ضیف

3-الجامع في تاريخ الأدب العربي حنا فاخوری

4-تاريخ الأدب العربي احمد حسن زیات

5-الأدب في عصر العباسيين (الجزء الأول والثاني) محمد زغلول سلام

6-عربی ادب کی تنقیدی تاریخ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

7-اردو دائرۃ المعارف